بفرمائش
شیخ مبارک علی تاجر کتب اندرون لوہاری دروازہ لاہور

عالمگیر الیکٹرک پریس لاہور میں باہتمام حافظ محمد عالم چھپا

طبع چہارم .... قیمت للعہ

فہرست ابواب

نوٹ: غالب کی جن تصانیف کے حوالے کتاب میں دیئے گئے ہیں، ان کے اڈیشنوں کی تفصیل یہ ہے۔

(۱) کلیات نظم فارسی مطبوعہ نولکشور ۱۸۹۳ء (۲) کلیات نثر فارسی مطبوعہ نولکشور ۱۸۸۴ء

(۳) اردوئے معلیٰ مطبوعہ مطبع فاروقی دہلی ۱۳۲۷ھ (۴) عود ہندی مطبوعہ نولکشور جولائی ۱۹۰۰ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ آج غالب کی سرگزشت حیات کا یہ مرقع اپنی زندگی کے چوتھے مرحلے میں داخل ہو رہا ہے جیساکہ بارہا عرض کر چکا ہوں، ہندوستان کے اس نادر الوجود شاعر کے سلسلے میں کام کے وسیع پروگرام کا یہ محض مقدمہ تھا۔ افسوس کہ اب تک اصل کام کے لئے ایک قدم اٹھانے کی بھی مہلت نصیب نہ ہو سکی۔ زندگی کے بیشتر اوقات، اور فکر و نظر کی "بضاعت مزجات" کو سیاسی مشغولیتوں کی نذر کر دینا پڑا۔ ان مشغولیتوں سے فراغت کے جو چند لمحے وقتاً فوقتاً میسر آئے۔ وہ غالب سے بھی اہم تر کام کے حوالے کر دیئے۔ اب تو وہ آرزو ہی افسردہ ہو چکی ہے جو غالب کے مفصل سوانح کی ترتیب میں مشعل راہ بنی تھی۔ اور پیہم اعادے نے اس ذکر میں بھی لطف و ذوق کی کوئی چاشنی باقی نہیں چھوڑی۔

کاغذ اور سامان طباعت کی گرانی آج بھی بدستور ہوشربا ہے بلکہ اس مرتبہ کتابت کے انتظام میں بھی سخت دشواریاں پیش آئیں جن کی وجہ سے کتاب کی طباعت کم و بیش دو مہینے موخر ہو گئی۔ ان حالات میں "غالب" کی ظاہری آرائش کے متعلق میری بے بسی کسی تفصیل کی محتاج نہیں۔

کتاب جب پہلی مرتبہ چھپی تھی تو میرے عزیز دوست جناب عبدالرشید صاحب راحل نے ایک بلیغ مادہ تاریخ حضرت حفیظ ہوشیارپوری کے ہاتھ میرے پاس بھیج دیا تھا۔ پھر میری درخواست پر اسے ایک قطعہ کی صورت میں نظم کر دیا۔ یہ قطعہ اسی زمانے میں انقلاب میں چھپ گیا تھا۔ اب میں اپنے عزیز و مخلص دوست کے اس گراں بہا ارمغاں کو مستقل طور پر شامل کتاب کرتا ہوں اور یہ ہر لحاظ سے میرے لئے اور کتاب کے لئے سرمایہ افتخار ہے۔

حضرت راحل فرماتے ہیں:

جامے بدہ ز بادۂ غالب بہ لطف خاص	جانم فدائے لطف تو ساقی مہر چہر
زیں بعد گو بہ حضرت مہر ایں پیام من	"دل را بہ دل رہیست دریں گنبد سپہر"
در زیر چرخ راحل سر مست دا بس است	جامے ز دست ساقی "غالب زکلک مہر"

۱۳۵۵ھ

آخر میں اپنے محترم بھائی الحاج شیخ مبارک علی صاحب تاجر کتب کا شکریہ واجب ہے جنہوں نے ابتدا ہی سے غالب کی کتابت و طباعت وغیرہ کی تمام ذمہ داریاں اپنے دوش ہمت پر اٹھالی تھیں۔ الحمد للہ اس سلسلے میں نگرانی کے سوا مجھے ہر زحمت سے بچائے رکھا۔ اگر یہ ناچیز کام کسی اعتبار سے بھی قابل توجہ سمجھا جا سکتا ہے۔ تو شیخ صاحب ممدوح اس کے اجر میں بہ الفاظ غالب یقیناً "شریک غالب" ہیں۔

مہر

مسلم ٹاؤن لاہور ۱۴ ستمبر ۱۹۴۶ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پہلا باب

پیدائش، نام ونسب اور خاندان

غالب نام آورم نام و نشانم مپرس
ہم اسد اللّٰہم و ہم اسد اللّٰہیم

تاریخ پیدائش اسد اللہ بیگ خاں نام، میرزا نوشہ عرف، نجم الدولہ، دبیر الملک، نظام جنگ، خطاب، ۸ رجب ۱۲۱۲ھ (۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء) کو اکبر آباد (آگرہ) میں زینت آرائے عالم وجود ہوئے[1] نواب علاء الدین احمد خاں رئیس لوہارو کو ایک خط میں جو غالباً ۱۲۸۰ھ کا لکھا ہوا ہے، فرماتے ہیں:-

"میں ۱۲۱۲ھ میں پیدا ہوا ہوں۔ اب کے رجب کے مہینے سے اُنہترواں برس شروع ہوا ہے۔"

ایک اور خط میں نواب صاحب ممدوح ہی کو لکھتے ہیں:-

قاعدۂ عام یہ ہے۔ کہ عالم آب و گل کے مجرم عالم ارواح میں سزا پاتے ہیں۔ لیکن یوں بھی ہوا ہے۔

---

[1] غالب نے ایک جگہ لکھا ہے۔ کہ ان کی ولادت "بوقت شب چار گھڑی پیش از طلوع صبح روز یکشنبہ ہشتم رجب ۱۲۱۲ھ مطابق آغاز ۱۷۹۷ء ہوئی" حساب کے مطابق ۸ رجب ۱۲۱۲ھ کی عیسوی تاریخ ۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء تھی نیز اس دن یکشنبہ نہ تھا۔ بلکہ چہار شنبہ تھا یعنی غالب نے وقت اور قمری تاریخ درست لکھی لیکن دن اور عیسوی تاریخ کی غلطی ظاہر ہے

کہ عالم ارواح کے گنہگار کو دنیا میں بھیجکر سزا دیتے ہیں چنانچہ ۸ رجب ۱۲۱۲ھ کو مجھے روبکاری کے واسطے یہاں (یعنی دنیا میں) بھیجا" (مرقومہ ماہ ذیحجہ ۱۲۷۷ھ)

خواجہ غلام غوث خاں بیخبر کو ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:۔

حضرت! میں اب چراغ سحری ہوں۔ رجب ۱۲۸۲ھ کی آٹھویں تاریخ سے اکہترواں برس شروع ہوگیا۔ طاقت سلب، حواس مفقود، امراض مستولی۔

دیوان فارسی کے خاتمہ کی نثر میں غالب نے اپنی تاریخ پیدائش کے متعلق ایک دلچسپ رُباعی لکھی ہے جس میں دو مادے نظم کئے ہیں۔ اور دونوں اس نادر روزگار ہستی کی سرگزشت حیات کا آئینہ ہیں:

غالب چو ز ناسازی فرجام نصیب ہم خوف عدو دارم و ہم ذوق حبیب
تاریخ ولادت من از عالم قدس ہم "شورش شوق" آمد و ہم لفظ "غریب"

"شورش شوق" اور "غریب" دونوں سے ۱۲۱۲ھ کا عدد برآمد ہوتا ہے اور دونوں مادے غالب کی زندگی کا نہایت ہی صحیح نقشہ پیش کرتے ہیں۔

صاحب عالم مارہروی سجادہ نشین درگاہ برکاتیہ معروف بہ "سرکار خورد" غالب کے ایک نہایت عزیز دوست تھے۔ اُردوئے مُعلّی کے مکتوب الیہم میں ہیں۔ ۱۲۱۱ھ میں پیدا ہوئے۔ ایک مرتبہ غالب کو لکھا کہ میرا سنہ ولادت لفظ "تاریخ" سے نکلتا ہے۔ اس تاجدار اقلیم تفنّن نے بے تکلّف لکھ بھیجا:۔

ہاتف غیب شب کو یُوں چیخا
اُن کی "تاریخ میرا "تاریخا"

"تاریخ" کے اعداد میں الف کا ایک ہندسہ بڑھا دیا جائے۔ تو ۱۲۱۲ھ بن جاتے ہیں ÷

نام | نام، عرف اور خطاب کے متعلق غالب کی اُردو اور فارسی تحریرات میں جا بجا

تصریحات ملتی ہیں۔ غدر کے متعلق نثر کی مشہور کتاب "دستنبو" پہلی مرتبہ آگرہ میں منشی شیونرائن آرام کے مطبع مفید خلائق میں چھپی تھی۔ اور چھپائی کا سارا انتظام منشی ہرگوپال تفتہ، منشی نبی بخش حقیر اور مرزا حاتم علی بیگ مہر کے سپرد ہوا تھا۔ ایک خط میں تفتہ کو ہدایات دیتے ہوئے فرماتے ہیں :۔

منشی شیونرائن کو سمجھا دینا کہ زنہار (سرورق "دستنبو" پر) عرف نہ لکھیں یا جزائے خطابی کا لکھنا نامناسب بلکہ مضر ہے۔ مگر ہاں نام کے بعد لفظ بہادر کا اور بہادر کے بعد تخلص :۔

اسد اللہ خاں بہادر غالب

پھر منشی شیونرائن کو ایک خط میں لکھتے ہیں :۔

سُنو میری جان! نوابی کا مجھ کو خطاب ہے۔ "نجم الدولہ" اطراف و جوانب کے امراء سب مجھ کو نواب لکھتے ہیں، بلکہ بعض انگریز بھی۔ چنانچہ صاحب بہادر نے جو ان دنوں ایک روبکاری بھیجی ہے۔ تو لفافہ پر نواب اسد اللہ خاں لکھا ہے۔ لیکن یاد رہے۔ کہ نواب کے لفظ کے ساتھ میرزا یا میر نہیں لکھتے۔ یہ خلاف دستور ہے۔ یا "نواب اسد اللہ خاں" لکھو یا "میرزا اسد اللہ خاں" اور "بہادر" کا لفظ دونوں حال میں واجب اور لازم ہے۔

تفتہ نے پوچھا تھا کہ "اسد اللہ خاں" کے بجائے "محمد اسد اللہ خاں" کیوں نہ لکھا جائے۔ نیز نام سے پہلے "میرزا" لکھا جائے یا "مولانا" یا "نواب"۔

جواب میں فرماتے ہیں :۔

سُنو صاحب! لفظ مبارک م، ح، م، د (محمد) کے ہر حرف پر میری جان نثار ہے۔ مگر چونکہ یہاں سے ولایت تک حکام کے ہاں یہ لفظ یعنی "محمد اسد اللہ خاں" نہیں لکھا جاتا میں نے بھی موقوف کر دیا ہے۔ رہا میرزا و مولانا و نواب اس میں سے تم کو اور بھائی (منشی نبی بخش حقیر) کو اختیار ہے جو چاہو لکھو۔

عرف: عرف کا ذکر غالب نے اپنے اردو دیوان کے دیباچہ کی نثر میں کیا ہے۔

فرماتے ہیں :-

یارب ایں بُوئے ہستی ناشنیدہ از ہستی بہ پیدائی نارسیدہ یعنی نقش بہ ضمیر آمدہ نقاش کہ بہ اسد اللہ خاں موسوم، بہ میرزا نوشہ معروف، بہ غالب تخلص است، چنانکہ اکبر آبادی مولد و دہلوی مسکن است، فرجام کار نجفی مدفن باد :-

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ غالب ابتدا میں اپنے عرف کا اظہار بے تکلف کرتے تھے لیکن جس زمانے میں "دستنبو" چھپ رہی تھی۔ منشی شیو نرائن صاحب آرام مالک مطبع مفید خلائق نے غالب کو ایک خط ایسا بھیجا۔ جس کے لفافے پر "میرزا نوشہ صاحب غالب" درج تھا۔ غالب کو خوف پیدا ہوا کہ کہیں "دستنبو" کے سرورق پر بھی یہی عبارت درج نہ ہو جائے۔ چنانچہ تفتہ کو لکھتے ہیں :-

صاحب مطبع (منشی شیو نرائن) کے خط کے لفافہ پر لکھا ہے "میرزا نوشہ صاحب غالب"۔ اللہ غور کرو، کتنا بے جوڑ جملہ ہے۔ ڈرتا ہوں کہ صفحہ اول کتاب پر یہی نہ لکھ دیں۔ آیا فارسی کا دیوان یا اُردو کا یا "پنج آہنگ" یا "مہر نیمروز" چھاپے کی کوئی کتاب اس شہر (آگرہ) بابن تہیج پہنچی جو وہ (منشی شیو نرائن) میرا نام دیکھ بیٹھے ؟ تم نے بھی میرا نام انہیں نہ بتایا۔ صرف اپنی نفرت عرف سے وجہ اس واویلا کی نہیں ہاں بلکہ وجہ یہ ہے۔ کہ دہلی کے عوام کو تو عرف معلوم ہے۔ مگر کلکتہ سے ولایت تک یعنی وزرا کے محکمہ میں اور ملکہ عالیہ کے حضور میں کوئی اس نالائق عرف کو نہیں جانتا۔ پس اگر صاحب مطبع نے "میرزا نوشہ" لکھ دیا۔ تو میں غارت ہو گیا، کھو دیا گیا :-

اس تحریر سے صاف ظاہر ہے کہ ۱۸۵۷ء تک غالب عرف سے متنفر ہو چکے تھے اور اس کے اظہار کو موجب عار سمجھنے لگے تھے۔ شاید ابتدا میں عرف اس لئے اختیار کر لیا تھا کہ اس زمانے کا ایک عام دستور تھا۔ اور "میرزا نوشہ" کہلانے کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے۔ کہ غالب کے والد میرزا عبد اللہ بیگ کا عرف "میرزا دولھا" تھا۔

لیکن جب شباب کی رنگینیوں اور عامیانہ آرائش جوئیوں کا دور گزر گیا اور طبیعت میں متانت وثقاہت پیدا ہوگئی تو عرف سے عار آنے لگی۔

مولد سے محبت

اگرچہ ابتدا عہد شباب ہی میں آگرہ کو چھوڑ کر دہلی میں سکونت اختیار کرلی تھی، لیکن مولد کی محبت ان کے دل میں ہمیشہ موجزن رہی۔ نواب ضیاءالدین احمد خاں نیر ایک دفعہ آگرہ تشریف لے گئے۔ غالب نے انہیں آگرہ خط بھیجا۔ دیکھیئے اس میں مولد کے ساتھ والہیت کا اظہار کس ولولہ انگیز انداز میں کرتے ہیں:-

جان برادر! اشک و آہ غالب، امراد یعنی آب و ہوائے اکبرآباد بہ شما سازگار باد ...... گرفتم کہ خود را بہ سفر گرفتہ و نزدیک تو از من دور تر رفتہ اید، اما چوں ہنوزم در وطن اید ہمانا کہ نزدیک بامن اید۔ شادم کہ شوق دور اندیش دیدہ و دل را دریں سفر بہ شما فرستاد تا ہم دریں غربت داد شادمانی دیدار وطن نیز تواں داد۔ زینہار اکبرآباد را بچشم کم ننگرند و از رہ گزرہائے آں دیار الحفیظ گوے "دارالامان سرائے" گزرند کہ آں آباد چہ ویران و آں ویرانہ آباد یا زی گاہ ہم چو من مجنونے و ہنوز آں بقعہ را در ہر کف خاک چشمہ خونے امست۔ روزگارے بود کہ در آں سرزمین جز مہر گیا نہ رستے و ہیچ نہال جز دل بار نیاوردے۔ نسیم صبح در آں گل کدہ بہ مستانہ وزیدن دلہا را آنما یہ از جا برانگیختے کہ رنداں را ہوائے صبوحی از سر و پارسایاں را نیت نماز از ضمیر فرو ریختے۔ ہرچند ہر ذرۂ خاک آں گل زمیں را از تن پیامے بود دلنشیں و ہر برگ آں گلستاں را از جاں درودے بود خاطر نشاں، اما تازگی وقت شمار اور نظر داشتہ چشم براہ آں داشت کسے کے نویسند دریغ کہ ہیچ گاہ ننوشتند کہ رخش[1] سنگیں دعائے مرا بہ کدام ادا پذیرفت و دریا بہ پاسخ سلام من از زبان موج چہ گفت۔

[1] یعنی پتھر کا گھوڑا۔ سکندرہ (آگرہ) میں اکبر کے مقبرے کے قریب اعتبار ی خاں کی مسجد سے ملا ہوا سنگ سرخ کا ایک نہایت خوبصورت گھوڑا نصب ہے۔ غالب کا اشارہ اسی کی طرف ہے (بقیہ حاشیہ صفحہ ۶ پر

بقیہ حاشیہ متعلقہ صفحہ نمبر ۵:- عام روایت یہ ہے کہ کسی تاجر کا ایک عزیز گھوڑا اس مقام پر یکایک مر گیا تھا اس کی قبر پر بطور یادگار یہ مجسمہ کھڑا کر دیا گیا۔

اورنگ زیب نے زمانۂ شہزادگی میں جبکہ اس کی عُمر صرف چودہ برس کی تھی، مست ہاتھی سے جو جانبازانہ جنگ کی تھی ہر تاریخ داں کو معلوم ہے۔ شاہانِ مغلیہ بالعموم مست ہاتھیوں کی لڑائی کا تماشا دیکھا کرتے تھے۔ اسی قسم کا ایک تماشا شاہجہاں کے حضور میں ۲۹ ذی قعدہ ۱۰۴۲ھ (۲۸ مئی ۱۶۳۳ء) کو ہوا تھا۔ جس میں عام تماشائیوں اور امراء کے علاوہ دارا شکوہ، شجاع اور اورنگ زیب بھی موجود تھے۔ لڑنے والے ہاتھیوں میں سے ایک کا نام سُدھکر اور دوسرے کا صورت سندر تھا۔ لڑتے لڑتے صورت سُندر ایک طرف کو بھاگ نکلا۔ سُدھکر نے اس کا تعاقب کیا۔ لیکن یکایک وہ حریف کو چھوڑ کر تماشائیوں کی طرف متوجہ ہو گیا جس حصے کا اُس نے رُخ کیا وہاں اورنگ زیب سب سے آگے گھوڑے پر سوار کھڑا تھا۔ تمام تماشائی سراسیمگی میں اِدھر اُدھر بھاگ نکلے۔ لیکن اورنگ زیب اپنی جگہ چٹان کی طرح جما رہا۔ ہاتھی قریب پہنچا۔ تو بہادر شہزادے نے بے باکانہ اس کی پیشانی پر برچھا مارا۔ برچھا کھاتے ہی سُدھکر نے غضبناک ہو کر اورنگ زیب کے گھوڑے پر اس زور سے حملہ کیا۔ کہ سوار اور گھوڑا دونوں زمین پر آ رہے۔ جواں سال شہزادے کو یوں ہولناک خطرے میں دیکھ کر بادشاہ، امرا اور تماشائیوں کی سانسیں رُک گئیں۔ اِدھر اُدھر سے سُدھکر پر برچھیاں چھوڑی گئیں۔ لیکن کچھ اثر نہ ہوا۔ اورنگ زیب گرتے ہی اُٹھا اور تلوار کھینچکر تنہا ہاتھی کے مقابلے کے لئے تیار ہو گیا۔ شجاع نے بھائی کو بچانے کے لئے گھوڑا آگے بڑھایا، لیکن سوء اتفاق سے اس کے گھوڑے کی پیشانی پر ایک برچھی لگی اور وہ گر پڑا۔ میرزا راجا جے سنگھ نیزہ ہاتھ میں لے کر آگے بڑھا۔ اس اثناء میں صورت سندر پلٹ آیا۔ اور سُدھکر کا رُخ اس کی طرف ہو گیا۔ اس طرح شہزادے کی جان بچی۔ شاہ جہان نے چودہ برس کے جگر بند کی یہ شانِ جلادت دیکھ کر معاً "بہادر" کا خطاب عطا کیا۔

کلیم ہمدانی نے اس واقعہ کو مثنوی کی شکل میں نظم کر دیا تھا۔ میرے پاس دیوانِ کلیم کا ایک قلمی نسخہ ہے۔ جو شاعر کی وفات سے صرف سترہ برس بعد لکھا گیا تھا۔ اس کے ساتھ ایک علیحدہ ورق پر اس واقعہ کے متعلق ایک قطعہ بھی موجود ہے۔ جس کے بعض اشعار ذیل میں درج ہیں ؎

شیر دل شہزادۂ فطرت بلند اورنگ زیب — آبِ شمشیرش بہ آتش دعوئے پیکار کرد
در حضورِ ثانیِ صاحب قراں، شاہ جہاں — جرأتش با فیلِ مست آہنگِ گیرودار کرد
نیزہ اش چوں از سرِ آں فیل جوئے خوں کشاد — سیلِ گفتی سوئے دشت آہنگ از کہسار کرد
رخشِ آں رستم دل از آسیبِ فیل از پا فتاد — جاں فدائے شہسوارِ عرصۂ پیکار کرد
چوں سپرد آں بادپا را حق شناسیہا بخاک — مرقد او را مطافِ آہوئے تاتار کرد

آسماں سنگِ مزارش را بہ شکلِ اسپ ساخت
زانکہ از دل نقشِ او نتواں بروں یک بار کرد

نہیں کہا جا سکتا۔ کہ یہ قطعہ کلیم کا ہے۔ یا کسی دوسرے شاعر کا اور موجودہ "رخشِ سنگیں" اورنگ زیب کے گھوڑے کی یادگار ہے۔ یا کسی دوسرے گھوڑے کی۔ لیکن قطعہ سے صاف ظاہر ہے۔ کہ اورنگ زیب کے گھوڑے کی قبر بھی "بہ شکلِ اسپ" مبنی تھی۔

خطاب "نجم الدولہ، دبیر الملک نظام جنگ" کا خطاب دودمان تیموریہ کے آخری پادشاد سراج الدین بہادر شاہ مرحوم کی طرف سے ۴ جولائی ۱۸۵۰ء کو ملا تھا۔ جبکہ خاندان شاہی کی تاریخ نگاری کا منصب غالب کے حوالے کیا گیا تھا۔ "مہر نیمروز"[1] کے دیباچہ میں ہے:۔

بہ پنجشنبہ بست و سوم شعبان سال یک ہزار و صد و شصت و شش ہجری یا چہارم جون سال یکہزار و ہشت صد و پنجاہ عیسوی برابر شہنشاہ بہ شکوہے کہ پنداری آفتاب است در بیت الشرف براورنگ نشستہ و من بہ نشاطے کہ گوئی عطار داست در تقسیم بہ روبرو ایستادہ کارپردازان شاہی بہ فرمان حضرت ظل الٰہی بہ خلعت خانۂ خاصم بردند و تا متم را بہ خلعت شش پارچہ آراستہ بہ سلام گاہم آوردند خداوند دنیا و دین بداں دست بخشش آئین کہ کف آں دست دریائے ہست کہ حقیقت دریا کف او ست جگر گوشہ ہائے معدن یعنی جیغہ و سر پیچ بہ سرم بست، رگ جان ابر نیساں یعنی حمائل مروارید بہ گردنم آویخت۔ چاؤش فرخ سروش گہر ہائے نزاویدہ رگ ابر خامہ شاہ پروین سپاہ بر گوشہ بساط بارگاہ افشاند و غالب سخن سرائے را نجم الدولہ و دبیر الملک نظام جنگ خواند۔

تخلص غالب نے ابتدا میں اردو میں شعر کہے۔ تو اسد تخلص رکھا۔ جب فارسی میں کہنے شروع کئے۔ تو غالب تخلص اختیار کیا۔ بعد ازاں اردو میں بھی بالعموم یہی تخلص رہا اور اسی نے عالمگیر شہرت پائی۔ لیکن اردو میں اس تخلص کی پابندی انہوں نے کبھی گوارا نہ کی۔ چنانچہ پچیس برس کی عمر کے بعد جو اردو کی غزلیں کہی گئیں۔ ان میں سے دس بارہ میں اسد تخلص موجود ہے۔ بعض اوقات تخلص کی جگہ پورا نام رکھ دیتے تھے۔ مثلاً:

مارا زمانے نے اسد اللہ خاں تمہیں
وہ ولولے کہاں وہ جوانی کدھر گئی

---

[1] "مہر نیمروز" میں جون ہی چھپا ہوا ہے۔ لیکن تقویم سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۲۳ شعبان ۱۲۶۶ھ کو ۴ جون نہیں بلکہ ۴ جولائی تھی۔ دن یقیناً پنجشنبہ یا جمعرات کا تھا میرا خیال ہے کہ غالب کا سہو نہیں ہے۔ بلکہ کتابت کی غلطی ہے۔

یا

اسد اللہ خاں تمام ہوا

اے دریغا وہ رند شاہد باز

تبدیل تخلص کی وجہ

تخلص بدلنے کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے۔ کہ بعض لوگ جو ذوقِ سخن سے نا آشنا تھے، میر امانی اسد ایک غیر معروف شاعر کے اشعار غالب سے منسوب کرنے لگے تھے۔ ایک مرتبہ غالب کے عزیز شاگرد منشی شیو نرائن آرام نے بھی میر امانی کے ایک شعر کو غالب کا شعر سمجھ کر پوری غزل مانگی۔ اس کے جواب میں لکھتے ہیں :۔

بھائی۔ حاشا! ثم حاشا!! اگر یہ غزل میری ہو ع

اسد اور لینے کے دینے پڑے ہیں

اس غریب کو میں کچھ کیوں کہوں لیکن اگر یہ غزل میری ہو تو مجھ پر ہزار لعنت۔ اس سے آگے ایک شخص نے یہ مطلع میرے سامنے پڑھا اور کہا کہ قبلہ آپ نے خوب مطلع کہا ہے :

اسد اس جفا پر بتوں سے وفا کی

مرے شیر شاباش رحمت خدا کی

میں نے ان سے کہا کہ اگر یہ مطلع میرا ہو تو مجھ پر لعنت۔ بات یہ ہے کہ ایک شخص میر امانی اسد ہو گزرے ہیں۔ اور یہ غزل ان کے "کلام معجز نظام" میں سے ہے۔ اور تذکروں میں مرقوم ہے۔ میں نے تو کوئی دو چار برس ابتدا میں اسد تخلص رکھا ہے۔ ورنہ غالب ہی لکھتا رہا ہوں۔ تم طرز تحریر اور روش فکر پر بھی نظر نہیں کرتے۔ میرا کلام اور ایسا مزخرف ہو!

لیکن جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے۔ بعد میں بھی کبھی کبھی اسد تخلص فرماتے رہے۔ مولانا آزاد نے "آب حیات" میں لکھا ہے۔ کہ جھجر میں کوئی فرومایہ شخص اسد تخلص کرتا تھا۔ ایک دن ان کا مقطع کسی نے پڑھا :۔

اسد تم نے بنائی یہ غزل خوب

ارے او شیر رحمت ہے خدا کی

سنتے ہی اس تخلص سے جی بیزار ہو گیا۔ اور انہوں نے ۱۲۴۵ھ میں "اسد اللہ الغالب" کی رعایت سے غالب تخلص اختیار کیا۔[1]

میں نہیں کہہ سکتا کہ آزاد مرحوم کے اس بیان کی بنیاد کیا ہے۔ لیکن ۱۲۴۵ھ میں تخلص بدلنے کا واقعہ یقیناً غلط ہے۔ غالب ۱۲۴۲ھ میں کلکتہ جاتے ہوئے لکھنؤ ٹھہرے تھے۔ وہاں انہوں نے جو غزل کہی تھی اس میں غالب تخلص موجود ہے:۔

لئے جاتی ہے کہیں ایک توقع غالب
جادۂ رہ کششِ کافِ کرم ہے ہم کو

اس سے ظاہر ہے۔ کہ وہ ۱۲۴۵ھ سے پہلے ہی اردو میں بھی غالب تخلص فرمانے لگے تھے۔

نسب و خاندان قوم کے ایک ترک تھے۔ بار بار دعویٰ کرتے ہیں۔ کہ میرا سلسلہ نسب تو ران ابن فریدوں سے ملتا ہے۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ جب تورانیوں کا جاہ و جلال کیانیوں کے عروج و اقبال کی آندھی میں مشتِ غبار کی طرح اڑ گیا تو حکمران خاندان کے تمام بقیۃ السیف افراد وطن کو چھوڑ کر جا بجا منتشر ہو گئے۔ اسلامی عہد میں اس خاندان کے بعض افراد نے وہ عظیم الشان سلطنت قائم کی، جو تاریخ کے اوراق پر سلجوقی سلطنت کے نام سے مشہور ہوئی اور جس کے تاجداروں میں الپ ارسلان، ملک شاہ اور سنجر شہرتِ عام کے تاج پہن چکے ہیں۔ جب یہ سلطنت زائل ہو گئی، تو افرادِ خاندان دوبارہ غربت اولے کی طرح پریشان و منتشر ہو گئے۔ انہی میں سے ایک کا نام شہزادہ ترسم خاں تھا، جو سمرقند میں جا بسا۔ یہ غالباً غالب کا پردادا تھا۔

لیکن ان بیانات کی تاریخی حیثیت کے متعلق وثوق سے کچھ کہنا مشکل ہے۔ اس لئے

---

[1] "آبِ حیات" صفحہ ۵۰۰

کہ محققین کے نزدیک تو یہ بھی ثابت شدہ بات نہیں کہ سلجوقی انہی تورانیوں کی نسل سے تھے۔ جن کی عظمت و برتری کا افسانہ "شاہ نامہ" نے سنایا ہے۔ یہ نسب نامہ غالبؔ اس وقت بنایا گیا، جب سنجر نے خلیفہ بغداد کی لڑکی سے نکاح کی خواہش کی تھی۔ اور مقصد یہ تھا۔ کہ سلجوقیوں کے خاندان کو قدیم و باجبروت پادشاہوں کا خاندان دکھلایا جائے۔ بہر حال غالبؔ کے یہ دعاوی ہر لحاظ سے درست ہوں یا نہ ہوں۔ لیکن یہ حقیقت ہے۔ کہ وہ اونچے درجے کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ اور ان کے آبا و اجداد کا محبوب ترین مشغلہ تیغ زنی و سپہگری تھا۔

دادا ہندوستان آئے

غالبؔ کے دادا غالباً محمد شاہ پادشاہ کے عہد میں ہندوستان آئے۔ اور سب سے پہلے لاہور میں نواب معین الملک کے پاس ملازم ہوئے۔ معین الملک کے انتقال کے بعد پنجاب میں طوائف گردی شروع ہو گئی تو غالبؔ کے دادا لاہور سے دہلی چلے گئے۔ جب شاہ عالم پادشاہ ہوئے اور ذوالفقار الدولہ[1] میرزا نجف خان مختار کل بن گئے۔ تو غالبؔ کے دادا کو ایک اچھی ملازمت مل گئی۔ اور پہاسو کا پرگنہ ذات اور رسالے کی تنخواہ کے لئے مقرر ہو گیا۔ اس وقت سے انہوں نے دہلی میں سکونت اختیار کر لی۔ اور غالبؔ کے والد میرزا عبد اللہ بیگ خاں دہلی ہی میں پیدا

[1] ذوالفقار الدولہ میرزا نجف خاں ایران کے صفوی خاندان کا ایک فرد تھا۔ نادر شاہ افشار کے دور اقتدار میں صفوی خاندان پر تباہی آئی تو نجف خاں بے یار و مددگار رہ گیا۔ نواب زیر صفدر جنگ صوبیدار اودھ کے بھائی میرزا محسن سفیر بنکر ایران گئے تو نجف خاں اور اسکی بہن خدیجہ بیگم کو ہندوستان لے آئے۔ خدیجہ سے میرزا محسن نے خود نکاح کر لیا۔ میرزا نجف خاں کچھ مدت شجاع الدولہ کے پاس اودھ میں رہے بعد میں تعلقات بہت خراب ہو گئے تو میرزائے ممدوح نے میر قاسم صوبیدار بنگال کی ملازمت اختیار کر لی۔ بکسر کی لڑائی کے بعد نجف خاں وہیں کھنچ گیا۔ پھر شاہ عالم کے ساتھ دہلی چلا آیا۔ جہاں اس نے مختاری عام کا منصب حاصل کر لیا۔ آگرہ میرٹھ۔ مچھیری جاٹ علاقہ اور دوآبہ گنگا و جمنا کا بڑا حصہ جاگیر میں مل گیا۔ جس کی سالانہ آمدنی بیس لاکھ پونڈ تھی۔ اس نے مغلیہ سلطنت کے بکھرے ہوئے شیرازے کو درست کرنیکی انتہائی کوشش کی۔ بڑا بہادر، باتدبیر، خوش مزاج، خوش تقریر اور انصاف پسند امیر تھا۔ بعض بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ شیعیت میں اُسے بڑا غلو تھا۔ اپریل ۱۷۸۲ء میں وفات پائی +

ہوئے۔ منشی حبیب اللہ خان ذکاؔ حیدر آبادی کو لکھتے ہیں :-

میں قوم کا ترک سلجوقی ہوں۔ دادا میرا ماوراء النہر سے شاہ عالم[1] کے وقت میں ہندوستان میں آیا۔ سلطنت ضعیف ہو گئی تھی۔ صرف پچاس گھوڑے اور نقارہ و نشان سے شاہ عالم کا نوکر ہوا۔ ایک پرگنہ سیر حاصل ذات کی تنخواہ اور رسالے کی تنخواہ میں پایا۔ بعد انتقال اس کے جو طوائف الملوکی کا ہنگامہ گرم تھا، وہ علاقہ نہ رہا۔

مولوی سراج الدین احمد صاحب کو ایک فارسی خط میں لکھتے ہیں :-

ترک نژادم و نسب من بہ افراسیاب و پشنگ، مے پیوندد۔ بزرگان من از انجا کہ با سلجوقیاں پیوند ہم گوہری داشتند بعہد دولت اینان رایت سروری و سپہبدی افراشتند۔ بعد سپری شدن روزگار جاہ مندی آں گروہ چوں نارسائی و بے نوائی روئے آورد، جمعے را ذوق رہزنی و غارت گری از جائے برد۔ و طائفہ را کشاورزی پیشہ گشت۔ نیاگان مرا بہ توران زمین شہر سمرقند آرامش گاہ شد ازاں میانہ نیائے (دادا) من از پدر خود رنجیدہ آہنگ ہند کرد و بہ لاہور ہمراہی معین الملک گزید۔ چوں بساط معین الملک در نوشتند بہ دہلی آمد و با ذو الفقار الدولہ میرزا نجف خان بہادر پیوست ازاں پس پدرم عبد اللہ بیگ خاں بہ شاہ جہاں آباد بوجود آمد و من بہ اکبر آباد۔

انور الدولہ نواب محمد سعد الدین خان بہادر شفقؔ رئیس کدوراکالپی کو لکھتے ہیں :-

نیائے نامہ نگار ترکی بود از نژاد افراسیاب و پشنگ، از ترکستان بہ ہند روئے آورد۔ در لاہور در معین الملک تکیہ گاہ و آرامش جائے ساخت۔

مہر نیمروزؔ کے دیباچہ میں فرماتے ہیں :-

نیاگان نامہ نگار از تخمۂ افراسیاب و پشنگ، بودہ اند و فرماندہان با فر و فرہنگ۔ فرو مردن چراغ ہستی نور دیدۂ تور (افراسیاب) بہ باد آئین کینۂ کیخسرو، پشنگیاں را روز سیاہ

---

[1] غالب کے اس دعوے کے متعلق میری تحقیق آگے چل کر درج ہو گی۔

پیش آورد۔ خداوندان اورنگ و دیہیم را ازاں برگ و ساز جز تیغ گندناگوں بہ کف نہ ماند۔
بہ مرز بوم بیگانہ روئے آوردند بہ دست مزد تیغ زدن نان خوردند۔ ہم ازیں نیستاں ایوانان
کہسار نشیں سلجوقیاں وگرباره سر بہ افسر و افسر بہ گوہر آراستند۔ چرخ گردندہ چنانچہ خوے اوست
ایں نامداران کاؤس کوس را نیز از پاے فگند۔

در مشرب ما خواہش فردوس نجوئی — در مجمع ما طالع مسعود نیابی
در بادۂ اندیشۂ ما دُرد نہ بینی — در آتش ہنگامۂ ما دود نیابی

از والبیان ایں قافلہ نیاے من کہ در قلمرو ماوراء النہر سمرقند شہر را مسقط الراس وے بود
چوں سیل کہ از بالا بہ پستی آید از سمرقند بہ ہند آمد و در دفتر سپہبد شاہ، ذوالفقار الدولہ میرزا
نجف خاں توقیع نوکری شاہش نوشتند و بر پرگنہ پہاسو برات روزی وے و سپاہش نوشتند

غالب کے دادا

غالب کے دادا کا نام میرزا قوقان بیگ خان تھا۔ وہ خود ایک تحریر میں جو غالب نے تذکرۂ مظہر العجائب کے لئے لکھی گئی تھی۔ (مطبوعہ رسالہ اُردو) فرماتے ہیں:۔

اسد اللہ خاں، غالب تخلص، عرف میرزا نوشہ، قوم کا ترک سلجوقی، سلطان برکیارق کے اولاد میں سے، اس کا دادا قوقان بیگ خاں، شاہ عالم کے عہد میں سمرقند سے دلی آیا۔ پچاس گھوڑے اور نقارہ و نشان سے بادشاہ کا نوکر ہوا۔ پہاسو کا پرگنہ جو سمرو کی بیگم کو سرکار سے ملا تھا۔ وہ اس کی جاداد میں مقرر ہوا تھا۔

خواجہ حالی مرحوم فرماتے ہیں کہ غالب کے دادا کی زبان ترکی تھی۔ نیز ان کے متعدد بیٹے تھے۔ جن میں سے صرف دو کے نام معلوم ہیں:۔ ایک میرزا عبد اللہ بیگ خاں عرف میرزا دولہا (غالب کے پدر بزرگوار) دوسرا میرزا نصر اللہ بیگ خان (غالب کے عم محترم)

"یادگار غالب" میں منشی نبی بخش حقیر کے نام غالب کا ایک خط موجود ہے۔ جس

میں اپنی پھپھی کے مرنے کی اطلاع دیتے ہوئے لکھتے ہیں:-

آپ کو معلوم رہے کہ پرسوں میرے گویا نو آدمی مرے۔ تین پھپھیاں، تین چچا اور ایک باپ اور ایک دادی اور ایک دادا یعنی اس مرحومہ کے ہونے سے میں جانتا تھا کہ یہ نو آدمی زندہ ہیں۔ اور اس کے مرنے سے میں نے جانا کہ یہ نو آدمی آج ایک بار مر گئے۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ توقان بیگ خان کے سات بچے تھے، چار لڑکے اور تین لڑکیاں۔ غالب کا یہ دعوے محل نظر ہے کہ ان کے دادا شاہ عالم کے عہد میں ہندوستان آئے۔ اس لئے کہ شاہ عالم کی بادشاہی کا زمانہ ۱۷۵۹ء سے شروع ہوتا ہے۔ اور نواب معین الملک عرف میر منو نے جن کے پاس غالب کے دادا لاہور میں ملازم ہوئے تھے۔ نومبر ۱۷۵۳ء (محرم ۱۱۶۷ھ) میں وفات پائی۔ لہذا ماننا چاہیئے۔ کہ میرزا توقان بیگ خان محمد شاہ کے عہد میں ہندوستان آئے۔ یہ بیان غالب کا عام خاندانی روایات پر مبنی ہے۔ نواب معین الملک کی وفات اور شاہ عالم کی تخت نشینی کے سنین معلوم نہ ہونے کی وجہ سے وہ اس کی تصحیح نہ کر سکے۔

نسب پر فخر

غالب نے اپنے نسب پر جا بجا فخر کیا ہے۔ وہ کبھی اپنے کو افراسیابی اور پشنگی[2] کہتے ہیں، کبھی "دودہ زاد شم[3]" میں سے ہونے پر اتراتے ہیں، کبھی سلجوقی اور تورانی بتاتے ہیں، کبھی ایبک ہونے پر فخر کرتے ہیں مثلاً:

غالب از خاکِ پاکِ تورانیم — لاجرم در نسب فرہ مندیم
تُرک زادیم و در نژاد ہمے — بہ سترگانِ قوم پیوندیم
ایبکیم[4] از جماعۂ اتراک — در تمامی زماہ دہ چندیم
فن آبائے ما کشاورزی است
مرزبان زادۂ سمرقندیم

---

[1] یادگار صفحہ ۱۶، [2] پشنگ افراسیاب کا باپ [3] زادشم افراسیاب کا دادا [4] ایبک مرکب ہے "ای" اور "بک" سے یعنی ماہ کامل یہ ترکوں کے ایک قبیلے کا نام ہے۔

پھر فرماتے ہیں :-

ساقی چوں من پشنگی و افراسیابیم | دانی کہ اصل گوہرم از دودہ جم است
میراث جم کہ مے بود اکنوں بہ من سپار | زاں پس بہ سدرہشتن کہ میراث آدم است

"مہر نیمروز" کے دیباچہ میں اپنے نسب کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

غالب بہ گہر ز دودہ زادشمم | زاں رو بہ صفائے دم تیغ است دمم
چوں رفت سپہبدی ، ازوم چنگ بہ شعر | شد تیر شکستۂ نیاگاں قلمم

بہادر شاہ کے ایک قصیدے میں فرماتے ہیں :

سلجوقیم بہ گوہر و خاقانیم بہ فن
توقیع من بہ سنجر و خاقاں برابر است

فتح پنجاب پہ لارڈ ہارڈنگ کی مدح میں جو قصیدہ کہا تھا۔ اس میں لکھتے ہیں :-

بلند پایہ سرا اگر چہ من سخن سنجم | ولیک پیشۂ آبا بہ عالم اسباب
سپہبدی بُد و تا افراسیاب تا پدرم | ہماں طریقۂ اسلاف داشتند اعقاب
دلاوراں نگری تا پشنگ پشتا بہ پشت | بہ پیشگاہِ تو چوں خویش را شوم نساب
من آں کسم کہ بہ توقیعِ مبدءِ فیاض | شہ قلمرو نظمم دریں جہانِ خراب
ہمے کنم بقلم کار تیغ و ایں کاریست
شگرف و نغز و پسندیدۂ اولوالالباب

آغا بزرگ شیرازی متخلص بہ وفا کے مکتوب میں لکھتے ہیں :-

غالبم و لے نور چشم محیطم | غریبم و لے روشناس جہانم
بہ مضمار دعوے خداوند خشم | در اقلیم معنی جہاں پہلوانم
گرفتم کہ از تخم افراسیابم | گرفتم کہ از نسل سلجوقیانم
دل و دستِ تیغ آزمائی ندارم | رہ و رسم کشور کشائی نہ دانم

پنجہ سال تو قیع معنی نوشتم   ہنر دگر نویسندہ صاحب نفرانم

سہروں کے قضیہ میں ذوق کی کم حوصلگی اور ادا ناشناسی سے جو ناگوار صورت پیدا ہو گئی تھی، اسے ختم کرنے کے لئے غالبؔ نے اُردو میں ایک قطعہ لکھا تھا، جو زباں زد عوام ہے۔ اس کا ایک شعر یہ ہے:۔

سو پُشت سے ہے پیشۂ آبا سپہگری
کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے!

غالبؔ کے اجداد کی جو کیفیت اوپر بیان ہو چکی ہے، اسے مد نظر رکھتے ہوئے یہ دعویٰ حرفاً حرفاً درست ہے۔ اور اسے عام شاعرانہ مبالغہ یا خالی سخن گستری پر محمول نہیں ہونا چاہیئے۔

اپنے ہم قوموں کے متعلق نواب انوار الدولہ بہادر شفق کو لکھتے ہیں:

سُبحان اللہ اکثر امور میں تم کو ہم طالع پاتا ہوں۔ عزیزوں کی ستم کیشی اور رشتہ داروں سے ناخوشی۔ میرا ہم قوم تو سراسر قلمرو ہند میں نہیں، سمر قند میں دو چار اور دشت خفچاق میں سو دو سو ہوں گے، مگر ہاں اقربا سببی ہیں۔

غالبؔ کے والد ماجد میرزا قوقان بیگ کی وفات کے بعد ان کے بیٹے عبد اللہ بیگ خاں اور نصر اللہ بیگ خاں اپنے آبائی پیشے یعنی سپہگری میں مصروف رہے۔ دونوں میں سے کسی کی تاریخ پیدائش معلوم نہیں ہو سکی۔ نہ یہ بتایا جا سکتا ہے کہ وفات کے وقت ان کی عمریں کیا تھیں۔ لیکن چونکہ دونو غالبؔ کی کم سنی میں فوت ہوئے اس لئے قیاس کہتا ہے۔ کہ ان کی عمریں تیس پینتیس برس سے متجاوز نہ ہوں گی۔

غالبؔ کے والد پہلے لکھنؤ میں آصف الدولہ کے ہاں نوکر ہوئے، پھر حیدر آباد چلے گئے۔ اور نظام علی خاں کے پاس تین سو سواروں کی جمعیت کے ساتھ ملازم رہے۔ یہ ملازمت جاتی رہی، تو آگرہ چلے آئے۔ جہاں ان کی شادی خواجہ غلام حسین خاں کمیدان کی

صاحبزادی سے ہو چکی تھی۔ آگرہ سے راجہ بختاور سنگھ والی الور کے پاس بغرض ملازمت پہنچے لیکن مدعابراری کی کوئی صورت پیدا نہ ہوئی۔ مایوس ہو کر واپس ہو رہے تھے۔ کہ الور کا ایک زمیندار راجہ سے سرکشی پر آمادہ ہو گیا۔ اس کی سرکوبی کے لئے جو فوج بھیجی گئی۔ اس میں میرزا عبداللہ بیگ خاں کا دستہ بھی شامل کر دیا گیا۔ راج گڑھ کے مقام پر سرکش زمیندار کے ساتھ چپقلش ہوئی، جس میں میرزا عبداللہ بیگ خاں گولی کھا کر شہید ہو گئے، اور وہیں انہیں سپرد خاک کر دیا گیا۔ یہ غالباً ۱۸۰۲ء کا واقعہ ہے۔ غالبؔ کی عمر اس وقت صرف پانچ برس کی تھی۔ راجا شیودھیان سنگھ والئے الور کے قصیدہ میں اس واقعہ کی طرف بھی اشارہ موجود ہے فرماتے ہیں:-

زاں پس کہ گشت گوہر من در جہاں یتیم	زاں پس کہ کشتہ شد پدر من بہ کارزار
در پنج سالگی شدہ ام چاکر حضور	رنگیں سخن طرازم و دیریں وظیفہ خوار
دارم بہ گوش حلقہ ز پنجاہ و ہشت سال	اکنوں کہ عمر شصت و سہ سال است در شمار
باید شنید راز ز اعیان بارگاہ!	باید شنفت قصہ ز پیران آں دیار

کافی بود مشاہدہ، شاہد ضرور نیست

درخاکِ "راج گڑھ" پدرم را بود مزار

منشی حبیب اللہ خاں ذکا حیدر آبادی کو لکھتے ہیں:-

باپ میرا عبداللہ بیگ خاں لکھنؤ جا کر نواب آصف الدولہ کا نوکر رہا۔ بعد چند روز حیدر آباد جا کر نواب نظام علی خاں کا نوکر ہوا۔ تین سو سواروں کی جمعیت سے ملازم تھا۔ کئی برس وہاں رہا۔ وہ نوکری ایک خانہ جنگی کے بکھیڑے میں جاتی رہی۔ والد نے گھبرا کر الور کا قصد کیا۔ راؤ راجہ بختاور سنگھ کا نوکر ہوا۔ وہاں کسی لڑائی میں مارا گیا۔

تذکرہ مظہر العجائب کے لئے غالبؔ کی جس تحریر کا اوپر حوالہ دیا جا چکا ہے۔ اس میں

لکھتے ہیں۔

باپ اسد اللہ خان مذکور کا عبد اللہ بیگ خان دلی کی ریاست چھوڑ کر اکبر آباد میں[1] جا رہا۔ اسد اللہ خان اکبر آباد میں پیدا ہوا۔ عبد اللہ بیگ خان الور میں راؤ راجہ بختاور سنگھ کا نوکر ہوا۔ اور وہاں ایک لڑائی میں بڑی بہادری سے لڑتا ہوا مارا گیا، جس حال میں کہ اسد اللہ خان مذکور پانچ چھ برس کا تھا۔

عبد اللہ بیگ خان نے تین بچے چھوڑے۔ سب سے بڑی ایک لڑکی تھی جس کا عرف چھوٹی خانم تھا اور جو میرزا جیون بیگ بدخشی کے صاحبزادے اکبر بیگ سے بیاہی گئی تھی۔ اس سے چھوٹے اسد اللہ خان غالب تھے۔ اور سب سے چھوٹے یوسف خان۔

خواجہ حالی فرماتے ہیں کہ راجہ الور نے دو گاؤں سیر حاصل اور کسی قدر روزینہ عبد اللہ بیگ خان کے بچوں کی پرورش کے لئے مقرر کر دیا تھا جو مدت دراز تک جاری رہا۔

غالب کے عم محترم — عبد اللہ بیگ خان کی دردناک موت کے بعد ان کے بچوں کی کفالت نصر اللہ بیگ خان سے متعلق ہو گئی۔ وہ پہلے مرہٹوں کی طرف سے آگرہ کے صوبیدار تھے۔ لیکن جب آگرہ انگریزوں کے قبضے میں آگیا اور صوبیداری کمشنری بن گئی، تو کمشنر ایک انگریز مقرر ہو گیا۔ فخر الدولہ دلاور الملک نواب احمد بخش بہادر رستم جنگ رئیس

---

[1] یقین کے ساتھ یہ کہنا مشکل ہے کہ میرزا غالب کے والد یا دادا کیوں دہلی کو چھوڑ کر آگرہ گئے۔ اگر میرزا نجف خان نے انہیں انتظام کے سلسلے میں بھیجا تو یہ بہر حال ۱۷۸۲ء سے پیشتر کا واقعہ ہوگا۔ اگر وہ نجف خان کی وفات کے بعد میرزا شفیع، افراسیاب خان، زین العابدین، محمد بیگ ہمدانی اور اسماعیل بیگ کی کشمکش سے تنگ آکر آگرہ گئے تو یہ ترک ۱۷۸۵ء میں عمل میں آیا۔ اگر وہ غلام قادر خان روہیلے کے اقتدار اور شاہ عالم کی بے بسی کے زمانے میں وہاں گئے، تو اسے دو تین برس بعد کا واقعہ سمجھنا چاہئے۔ یہ بھی ممکن ہے خواجہ غلام حسین خان کی صاحبزادی سے شادی ہونے کے باعث دہلی کو چھوڑ کر آگرہ چلے گئے ہوں۔

فیروزپور جھرکہ و جاگیردار لوہارو کو انگریزوں کے ہاں بڑا اعتماد حاصل تھا۔ ان کی ہمشیر میرزا نصراللہ بیگ خاں سے منسوب تھی۔ انہوں نے لارڈ لیک سے کہہ کر نصراللہ بیگ خان کو انگریزی فوج میں رسالداری کا منصب دلوا دیا اور ان کی ذات اور رسالے کے لیے نواحی آگرہ کے دو پرگنے سونک اور سونسا مقرر کرا دیئے۔ سنہ ۱۸۰۶ء میں وفعتہً ان کا بھی انتقال ہو گیا۔[1] اس وقت غالب کی عمر صرف نو برس کی تھی۔ منشی حبیب اللہ خاں ذکا کو غالب لکھتے ہیں :-

نصراللہ بیگ خاں میرا حقیقی چچا مرہٹوں کی طرف سے اکبرآباد کا صوبیدار تھا۔ اس نے مجھے پالا۔ سنہ ۱۸۰۶ء میں جرنیل لیک کا عمل ہوا۔ صوبیداری کمشنری ہو گئی اور صاحب کمشنر ایک انگریز مقرر ہوا۔ میرے چچا کو جرنیل لیک نے سواروں کی بھرتی کا حکم دیا۔ چار سو سوار کا برگیڈیر مقرر ہوا۔ ایک ہزار روپیہ ذات کا اور لاکھ ڈیڑھ لاکھ روپیہ سال کی جاگیر حین حیات علاوہ مرزبانی کے تھی کہ بہ مرگ ناگاہ مر گیا۔ رسالہ برطرف ہو گیا۔ ملک کے عوض نقدی ہو گئی۔ وہ اب تک پاتا ہوں۔

چودھری عبدالغفور خاں صاحب سرور مارہروی کو لکھتے ہیں :

میں پانچ برس کا تھا کہ باپ مرا۔ نو برس کا تھا کہ چچا مرا۔ اس کی جاگیر کے عوض میرے اور میرے

---

[1] صحیح تاریخ وفات معلوم نہ ہو سکی لیکن سال وفات یقیناً سنہ ۱۸۰۶ء ہے۔ نواب احمد بخش خان مرحوم کو سرکار انگریزی سے لارڈ لیک نے جاگیر کی دو سندیں دلائی تھیں پہلی ۲۲ دسمبر سنہ ۱۸۰۴ء کو دوسری ۴ مارچ سنہ ۱۸۰۶ء کو۔ ۴ مئی سنہ ۱۸۰۶ء کو حکومت کی تجویز کے مطابق ایک شقہ نواب احمد بخش خاں کو بھیجا گیا جس میں نصراللہ بیگ خاں کے انتقال کا ذکر کرتے ہوئے مرقوم تھا کہ کمپنی بہادر کو ان کے متعلقین کی پرورش منظور ہے۔ اور اس سلسلے میں نواب مرحوم کی جاگیر پر پچیس ہزار روپے کی جو رقم مقرر کی تھی اس میں سے دس ہزار کی رقم نصراللہ بیگ خاں کے متعلقین کی پرورش کے سلسلے میں معاف کر دی تھی پندرہ ہزار کی رقم پچاس سواروں کے سلسلے میں معاف ہو چکی تھی جو نصراللہ بیگ خاں نے مقرر کر رکھے تھے۔ اس سے ظاہر ہے کہ نصراللہ بیگ خاں کا انتقال ۴ مارچ سنہ ۱۸۰۶ء اور ۴ مئی سنہ ۱۸۰۶ء کے درمیان ہوا۔

سرکار حقیقی کے واسطے شامل جاگیر نواب احمد بخش خاں مرحوم دس ہزار روپے سال مقرر ہوئے

انہوں نے نہ دیئے۔ مگر تین ہزار روپے سال۔

مولوی سراج الدین احمد خاں کو ایک فارسی مکتوب میں رقم فرماتے ہیں۔

پنج سال از عمر من گذشت کہ پدر از سرم سایہ برگرفت۔ عم من نصر اللہ بیگ خاں چوں خواست

کہ مرا بہ ناز پرورد ناگاہ مرگش فرا آمد۔ کمابیش پنج سال بعد گذشتن برادر میں، پیٹے برادر

بر داشت و مرا در ہیں شہر بہ تنہا گذاشت۔ در ایں حادثہ کہ مرا نشاں جاں گدازی دگر بود راکیبہ بازی

بود۔ در سال ہزار و ہشت صد و شش عیسوی دستشدہ بہ ہنگام لشکر آرائی وکشور کشائی صمصام الدولہ

جرنیل لارڈ لیک صاحب بہادر بروے کار آمد۔ چوں عم مرحوم از دولتیان دولت اہل فرنگ بود و

با انبوہے چہار صد سوار بہ رکاب صمصام الدولہ لارڈ لیک، با سرکشاں سرگرم جنگ و ہم از

بخششہائے سرکار انگریزی دو پرگنہ سیر حاصل از مضافات اکبر آباد در جاگیر داشت۔ سرکار

انگلشیہ بہ خوں بہائے آفتاب، کلبہ تار گدایاں را چراغ و ملبلے لوایاں را بہ عوض جاگیر، مشاہرہ

از خار خار جستجوئے وجہ معاش فراغ بخشید و ما مرونہ کہ شمارۂ نفس شماری زندگانی بہ پہل و چہار

رسد بدان راتبہ خرسندیم و بدان مایہ قانع۔

ایک اور مقام پر فرماتے ہیں۔

نصر اللہ بیگ خاں مرہٹوں کی طرف سے اکبر آباد کا صوبیدار تھا۔ ۱۸۰۳ء میں جب جرنیل لیک

صاحب اکبر آباد پر آئے تو نصر اللہ بیگ خاں نے شہر سپرد کر دیا اور اطاعت کی جرنیل صاحب

نے چار سو سوار کا بریگیڈیر کیا اور ایک ہزار سات سو تنخواہ مقرر کی۔ پھر جب اس نے اپنے

زور بازو سے سونک سونسا کے پرگنے بھرت پور کے قریب ہلکر کے سواروں سے چھین

لئے، جرنیل صاحب نے وہ دونوں پرگنے بہادر موصوف کو بہ طریق استمرار عطا فرمائے۔ مگر خاں

موصوف جاگیر مقرر ہونے کے دس مہینے بعد بہ مرگ ناگاہ ہاتھی پر سے گر کر مر گیا۔ جاگیر سرکار

میں بازیافت ہوئی اور اس کے عوض نقدی مقرر ہو گئی۔

غالب نے کسی جگہ بھی صراحتہً نہیں لکھا کہ چچا کی موت کس طرح واقع ہوئی محولہ بالا تحریرات سے صرف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اول موت ناگاہ ہوئی، دوم اس حالت میں ہوئی جبکہ میرزا نصراللہ بیگ خاں لارڈ لیک کے ہمرکاب سرگرم جنگ تھے تیسرے ہاتھی سے گر کر ہوئی لفظ "خوں بہا" سے یہ شبہ بھی ہو سکتا ہے کہ شاید نصراللہ بیگ خاں شہید ہوئے لیکن میں جس حد تک معلوم کر سکا ہوں اس کے لئے کوئی شہادت نہیں مل سکی۔

بہرحال غالب کے والد اور چچا چار سال کے اندر اندر یکے بعد دیگرے رہگرائے عالم بقا ہو گئے اور لارڈ لیک نے ان کے چچا کی وفات کے بعد دس ہزار روپے سالانہ کی نقد معاش شامل جاگیر نواب احمد بخش خاں پس ماندوں کے لئے مقرر کرا دی۔ لیکن نواب مرحوم نے تین ہزار روپے سال سے زیادہ نہ دیئے۔ جن میں سے غالب کے حصے کی رقم ساڑھے سات سو روپے سالانہ تھی۔ اس پنشن کا تفصیلی ذکر دوسری جگہ آئے گا۔

غالب کی والدہ غالب کے ایک غیر مطبوعہ خط سے معلوم ہوا کہ اس کی والدہ کا نام عزت النساء بیگم تھا اور وہ اتنی تعلیم یافتہ تھیں کہ دستاویزیں پڑھ سکتی تھیں۔ آگرہ میں خداداد خاں اور اس کا بیٹا ولی داد خاں ساہوکارہ کرتے تھے جن سے غالب کی والدہ کو بھی روپیہ منگانے کی ضرورت پڑی تھی۔ انہی کو غالب نے لکھا تھا کہ میری والدہ پڑھی لکھی ہیں جس دستاویز پر ان کے دستخط ثبت نہ ہوں گے وہ معتبر اور جائز متصور نہ ہوگی[1]

غالب کے نانا غالب کے نانا خواجہ غلام حسین خاں کمیدان تھے۔ جو خواجہ حالی مرحوم کے بیان کے مطابق سرکار میرٹھ کے معزز فوجی افسر اور آگرہ کے عمائدین سے تھے۔

[1] اصل خط نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خان شروانی کے پاس ہے اسکی نقل جولائی ۱۹۳۶ء کے رسالہ زمانہ کانپور میں شائع ہوئی تھی۔

ان کی دولت اور وسعت جایداد کا اندازہ اُردوے معلّٰے کے ایک مکتوب سے ہوتا ہے، جو غالب نے منشی شیو نرائن آرام کو لکھا تھا۔ فرماتے ہیں :۔

تم کو ہمارے خاندان اور اپنے خاندان کی آمیزش کا حال کیا معلوم ہے؟ مجھ سے سنو۔ تمہارے دادا کے والد عہد نجف خان میں میرے نانا صاحب خواجہ غلام حسین خان کے رفیق تھے۔ جب میرے نانا نے نوکری ترک کی اور گھر بیٹھے تو تمہارے پردادا نے بھی کمر کھول دی اور پھر کہیں نوکری نہ کی۔ یہ باتیں میرے ہوش سے پہلے کی ہیں۔ مگر جب میں جوان ہوا تو میں نے دیکھا کہ منشی بنسی دھر (منشی شیو نرائن کے دادا) خان صاحب (خواجہ غلام حسین خان) کے ساتھ ہیں اور انہوں نے جو کیتھم گاؤں اپنی جاگیر کا سرکار میں دعویٰ کیا تو منشی بنسی دھر اس امر کے منصرم ہیں، وکالت اور مختاری کرتے ہیں۔ میں اور وہ (منشی بنسی دھر) ہم عمر تھے۔ شاید منشی بنسی دھر مجھ سے ایک دو برس بڑے ہوں یا چھوٹے ہوں۔ اُنیس بیس برس کی میری عمر اور ایسی ہی عمر اُن کی۔ باہم شطرنج اور اختلاط اور صحبت۔ آدھی آدھی رات گزر جاتی تھی چونکہ گھر ان کا بہت دُور نہ تھا۔ اس واسطے جب چاہتے تھے چلے جاتے تھے۔ بس ہمارے اور ان کے مکان میں مچھیارنڈی کا گھر اور ہمارے دو کٹڑے درمیان تھے۔ ہماری بڑی حویلی وہ ہے جو اب سیٹھ لکھمی چند نے مول لی ہے اس کے دروازے کی سنگین بارہ دری پر میری نشست تھی اور پاس اس کے ایک کٹھیاوالی حویلی اور سلیم شاہ کے تکیہ کے پاس دوسری حویلی اور کالے محل سے لگی ہوئی ایک اور حویلی اور اس کے آگے بڑھ کر ایک اور کٹڑہ کہ وہ گڈریوں والا مشہور تھا۔ اور ایک کٹڑہ کہ وہ کشمیرن والا کہلاتا تھا۔ اس کٹڑے کے ایک کوٹھے پر میں پتنگ اُڑاتا تھا اور راجہ بلوان سنگھ سے پتنگ لڑا کرتے تھے۔ واصل خاں نامی ایک سپاہی تمہارے دادا کا پیش دست رہتا تھا۔ وہ کٹڑوں کا کرایہ اُگاہ کر ان کے پاس جمع کراتا تھا۔ سنو تو سہی، تمہارا دادا بہت کچھ پیدا کر گیا ہے۔ علاقے مول لیے تھے اور زمینداره اپنا کر لیا تھا۔ دس بارہ ہزار روپے کی سرکاری مالگزاری ادا کرتا تھا۔

خواجہ حالی مرحوم کے ارشاد کے مطابق جس سرکار (خواجہ غلام حسین خاں) کے متوسلین دس دس ہزار روپے کے مالگزار بن گئے تھے اس کے بڑا ہونے میں کیا شبہ ہے۔

اس خط سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ غالب کے والد آگرہ میں بہ طور خانہ داماد کے رہتے تھے۔ اس لئے کہ غالب نے اپنے نانا ہی کے املاک کو اپنے املاک ظاہر کیا ہے یا اس میں قطعاً شبہ نہیں کہ والد اور چچا کی وفات کے بعد غالب اپنے نانا ہی کے ہاں رہتے تھے۔ خط سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ جب غالب نے دہلی میں سکونت اختیار کر لی تھی تو ان کے نانا کے بعض املاک فروخت ہو گئے تھے یا خود غالب نے وہ املاک فروخت کر دیئے تھے جو ننہال کی طرف سے انہیں ملے۔

خاندانی عظمت

یہ بھی ظاہر ہے کہ غالب کا خاندان بڑے اونچے درجے کا تھا۔ انکے والد کی شادی خواجہ غلام حسین خاں کی صاحبزادی سے ہوئی تھی۔ ان کے چچا کو پیش قرار مشاہرے کے علاوہ ڈیڑھ لاکھ کی جاگیر ملی تھی۔ اور وہ نواب احمد بخش خاں مرحوم کی ہمشیر سے منسوب تھے۔ غالباً اس آخری رشتے ہی کی وجہ سے غالب کی شادی احمد بخش خاں کے چھوٹے بھائی نواب الٰہی بخش خاں معروف کی چھوٹی صاحبزادی امراؤ بیگم سے ہوئی۔

یتیمی اور حکمت الٰہی

میرا خیال ہے کہ اگر غالب کے باپ اور چچا کا سایہ کمسنی میں سر سے نہ اٹھ جاتا، تو بہ ظاہر کوئی امکان نہ تھا کہ انہیں سپہگری کے آبائی پیشہ کو چھوڑ کر پوری زندگی ادب و شعر کی خدمت کے لئے وقف کر دینے کا موقع ملتا۔ اگر باپ یا چچا زیادہ دیر تک زندہ رہتے تو اغلب یہی ہے کہ شاعری کا یہ گنج گراں مایہ سپہگری کی نذر ہو جاتا۔ لیکن قدرت اس نادر روزگار وجود سے دوسرا کام لینا چاہتی تھی لہٰذا جو ہستیاں آبائی پیشہ میں لگانے کا سب سے بڑا ذریعہ ہو سکتی تھیں، وہ اس کے

ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی دنیا سے رخصت ہوگئیں۔ سپہگری میں غالب بڑی سے بڑی ترقی کرتے تو اپنے چچا کی طرح رسالدار یا اپنے نانا کی طرح کمیدان بن جاتے۔ لیکن ادب و شعر میں انہیں وہ پایہ حاصل ہوا، جو سلطنت و تاجداری میں افراسیاب طغرل، سنجر، الپ ارسلان اور ملک شاہ نے حاصل کیا۔ آج ترسم خاں، عبداللہ بیگ خاں، نصراللہ بیگ خاں اور خواجہ غلام حسین خاں کے ناموں سے ہم صرف اس لئے روشناس ہیں کہ وہ غالب کے بزرگ تھے۔ ورنہ ایسے ہزاروں لاکھوں آدمی ہر عہد میں موجود رہے ہیں، جن کے نام بھی دفاترِ سیر و سوانح میں شایانِ اندراج نہیں سمجھے گئے۔

اہلِ خاندان یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ غالب کے والد اور چچا کی وفات کے بعد ان کے اور کون کون سے رشتہ دار موجود تھے؟ اوپر عرض کیا جا چکا ہے۔ کہ چچا کی وفات کے بعد غالب کے خاندان کے لئے دس ہزار روپے کی معاش مقرر ہوئی تھی جس میں سے نواب احمد بخش مرحوم نے صرف تین ہزار سالانہ کی رقم دی۔ اس میں سے غالب کا حصہ ساڑھے سات سو روپے تھا۔ ساڑھے سات سو ان کے بھائی یوسف خاں کو ملتے تھے۔ دہلی رزیڈنسی کے جو پرانے کاغذات حکومت پنجاب کے ریکارڈز آفس میں محفوظ ہیں، ان میں غالب کی پنشن کے متعلق بھی بعض کاغذات ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ بقیہ پندرہ سو روپے نصراللہ بیگ خان کی والدہ یعنی غالب کی دادی اور خان مذکور کی تین بہنوں یعنی غالب کی پھپھیوں کو ملتے تھے۔ دوسرے رشتہ داروں کے متعلق کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔ البتہ یہ معلوم ہے کہ جب غالب دہلی میں سکونت پذیر ہو چکے تھے تو ان کی والدہ اس وقت بھی زندہ تھیں اور وقتاً فوقتاً مالی امداد فرماتی رہتی تھیں۔ چنانچہ نواب علاؤالدین خاں والی لوہارو کو ایک خط میں اپنی مالی مشکلات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

بایں ہمہ کبھی خان[1] نے کچھ دے دیا، کبھی الور سے کچھ دلوا دیا، کبھی ماں نے کچھ آگرہ سے بھیج دیا۔

غالب کا شجرۂ نسب

میرزا قوقان بیگ خان

عزت النسا بیگم بنت خواجہ غلام حسین خاں = میرزا عبداللہ بیگ خاں

میرزا نصراللہ بیگ خاں
(ان کی شادی نواب احمد بخش خاں کی ہمشیرہ سے ہوئی تھی لیکن لاولد وفات پائی۔)

دو صاحبزادے اور تین صاحبزادیاں
(جن کے نام معلوم نہیں ہو سکے)

میرزا یوسف خاں

عزیز النسا بیگم = میرزا غلام فخرالدین
(اولاد کیلئے دیکھئے شجرۂ خاندان لوہارو)

میرزا اسداللہ بیگ خاں غالب
لاولد

چھوٹی خانم = میرزا اکبر بیگ بدخشی
(اولاد کیلئے دیکھئے شجرۂ خاندان بدخشی)

[1] نواب احمد بخش خاں مرحوم

شجرۂ نسب خاندان بدخشی

یہ خاندان بھی غالب کے خاندان کی طرح ترکستان سے آیا تھا۔ اور ایک بزرگ کی وجہ سے "سبز پوش" مشہور تھا۔ اس کا مختصر سا شجرہ یہ ہے:

جیون بیگ کمیدان

- الہ داد بیگ
- خداداد بیگ
  (یہ دونوں باپ کے ساتھ ہندوستان آئے تلاش روزگار میں الگ ہو گئے پھر ان کا پتہ نہ مل سکا)
- دختر (زوجہ خواجہ حاجی) (اولاد کے لئے دیکھئے شجرہ خواجہ حاجی)
- اکبر بیگ (ان کی شادی غالب کی بہن چھوٹی خانم سے ہوئی تھی)
  - عاشور بیگ
    - رفیع الدین بیگ
    - احمد بیگ
    - محمود بیگ
    - خداداد بیگ
  - عباس بیگ
    - دختر
  - جواد علی بیگ عرف مغل بیگ
    - آغا مرزا بیگ
    - فیاض بیگ
    - ساجد بیگ
    - عابد بیگ
- افضل بیگ (شاہان دہلی کی طرف سے سرکار انگریزی میں وکیل رہے)

نوٹ (۱) عاشور بیگ (غالب کے بھانجے) مع اپنے بیٹے احمد بیگ کے غدر میں مارے گئے۔

(۲) عباس بیگ اودھ میں ڈپٹی کمشنر کا کلکٹر بن گئے تھے۔ غدر کے زمانے میں بلگرام میں سے بعد ازاں فرخ آباد میں۔

(۳) آغا مرزا بیگ حیدرآباد چلے گئے اور وہاں حضور نظام کے استاد مقرر ہوئے جہاں سے انہیں نواب سرور الملک کا خطاب عطا ہوا۔

(۴) محمود بیگ اور خداداد بیگ اپنے چچا عباس بیگ کے پاس اودھ چلے گئے اور وہاں بعد میں ڈپٹی کلکٹر بنے۔

(۵) رفیع الدین بیگ وحشتی ابن عاشور بیگ کا دیوان میرزا حیرت دہلوی کے مقدمے کے ساتھ چھپ چکا ہے۔

دوسرا باب

عہدِ طفلی اور تعلیم

گہر از رایت شاہانِ عجم برچیدند | بعوض خامۂ گنجینہ فشانم دادند
افسر از تارک ترکانِ پشنگی بردند | بہ سخن ناصیۂ فرکیانم دادند

عہدِ طفلی

غالب زیادہ سے زیادہ پانچ برس کے ہوں گے جب ان کے والد کا انتقال ہوا آٹھ نو برس کے تھے۔ جب اس شفیق چچا کے ظلِ عاطفت سے بھی محروم ہو گئے۔ جس نے باپ کے مرتے ہی یتیم بھتیجے کو آغوشِ محبت میں لے لیا تھا۔ گرد و پیش امارت کے وسیع سامان موجود تھے۔ چچا کی جاگیر اگرچہ چھن چکی تھی۔ لیکن جس خاندان کی سالانہ آمدنی لاکھ ڈیڑھ لاکھ کی تھی۔ اس کا محفوظ سرمایہ بہرحال کافی ہو گا۔ پھر ننہال کے وسیع املاک موجود تھے۔ اور خواجہ حالی مرحوم کا بیان اگر درست ہے تو انور کی طرف سے دو سیر حاصل گاؤں بھی ملے ہوئے تھے۔ ان کے علاوہ روزینہ بھی مقرر تھا۔ سرکاری پنشن بھی مل رہی تھی۔ ان ساما نوں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے وثوق سے کہا جا سکتا ہے۔ کہ غالب کی ابتدائی زندگی بڑی امیرانہ ہو گی۔ عہدِ طفلی کے حالات اگرچہ تفصیلاً معلوم نہیں ہو سکے لیکن یہ یقینی ہے کہ اس زمانے کے عام امیر بچوں کی طرح ان کی زندگی بھی لا اُبالی سی ہو گئی تھی۔ وہ شطرنج اور چوسر کھیلتے، پتنگ اُڑاتے، یاروں اور دوستوں کے

کے جھگھٹے میں بےفکری سے دن گزارتے۔ غالباً اسی زمانے میں عرق نوشی کی عادت پڑی جو مرتے دم تک نہ چھوٹی۔

تعلیم تعلیم کے متعلق تفصیلی حالات معلوم نہیں ہیں۔ خواجہ حالی مرحوم نے لکھا ہے کہ وہ شیخ معظم سے پڑھتے تھے۔ جو اس زمانے میں آگرہ کے مشہور معلموں میں سے تھے۔ بعض لوگوں نے نظیر اکبر آبادی کو بھی غالب کا اُستاد بتایا ہے۔ لیکن میرے نزدیک یہ درست نہیں۔ ان کی فارسی تعلیم میں سب سے بڑا حصہ ایک نومسلم ایرانی پارسی کا ہے۔ جس کا ابتدائی نام ہرمزد[۱] تھا۔ اسلامی نام عبدالصمد رکھا گیا۔ یہ فارسی اور عربی کا متبحر عالم تھا۔ ۱۲۲۶ھ (۱۸۱۱ء) میں بر سبیل سیاحت آگرہ پہنچا۔ دو برس غالب کے پاس مقیم رہا۔ ملا عبدالصمد کے دل پر غالب کی جودت و ذکاوت اور حسنِ استعداد

---

[۱] حضرت مولانا ابوالکلام آزاد فرماتے ہیں:-

ایک بات بالکل واضح ہے کہ عبدالصمد غیر معمولی قابلیت و استعداد کا آدمی تھا۔ مرزا غالب نے "درفش کاویانی" کے آخر میں جو فوائد لکھے ہیں اور انہیں عبدالصمد کی طرف نسبت دی ہے۔ ان سے اس حقیقت پر روشنی پڑتی ہے فارسی زبان کے اصول و قواعد اور قدیم فارسی کے رموز و دقائق کا اگر وہ ماہر تھا تو یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ سنسکرت اور قدیم فارسی کے باہمی رشتہ کا راز اس پر کھل چکا تھا۔ اور دونوں زبانوں کے مترادفات کی صحیح مثالیں بڑی تعداد میں اس پر نمایاں ہو چکی تھیں۔ "مرزا غالب" "درفش کاویانی کے فوائد میں لکھتے ہیں "در زبان دری و زبان سنسکرت توافق بیش از آن است کہ شمردہ آید" پھر مثالیں دی ہیں جو صحیح ہیں۔ اور سر ولیم جونس وغیرہ کے ابتدائی مباحث میں بھی انہی سے کام لیا گیا ہے۔ پاتی بمعنی مکتوب، سندیسا بمعنی پیام۔ ونشٹ سنسکرت بمعنی نگاہ داشتن فارسی۔ پرتاپ در ہر دو زبان بمعنی ظرفے کہ برائے نگاہ داشتن آب از چرم سازند، دشنت در ہر دو زبان بمعنی مکروہ، جال در ہر دو زبان بمعنی دام۔ تال در ہر دو زبان بمعنی آبگیر۔

بوم فارسی بمعنی زمین اندر بوم و بھومی سنسکرت بہمیں معنی۔ تپاس فارسی و تپسیا سنسکرت بمعنی ریاضت . . .

ساسان در فارسی ہماں معنی دارد کہ در سنسکرت "سنیاسی" دارد یعنی درویش مرتاض۔ سلاطین ساسانیہ کے تلقب کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ ان کا مورث اعلیٰ قلندرانہ زندگی بسر کرتا تھا۔

الف فارسی کے ابتدائے کلمہ میں افادۂ نفی کرتا ہے۔ مثلاً اخواستنی، اجنبان، سنسکرت میں بھی یہی اثر رکھتا ہے مرزا غالب نے اس مشابہت کی طرف اشارہ کیا ہے اور دال اور تے اور سین اور زبین وغیرہ کے استبدال کی بھی مثالیں دی ہیں جو بالکل صحیح ہیں پارسیوں کا جو دینی لٹریچر اٹھارھویں اور انیسویں صدی میں مستشرقین یورپ اور بمبئی کے پارسیوں کی کوششوں سے نمایاں ہو کر شائع ہوا۔ اس میں بعض چیزیں ایسی ہیں جو صریح اسلامی عقائد اور اسلامی روایات کا عکس معلوم ہوتی ہیں۔ مثلاً زردشت کا معراج بہشت و دوزخ کے مشاہدات، پلصراط وغیرہ۔ اسپیگل وغیرہ محققین ان تحریرات کی زبان و اسلوب کے مطالعہ کے بعد اس نتیجہ تک پہنچے ہیں۔ کہ یہ تمام تر بعد از اسلام عہد کے مجوسی اختراعات ہیں اور ان کی قدامت زیادہ سے زیادہ دسویں صدی عیسوی تک لے جائی جا سکتی ہے اور وہ بھی ہر تحریر کے لئے نہیں۔ (بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۸ پر)

کا اتنا گہرا اثر تھا۔ کہ ہندوستان سے چلے جانے کے بعد بھی اس نے مکاتبت کا سلسلہ جاری رکھا۔ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ مرحوم کے بیان کے مطابق ایک مرتبہ ملّا صاحب نے غالب کو لکھا تھا:۔

اے عزیز چہ کسی کہ باوجود آزادی ہا گاہ گاہ بہ خاطر مے گذری۔

غالب خود ایک خط میں اپنی تعلیم کے متعلق فرماتے ہیں:۔

میں نے ایام دبستان نشینی میں "شرح مأتہ عامل" تک پڑھا۔ بعد اس کے لہو و لعب اور آگے بڑھ کر فسق و فجور، عیش و عشرت میں منہمک ہو گیا۔ فارسی زبان سے لگاؤ اور شعر و سخن کا ذوق فطری و طبعی تھا۔ ناگاہ ایک شخص کہ ساسان پنجم کی نسل میں سے معہذا منطق و فلسفہ میں مولوی فضل حق مرحوم کا نظیر اور مومن موحد و صوفی صافی تھا میرے شہر (آگرہ) میں وارد ہوا۔ اور لطائف فارسی بحت (خالص فارسی بے آمیزش عربی) اور غوامض فارسی آمیختہ بہ عربی اس سے میرے حالی ہوئے۔ سونا کسوٹی پر چڑھ گیا۔ ذہن معوج نہ تھا۔ زبان دری سے پیوند ازلی اور استاد بے مبالغہ جاماسپ عہد و بزرجمہر عصر تھا۔ حقیقت اس زبان کی دل نشین و خاطر نشان ہو گئی۔[1]

بہر حال ملّا عبد الصمد کی تعلیم و آموزش فارسی زبان میں غالب کے کمال رسوخ کا سب سے بڑا ظاہری ذریعہ تھی۔ تعلیم کی مدت اگرچہ بہت ہی کم تھی یعنی صرف دو برس، لیکن

بقیہ حاشیہ متعلقہ صفحہ نمبر ۲۷:۔

معلوم ہوتا ہے کہ عبد الصمد پر یہ حقیقت اچھی طرح منکشف ہو چکی تھی۔ چنانچہ "درفش کاویانی" کے خاتمہ میں سب سے پہلا فائدہ اسی مضمون کا ہے۔ سیماد اور جیبود وغیرہ مصطلحات کو بعد کی اختراعات قرار دیتے ہیں۔ اور لکھتے ہیں: "مولانا ہرمزد ثم عبد الصمد ایں راز با من مے گفت و بر فریب و نیرنگ پارسیاں مے خندید و نگارندۂ دبستان مذاہب (محسن فانی کشمیری) را یکے از نیاں مے دانست۔ البتہ معلوم ہوتا ہے کہ دساتیر کے بارے میں جو دھوکا سر ولیم جونس وغیرہ کو ابتدا میں ہوا تھا اس کی حقیقت عبد الصمد پر نہیں کھلی تھی۔ وہ دساتیر کو ساسان پنجم کی واقعی تصنیف تصور کرتا تھا۔ اور مرزا غالب بھی عمر بھر اسی دھوکے میں رہے، حالانکہ دساتیر بھی سرتاسر جعل و اختراع ہے۔ ملّا فیروز نے گورنر بمبئی کی فرمائش سے اس کا ترجمہ کر کے مع اصل کے شائع کیا تھا۔ لیکن بہت جلد اہل علم کا فیصلہ اس کے خلاف صادر ہو گیا۔ بہر حال ملّا عبد الصمد ایک غیر معمولی علم و استعداد کا آدمی تھا۔ بلاشبہ مرزا غالب کی غیر معمولی فارسی مناسبت و رسوخ میں اس کی تعلیم کو بڑا دخل ہو گا اور اس بارے میں وہ جو لکھتے ہیں حرف بحرف صحیح ہے۔

[1] مطبوعہ رسالہ "ہندوستانی" بابت ماہ جنوری ۱۹۳۲ء

غالب کی غیر معمولی فطری استعداد نے اس مختصر سی صحبت میں اتنا فیض حاصل کر لیا۔ کہ دوسروں کے مدت العمر کے اکتسابات بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ صحیح تعلیم اور صحیح استعداد کے اجتماع کی یہ ایک نہایت عمدہ مثال ہے۔

شاعری میں غالب کو کسی سے تلمذ نہ تھا۔ ملا عبد الصمد سے فارسی پڑھی اور اس کے اصول و قواعد سیکھے۔ لیکن شعر گوئی میں مبدأ فیاض کے سوا وہ کسی کے منت پذیر نہ ہوئے۔

علمی حیثیت

غالب کی مختلف تحریرات سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ انہیں فارسی زبان کے قواعد اور تاریخ پر کامل عبور حاصل تھا۔ اساتذہ کے دواوین نظم و نثر نظر سے گزر چکے تھے۔ حافظہ غیر معمولی تھا۔ جو کتاب ایک مرتبہ دیکھ لیتے۔ اس کے تمام ضروری حصے یاد ہو جاتے۔ سرعت فہم کا یہ عالم تھا۔ کہ مشکل سے مشکل مسائل کو صرف سرسری طور پر دیکھ کر حل کر لیتے۔ خواجہ حالی لکھتے ہیں۔ کہ نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ ایک مرتبہ شاہ ولی اللہ محدث کا ایک رسالہ دیکھ رہے تھے۔ جو حقائق و معارف کے دقیق مسائل پر مشتمل تھا۔ ایک مقام بالکل سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ اتفاقاً اسی وقت غالب آ نکلے۔ نواب صاحب نے وہ مقام انہیں دکھایا۔

کسی قدر غور کے بعد اس کا مطلب ایسی خوبی اور وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا۔ کہ شاہ ولی اللہ بھی شاید اس سے زیادہ بیان نہ کر سکتے[۱]

فارسی زبان کے علاوہ غالب عربی خاصی جانتے تھے۔ نجوم و تصوف اور منطق و فلسفہ میں بھی کافی درخور تھا۔

علم طب سے آگاہی کے شواہد

بعض تحریرات سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ طب سے بھی صاحب فن کی حیثیت میں آگاہ تھے[۲]۔ ایک مرتبہ نواب کلب علی خاں مرحوم فرمانروائے رام پور کا مزاج ناساز ہو گیا۔ انہیں لکھتے ہیں:۔

۱؎ "یادگار" صفحہ ۶۰ ۲؎ اردوئے معلیٰ صفحہ ۲۴ و ۳۴۰

میں طبیب نہیں مگر تجربہ کار ہوں۔ خدا جانے اور طبیب کیا سمجھتے ہوں گے۔ کہ کیا تھا۔
میرے نزدیک بہ اشتراکِ معدہ و قلب یہ مرض طاری ہوا تھا۔ اب آپ کو حفظِ صحت
کے واسطے گاہ گاہ نارجیل دریائی اور جدوار کا استعمال ضروری ہے اور معجون طلائی عنبری
تقویتِ قلب میں مجوزۂ حکیم میر علی خاں مغفور ہے۔ ورق طلا، عنبر اشہب، عرق کیوڑہ، قند، کثرتِ اجزا
اس ترکیب خاص میں ناپسند۔ کثیر الاجزا اور معجونیں ہیں۔ مفرح ابو علی سینا، خمیرہ مروارید، خمیرہ گاؤزبان
عنبری، ماء اللحم عنبر تشتی جس میں طیور کے گوشت ادویہ مفرح و مقوی حرارت و برودت میں معتدل
(ڈالی جائیں) گاہ گاہ سکنجبین و گلاب پی لیا کیجئے۔ غذا اپنی گوشت طیور اکثر، بیضہ نیم برشت اکثر
لیکن یہ خیال رہے کہ بیضہ مرغ و لحم طیور ایک جلسہ میں تناول نہ فرمایئے۔ بکری کے گوشت
کے ساتھ بیضۂ مرغ جائز اور لذیذ اور مرغوب۔ پودینہ کا عرق، چھوٹی الائچی کا عرق ہمیشہ دواخانے
میں موجود رہے۔ عطریات کے استعمال میں مبالغہ..... شوربائے پاچۂ گوسفند
مائدہ خاص پر موجود رہے[1]۔

مریض کو دیکھے بغیر صرف عوارض کی تفصیل پڑھ کر بیماری کا اصل سبب معلوم کر لینا، اور اس تفصیل سے دوا و غذا تجویز کر دینا محض "تجربہ کاری" کا کرشمہ نہیں سمجھا جا سکتا۔ بلاشبہ غالب طبیب نہ تھے۔ اس لئے کہ طب کو انہوں نے پیشہ کے طور پر اختیار نہیں کیا تھا، لیکن فن طب میں خاصی دستگاہ رکھتے تھے۔

اس باب میں بعض مزید شہادتیں فراہم ہو گئی ہیں۔ مثلاً غالب کے قیام کلکتہ کے متعلق بعض غیر مطبوعہ تحریرات پروفیسر سید محمود حسن صاحب رضوی ادیب ایم۔ اے نے دسمبر ۱۹۳۴ء کے "الناظر" میں شائع کر دی تھیں۔ ان سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ غالب نے اپنے ایک دوست میرزا ابو القاسم خاں قاسم کے لئے مسہل تجویز کیا تھا۔ اس کا شکریہ قاسم نے مندرجہ ذیل قطعہ میں ادا کیا ہے:۔

[1] مکاتیب غالب صفحہ ۶۲ و ۶۳۔

اے مسیح زمان تو مے دانی　　بجنابت ارادتے کہ مراست

بوعلی کے رسد بہ تشخیصت　　کے ارسطو[1] مثال تو داناست

مے سزد گر بگویمت بقراط　　ور فلاطون بخوانمت زیباست

مسہل[2] دادی و بفرمودی　　بعمل آر بے گماں کہ شفاست

زاں عمل دور شد مرض بالکل

گر بگویم توئی مسیح بجاست

قاسم ہی کے نام ایک مکتوب میں لکھتے ہیں :-

شب رفتہ من نیز مسہلے از روغن بید انجیر و نمک آب آشامیدہ بودم، اما طبع آں را نہ پذیرفت و رفع قبض نہ شد۔ امروز بہ طور خود ترکیبے کہ بر فعل مسہل شبانہ موثر باشد بعمل آوردہ ام۔

جناب محمد عبد الرزاق صاحب راشد مددگار معتمد فینانس دولت آصفیہ نے ۱۶ فروری ۱۹۳۶ء کو غالب کے متعلق ایک تقریر نشر کی تھی۔ اس میں ڈاکٹر سید قاسم صاحب (پتھر گٹی حیدر آباد) کے کتب خانہ کی ایک کتاب "ذخیرۂ دولت شاہی" کا حوالہ دیا ہے۔ جس پر غالب کی مہر بھی ثبت ہے۔ نیز یہ شعر درج ہے ؂

رضینا قسمت الجبار فینا　　لنا علم و للجہال مال

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کتاب غالب کے زیر مطالعہ رہی۔

---

[1] یہاں "فلاطون" درج ہے۔ لیکن فلاطون چونکہ اگلے شعر میں بھی آیا ہے۔ لہذا میرا خیال ہے کہ اس جگہ غالباً "ارسطو" ہوگا۔ نقل میں سہواً "فلاطون" لکھا گیا۔

[2] قاسم نے مسہل کے "لام" کو کسرہ دیدیا تھا حالانکہ یہاں "یائے" چاہیئے تھی غالب نے جوابی قطعہ میں اسکی طرف اشارہ کیا ہے۔

آخر لفظ "مسہل" از سر سہو　　مکسرہ المنونشہ وہ موقع یا مستقر

"یائے توحید" بر نگار ایں جا　　کسرہ خود بے مضاف الیہ خطاست

فن انشا نیاں نہ گردازیں　　لیک عیب طریقہ املاست

لیکن یہ سب کچھ اس غرض سے عرض کیا جا رہا ہے کہ غالبؔ کے علم کا تنوع ظاہر ہو جائے۔ یہ درست ہے۔ کہ وہ طبیب نہ تھے۔ اور ان کی شہرت و عظمت کا میدان دوسرا ہے۔

اسراف اور قرض

رسالہ "ہندوستانی" میں شائع شدہ خط کا اقتباس اوپر درج ہو چکا ہے اس سے ظاہر ہے۔ کہ تعلیم و تدریس ابتدائی حالت میں تھی جب غالبؔ لہو و لعب فسق و فجور اور عیش و طرب میں منہمک ہو گئے۔ رندی اسراف پر منتج ہوئی۔ اور اسراف نے انہیں قرض کا عادی بنا دیا۔ نواب علاء الدین احمد خاں کے نام کے ایک خط سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ ابتدائی زمانہ ہی سے قرض لینا شروع کر دیا تھا۔ فرماتے ہیں:-

بھائی (نواب امین الدین احمد خاں والی لوہارو) کو سلام کہنا اور کہنا کہ صاحب وہ زمانہ نہیں کہ ادھر متھرا داس سے قرض لیا، ادھر دریا ری مل کو مارا۔ ادھر خوب چند چین سکھ کی کوٹھی جا لوٹی۔ ہر ایک کے پاس تمسک مُہری موجود، شہد لگاؤ چاٹو، نہ مُول نہ سُود۔

یہ بھی معلوم ہوتا ہے۔ کہ ان کے رشتہ دار بہت کافی مالی امداد دیتے تھے۔ خُود لکھتے ہیں:

اس سے بڑھ کر یہ کہ روٹی کا خرچ بالکل پھوپھی کے سر، با ایں ہمہ کبھی خاں[1] نے کچھ دیدیا۔ کبھی الور سے کچھ دلوا دیا۔ کبھی ماں نے کچھ آگرہ سے بھیجدیا۔ اب میں اور باسٹھ روپے کلکٹری کے، سو روپے رام پور کے۔

میرزا یوسف خاں

غالبؔ دہلی چلے آئے تو ان کے چھوٹے بھائی میرزا یوسف خاں بھی آگرہ کی سکونت ترک کر کے دہلی میں آ بسے۔ وہ غالبؔ سے دو برس چھوٹے تھے۔ تیس برس کی عمر میں دیوانگی کا عارضہ ہوا۔ جس سے تا دم مرگ کامل افاقہ نہ ہوا۔

---

[1] جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے۔ یہ اشارہ غالباً نواب احمد بخش خاں مرحوم والی فیروز پور جھرکہ کی طرف ہے۔

دہلی میں وہ غالب سے الگ رہتے تھے۔ ان کی صرف ایک لڑکی تھی، جس کی شادی میرزا علی بخش خاں رنجور (ابن نواب الٰہی بخش خاں معروف) کے صاحبزادے غلام فخر الدین خان کے ساتھ ہوئی تھی۔ غدر میں میرزا یوسف کی بیوی اور لڑکی بچوں سمیت دہلی سے جے پور چلے گئے اور میرزا ے موصوف کی خبر گیری کے لئے گھر میں ایک سن رسیدہ ملازم اور ایک بڑھیا خادمہ کو چھوڑ گئے۔ غالب نے انہیں اپنے مکان پر لانے کی کوشش کی مگر نہ لا سکے۔ "دستنبو" میں لکھتے ہیں:

برادر کہ دو سال از من کوچک است در سی سالگی خرد بہ باد داد و دیوانگی و کالیوگی گزید۔ سی سال است کہ آں دیوانہ کم آزار مست و بے ہوش مے زید۔ خانہ وے از خانہ من جدا است و کما بیش دوری دو ہزار گام درمیان۔ زن و دخترش با فرزندان و کنیزان زندگی در گریختن پنداشتند و خانہ خداوند دیوانہ را با خانہ و کاچال (اسباب خانہ)، و دربان کہن سال و کنیز پیر زال بجا گزاشتند۔ کس فرستادن و آں سہ تن و کالا را بدیں جا آوردن اگر جادو دانستمے توانستمے این خود گراں اندوہے دیگر و از بار ایں اندوہ بر دل کوہے دیگر است۔

میرزا یوسف کی وفات غدر کے دوران ہی میں میرزا یوسف کو پانچ روز بخار آیا جو اُن کی موت کا بہانہ بن گیا۔ بڈھے دربان نے غالب کو یہ خبر پہنچائی۔ "دستنبو" میں ۱۹ اکتوبر کے حالات میں لکھتے ہیں۔ اب یہ تشویش ہوئی کہ کفن دفن کا کیا انتظام کیا جائے نہ مردہ شو کا پتا نہ گورکن کی خبر، نہ بازار کھلے تھے کہ کفن کے لئے کپڑا خریدا جائے۔

ہندو بہے تواند کہ مردہ را بہ دریا بردہ بر لب آب در آتش سوزاند۔ مسلمان را چہ زہرہ کہ دو سہ کس ہمپائے یک دگر دوشادوش بہ رہے گزرند، چہ جائے آنکہ مردہ را از شہر بروں برند۔ ہمسایگان بر تنہائی من بخشودند و بہ سرانجام کار کمر بستند۔ یکے را از سپاہیان پٹیالہ پیشا پیش و دو تن را از چاکران من با خویش گرفتند و رفتند و تن مردہ را شستند و در دو سہ چادر کہ از ین جا بردہ

بودند بپیچیدند و بہ نماز گاہے (مسجد) کہ بہ پہلوئے آں کاشانہ بود زمین کندند و مردہ را در آنجا نہادند و مغاک بہ خاک انباشتند و برگشتند۔

دریغ آں کہ اندر درنگ سہ بیست | سی دہ شاد و سی سال ناشاد زیست
بہ خاک بالیں ز خشتش نہ بود | بجز خاک در سرنوشتش نہ بود
خدایا برایں مردہ بخشایشے | کہ نادید در زیست آسایشے

سروشے بہ دلجوئی او فرست

روانش بہ جاوید مینو فرست

یعنی ساٹھ برس (بہ حساب سنین قمری) کی زندگی ہوئی جس میں سے تیس سال شادمانی میں گزرے اور تیس سال ناشادمانی میں بسر ہوئے۔

تاریخ وفات یوسف خاں | میرزا یوسف کا انتقال ۲۹ر صفر ۱۲۷۴ھ (مطابق ۱۹ر اکتوبر ۱۸۵۷ء) کو ہوا۔ غالب نے تاریخ وفات لکھی:۔

ز سالِ مرگِ ستم دیدہ میرزا یوسف | کہ زیستے بہ جہاں در ز خویش بیگانہ
یکے در انجمن از من ہمے پژوہش کرد | کشیدم آہے و گفتم "دریغ دیوانہ"

"دریغ دیوانہ" کے اعداد میں سے "آہے" کے اعداد کا تخرجہ کیا جائے تو تاریخ نکلتی ہے۔

یوسف خاں کی اولاد | یوسف خاں کی صاحبزادی کے چار بچے تھے ان کے شوہر غلام فخرالدین خاں غدر سے قبل بادشاہ کی جاگیر کوٹ قاسم کے منتظم تھے۔ اور بادشاہ کی ہدایات کے مطابق غدر کے دنوں میں بھی روپیہ دیتے رہے تھے۔ اس بنا پر ان کے خلاف مقدمہ بنا لیکن انجام کار وہ بری ہو گئے۔ بعد ازاں حیدرآباد چلے گئے۔ وہاں ان کے لئے دو سو روپے ماہوار کی رقم بہ طور منصب مقرر ہو گئی۔ غلام فخرالدین خاں کے صاحبزادے میرزا محمد سعید خاں تھے جنہوں نے ابتدا میں ملازمت اختیار کی مگر بعد میں درویش بن گئے اور بائیس برس گوشہ نشینی اور یاد الٰہی میں بسر کر دیئے۔ وہ بعد وفات

محلہ مستعد پورہ حیدر آباد میں دفن ہوئے۔ ان کے صاحبزادے میرزا نصر اللہ خاں بیرسٹر ایٹ لا اس وقت حیدر آباد میں صدر محاسبی کے عہدۂ جلیلہ پر فائز ہیں۔

بھتیجی کی پرورش کا اضطراب

غالب کو اپنی بھتیجی اور اس کے بچوں کی پرورش کا بڑا خیال تھا۔ ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:-

حقیقی میرا ایک بھائی دیوانہ مر گیا۔ اس کی بیٹی، اس کے چار بچے۔ اس کی ماں، میری بھاوج، جے پور میں پڑے ہوئے ہیں اس تین برس میں (یعنی غدر کے بعد) ایک روپیہ ان کو نہیں بھیجا۔ بھتیجی کیا کہتی ہو گی کہ میرا بھی چچا ہے۔

غلام فخر الدین کے مقدمے کے دوران میں بھی غالب بڑے مضطرب تھے اور جب انہوں نے رہائی پائی تو اتنے خوش ہوئے کہ اسے غلام فخر الدین کی نئی زندگی سے تعبیر کرتے ہیں[1]۔

---

[1] اردوئے معلیٰ صفحہ ۱۱۳

تیسرا باب

شادی، خانگی زندگی اور متعلقین

بکاشی لختے از کاشانہ یاد آر   دریں جنت ازاں ویرانہ یاد آر
دریغا در وطن وا ماندۂ چند   بخونِ دیدہ زورق راندۂ چند
ہوس را پلے در دامن شکستہ
باُمید تو چشم از خویش بستہ

شادی

غالب کی شادی ۷ رجب ۱۲۲۵ھ کو ٹھیک تیرہ برس کی عمر میں نواب الٰہی بخش خاں معروف کی چھوٹی صاحبزادی امراؤ بیگم سے ہوئی۔ نواب علاؤ الدین احمد خاں کے جس مکتوب میں وہ اپنی حیات مستعارہ کو عالم ارواح کی گناہ گاری کی سزا قرار دیتے ہیں، اس میں تحریر فرماتے ہیں:۔

۸ رجب ۱۲۱۲ھ کو مجھ کو روبکاری کے واسطے یہاں بھیجا یعنی کتم عدم سے معرض وجود میں آیا، تیرہ برس حوالات میں رہا۔ ۷ رجب ۱۲۲۵ھ کو میرے واسطے حکم دوام حبس صادر ہوا۔ ایک بیڑی میرے پاؤں میں ڈال دی۔ دلّی شہر کو زندان مقرر کیا اور مجھے اس زندان میں ڈال دیا نظم و نثر کو مشقت ٹھہرایا۔

ظاہر ہے کہ اس خط میں "حکم دوام حبس" سے مراد شادی اور "بیڑی" سے مراد بیوی ہے۔

ہرگوپال تفتہ نے اپنے اور غالب کے مشترک دوست امراؤ سنگھ کی دوسری بیوی کے انتقال کی اطلاع دی تھی۔ اس کے جواب میں ۱۹ دسمبر ۱۸۵۸ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

امراؤ سنگھ کے حال پر اس کے واسطے مجھ کو رحم اور اپنے واسطے رشک آیا۔ اللہ اللہ ایک وہ ہیں کہ دو بار ان کی بیڑیاں کٹ چکی ہیں اور ایک ہم ہیں کہ ایک اوپر پچاس برس سے جو پھانسی کا پھندا گلے میں پڑا ہے نہ پھندا ہی ٹوٹتا ہے نہ دم ہی نکلتا ہے۔

قمری حساب کے مطابق یہ خط ۱۲۷۶ھ میں لکھا گیا۔ ۱۲۷۶ میں سے اکاون نکال دیئے جائیں تو ۱۲۲۵ھ رہ جاتے ہیں۔ گویا اس مکتوب سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ غالب کی شادی ۱۲۲۵ھ میں ہوئی۔

غالب کے خسر

ان کے خسر نواب الٰہی بخش خاں معروف تھے، جو فخر الدولہ دلاور الملک نواب احمد بخش خاں بہادر رستم جنگ والی فیروز پور جھرکہ و رئیس لوہارو کے چھوٹے بھائی تھے۔ انہوں نے اپنی تمام عمر گوشہ نشینی اور عبادت گزاری میں بسر کی۔ نواب احمد بخش خاں اگرچہ عمر میں بڑے تھے مگر چھوٹے بھائی کے زہد و اتقا کے باعث ان کا بڑا احترام کرتے تھے۔ معروف اچھے شاعر تھے۔ شاہ نصیر دہلوی کے شاگرد تھے۔ ان کا دیوان مولینا عبدالحامد قادری بدایونی کی کوشش سے شائع ہوا ہے۔ ۱۲۴۲ھ مطابق ۱۸۲۶ء میں رہگرائے عالم بقا ہوئے اور خواجہ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ کے مقبرہ کے پاس اس احاطہ میں دفن ہوئے جہاں بعد میں غالب سپرد خاک ہوئے۔ مولینا محمد حسین آزاد نے اُستاد پرستی کے جوش میں معروف کے کمالات کو بھی ذوق کی تراوش طبع کا نتیجہ قرار دیا ہے، حالانکہ یہ دعوے بالکل بے اصل ہے۔

معروف کی اولاد

معروف کے دو بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں۔ ہمیں صرف ایک بیٹے میرزا علی بخش رنجور کے متعلق کچھ معلومات حاصل ہیں۔ دوسرے

کا صرف نام معلوم ہے یعنی علی نواز خاں۔ بیٹیوں میں سے بڑی کا نام بنیادی بیگم تھا جن کی شادی نواب غلام حسین خاں مسرور[1] سے ہوئی۔ چھوٹی کا نام امراؤ بیگم تھا۔ جو غالب کی رفیقۂ حیات تھیں۔

امراؤ بیگم کی عمر

امراؤ بیگم غالب سے دو برس چھوٹی تھیں جیسا کہ خود غالب کے ایک مکتوب سے ظاہر ہوتا ہے۔ غدر سے دو تین برس بعد دہلی میں ہیضہ کی وبا پھیل گئی تھی۔ میر مہدی مجروح نے جو اس زمانے میں غالباً الور میں تھے۔ وبا کی کیفیت پوچھی فرماتے ہیں :۔

وبا تھی کہاں جو میں لکھوں کہ اب کم ہے یا زیادہ۔ ایک چھیاسٹھ برس کا مرد (غالب) اور ایک چونسٹھ برس کی عورت (بیگم غالب) ان دونوں میں سے ایک بھی مرتا۔ تو ہم جانتے کہ وبا تھی۔ تف بریں وبا!

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ شادی کے وقت امراؤ بیگم کی عمر گیارہ برس کی تھی۔ گویا ان کا سن ولادت ۱۲۱۴ھ سمجھنا چاہیئے۔

علی بخش خاں رنجور

علی بخش خاں رنجور غالب سے چار برس چھوٹے تھے۔ جیسا کہ خود غالب لکھتے ہیں :۔

علی بخش خاں مرحوم مجھ سے چار برس چھوٹا تھا۔ ۱۲۱۲ھ میں پیدا ہوا۔ اب کے رجب کے مہینے سے انہترواں برس شروع ہو گیا۔ اس نے (علی بخش خاں نے) چھیاسٹھ برس کی عمر پائی۔

غالب کے ساتھ علی بخش خاں کے تعلقات ہمیشہ بہت اچھے رہے۔ انہوں نے جب کلکتہ جاکر اپنی پنشن کے سلسلے میں چارہ جوئی کی تھی تو علی بخش خاں خاص

---

[1] نواب غلام حسین خاں مسرور سہراب جنگ ابن فیض اللہ بیگ خاں سہراب جنگ ابن شرف الدولہ قاسم جان۔

ہمراز و معاون تھے۔ اس باب میں غالب نے انہیں کلکتہ سے جو خط لکھے ان کا مفصل ذکر پنشن کے سلسلے میں آئے گا۔ فارسی نثر کی مشہور کتاب "پنج آہنگ" علی بخش خاں ہی کے ایما پر لکھی گئی تھی۔ جیسا کہ اس کے دیباچہ سے ظاہر ہے۔ تفصیلات غالب کی تصانیف کے باب میں پیش کی جائیں گی۔

کلکتہ جاتے ہوئے غالب کو راستے میں نواب احمد بخش خاں کے انتقال کی اطلاع ملی تو سب سے پہلے علی بخش خاں ہی کی پریشانیوں کا خیال آیا چنانچہ خان موصوف کو لکھتے ہیں:۔

از جانب شما اندیشہ ناکم ودانم کہ آنچہ شمارا پیش آید دلخواہ نباشد۔ ناکساں را رونق بازار خواہد بود۔ ہوشمندی را کار باید بست و ہموارہ بر خود نگراں باید بود۔

علی بخش خاں کو فیروزپور جھرکہ سے سو روپے ماہوار وظیفہ ملتا تھا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ نواب احمد بخش خاں کے انتقال کے بعد یہ وظیفہ بند ہو گیا تھا۔ اس زمانے میں وہ دہلی سے نکل کر پہلے لکھنؤ میں رہے۔ پھر جے پور چلے گئے۔ بعد ازاں حیدرآباد پہنچ گئے جب نواب شمس الدین احمد خاں ولیم فریزر کے قتل کے سلسلے میں پھانسی پاگئے اور ان کی ریاست ضبط ہو گئی تو سرکار انگریزی نے علی بخش خاں کے لئے سو روپے کے بجائے پچاس روپے کا وظیفہ مقرر کر دیا، جو ان کی وفات تک جاری رہا۔ ۳۱ر دسمبر ۱۸۶۳ء کو انھوں نے دہلی میں وفات پائی اور غالباً اپنے خاندانی قبرستان میں دفن ہوئے۔ غالب یکم جنوری کے خط میں نواب علاء الدین احمد خاں کو لکھتے ہیں:۔

بھائی علی بخش خاں مدت سے بیمار تھے۔ رات کو بارہ بجے پر دو بجے مرگئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون،

ل‍ے پنجاب گورنمنٹ کے ریکارڈز متعلقہ دہلی رزیڈنسی ۱۲

تمہارے عم نامدار (نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر) آج دن کے بارہ بجے (تدفین کے لئے) سلطان جی گئے ہیں۔ میں نہ جا سکا۔ تجہیز و تکفین ان کی طرف سے (نواب ضیاء الدین احمد خاں کی طرف سے) عمل میں آئے گی۔

علی بخش خاں کو سخن طرازی کا بڑا شوق تھا اور بعض اوقات وہ اپنے متعلق غلط دعاوی میں بھی تکلیف نہیں کرتے تھے۔ غالب نواب علاء الدین احمد خاں کو لکھتے ہیں:

اکبر آباد میں (علی بخش خاں) میور صاحب سے ملے اثنائے مکالمت میں کہنے لگے کہ میں چچا جان (نواب احمد بخش خاں) کے ساتھ جرنیل لارڈ لیک صاحب کے لشکر میں موجود تھا اور وہ ہلکر سے جو محاربات ہوئے ہیں۔ ان میں شامل رہا ہوں۔ بے ادبی ہوتی ہے، ورنہ قبا و پیرہن اُتار کر دکھاؤں تو سارا بدن ٹکڑے ٹکڑے ہے۔ جا بجا تلوار اور برچھی کے زخم ہیں۔ وہ (میور صاحب) ایک بیدار مغز اور دیدہ ور آدمی تھے۔ ان کو (علی بخش خاں کو) دیکھ کر کہنے لگے "نواب صاحب! ہم ایسا جانتے ہیں۔ کہ تم جرنیل کے وقت میں چار پانچ برس کے ہو گے" یہ سُن کر آپ نے (علی بخش خاں نے) کہا کہ درست و بجا، ارشاد ہوتا ہے۔ خدا یش بیا مرزاد و بہ ایں دروغہائے بے نمک مگیراد۔

خاندان لوہارو | لوہارو کا خاندان چونکہ قرابت داری اور روابط خصوصی کے باعث غالب کا اپنا خاندان بن گیا تھا۔ اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اختصار کے ساتھ اس کا بھی ذکر کر دیا جائے۔

اٹھارھویں صدی کے وسط میں سمرقند سے تین تورانی بھائی پنجاب آئے یہ قاسم جان، عالم جان، عارف جان۔

قاسم جان بڑے تھے۔ نواب معین الملک عرف میر منّو ناظم پنجاب نے ان کی قدر دانی کی اور اپنی رفاقت میں رکھ لیا۔ وہیں نظیر بیگ خاں ہزارہ کی لڑکی سے ان کی شادی ہوئی اور سندھ میں جاگیر ملی۔ میر منّو کے انتقال کے بعد

نظامت پنجاب کا کارخانہ درہم برہم ہوا۔ تو قاسم جان پانچسو تورانی سواروں کی جمعیت لے کر لاہور سے نکلے۔ کہ کسی دوسری جگہ قسمت آزمائی کریں۔ اس زمانے میں شہزادہ عالی گوہر (جو بعد کو شاہ عالم ہوئے) بہار میں تھے۔ اور نظامت بنگال کی فوج کلائیو کے ماتحت راہ روکے کھڑی تھی۔ قاسم جان کو یہ حالات معلوم ہوئے تو وہیں کا قصد کیا اور پٹنہ کے قریب پہنچتے ہی میرن (میر جعفر کے لڑکے) کے ایک دستہ پر حملہ کرکے تمام سامان اور رسد کا ذخیرہ چھین لیا۔ شہزادہ کو یہ کارگزاری اور جوانمردانہ ہمت بہت پسند آئی۔ شرف الدولہ کا خطاب دیا اور اپنے رفقاء خاص میں داخل کر لیا۔

اس کے بعد بادشاہ (عالمگیر ثانی) کا قتل، گھٹولی میں شہزادہ کی تخت نشینی انگریزوں کا تقرب، دیوانی کی تفویض، الہ آباد کی اقامت وغیرہ معاملات یکے بعد دیگرے پیش آئے۔ اور ان سب میں شرف الدولہ دخیل و مشیر رہے۔ پھر جب شاہ عالم دہلی آئے۔ تو جاٹوں کے دفع و اخراج کی مہم بھی انہی کے سپرد ہوئی اور تورانیوں کی جانفشانی سے اس میں کامیابی حاصل ہوئی۔ میرزا نجف خاں کے بخشی فوج مقرر ہونے کا معاملہ بھی انہی کے صواب دید سے انجام پایا۔

نجف خاں کے انتقال کے بعد جب غلام قادر خاں کا تسلط ہوا تو دہلی کے بچے بچائے امرا ادھر ادھر منتشر ہو گئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اسی زمانے میں شرف الدولہ کو بھی دہلی سے نکلنا پڑا۔ اور لکھنؤ چلے گئے۔ یہ آصف الدولہ کا عہد تھا۔ وہیں ان کا انتقال ہوا۔

منشی عبدالکریم تحفۃ الاحباب[۵] میں شرف الدولہ کے پوتے معین الدین حسین خاں کی زبانی لکھتے ہیں۔ کہ شرف الدولہ میرزا قاسم جان بخارا کے رہنے والے تھے۔ وہاں

---

[۵] تحفۃ الاحباب تاریخ پنجاب کے متعلق ایک مختصر رسالہ فارسی زبان میں ہے۔ جسے عبدالکریم میر منشی لفٹنٹ گورنر آگرہ نے ۱۸۵۰ء میں لکھ کر شائع کیا۔ اس میں سکھوں اور انگریزوں کی دونوں لڑائیوں کے حالات اخباروں سے لے کر جمع کردیئے گئے ہیں۔

سے سمرقند پہنچے اس جگہ کے حاکم کی رفاقت میں رہنے لگے۔ اور اس درجہ مقبول و دخیل ہوئے۔ کہ ریاست کی مدارالمہامی ان کے سپرد ہو گئی۔ پھر جب حاکم سمرقند کا اچانک انتقال ہو گیا۔ تو شرف الدولہ نے وہاں رہنا پسند نہ کیا اور سیدھے ہندوستان چلے آئے اس وقت ان کے پاس اسباب و متاع کے علاوہ تیرہ ہزار نقد اشرفیاں تھیں۔ دہلی میں بلیماراں کے پاس قاسم جان کی گلی مشہور ہے۔ یہ انہی شرف الدولہ میرزا قاسم جان کے نام سے موسوم ہے۔ عالم جان کے حالات معلوم نہیں ہو سکے۔

عارف جان عارف جان کے چار بیٹے تھے۔ جن میں سے دو بہت مشہور ہیں:۔ اوّل نواب احمد بخش خاں دوم نواب الٰہی بخش خاں معروف۔ احمد بخش خاں دور آخر کے نہایت جلیل القدر فرد اور بڑے اعلےٰ درجے کے جرنیل تھے۔ اگر یہ کہا جائے کہ موجودہ ریاست الور کی تاسیس احمد بخش خاں ہی کی مساعی کا نتیجہ تھی۔ تو یہ مبالغہ نہ ہوگا۔ نواب موصوف نے لارڈ لیک کی معیت میں بڑی شاندار خدمات انجام دی تھیں جن کی بناء پر انہیں علاقہ میوات میں فیروز پور جھرکہ کی ریاست مل گئی۔ لوہارو کا پرگنہ انہوں نے خود خرید لیا۔ یا ایک روایت کے مطابق والی الور نے حسن خدمات کے اعتراف میں انہیں دے دیا۔

خواصوں کے علاوہ نواب احمد بخش خاں کی دو بیگمیں تھیں۔ ایک میواتی الاصل جس کا نام مدی بیگم عرف بہو خانم تھا۔ اس کے بطن سے بڑے صاحبزادے شمس الدین احمد خاں تھے۔ ان کے ایک بھائی اور غالباً بہنیں بھی تھیں۔ دوسری بیگم جس کے بطن سے نواب امین الدین احمد خاں اور نواب ضیاء الدین احمد خاں پیدا ہوئے۔ نواب کی ہم قوم تھی۔ اور اس کا نام "بیگم جان" تھا۔

نواب نے ۱۸۲۲ء میں بڑے صاحبزادے شمس الدین احمد خاں کو اپنا جانشین قرار دیا۔ وہ چونکہ میواتی بیگم کے بطن سے تھے۔ اس لئے خاندان کے دوسرے افراد

جن میں غالب بھی شامل تھے، انہیں نسباً اپنا ہم پایہ نہیں سمجھتے تھے۔ اس طرح خاندان میں کشیدگی پیدا ہوگئی تھی۔ شمس الدین احمد خاں ایک طرف تھے۔ اور باقی سارا خاندان دوسری طرف تھا۔ غالباً اسی کشیدگی کو ملحوظ رکھتے ہوئے نواب احمد بخش خاں نے اپنے دل میں یہ فیصلہ کر لیا تھا۔ کہ دونوں چھوٹے لڑکوں کو لوہارو کی جاگیر مستقل طور پر دے دیں۔ اور بقیہ افراد خاندان کی پنشنیں فیروز پور جھرکہ سے متعلق کر دیں۔ غرض انہوں نے شمس الدین احمد خاں سے ایک اقرار نامہ لیا، جو لوہارو کی جاگیر سے دست برداری پر مشتمل تھا۔ ۱۸۲۶ء میں فیروز پور جھرکہ کی مسند شمس الدین احمد خاں کے حوالے کی۔ لوہارو امین الدین احمد خاں اور ضیاء الدین احمد خاں کو سونپا اور خود اپنی خاندانی حویلی (واقعہ قطب صاحب) میں گوشہ نشین ہو گئے۔ اکتوبر ۱۸۲۷ء میں وفات پائی۔ اور اپنے پیر و مرشد مولانا فخر الدینؒ[1] اورنگ آبادی کے مزار کے پاس دفن ہوئے[2]۔

---

[1] مولانا فخر الدینؒ فخر عالم دور آخر کے جلیل القدر اولیاء میں سے تھے۔ آپ کا سلسلۂ بیعت خواجہ کلیم اللہؒ جہان آبادی سے ملتا ہے۔ بہادر شاہ کے پیر شیخ نصیر الدین عرف کالے میاں مولانا فخر عالم کے پوتے تھے۔ نواب احمد بخش خاں اور نواب الٰہی بخش خاں معروف مولاناؒ کے بڑے معتقد تھے۔ بیان کیا جاتا ہے۔ کہ ریاست ملنے اور نواب بننے سے پیشتر احمد بخش ایک روز مولانا کے پاؤں داب رہے تھے۔ حضرت نے فرمایا۔ "نواب صاحب! بس کیجیئے!" احمد بخش خاں اس تلقیب پر حیران ہوئے اس لئے کہ وہ "نواب" نہ تھے۔ لیکن چند روز کے بعد انہیں ریاست مل گئی۔
خواجہ نور محمد مہاروالے آپ ہی کے خلیفہ تھے خواجہ سلیمان تونسوی بھی اس سلسلہ فیض روحانی کا ایک مایۂ ناز نمونہ تھے؟

[2] مولانا ابو الکلام آزاد فرماتے ہیں: "میرزا غالب اور نواب احمد بخش خاں کے خاندانوں کا حال ہر اعتبار سے اس درجہ اشتباہ و اشتراک کو لئے ہوئے ہے۔ کہ صاف معلوم ہوتا ہے۔ دونوں میں پہلے سے باہمی رفاقت اور اتحاد حالات و کوائف کا رشتہ موجود تھا۔ دونوں سمرقند سے نکلے، دونوں لاہور آئے۔ دونوں کا ابتدائی قیام لاہور میں ہوا۔ دونوں دہلی آئے۔ دونوں نے لکھنؤ کا رخ کیا۔ دونوں کا تعلق آصف الدولہ سے رہا۔ دونوں ہم پیشہ تھے۔ اور دونوں اس زمانے کے فری لانسرز کی طرح قسمت آزمائی میں سیر و گردش کرتے رہے۔ دونوں کے ترک وطن اور توطن ہند کا زمانہ ایک ہی ہے۔ غالباً قاسم جان اور مرزا غالب کے مورث اعلیٰ ایک ہی قبیلہ کے افراد تھے۔ اور باہم رفاقت میں سمرقند سے نکلے تھے۔ بعد میں دونوں خاندانوں میں جو رشتہ داریاں ہوئیں۔ ان سے بھی بنیادی قرب و تعلق پر روشنی پڑتی ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۴ پر)

نواب احمد بخش خاں کے صاجزادوں میں کشمکش

غالب کی پنشن کا جھگڑا نواب احمد بخش خاں کی زندگی ہی میں شروع ہو چکا تھا۔ لیکن بقیہ خاندانی منافشات ان کی وفات کے بعد رونما ہوئے۔ نواب شمس الدین احمد خاں نے یہ دعوےٰ کر دیا کہ لوہارو کا پرگنہ میرے حوالے کیا جائے۔ اور بھائیوں کی پنشنیں مقرر ہوں۔ بھائیوں نے یہ مطالبہ پیش کر دیا۔ کہ نواب مرحوم کے ترکہ میں جو نقد روپے بیش بہا جواہرات اور دوسری چیزیں تھیں ان میں سے بھی حصہ ملنا چاہیئے۔

آخر یہ جھگڑا دہلی کے انگریز ریذیڈنٹ کے پاس پہنچا۔ جس نے گورنر جنرل کے پاس رپورٹ پیش کی۔ وہاں سے ریذیڈنٹ کو فیصلے کا مختار بنا دیا گیا۔ اس نے ۲۵ مارچ ۱۸۲۸ء کو یہ سفارش کی کہ لوہارو امین الدین احمد خاں اور ضیاء الدین احمد خاں کو مل جائے۔ اور شمس الدین احمد خاں کو اس میں مداخلت کا کوئی حق حاصل نہ رہے۔ جاگیر کے مصارف انتظام و تحصیل کے بعد جو کچھ بچے۔ اس کا نصف حصہ ضیاء الدین احمد خاں کی نابالغی کے زمانے میں اُن کے نام سرکاری خزانہ میں جمع ہوتا رہے۔ جب وہ بالغ ہو جائیں۔ تو لوہارو کا پرگنہ دونوں بھائیوں میں بہ حصہ مساوی تقسیم ہو جائے۔

یہ فیصلہ طرفین کو سُنا دیا گیا۔ تینوں بھائیوں نے اسے منظور کر لیا۔ اور ۱۱ اگست ۱۸۲۸ء کو ریذیڈنٹ نے اسے بغرض منظوری اوپر بھیجدیا۔ حکومت ہند نے اس سے اتفاق کیا لیکن اپنی طرف سے تجویز پیش کر دی کہ لوہارو کو تقسیم کرنا مناسب نہیں اگر امین الدین احمد خاں اور ضیاء الدین احمد خاں راضی ہو جائیں تو انہیں جاگیر کی آمدنی کے برابر بعد وضع مصارف انتظام، نقد روپیہ سال بسال دیا جائے اور جاگیر کا انتظام شمس الدین احمد خاں کے حوالے کر دیا جائے

(بقیہ حاشیہ متعلقہ صفحہ ۴۳) مگر یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ میرزا غالب اس بارے میں کیوں خاموش رہے؟ کیوں وہ اپنے دادا اور شرف الدولہ کے باہمی تعلق و رفاقت کے حالات نمایاں نہیں کرتے؟ میں نے نواب امیر الدین مرحوم دوالی لوہارو سے ایک بار اس کا تذکرہ کیا تھا، انھوں نے شرف الدولہ و میرزا غالب کے دادا کی باہمی رفاقت، اور بابعد گرترک وطن کو قرین قیاس تسلیم کیا۔ لیکن اور کچھ نہ بتلا سکے"۔

اس طرح ایک طے شدہ معاملہ دوبارہ معرض کشمکش میں پڑ گیا اور شمس الدین احمد خاں جو لوہارو کو بھائیوں کے سپرد کرنے پر راضی ہو چکے تھے، حکومت ہند کی اس تجویز کے بعد پھر اپنے پہلے مطالبے پر جم گئے۔

یہ جھگڑا جاری ہی تھا۔ کہ ریزیڈنٹ بدل گیا۔ نئے ریزیڈنٹ نے حکومت کی تجویز کے مطابق ۹ نومبر ۱۸۳۱ء کو لوہارو شمس الدین احمد خاں کے حوالے کر دیا۔ اس سلسلے میں دوسری وجوہ کے علاوہ ایک وجہ یہ پیش کی جو شمس الدین احمد خاں نے سمجھائی ہو گی، کہ امین الدین احمد خاں نے چھوٹے بھائی کے حصے کا روپیہ خزانے میں داخل نہیں کیا۔ حالانکہ اس باب میں اعتراض کا حق ریزیڈنٹ یا شمس الدین احمد خاں کو نہ تھا۔ بلکہ صرف ضیاء الدین احمد خاں کو تھا۔ اور ان کی طرف سے کوئی اعتراض نہیں ہوا تھا۔

اس ضمن میں ریزیڈنٹ نے جاگیر کی آمدنی کا جو فیصلہ کیا، وہ بھی سراسر نادرست تھا یعنی کل آمدنی کا تخمینہ پچیس ہزار کر کے پندرہ ہزار انتظام کے لئے رکھے اور صرف دس ہزار کی بچت دکھائی۔ گویا امین الدین احمد خاں اور ضیاء الدین احمد خاں صرف دس ہزار کے حقدار قرار پائے[1]

اس پر امین الدین احمد خاں اور ضیاء الدین احمد خاں کی طرف سے یہ اعتراض ہوا۔ کہ کاشتکاروں کی سرکشی کے باعث پورا مالیہ وصول نہیں ہوا۔ لہٰذا حقیقی آمدنی کی تشخیص صحیح نہیں۔ نیز اگر لوہارو کو ہم سے چھیننا ہی منظور ہے تو شمس الدین احمد خاں کے حوالے کرنے کے بجائے سرکار انگلشیہ اسے اپنی تحویل میں لے لے اور ہمارے وظیفے مقرر کر دے۔ میرا خیال ہے کہ کاشتکاروں کی سرکشی شمس الدین احمد خاں کی انگیخت کا نتیجہ تھی۔

---

[1] پہلی تجویز سر ایڈورڈ کول بروک نے پیش کی تھی۔ انکی جگہ فرانسس ہاکنس ریزیڈنٹ بن کر آئے تو انھوں نے آخر الذکر فیصلہ کیا۔ غالب نے ایک جگہ لکھا ہے کہ فرانسس ہاکنس "باوا" فیروز پور د شمس الدین احمد خاں ہیجان یافتہ "ی البت" اوپر کے بیان سے ظاہر ہے۔ کہ یہ رائے بالکل درست تھی۔ ہاکنس نے لوہارو کے متعلق جو فیصلہ کیا وہ بھی سراسر شمس الدین احمد خاں کی مرضی کے مطابق تھا اور پنشن کے متعلق غالب کے دعوے کے باب میں جو رپورٹ پیش کی وہ بھی شمس الدین احمد خاں کے حق میں تھی۔

جو اس طریق سے لوہارو کی آمدنی کو کم ظاہر کرنے کے درپے تھا۔ کہ بھائیوں کے حصے کی رقم زیادہ سے زیادہ گھٹ جائے۔

حکومت نے پہلے یہ فیصلہ کیا۔ کہ لوہارو کو پرسنل اسسٹنٹ ریونیو حصار کے حوالے کر دیا جائے۔ اور مصارف انتظام وضع کرنے کے بعد بقیہ روپیہ امین الدین احمد خاں اور ضیاء الدین احمد خاں کو ملتا رہے۔ پھر شمس الدین احمد خاں کے اصرار پر لوہارو ان کے حوالے کر دیا۔

ولیم فریزر کا زمانہ

۱۸۳۲ء میں ولیم فریزر[1] دہلی کے ایجنٹ مقرر ہو کر آئے۔ وہ ۱۸۰۵ء میں دہلی میں ڈیوڈ آکٹر لونی کے سکرٹری رہ چکے تھے۔ احمد بخش خاں کے نہایت گہرے دوست تھے۔ اور نواب مرحوم کے صاحبزادے انہیں "چچا" کہتے تھے۔ بھائیوں کی کشمکش جاری تھی۔ فریزر صاحب نے تجویز پیش کی کہ نواب احمد بخش خاں کی تقسیم کے مطابق لوہارو امین الدین احمد خاں اور ضیاء الدین احمد خاں کو ملنا چاہیئے۔ اگر امین الدین احمد خاں نے بھائی کے حصے کا روپیہ دہلی کے خزانے میں جمع نہیں کرایا۔ تو اس پر اعتراض کا حق ضیاء الدین احمد خاں کو ہے۔ جب اصل حقدار اس صورتِ حالات پر مطمئن ہے تو شمس الدین احمد خان کے اعتراض کو کس بنا پر بجا سمجھا جا سکتا ہے؟

صاحب نے یہ بھی لکھا کہ لوہارو کی آمدنی فی الحال چالیس ہزار ہے لیکن مزید اصلاح کے بعد توقع ہے کہ یہ ساٹھ ہزار ہو جائیگی۔ لہٰذا جاگیر کو ایک مقررہ رقم پر شمس الدین احمد خاں کے حوالے کر دینے سے چھوٹے بھائیوں کے حقوق کو نقصان پہنچے گا۔ لیکن یہ تجویز منظور نہ ہوئی اور غالباً فریزر ہی کے مشورے کے مطابق امین الدین احمد خاں اپنے مقدمے کی پیروی کے لئے خود کلکتہ گئے۔ اس سفر کیلئے یہ بات بھی محرک ہوئی کہ سر چارلس مٹکاف اس زمانے میں سوپریم کونسل کے ممبر تھے۔ وہ امین الدین احمد خاں کے خاندانی حالات سے واقف تھے۔ اور ان کے ذریعہ سے مدعا برآری کی پوری امید تھی۔

---

[1] ولیم فریزر ایک مرتبہ ۱۸۳۰ء میں تھوڑی سی مدت کے لئے ریزیڈنٹ رہے۔ اس کے بعد ریزیڈنسی ایجنسی بن گئی۔ اور وہ ۱۸۳۲ء سے کر قتل تک ایجنٹ رہے۔

شمس الدین احمد خاں کے خلاف فیصلہ

کلکتہ پہنچ کر امین الدین احمد خاں نے تمام معاملات حکام والا کے گوش گزار کئے تو فیصلہ ان کے حق میں ہوگیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ جب مقدمہ کے دگرگوں ہو جانے کی رپورٹ کلکتہ سے شمس الدین احمد خاں کے پاس پہنچی تو وہ مصاحبوں کے ساتھ کھانا کھا رہے تھے۔ رپورٹ پڑھتے ہی کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا۔ اور سوچ میں پڑ گئے۔ کریم خاں نامی ایک روہیلہ سوار بہت مُنہ لگا تھا۔ بے تکلّف بول اُٹھا "سوچ میں کیوں پڑ گئے ہیں۔ اور کھانا کس لئے ٹھنڈا کر رہے ہیں" نواب نے خلاف معمول خفگی سے جواب دیا کریم خاں نے حالات معلوم کئے بغیر کہہ دیا کہ "اگر دشمن سے آزار پہنچا ہے تو میں اس کا خاتمہ کردوں گا" شمس الدین احمد خاں بولے "شکم پرست لوگ یونہی باتیں بنایا کرتے ہیں" کریم خاں نے کہا "نواب صاحب! میں پٹھان ہوں، میرے ساتھ دوسروں کی طرح طعن آمیز گفتگو نہ کیجیئے" نواب خاموش رہے۔ کریم خاں اُٹھ کر دوسرے کمرے میں چلا گیا جہاں نواب کا دیوان اور ایک خدمت گزار (انیا میو) بیٹھے تھے۔ ان سے نواب کی غیر معمولی پریشانی کا سبب معلوم ہوا۔

فریزر کا قتل

کریم خاں اسی وقت "انیا" کو ساتھ لے کر فیروزپور جھرکہ سے دہلی روانہ ہوگیا تاکہ ولیم فریزر کا خاتمہ کردے جو لوہارو کو شمس الدین احمد خاں سے چھنوانے کا حقیقی موجب تھا[1]۔ بعض لوگوں کا بیان ہے کہ کلکتہ سے فیصلے کی اطلاع پاتے ہی نواب نے خود فریزر کے قتل کی سکیم تیار کر کے کریم خاں اور انیا کو دہلی بھیجا۔ کہ ایجنٹ کو تنہا پاتے ہی قتل کر ڈالیں۔ وہ دونوں دہلی میں تین ماہ تک فریزر کے پیچھے لگے رہے۔ لیکن وار کا موقعہ نہ ملا۔ آخر ناکام واپس چلے گئے۔ شمس الدین احمد خاں اس ناکامی پر بہت خفا ہوئے تو دونوں دوبارہ دہلی پہنچے۔ کریم خاں نے ایک بندوق لیکر

۱؎ یہ واقعات مجھے بعض سن رسیدہ بزرگوں سے معلوم ہوئے جن میں سے نواب امیر الدین احمد خاں مرحوم سابق فرمانروائے لوہارو بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

اس کی نالی چھوٹی کرائی تاکہ اسے بہ آسانی چھپایا جا سکے۔ دو ماہ تک فریزر کا تعاقب جاری رہا لیکن حملے کا موقع نہ ملا۔ ۲۲ مارچ ۱۸۳۵ء کی شب کو ایک جگہ صاحب کی دعوت تھی۔ جس سے فارغ ہو کر گھر واپس جا رہا تھا۔ کریم خاں نے راستے میں گولی مار کر کام تمام کر دیا۔ اور خود بچ نکلا۔ لیکن شہر سے باہر نہ جا سکا۔

قتل کی اطلاع ملتے ہی شہر کے دروازے بند کر دیئے گئے اور قاتل کی تلاش شروع ہو گئی۔ کریم خاں اور انیا نے بندوق ایک کنوئیں میں پھینک دی۔ باقی سارے نشانات بھی زائل کر ڈالے۔ نواب کی طرف سے اس دوران میں جتنے خط آئے تھے۔ وہ سب جلا ڈالے۔ چند روز کے بعد کریم خاں نے انیا کو تمام حالات کے متعلق ایک مفصل خط دیکر نواب کے پاس بھیجا۔ وہ کارگزاری کی تفصیلات سُنکر بہت خوش ہوئے۔ انیا نواب سے مل کر باہر نکل رہا تھا۔ کہ کریم خاں کے ایک قریبی رشتہ دار نے رائے دی۔ کہ انیا جیسے فرومایہ آدمی کو جو تمام رازوں سے آگاہ ہے، زندہ چھوڑنا خلاف احتیاط ہے۔ اس کا بھی خاتمہ کر دینا چاہیئے۔ انیا یہ بات سُنتے ہی فیروزجھرکہ سے بھاگ کر اپنے گھر پہنچا۔ پھر مختلف جگہوں میں چھپتا چھپاتا اور جان بچاتا ہؤا پہلے آگرہ بعد ازاں بریلی چلا گیا۔ اس اثنا میں کریم خاں بعض شبہات کی بناء پر پکڑا گیا۔ اس کا سُراغ مل جانے کی بڑی وجہ یہ تھی۔ کہ شمس الدین احمد خاں اور فریزر کی عداوت کا ہر شخص کو علم تھا۔ عام رائے یہی تھی کہ فریزر کا قتل شمس الدین احمد خاں کی انگیخت پر ہؤا ہے۔ اور اس کا ذمہ دار نواب ہی کا ملازم ہو گا۔ بدقسمتی یہ کہ جس کنوئیں میں بندوق پھینکی گئی تھی۔ اسی میں ایک شخص کا لوٹا گر گیا۔ اس نے سقّوں سے کہکر لوٹا نکلوانا چاہا، تو بندوق نکل آئی۔ اور کریم خاں پر قتل کا جرم ثابت ہو گیا۔[۱]

---

[۱] یہ حالات کرنیل سلیمن نے اپنی کتاب "ریمبلس اینڈ ری کولکشنس" کی دوسری جلد میں لکھے ہیں۔

معاملہ کا سراغ کیونکر ملا | حضرت مولانا ابوالکلام آزاد نواب ضمیر[1] مرزا صاحب کی زبانی بیان فرماتے ہیں :-

جب فریزر کی نعش دیوان خانے میں رکھی گئی ۔ رؤساء شہر اور حکام وہاں پہنچے تو ان میں فتح اللہ[2] بیگ خان بھی تھے جو فریزر کی نعش کو دیکھتے ہی اس پر گر پڑے اور بے اختیار چیخ پڑے "ہائے شمس الدین نے تجھے نہ چھوڑا" یہ بات لوگوں نے پکڑ لی اور پھر گو انہوں نے گریز کرنا چاہا مگر سود مند نہ ہوا ۔

باسورتھ سمتھ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ معاملہ کا بنیادی سراغ جان لارنس (بعد ازاں لارڈ لارنس) کی تفتیش و نگرانی سے ہاتھ آیا تھا جو اس زمانے میں پانی پت میں مجسٹریٹ کے طور پر کام کر رہے تھے ۔ وہ ولیم فریزر کے گہرے دوست تھے اور قتل کی اطلاع پاتے ہی گھوڑے پر سوار ہو کر جلد سے جلد دہلی پہنچ گئے تھے ۔

دہلی میں اس وقت دو بڑے انگریز افسر تھے ۔ ولیم فریزر کے بھائی سیمن فریزر اور ٹامس مٹکاف ۔ شمس الدین احمد خاں کے متعلق فتح اللہ بیگ خان کی زبان سے جو الفاظ بے اختیار نکل گئے تھے ، انہیں ٹامس مٹکاف نے تو اس وجہ سے چنداں اہمیت نہ دی کہ فتح اللہ بیگ خان اور شمس الدین احمد خاں کی دشمنی کا خاص و عام کو علم تھا ۔ لیکن جان لارنس کے دل میں یہ الفاظ پیوست ہو گئے اور انہوں نے اسی جانب تحقیقات

---

[1] نواب ضمیر الدین احمد خاں عرف ضمیر مرزا ابن نواب علاء الدین احمد خاں

[2] فتح اللہ بیگ خاں ابن محمد بخش ابن شرف الدولہ قاسم جان جسے لارڈ لارنس کے سوانح نگار باسورتھ سمتھ نے فتح خاں لکھا ہے یہ شمس الدین احمد خاں کا ابن عم تھا ، کہا جاتا ہے ۔ کہ دونوں کے درمیان رنجش کی ابتدا ایک گھوڑے کے متعلق مذاق سے ہوئی ۔ اس کے بعد عداوت انتہا کو پہنچ گئی ۔

[3] لائیف آف لارڈ لارنس مصنفہ باسورتھ سمتھ جلد اول صفحہ (۵۰۷-۴۸)

شروع کر دی۔ جاگیر لوہارو کے انتظام و تصرف کے بارے میں ولیم فریزر اور شمس الدین احمد خاں کے اختلاف کا واقعہ سن کر شبہ اور بھی قوی ہو گیا چنانچہ جان لارنس سیمن فریزر کے ساتھ تلاشی کے ارادے سے شمس الدین احمد خان کے دہلی والے مکان پر پہنچے۔ فریزر تو مکان کے اندر داخل ہو گئے لیکن لارنس صحن ہی میں رہے۔ وہاں ایک ٹرنگ گھوڑا بندھا ہوا تھا جو بظاہر تندرست معلوم ہوتا تھا لیکن اردلی نے اسے بیمار ظاہر کیا۔ لارنس کی نظر اس کے سموں پر پڑی تو نعلوں کی میخیں خلاف معمول معلوم ہوئیں۔ اس پر دفعتہً یاد آگیا کہ انگلستان کی روایات قدیمہ کا ایک ڈاکو ڈِک ٹرپن اپنے گھوڑے کے نعل اُلٹے لگوایا کرتا تھا تاکہ لوٹ مار کے بعد اس کا سراغ نہ مل سکے۔ پھر دیکھا کہ گھوڑے کے پاس ہی زین کے نیچے دانے کا توبڑا پڑا ہے۔ اسے اٹھا کر گھوڑے کے منہ کو لگایا تو وہ تندرست جانوروں کی طرح دانہ کھانے لگا۔ سُراغرسانوں نے گھوڑے کے سموں کی پیمایش کر کے بتا دیا کہ یہی گھوڑا تھا جس پر ولیم فریزر کا قاتل سوار ہو کر بھاگا تھا۔

سیمن فریزر کو پانی کے ایک ڈول سے کاغذ کے چند پرزے مل گئے۔ جن کی سیاہی دُھل چکی تھی لیکن کیمیاوی اجزاء کے استعمال سے حروف روشن ہو گئے۔ اُن پرزوں کو جوڑا گیا تو فارسی زبان میں یہ عبارت تھی:

> تم خوب جانتے ہو کہ میں نے تمہیں دہلی کس غرض سے بھیجا ہے۔ میں بار بار کہہ چکا ہوں کہ میرے لئے کتے خریدنا کس قدر ضروری ہے۔ اگر اب تک کتے نہیں خریدے تو بلا توقف یہ کام انجام دے دو۔

اس عبارت سے سمجھا گیا کہ "کتوں کی خریداری" کا اشارہ ولیم فریزر کے قتل کی طرف ہے۔ اس بناء پر نواب کے ملازم کو جس کا نام باسورتھ سمتھ نے وسائل خان[1] ...

---

[1] معلوم نہیں باسورتھ سمتھ نے کس بناء پر بیان کردہ قاتل کا نام وسائل خان لکھا۔ صحیح یہی ہے کہ اس کا نام کریم خان تھا۔ اس کی تصدیق غالب کے بیان سے بھی ہوتی ہے۔ فارسی مکاتیب میں ایک جگہ لکھتے ہیں۔ "مرزبان میوات مانند کریم خاں سرہنگ خویش بحلق آدیخته شد و برا ثرش بعدم آباد رفت" (کلیات نثر فارسی صفحہ ۶۳)

بتایا ہے گرفتار کر لیا گیا اور نواب کو پیغام بھیج کر دہلی بلا لیا گیا۔

شمس الدین احمد خاں کی گرفتاری

نواب امیر الدین احمد خاں مرحوم فرماتے تھے کہ جب دہلی سے شمس الدین احمد خاں کی طلبی ہوئی اور معلوم ہوا کہ انکے خلاف واقعہ قتل میں انگیخت کا شبہ قوی ہو چکا ہے تو خاندان کے تمام آدمیوں نے دہلی جانے کی مخالفت کی۔ ان کی رائے تھی کہ راتوں رات نکلکر سکھوں کے علاقہ میں پہنچ جائیں۔ نواب احمد بخش خاں کے زمانے کا ایک بوڑھا سانڈنی سوار بڑا وفادار تھا۔ وہ آیا اور کہنے لگا کہ میری سانڈنی سو کوس سے ادھر دم لینے والی نہیں۔ میرے کپڑے پہن لیجئے اور ہمیانی کمر سے باندھ کر نکل چلئے۔ فرنگیوں پر بھروسا نہ کیجئے وہ کبھی نہ چھوڑیں گے۔"

لیکن شمس الدین احمد خاں کو اپنے خاندان اور امیرانہ علائق کا غرہ تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ میرے خلاف کچھ ہونے والا نہیں۔ دس سوار ساتھ لے کر پالکی میں دہلی روانہ ہو گئے۔ جب شہر کے قریب پہنچے تو ایک سوار کو آگے بھجوا دیا۔ ایجنٹ اور حکام موقع پر موجود تھے۔ کرنیل سکنر نے جس کی ان سے گہری دوستی تھی آگے بڑھکر کہا کہ "نواب صاحب ہتھیار حوالے کر دیجئے اور صاحب کلاں بہادر (ایجنٹ) پر بھروسا رکھئے۔ یہ آپ کے لئے جو کچھ کر سکیں گے کریں گے" نواب نے تلوار حوالے کر دی۔ اسکے بعد مجسٹریٹ آگے بڑھا اور اس نے کہا "آپ سرکار کے حکم سے گرفتار کئے جاتے ہیں اس وقت سے اپنے کو قیدی تصور کیجئے"۔ اب نواب کی آنکھیں کھلیں اور اقارب و متوسلین کے مشورے یاد آئے۔ لیکن وقت نکل چکا تھا اور بچ نکلنے کی سب راہیں بند تھیں۔ جب موت سامنے آگئی تو سپاہی زادہ تھا جوانمردانہ اس کیلئے تیار ہو گیا۔

پھانسی کا حکم

اینا کو بریلی میں یہ اطلاع ملی تو وہ سلطانی گواہ بن گیا اور اس نے نواب کی شرکت و انگیخت کے متعلق گواہی دی۔ کریم خاں کو یا باسورتھ سمنھ کے بیان کے مطابق وسائل خان کو پہلے پھانسی مل گئی۔ بعد ازاں نواب کیلئے بھی پھانسی کا حکم ہو گیا

اور اکتوبر ۱۸۳۵ء میں انہیں کشمیری دروازہ کے باہر نو سو فوجیوں کے پہرے میں پھانسی دے دی گئی۔ میت کو انکے خسر مرزا مغل بیگ نے قدم شریف میں دفن کیا۔ ریاست ضبط کر لی گئی۔

کہتے ہیں نواب نے بڑی مردانگی سے جان دی۔ پہلے سبز لباس پہنا لیکن وہ لباس اتروا دیا گیا تو سفید کپڑے پہن لیے۔ نواب ضمیر مرزا کی زبانی معلوم ہوا کہ جب پھانسی کے لئے لے جا رہے تھے تو راستے میں ایک کنجڑے کی دکان پر کسیرو دیکھے۔ جو افسر پالکی کے ساتھ تھا اس سے کہا "میرا جی چاہتا ہے کسیرو کھاؤں"۔ اس نے پالکی رکوائی اور کسیرو خرید کر سامنے رکھ دیئے۔ جب پالکی چلی تو یہ کھاتے جاتے تھے اور چھلکے باہر پھینکتے جاتے تھے۔ اس واقعہ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ نواب نے موت کا مردانہ وار مقابلہ کیا۔ پھانسی پر لٹکنے کے بعد ان کی لاش قبلہ رخ ہو گئی۔ عام لوگوں نے اسے نواب کی بے گناہی کا ثبوت قرار دیا۔ کہا جاتا ہے۔ کہ ان کی قبر مدت تک زیارت گاہ عوام رہی[1]

---

[1] باسورتھ سمتھ نے لکھا ہے کہ اینا غیر معمولی قوت کا آدمی تھا اور بڑا تیز بھاگتا تھا سلطانی گواہ بن جانے کے بعد اس نے بیان دیا کہ نواب نے مجھے اس غرض سے اپنے مقرر کردہ آدمی کے ساتھ کر دیا تھا کہ اگر اس کا وار خطا جائے تو تم فوراً وار کر کے فریزر کا خاتمہ کر ڈالنا جب فریزر مارا گیا تو اینا ایک رات دن میں نوے میل کا فاصلہ پیدل طے کر کے فیروزپور جھرکہ پہنچ گیا اور سارے حالات سنا دیئے۔ وہیں اسے معلوم ہوا کہ نواب اینا کے خاتمہ کا فیصلہ کر چکا ہے۔ وہ دوبارہ بھاگا اور چھپ چھپا کر بچ نکلا۔ کرنیل سکنر نے اس کا سراغ لگایا۔

پنجاب گورنمنٹ کے پرانے ریکارڈوں میں فریزر کے قتل کے متعلق بھی کاغذات بھی موجود ہیں۔ ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ انیا میو کے بھائی اور ایک دوست نے خود دہلی پہنچ کر ذمہ دار افسروں سے کہا تھا کہ اگر اینا کی حفاظت کا ذمہ اٹھایا جائے تو وہ سارے حالات بتانے کیلئے تیار ہے حفاظت کا یقین دلایا گیا لیکن اینا اس وقت نہ آیا۔ غالباً اسے نواب کی طرف سے گراں قدر انعام کی امید تھی۔

ممکن ہے نواب نے یا ان کے ملازموں نے اینا کی اس سازش کی اطلاع پا کر اسے قتل کر ڈالنے کی کوشش کی ہو بہر حال آج اس میں شبہ نہیں کہ ولیم فریزر کے قتل میں نواب کی شرکت کا ثبوت اینا کے بیان یا نواب اور فریزر کی کشیدگی کے سوا کچھ نہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد فرماتے ہیں :- (بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۳ پر)

شمس الدین احمد خاں کے نرینہ اولاد نہ تھی صرف لڑکیاں تھیں، جنکی شادیاں بعد میں ہوئیں۔

نواب احمد بخش خاں کے دوسرے لڑکے نواب امین الدین احمد خاں رئیس لوہارو قرار پائے ان کے انتقال کے بعد ان کے صاحبزادے نواب علاء الدین احمد خاں والی لوہارو بنے پھر نواب سر امیر الدین مرحوم مسند نشین ہوئے، اب اُن کے پوتے فرمانروا ہیں۔

بحالی ریاست کیلئے چارہ جوئی

نواب شمس الدین احمد خاں پھانسی پا گئے اور فیروز پور جھرکہ کی جاگیر ضبط ہو گئی تو نواب امین الدین احمد خاں نے اُسکے خلاف بجا اعتراض اٹھایا تھا کہ یہ جاگیر نواب احمد بخش مرحوم کو دوامی ملی تھی، شمس الدین احمد خاں نواب مرحوم کے فرزند اکبر ہونے کی وجہ سے جاگیر کے مالک بنے اور نواب مرحوم نے حکومت کو بتا کر شمس الدین احمد خاں کی وفات پر یا دوسرے اسباب پیش آجانے پر مجھے (امین الدین احمد خاں) وارث مقرر کیا تھا، نیز شمس الدین احمد خاں کو قتل کے جرم میں پھانسی کی سزا ملی تھی، انہوں نے بغاوت نہیں کی تھی جس کی بناء پر دوامی خاندانی جاگیر کی ضبطی جائز متصور ہو۔ ۲۱ مئی ۱۸۳۶ء کے "بمبئے کوریئر" میں

(بقیہ حاشیہ متعلقہ صفحہ ۵۲) نند کمار کے بعد یہ دوسری پھانسی تھی جو ایک ہندوستانی رئیس کیلئے انگریزی قانون کو تجویز کرنی پڑی چونکہ شمالی ہند میں اس وقت تک کوئی واقعہ ایسا نہیں ہوا تھا اسلئے حکومت کو غیر معمولی احتیاطوں سے کام لینا پڑا۔ کلکتہ سے ایجنٹ کو لکھا گیا کہ اس بارے میں شاہ دہلی سے ایک فرمان حاصل کرنا چاہیئے نیز علماء و ثقات شہر کا ایک محضر تیار کرانا چاہیئے کہ احکام شرع کی رو سے بھی فریزر کا قصاص ضروری ہے اور اس باب میں انگریزی فیصلہ فیصلہ شرع کے خلاف نہیں ہے۔

مولوی رشید الدین کے مکاتیب کا جو قلمی مجموعہ میرے کتب خانہ میں ہے اس کی ایک تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ ایجنسی کے دفتر انشاء نے ایک تحریر تیار کی تھی جس میں کتب فقہ کی وہ تصریحات نقل کر دی تھیں جو ذمی کے قصاص کے بارے میں ہیں اور صورت یہ بنائی تھی کہ فریزر ذمیوں میں داخل تھے۔ اس کے مسلم قاتل اور محرک قتل سے قصاص لینا واجب ہے بادشاہ نے بڑی کوشش کر کے بعض علماء کو جو قلعہ سے وابستہ ہے اس پر آمادہ کیا کہ اس تحریر پر دستخط کر دیں اور اس محضر کی بناء پر خود بھی ایک شقہ لکھ کر ایجنٹ کے حوالے کر دیا۔ یہ شقہ اور محضر تمام ملک میں شائع کیا گیا تھا۔ اور ریزیڈنٹوں اور پولیٹکل ایجنٹوں کے ذریعہ تمام ریاستوں کے درباروں میں پہنچایا گیا تھا۔

میں اس دعوے کی پوری کیفیت درج ہے، جو اقتباساً ۱۲ مئی ۱۹۳۹ء کے "ٹائمز آف انڈیا" میں شائع ہوئی۔ لیکن سرکارِ انگلشیہ نے اس دعوے کو منظور نہ کیا اور فیروز پور جھرکہ کی ریاست خاندان لوہارو سے ہمیشہ کے لئے چھن گئی۔

لوہارو کے متعلق بھی جھگڑوں کا سلسلہ تادیر قائم رہا۔ پہلے مزارعوں نے نواب امین الدین احمد خاں کو قبضہ دلانے کی مخالفت کی۔ پھر ریاست الور کی طرف سے دعوے دائر ہوگیا کہ لوہارو ریاست مذکورہ کا حصہ ہے۔ اکتوبر ۱۸۴۷ء میں ضیاء الدین احمد خاں نے اپنے حصے کا دعویٰ دائر کر دیا۔ جس کا فیصلہ یہ ہوا کہ ریاست تقسیم نہیں ہو سکتی البتہ حصے کا روپیہ ملتا رہے گا۔ پھر یہ جھگڑا چلا کہ روپیہ کم ملتا ہے اس پر حکم ہوا کہ بارہ ہزار کے بجائے اٹھارہ ہزار ملا کریں۔ اس کے خلاف نواب امین الدین احمد خاں نے اپیل کی جو مسترد ہو گئی۔ پھر ادائے زر کے طریقے کے متعلق اختلاف پیدا ہو گیا۔ ۱۸۵۶ء میں ضیاء الدین احمد خاں نے بقایا رقم کے بارے میں ایک دعویٰ دائر کیا جس کا سلسلہ غالباً پانچ چھ برس تک جاری رہا۔ اس باب میں تفصیلات پیشِ نظر موضوع سے خارج ہیں۔

لوہارو خاندان کے افراد نواب ضیاء الدین احمد خاں کے صاحبزادوں میں سے شہاب الدین احمد خاں ثاقب اور سعید الدین احمد خاں طالب کے متعلق زیادہ حالات معلوم ہیں۔ اول الذکر کے دو صاحبزادے مشہور ہوئے، شجاع الدین احمد خاں تاباںؔ اور سراج الدین احمد خاں سائلؔ۔ دونوں شاعر تھے۔ سائل صاحب نے زیادہ شہرت پائی ۱۹۴۳ء میں فوت ہوئے۔ سعید الدین احمد خاں طالب بھی بڑے خوش ذوق شاعر اور ادیب تھے۔

امین الدین احمد خاں، ضیاء الدین احمد خاں، علاء الدین احمد خاں اور شہاب الدین احمد خاں کے ساتھ غالب کے تعلقات آخر دم تک خوشگوار رہے۔ یہ لوگ بھی اس تاجدارِ اقلیمِ سخنوری کے ساتھ گہری عقیدت رکھتے تھے۔ سب کے نام

غالبؔ کے مکاتیب موجود ہیں۔ ایک مکتوب نواب سر امیر الدین احمد خاں کے نام بھی ہے جو غالبؔ کی وفات کے وقت غالباً آٹھ برس کے تھے[1]۔ ضیاؤ الدین احمد خاں اور علاؤ الدین احمد خاں دونوں فارسی اور اُردو کے شاعر تھے۔ اول الذکر فارسی میں نیرؔ اور اردو میں رخشاںؔ تخلص فرماتے تھے۔ آخر الذکر کا تخلص پہلے نسیمیؔ تھا بعد ازاں علائیؔ ہو گیا۔ غالبؔ نے عارفؔ کے مرثیہ میں فرمایا ہے۔

هم سے تمہیں نفرت سہی نیرؔ سے لڑائی
بچوں کا بھی دیکھا نہ تماشا کوئی دن اور

یہاں نیرؔ سے مراد نواب ضیاؤ الدین احمد خاں ہیں۔ ایک اور غزل کے مقطع میں فرماتے ہیں:۔

ہم سے غالبؔ یہ علائیؔ نے غزل لکھوائی
ایک بیداد گرِ رنج فزا اور سہی

علائیؔ سے مراد نواب علاؤ الدین احمد خاں ہیں۔ غالبؔ نے نیرؔ اور علائیؔ کو اردو اور فارسی میں اپنی جانشینی کی سند عطا کی تھی۔ فارسی کلیات میں نواب ضیاؤ الدین احمد خاں کے لئے ایک قصیدہ موجود ہے جس میں فرماتے ہیں:

منم خزینۂ راز و در خزینۂ راز ضیائے دین محمد کہیں برادر من
بہ دین و دانش و دولت یگانۂ آفاق بہ عمر کہتر و از روئے رتبہ مہتر من

بہ مہر دل بہ برادر دہم نہ لیکن ہم
کہ پور خویش بود دلستان و دلبر من

---

[1] نواب مرحوم فرماتے تھے کہ اردوئے معلےٰ چھپ رہی تھی۔ کسی نے کہا کہ تم بھی اپنے نام ایک خط لکھوا لو۔ چنانچہ میں نے جا کر عرض کیا۔ کہ "دادا جان! میرے نام بھی ایک خط لکھ دیجئے" اس پر یہ خط لکھا گیا۔

غالب پر مخبری کا شبہ خاندان لوہارو کا صرف ایک فرد ہے جس کے متعلق غالب کی تحریرات میں کسی مقام پر بھی کوئی کلمہ خیر نہیں ملتا اور وہ نواب شمس الدین احمد خاں ہیں۔ جو تفصیلات اوپر پیش کی جا چکی ہیں۔ ان سے صاف ظاہر ہے کہ شمس الدین احمد خاں سے تنہا غالب ہی آزردہ نہ تھے بلکہ سارا خاندان ناراض تھا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ نواب کی گرفتاری کے سلسلے میں غالب بھی متہم ہوئے یعنی دہلی میں عام طور پر مشہور ہو گیا کہ غالب نے مخبری کر کے نواب کو پکڑوایا ہے۔ شمس الدین احمد خاں کے ساتھ دیرینہ نزاع و عداوت کے علاوہ اس شبہ کی دو وجہیں اور ہوئیں۔ اول یہ کہ ولیم فریزر غالب کے نہایت عزیز دوست تھے۔ دوسرے اس زمانے میں شہر کے مجسٹریٹ فریسکاٹ ٹامس مٹکاف صاحب تھے ان کے ہاں بھی غالب کی آمدورفت تھی۔ اتفاق سے انہی دنوں دو ساہوکاروں نے غالب نے خلاف زرِ قرض کی ڈگریاں لے رکھی تھیں۔ اس زمانے میں اونچے طبقے کے آدمیوں کو قرضے کی ڈگریوں کے سلسلے میں گھر کے اندر نہیں بلکہ صرف باہر گرفتار کیا جا سکتا تھا۔ اس لئے غالب گرفتاری سے بچنے کی خاطر سارا دن گھر کے اندر گزارتے تھے اور گھڑی دو گھڑی رات گئے پر باہر نکلا کرتے تھے۔ ان شبینہ سیروں میں وہ فریسکاٹ صاحب سے بھی ملتے رہے۔ لوگوں کو شبہ ہوا کہ رات کے وقت جا کر خفیہ خفیہ شمس الدین احمد خاں کے خلاف خبریں فراہم کر کے مجسٹریٹ کو پہنچاتے ہیں۔ غالب نے خود یہ سارے حالات ایک خط میں شیخ امام بخش ناسخ کو لکھے ہیں :-

مجسٹریٹ بہادر شہر کہ با من سابقۂ معرفتے و علاقۂ مودتے داشت دراں انزوا گفتہ شدم (یعنی مقروضیت کے سلسلے میں گرفتاری کے خوف سے خانہ نشینی) گاہ گاہ بہ نزدِ وے رفتمے و نفسے چند خوش گزاردمے۔ چوں ایں واقعہ (فریزر کا قتل) رو داد (مجسٹریٹ) مرا در پژوہش کار و دخل اسرار با خود انباز ساختے۔ تاآں شد کہ والی فیروزپور جھرکہ مجرم قرار یافت و بہ حکم سرکار با تنے چند از خاصان

خود اسیر شد۔ چوں میانہ من و رے (شمس الدین احمد خاں) ناسازگاری بود و مردم شہر آں را مے دانستند ہمگی ور من افتادند و گرفتاری آں کافر نعمت را در کشش بہ گردن من بستند۔

یہ بھی ممکن ہے کہ غالب نے واقعی مخبری کی ہو۔ اوپر کی تحریر کے انداز سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ شمس الدین احمد خاں کے حق میں نہ تھے، اور نواب کی گرفتاری کے پورے ذمہ دار ہوں یا نہ ہوں لیکن ان کا دامن اس باب میں کاملاً پاک نہ تھا۔ خود واقعہ قتل کی نسبت لکھتے ہیں:

یکے از ستمگران ناخدا ترس کہ بہ عذاب ابدی گرفتار باد ولیم فریزر بہادر کہ ریزیڈنٹ دہلی و غالب مغلوب را مربی بود در شب تاریک بہ ضرب تفنگ کشت دمراغم مرگ پدر تازہ گشت۔

اسی زمانے کی ایک غزل کے مقطع میں فرماتے ہیں:

غالب ستم نگر کہ چو ولیم فریزرے

زنیساں بہ چیرہ دستی اعدا شود ہلاک

نواب احمد بخش خاں کے انتقال کی خبر سن کر شمس الدین احمد خاں کی متوقع روش کا اظہار ان لفظوں میں کرتے ہیں۔

آہ ازاں کہ چراغ روشن ایں دودماں مرد و شبستان آرزو ہا تیرہ و تار شد۔۔۔ ناکساں اٹل رونق بازار خواہد بود و فرمایگاں را گرمی ہنگامہ زدہ کہ اگر ہمی الذہم باشد پراگندہ چند گرد آیند و دولت روے گرداند و آسودگی برخیزد۔

یہ ۱۸۲۷ء کی تحریر ہے جو ۱۸۳۵ء میں حرفاً حرفاً پوری ہوئی۔

ولیم فریزر نے ۱۸۳۴ء میں نواب شمس الدین احمد خاں کو کلکتہ بھیجا تھا۔ تو غالب نے اپنے کلکتہ کے دوستوں کے نام نہایت محبت بھرے سفارشی خط لکھے، جو کلیات نثر فارسی کے مجموعہ مکاتیب میں شامل ہیں۔

نواب احمد بخش خاں مرحوم کے ایک عم زاد بھائی میرزا قدرت اللہ بیگ تھے۔ ان

کے ساتھ بھی غالب کے تعلقات بہت خوشگوار تھے۔ میرزا قدرت بیگ کے دو بیٹے تھے۔ میرزا معین الدین حسین خاں اور میرزا محمد حسین خاں۔ سیف الحق سیاح کے نام کے دو خطوں میں ان کا بھی ذکر آیا ہے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں:

ہاں صاحب! برادر بہ جاں برابر میرزا معین الدین حسین خاں بہادر کو میرا سلام کہنا اور کہنا کہ بھائی ابھی دیکھنے کو بہت چاہتا ہے۔

دوسری جگہ لکھتے ہیں:۔

میرزا معین الدین حسین خاں اور میرزا محمد حسین خاں یہ دونوں بیٹے ہیں نواب قدرت اللہ بیگ خاں کے اور قدرت اللہ بیگ خاں ابن عم تھے نواب احمد بخش خاں کے اور معین الدین حسین خاں کی بہن منسوب ہے بھائی ضیاء الدین احمد خاں سے۔

میرزا معین الدین حسین خاں کا مرتب کیا ہوا ایک روزنامچۂ غدر خواجہ حسن نظامی صاحب کی کوشش سے شائع ہو چکا ہے۔

تاہل کی زندگی کے متعلق غالب کے بعض بیانات

غالب کی تحریرات میں تاہل کی زندگی کے متعلق بعض ایسی چیزیں ہیں جن سے ممکن ہے شبہ پیدا ہو کہ وہ اپنی بیگم سے خوش نہ تھے یا تاہل کو ناپسند کرتے تھے۔ مثلاً ایک مقام پر انہوں نے شادی کو حکم "حبس دوام" سے تعبیر کیا ہے اور بیوی کو "بیڑی" قرار دیا ہے۔ میر مہدی مجروح نے وبا کے متعلق پوچھا تو جواب دیا کہ جب "ایک چھیاسٹھ برس کا بڈھا اور چونسٹھ برس کی بڑھیا نہ مری تو کیوں کر سمجھا جائے کہ وبا تھی "تف برین وبا"۔ امراؤ سنگھ کی دوسری بیوی کے انتقال پر تفتہ کو جو خط لکھا ہے۔ اس میں بھی ایسے الفاظ ہیں جن سے مترشح ہوتا ہے کہ تاہل کی قید سے نجات پانے کے بڑے آرزومند تھے۔ اس خط کے آخر میں حکیم سنائی کے حدیقہ میں سے بھی بعض اشعار نقل کئے ہیں۔

"مسدحلبی" میں ان کا ایک قطعہ ہے:

گیرکہ در روزِ حشر چوں تو بہ بینی — بر سر و در رخ نہند تیرہ نہنبین

لیک نباشد درآں مضیق مصیبت — در طلبِ نان و جامہ کشمکشِ از زن

لیک نباشد درآں مقام صعوبت — شورِ تقاضائے نار و لے مہاجن

اُن کی ایک رُباعی ہے:

اے آنکہ براہ کعبہ روے داری — دانم کہ گزیدہ آرزوے داری

زیں گونہ کہ تند مے خرامی دانم — در خانہ زنے ستیزہ خوے داری

ایک قطعہ میں فرماتے ہیں:

بہ آدم زن، بہ شیطاں طوقِ لعنت — سپردند از رہِ تکریم و تذلیل

ولیکن در اسیری طوقِ آدم — گراں تر آمد از طوقِ عزازیل

ایک اور رباعی میں لکھتے ہیں:۔

آں مرد کہ زن گرفت دانا نبود — از غصہ فراغتش ہمانا نبود

دارد بہ جہاں خانہ و زاں نیست گزیر — نازم بخدا چرا توانا نبود

یہ تمام شوخ گفتاریاں اس خیال کے لیے تقویت کا باعث سمجھی جا سکتی ہیں کہ غالب تاہل کی زندگی سے نفور تھے۔ یا بیگم کے ساتھ ناسازگاری کے باعث تاہل ان کے لیے مصیبت بن گیا تھا اور اس مصیبت کا اظہار مختلف صورتوں میں کرتے ہیں لیکن یہ خیال حقیقت کے بالکل خلاف ہے۔ نظم و نثر کے تمام مندرجہ بالا کرشمے غالب کی طبعی شوخی، فطری مزاج اور بذلہ سنجی کا نتیجہ ہیں۔ جو کچھ ان کے جی میں آتا تھا بے تکلف کہہ دیتے تھے۔ بعض مذہبی امور کے متعلق بھی ان کے لطیفے مشہور ہیں حالانکہ انکے دل میں مذہب کا انتہائی احترام موجود تھا۔

بیگم سے محبت واقعہ یہ ہے کہ غالب کو اپنی بیوی سے بڑی محبت تھی۔ بیوی بھی شوہر کی راحت و آسایش پر اپنی جان قربان کرتی تھی۔ اگرچہ دونوں کے طرزِ زندگی میں نمایاں

فرق تھا۔ غالب فطرتاً رند تھے، بیگم بے حد پرہیزگار اور عبادت گزار خاتون تھیں۔
خواجہ حالی نے لکھا ہے کہ بیگم نے از رہ کمال اتقا اپنے کھانے پینے کے برتن الگ
کر لئے تھے اور معلوم ہے کہ غالب کم از کم شرب و نوش کے باب میں متقی نہ تھے۔
اس کے باوجود طرفین میں گہری محبت آخری دم تک قائم رہی۔

فرائض تاہل کی محبت آمیز بجا آوری

خواجہ حالی فرماتے ہیں کہ غالب میں جب تک چلنے پھرنے کی طاقت
رہی، وہ دن میں کم از کم ایک مرتبہ ضرور گھر جاتے اس کی تصدیق غالب
کی مختلف تحریروں سے ہوتی ہے۔ مثلاً میر مہدی مجروح کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

خط لکھ کر بند کر کے آدمی کو دوں گا اور میں گھر جاؤں گا۔ وہاں ایک دالان میں دھوپ آتی
ہے۔ اس میں بیٹھوں گا، ہاتھ منہ دھوؤں گا۔ ایک روٹی کا چھلکا سالن میں بھگو کر کھاؤں گا، بیسن
سے ہاتھ دھوؤں گا پھر اس کے بعد خدا جانے کون آئے گا۔ کیا صحبت رہے گی۔

نواب علاؤ الدین احمد خاں کو لکھتے ہیں:

روٹی کھانے کو باہر کے مکان سے محل سرا میں کہ وہ بہت قریب ہے، جب جاتا ہوں تو ہندوستانی
گھڑی بھر میں دم ٹھہرتا ہے اور یہی حال دیوان خانہ میں آکر ہوتا ہے۔

ایک اور خط میں نواب صاحب ہی کو لکھتے ہیں:

آج جس وقت روٹی کھانے کو گھر جاتا تھا شہاب الدین خان تمہارا خط اور مصری کی ٹھلیا
لے کر آیا میں اس کو لوا کر گھر گیا

میر مہدی مجروح کو لکھتے ہیں: -

لو بھئی اب تم جاؤ، ہو جاؤ میں اپنے گھر میں روٹی کھانے کو جاتا ہوں۔

یہ تمام اقتباسات اس امر کا قاطع ثبوت ہیں کہ وہ دن کا کھانا لازماً گھر میں کھاتے
تھے اور یہ دستور اس وقت بھی قائم رہا جبکہ ان کے لئے چلنا پھرنا خاصا مشکل ہو گیا
تھا اور بقول ان کے گھر پہنچ کر یا گھر سے واپس آکر "ہندوستانی گھڑی بھر میں" دم ٹھہرتا تھا

غالب کی تحریرات میں کوئی مواد ایسا نہیں جس سے تاہل کی زندگی پر پوری روشنی پڑ سکے۔ غالباً اس لئے کہ شرفا اس قسم کے تذکروں کو عام طور پر پسندیدہ نہیں سمجھتے تھے۔ لیکن ان کے فارسی اور اردو مکاتیب میں چند ایسے خطوط موجود ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ جب دہلی سے باہر جاتے تھے تو گھر کا پورا خیال رکھتے اور متواتر خطوط بھیجتے رہتے تھے۔ مثلاً انہوں نے کلکتہ سے راستے جو دلی کو جو خطوط بھیجے ان میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

سہ قطعہ مکتوب ملفوف است۔ یکے بہ جناب مبارز الدولہ نواب حسام الدین حیدر خاں ویکے بہ خدمت جناب مولوی فضل حق صاحب ویکے بغم خانۂ بدتر از ویرانۂ غالب ناکام رسانند۔

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

ایک مکتوبے بے لفافہ در لف خط غم خانہ رسد۔

۱۸۶۰ء میں نواب یوسف علی خاں کے پاس رام پور گئے تھے تو اس زمانے میں خاندانی پنشن بند تھی اور حکومت ہند سے خط و کتابت کر رہے تھے۔ گورنر جنرل کے چیف سیکرٹری نے ان کے کسی خط کا جواب بھیجا جسے بیگم نے حکیم غلام نجف خاں سے کہہ کر بند کا بند رام پور بھجوا دیا۔ حکیم صاحب نے یہ بھی لکھا کہ گھر خط جلد بھیجتے رہا کریں۔ جواب میں لکھتے ہیں:

یہ تم کیا لکھتے ہو گھر میں خط جلد جلد لکھا کرو۔ تم کو جو خط لکھتا ہوں گویا تمہاری استانی کو لکھتا ہوں (یعنی بیگم غالب) کیا تم سے نہیں ہو سکتا کہ جاؤ اور پڑھ کر سناؤ۔ اب ان کو یعنی بیگم کو یہ خیال ہوگا کہ انگریزی خط میں کیا لکھا ہے۔ تم یہ خط میرا ہاتھ میں لئے جاؤ اور حرف بحرف پڑھ کر سناؤ انگریزی خط میں گورنر جنرل کے چیف سکرٹری نے لکھا تھا کہ:

حکم دیا جاتا ہے عرضی دینے والے کو کہ جواب اس عرضی کا نواب گورنر جنرل بعد دریافت کے ارشاد فرمائیں گے۔

حکیم غلام نجف خاں کو یہ بھی لکھتے ہیں کہ لفافہ کھول کر پڑھ کیوں نہ لیا تاکہ گھر والوں کو پریشانی نہ ہوتی۔ اس سے ظاہر ہے کہ غالب بیوی کی ہلکی سی تشویش کو بھی گوارہ نہیں فرماتے تھے۔

رام پور ہی سے ایک اور خط میں حکیم غلام نجف خاں کو لکھتے ہیں :

ظہیر الدین (ابن حکیم غلام نجف خاں) کی دادی (بیگم غالب) کا بہ عارضہ سرفہ و سعال رنجور ہونا۔ کہار نانھ کا مجھ سے خفا ہونا۔ . . . . مطالب معلوم ہوئے . . . . . . اس کی دادی اس موسم میں ہمیشہ اس امراض میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ ایک نسخہ اس کے پاس ماء اللحم کا ہے وہ کھنچوا دو اور ذرا خبر لیتے رہو۔

نواب یوسف علی خاں والی رام پور کے انتقال اور نواب کلب علی خاں کی تخت نشینی کے سلسلے میں غالب اکتوبر ۱۸۶۵ء میں رام پور گئے تو غالباً بیگم کے کہنے کے مطابق حکیم غلام نجف خاں نے ایک خط میں تشویش ظاہر کی تھی کہ شاید مزاج کے مطابق کھانے پینے کی چیزیں نہ ملتی ہوں۔ اس کے جواب میں رقم فرماتے ہیں :۔

تمہارے خط سے معلوم ہوا ہے کہ تم کو میرے کھانے پینے کی طرف سے تشویش ہے۔ خدا کی قسم میں یہاں بہت خوش اور تندرست ہوں . . . . . . یہ خط لے کر تم اپنی دادی (بیگم غالب) کے پاس جاؤ اور یہ خط پڑھ کر سناؤ اور ان سے یہ کہہ دو کہ وہ بات جو میں نے تم سے کہی تھی وہ غلط ہے بے اصل ہے۔

ایک اور مکتوب میں جو رام پور کے سفر کے دوران میں لکھا گیا تھا فرماتے ہیں ،

لڑکوں (باقر علی اور حسین علی ابنائے نواب زین العابدین خاں عارف) کے ہاتھ کے دو خط لکھے ہوئے ان کی دادی کو بھجوا دیئے ہیں۔ تم اس اپنے نام کے خط کو لے کر ڈیوڑھی پر جانا اور استانی جی کو سُنا دینا اور خیر و عافیت کہہ دینا۔

حکیم ظہیر الدین کو ایک خط میں لکھتے ہیں :۔

سنو میاں ظہیر الدین! تم اپنی دادی کے پاس ابھی چلے جاؤ اور ان سے میری اور لڑکوں کی خیر و عافیت کہو اور پوچھو کہ شہاب الدین خاں نے اکتوبر کی تنخواہ کے پچاس روپے پہنچا دیئے یا نہیں۔ اچھا میرا بیٹا یہ دونوں باتیں اپنی دادی سے پوچھ کر جلد مجھ کو لکھیو۔ دیر نہ کیجو۔

یہ تمام اقتباسات اس امر کا ثبوت ہیں کہ غالب نہ محض فرائض تاہل کی بجا آوری ہی میں مستعد تھے بلکہ ان فرائض کو دل لگاؤ اور تعلق سے ادا کرتے تھے لیکن یہ صحیح ہے کہ مالی مشکلات کے ہجوم میں وہ بعض اوقات بہت تنگ دل ہو جاتے تھے۔ اس حالت میں گھبرا کر ایسی باتیں بھی لکھ جاتے تھے جن سے ان کے دلی خیالات و احساسات یا عام طرز زندگی کو کوئی علاقہ نہ تھا، بلکہ انہیں وقتی پریشان خاطری یا جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے طبعی شوخی کا کرشمہ قرار دینا چاہیئے۔ ایسی ہی ان کی یہ تحریر بھی ہے:

بھائی! میرا ذکر سنو۔ ہر شخص کو غم موافق اس کی طبیعت کے ہوتا ہے۔ ایک آ تنہائی سے نفور ہے ایک کو تنہائی منظور ہے۔ تاہل میری موت ہے۔ میں کبھی اس گرفتاری سے خوش نہیں رہا۔ پٹیالے جانے میں میری خوشی اور دولت تھی۔ اگرچہ مجھ کو دولت تنہائی میسر آجاتی، لیکن اس تنہائی چند روزہ اور تجرید مستعار کی کیا خوشی؟ خدا نے اولاد رکھا تھا، شکر بجا لاتا تھا۔ خدا نے میرا شکر منظور نہ کیا۔ یہ بلا بھی قبیلہ داری کی شکل کا نتیجہ ہے یعنی جس لوہے کا طوق (بیگم)، اسی لوہے کی دو ہتھکڑیاں بھی پڑ گئیں (یعنی بیگم کے حقیقی بھانجے زین العابدین خاں کے بچے)

اولاد غالب کا اپنا کوئی بچہ نہ تھا۔ سات بچے پیدا ہوئے لیکن کوئی بھی پندرہ مہینے سے زیادہ زندہ نہ رہا۔ سیف الحق منشی میاں داد خاں سیاح کو لکھتے ہیں:

تمہارے لڑکا پیدا ہونا اور اس کا مر جانا معلوم ہو کر مجھ کو بڑا غم ہوا۔ بھائی! اس داغ کی حقیقت مجھ سے پوچھو کہ بہتر برس کی عمر میں سات بچے پیدا ہوئے لڑکے بھی اور لڑکیاں بھی اور کسی کی عمر پندرہ مہینے سے زیادہ نہ ہوئی۔

جب اپنے ہاں اولاد کی طرف سے مایوسی ہو گئی تو غالب نے اپنی بیوی کے بھانجے

یعنی بنیادی بیگم کے صاحبزادے میرزا زین العابدین خاں عارف کو بیٹا بنا لیا۔ ان سے بے حد محبت کرتے تھے۔ اس لئے بھی کہ رشتے میں عارف بہت قریبی تھے اور اس لئے بھی کہ بڑے خوش فکر شاعر تھے لیکن عارف بھی جوانی کے عالم میں مفارقت کا داغ دے گئے[1]
غالب نے ان کی وفات پر درد بھرا نوحہ لکھا جو ان کی بہترین اردو نظموں میں ہے:

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستا کوئی دن اور — تنہا گئے کیوں اب رہو تنہا کوئی دن اور

آئے ہو کل اور آج ہی کہتے ہو کہ جاؤں — مانا کہ ہمیشہ نہیں اچھا کوئی دن اور

جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے — کیا خوب قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور

ہاں اے فلک پیر جواں تھا ابھی عارف — کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

تم ماہ شب چار دہم تھے مرے گھر کے — پھر کیوں نہ رہا گھر کا وہ نقشا کوئی دن اور

تم ایسے کہاں کے تھے کھرے داد و ستد کے — کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور

مجھ سے تمہیں نفرت سہی نیر سے لڑائی — بچوں کا بھی دیکھا نہ تماشا کوئی دن اور

گزری نہ بہر حال یہ مدت خوش و ناخوش — کرنا تھا جواں مرگ گزارا کوئی دن اور

ناداں ہو جو کہتے ہو کہ کیوں جیتے ہیں غالب
قسمت میں ہے مرنے کی تمنا کوئی دن اور

---

[1] عارف کا انتقال جمادی الثانی ۱۲۶۸ھ (اپریل ۱۸۵۲ء) میں ہوا۔ ان کے شاگرد ایلگزینڈر ہیدرلے نے ایک درد انگیز مرثیہ کہا تھا جس کا مصرعہ تاریخ یہ ہے۔ ع عارف پسندہ رحمت حق ہو چکا ہے آج
"سر یاس" کے تخرجہ سے تاریخ نکلتی ہے۔

[2] ایلگزینڈر ہیدرلے ایک فرانسیسی نژاد شخص جیمز ہیدرلے کے لڑکے تھے۔ جیمز نے ایک مسلمان خاتون سے شادی کرکے ہندوستانی معاشرت اختیار کر لی تھی۔ اس سے ایلگزینڈر اور ٹامس پیدا ہوئے۔ ایلگزینڈر بڑے اچھے شاعر تھے۔ آزاد تخلص تھا کبھی کبھی ایگ بھی تخلص کرتے تھے۔ پہلے جھجھر میں تھے پھر الور چلے گئے۔ طب میں بڑی مہارت تھی لوگوں کا علاج مفت کرتے تھے الور ہی میں ۳۲ برس کی عمر میں وفات پائی۔ غالب کے بعض تعات میں ان کا بھی ذکر ہے۔ ان کا دیوان ٹامس ہیدرلے نے چھپوایا تھا۔

غالب نے فارسی میں بھی عارف کی خوش فکری اور اپنی گہری اُلفت و محبت کا اظہار کیا ہے۔ اس کی ابتدا یہ ہے:-

آں پسندیدہ خوے عارف نام ‏ ‏ کہ فرخش شمع دودمانِ من است

آنکہ در بزم قرب و خلوت انس ‏ ‏ غمگسار و مزاجدانِ من است

پھر عارف کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں:-

ہم ز کلک تو خوش دلم خوشدل ‏ ‏ کاں نہال ثمر فشانِ من است

سود سرمایۂ کمالِ منی ‏ ‏ سخنت گنج شایگانِ من است

جاے دارد کہ خویش را نازی ‏ ‏ کہ ظہورِ تو در زمانِ من است

جاے دارد کہ خویش را نازم ‏ ‏ کہ فلانے ز پیروانِ من است

جاوداں باش اے کہ در گیتی ‏ ‏ سخنت عمر جاودانِ من است

اے کہ میراث خوارِ من باشی ‏ ‏ اندر اُردو کہ آں زبانِ من است

از معانی ز میسد اُفیاغی ‏ ‏ یاد آں تو ہرچہ آنِ من است

یہاں اتنا اور عرض کر دینا مناسب ہے کہ عارف کی والدہ بنیادی بیگم کے تعلقات اپنے شوہر نواب غلام حسین خاں مسرور سے اچھے نہیں رہے تھے اور نواب نے بیگم کو سات ہزار روپے کی مالیت کا ایک مکان دے کر علیحدہ کر دیا تھا۔ فیروز پور جھرکہ سے انہیں سو روپے پنشن ملتی تھی۔ عارف کی پہلی شادی شمس الدین احمد خاں کی حقیقی بہن نواب بیگم سے ہوئی تھی۔ نواب احمد بخش خاں ان کے ساتھ بیٹوں کا سا سلوک کرتے تھے[1]

دوسری شادی میرزا محمد علی کی صاحبزادی لیتی بیگم عرف نواب دُلہن سے ہوئی عارف کو اس بیوی سے غایت درجہ محبت تھی۔ درد گردہ سے اچانک اُس کا انتقال

---

[1] یہ حالات مجھے پنجاب گورنمنٹ کے اُن پُرانے کاغذات سے معلوم ہوئے جو ریاست لوہارو سے تعلق رکھتے ہیں۔

ہو گیا۔ اس صدمہ جانکاہ سے عارف کے دل پر اتنا گہرا اثر ہوا کہ اسی غم میں گھل گھل کر بیمار پڑ گئے اور ایک روایت کے مطابق چھ ہفتے کے اندر جاں بحق ہو گئے۔ آخری دنوں میں زندگی سے بالکل مایوسی ہو گئی تو اپنے دونوں بچوں باقر علی خاں اور حسین علی خاں کو غالب کے سپرد کر دیا۔

عارف کے بچے | عارف کے انتقال کے بعد غالب اور ان کی بیوی حسین علی خاں کو بیٹا بنا کر اپنے گھر لے آئے۔ جب بنیادی بیگم والدۂ عارف کا انتقال ہو گیا۔ تو باقر علی خاں بھی غالب ہی کے پاس چلے گئے۔ غالب کو ان دونوں سے بڑی محبت تھی۔ خواجہ حالی فرماتے ہیں۔ کہ ان کو کبھی آنکھ سے اوجھل نہ ہونے دیتے۔ اگرچہ خود بےحد تنک مزاج تھے۔ لیکن حسین علی خاں اور باقر علی خاں کے سارے ناز اٹھاتے۔ اور ان کی کسی بات پر خفا نہیں ہوتے۔

منشی ہرگوپال تفتہ کو لکھتے ہیں:-

سنو صاحب! یہ تم جانتے ہو کہ زین العابدین خاں مرحوم میرا فرزند تھا۔ اب اس کے دونوں بچے کہ وہ میرے پوتے ہوتے ہیں میرے پاس آ رہے ہیں اور دم بدم مجھ کو ستاتے ہیں۔ میں تحمل کرتا ہوں۔ خدا گواہ ہے کہ تم کو اپنا فرزند سمجھتا ہوں پس تمہارے نتائج طبع میرے معنوی پوتے ہوئے۔ جب اس عالم کے پوتوں سے کہ مجھے کھانا نہیں کھانے دیتے، مجھ کو دوپہر کو سونے نہیں دیتے۔ ننگے ننگے پاؤں پلنگ پر رکھتے ہیں، کہیں پانی لڑھاتے ہیں، کہیں خاک اڑاتے ہیں۔ میں تنگ نہیں آتا۔ تو ان معنوی پوتوں سے کہ ان میں یہ باتیں نہیں ہیں، کیوں گھبراؤں گا۔

میر مہدی مجروح کو لکھتے ہیں:-

اندر باہر سب روزہ دار ہیں، یہاں تک کہ بڑا لڑکا باقر علی خاں بھی۔ ایک میں اور میرا بیٹا حسین علی خاں روزہ خور ہیں۔ وہی حسین علی خاں جس کا روزمرہ ہے کھلونے منگا دو

میں بھی بجا رجاؤں گا۔"

رام پور کے دونوں سفروں میں دونوں صاحبزادے ساتھ تھے۔ رام پور سے بھیجے ہوئے مکاتیب میں جا بجا ان کا ذکر ہے۔ مثلاً حکیم غلام نجف خاں کو لکھتے ہیں :۔

لڑکے دونوں اچھی طرح ہیں۔ کبھی میرا دل بہلاتے ہیں، کبھی مجھ کو ستاتے ہیں۔ بکریاں، کبوتر، بٹیریں، تکل، کنکوا سب سامان درست۔ چہ فروری کے مہینے میں دو دو روپے دیے، دس دن میں اُٹھا ڈالے۔ پھر پرسوں چھوٹے صاحب آئے (حسین علی خاں) کہ دادا جان کچھ ہم کو قرض حسنہ دو۔ ایک روپیہ دونوں کو قرض حسنہ دیا گیا۔ آج ہمارے مہینہ دور ہے دیکھئے کے بار قرض لیں گے

ایک اور خط میں جو راستے سے لکھا گیا تھا فرماتے ہیں :۔

دونوں برخوردار گھوڑوں پر سوار چل دیئے۔ میں چار گھڑی دن سے ہاپوڑ کی سرائے میں پہنچا۔ دونوں بھائیوں کو بیٹھے ہوئے اور گھوڑوں کو ٹہلتے ہوئے پایا۔ گھڑی بھر دن سے قافلہ آیا۔ میں ہم چھٹانک بھر گھی داغ دیا۔ دو شامی کباب اس میں ڈال دیئے۔ رات ہوگئی تھی شراب پی لی۔ کباب کھائے لڑکوں نے ادھر کی کھچڑی پکوائی۔ خوب گھی ڈال کر آپ بھی کھائی اور سب آدمیوں کو بھی کھلائی۔ یا سے آج تک دونوں بھائیوں میں موافقت ہے آپس کی صلاح مشورے سے کام کرتے ہیں۔ اتنی بات زائد ہے۔ کہ حسین علی منزل پر اُتر کر پاپڑ اور مٹھائی کے کھلونے خرید لاتا ہے اور دونوں بھائی مل کر کھا لیتے ہیں۔

ہاپوڑ سے آگے کے سفر کی کیفیت کے سلسلے میں فرماتے ہیں :۔

دونو گھوڑے کوتل آئے دونو لڑکے رتھ میں سوار آتے ہیں، اب وہ آئے کھانا کھا لیا اور چلے۔ تم اپنی اُستانی (بیگم غالب) کے پاس یہ رقعہ سراسر پڑھ کر سنا دینا۔

ایک اور خط میں رام پور سے نواب علاءالدین احمد خاں کو لکھتے ہیں :۔

آج صبح کے سات بجے باقر علی خاں اور حسین علی خاں معہ چودہ مرغ۔ چھ بڑے آٹھ چھوٹے کے دلی کو روانہ ہوئے۔ دو آدمی میرے ان کے ساتھ تھے۔

باقر علی خاں	باقر علی خاں غالب کی زندگی ہی میں اور غالباً انہی کی سفارش سے الور

میں ملازم ہو گئے تھے۔ ان کی شادی نواب ضیاء الدین احمد خاں کی صاحبزادی معظم زمانی بیگم عرف بگا بیگم سے ہوئی۔

اُردوئے معلّیٰ میں ان کے نام تین خط ہیں۔ پہلے خط میں روزگار کی درستی پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے تسلّی دی ہے۔ کہ ترقی جلد ہو گی۔ آخر میں لکھتے ہیں:۔

تمہاری دادی اچھی ہے۔ تمہارا بھائی اچھی طرح ہے۔ تمہارے گھر میں سب طرح خیر و عافیت ہے۔ تمہاری لڑکی اچھی طرح ہے۔ کبھی روز کبھی دوسرے تیسرے میرے پاس آجاتی ہے۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ شادی اور ملازمت کے بعد باقر علی خاں علیحدہ مکان میں چلے گئے تھے۔ "سبدچین" میں ایک قطعہ ہے۔ جو باقر علی خاں کی بڑی لڑکی محمد سلطان بیگم عرف جندو بیگم کی پیدائش پر لکھا گیا تھا:۔

یہ من ز مقدم فرزند میرزا باقر	سروش تہنیت زیدہ مطالب گفت
چو قصد شد متعلق بہ گفتن تاریخ	طریق تعمیہ ورزید و "جان غالب" گفت

"جانِ غالب" کے اعداد میں "قصد" کے اعداد شامل کئے جائیں تو ۱۲۸۱ھ تاریخ نکلتی ہے۔ غالب جندو بیگم کو بہت پیار کرتے تھے۔ اور انہیں "میرزا جیون بیگ" کے نام سے پکارتے تھے۔

باقر علی خاں شاعر تھے۔ کامل تخلص تھا۔ الور سے ساٹھ روپے ماہوار تنخواہ ملتی تھی لیکن دو تین برس کے بعد ملازمت چھوڑ کر دہلی چلے آئے۔ اور گھوڑوں کی تجارت شروع کر دی۔ یکم جمادی الاوّل ۱۲۹۳ھ (۲۵ مئی ۱۸۷۶ء) کو ساڑھے اٹھائیس برس کی عمر میں وفات پائی۔ نرینہ اولاد کوئی نہ تھی۔ صرف تین صاحبزادیاں چھوڑیں۔ بڑی یعنی محمد سلطان بیگم عرف جندو بیگم کی شادی شہاب الدین احمد خاں ثاقب کے بڑے صاحبزادے شجاع الدین احمد خاں تاباں سے ہوئی۔ دوسری یعنی فاطمہ سلطان بیگم عرف بندو بیگم کی شادی نواب علاؤ الدین خاں کے صاحبزادے میرزا بشیر الدین احمد خاں سے ہوئی

تیسری صاحبزادی رقیہ سلطان بیگم عرف مچھن بیگم کی شادی کرنیل ذوالنور علی احمد سے ہوئی

علی حسین خاں مرزا حسین علی خاں باقر علی خاں سے تین برس چھوٹے تھے۔ غالب کی زندگی میں ان کی نسبت میرزا اکبر علی خاں[1] کی صاحبزادی سے قرار پائی تھی۔ اپنی زندگی کے آخری دنوں میں غالب نواب کلب علی خاں مرحوم کو متواتر شادی کے مصارف کے لئے خط بھیجتے رہے۔ نیز حسین علی خاں کی ملازمت کے لئے درخواستیں کرتے رہے۔ جب قرضخواہوں نے انہیں بہت تنگ کرنا شروع کیا۔ تو شادی کے لئے عطیہ کی گذارش چھوڑ کر صرف ادائے قرض کے لئے روپیہ مانگتے رہے۔ لیکن قرضداری کے عالم وفات پا گئے۔ بعد میں حسین علی خاں کو رام پور میں پچیس روپے کا منصب مل گیا۔ وہ اُردو اور فارسی کے شاعر تھے۔ اُردو میں شاداںؔ اور فارسی میں خیالیؔ تخلص فرماتے تھے۔ ملازمت کے بعد شادی بھی ہو گئی لیکن باقر علی خاں کے انتقال کا اتنا سخت صدمہ ہوا۔ کہ ملازمت چھوڑ کر دہلی چلے آئے۔ اسی وقت سے بیمار رہنے لگے اور یکم شوال ۱۲۹۹ھ (۱۶ ستمبر ۱۸۸۱ء) کو راہگرائے عالم بقا ہوئے۔ وفات کے وقت صرف تیس برس کی عمر تھی۔

متعلقین کا خیال غالبؔ کو آخری ایام میں اپنے متعلقین کا بہت خیال رہتا تھا۔ ان کے پاس کوئی اندوختہ نہ تھا، کوئی جائداد نہ تھی۔ آمدنی کے تمام وسائل صرف زندگی

---

[1] مالک رام صاحب ایم۔ اے نے "ذکر غالب" میں لکھا ہے، کہ میرزا اکبر علی خاں نواب احمد بخش خان کے ایک بھائی میرزا نبی بخش خاں کے پوتے تھے۔ انہوں نے ڈیوڈ آکٹرلونی کی لڑکی سے نکاح کر لیا تھا۔ جو ایک مسلمان عورت مبارک بیگم کے بطن سے تھی۔ اس کا نام مالک رام صاحب کے قول کے مطابق خورشید بیگم اور غالب کے قول کے مطابق حسن جہاں بیگم تھا۔ مبارک بیگم کی بنائی ہوئی ایک مسجد حوض قاضی کے بازار سرکی والاں میں ہے۔

تک کھلے تھے۔ وفات کے بعد نہ خاندانی پنشن کے جاری رہنے کا کوئی امکان تھا۔ نہ رام پور والا وظیفہ قائم رہ سکتا تھا۔ نہ دوسری فتوحات مل سکتی تھیں۔ اس لئے وہ بہت پریشان رہتے تھے۔ نواب امین الدین احمد خاں یہ اسرار لوہارو بلوا رہے تھے۔ انہیں لکھتے ہیں :-

واللہ نہیں آسکتا۔ باللہ نہیں آسکتا۔ دل کی جگہ میرے پہلو میں پتھر بھی تو نہیں۔ دوست نہ سہی دشمن بھی تو نہ ہوں گا۔ محبت نہ سہی عداوت بھی نہ ہوگی۔ آج تم دو نو بھائی (امین الدین احمد خاں اور ضیاء الدین احمد خاں) اس خاندان میں شرف الدولہ اور فخر الدولہ کی جگہ ہو۔ میں تم پدر و تم پولد ہوں۔ میری زوجہ تمہاری بہن، میرے بچے تمہارے بچے ہیں۔ خود جو میری حقیقی بھتیجی ہے، تاکہ علاؤ الدین کی تمہاری اولاد ہے (اس لئے کہ بھتیجی کی شادی الٰہی بخش خاں معروف کے پوتے سے ہوئی تھی) نہ تمہارے واسطے بلکہ ان بیکسوں کے واسطے تمہارا دعا گو ہوں اور تمہاری بھلائی چاہتا ہوں۔ تمنا یہ ہے اور انشاء اللہ تعالیٰ ایسا ہی ہوگا کہ تم جیتے رہو اور میں تم دونوں کے سامنے مر جاؤں تا اگر اس قافلے کو روٹی نہ دو گے تو کپڑا تو دو گے۔ اگر کپڑا بھی نہ دو گے اور بات نہ پوچھو گے تو میری بلا سے۔ میں تو موافق اپنے تصور کے مرتے وقت ان عزیزوں کے غم میں نہ الجھوں گا۔

امراؤ بیگم کی وفات

اب تحقیقی طور پر معلوم ہو چکا ہے کہ امراؤ بیگم غالب کے بعد پورا ایک برس زندہ رہیں اور انہوں نے غالب کی پہلی برسی کے دن (۲ ذی قعدہ ۱۲۸۶ھ کو (مطابق ۴ فروری ۱۸۷۰ء) وفات پائی۔ وفات کے وقت غالب آٹھ سو روپیہ کے مقروض تھے۔ قرض کو ادا کرنے کے لئے بار بار نواب کلب علی خاں سے ناکام التجائیں کر چکے تھے۔ امراؤ بیگم کے لئے پہلی تشویش یہ تھی کہ کسی طرح قرض ادا ہو جائے۔ دوسری تشویش یہ تھی۔ کہ حسین علی خان کی شادی ہو جائے، نیز اسے کہیں ملازمت مل جائے غالب کی وفات پر امراؤ بیگم کی معاش کے تمام دروازے بند ہو گئے تھے۔ نہ سرکاری خاندانی

پنشن باقی تھی۔ نہ رام پور کا وظیفہ باقی تھا۔ اور نہ کہیں سے فتوح مل سکتی تھی۔ بیگم نے سرکاری انگریزی میں درخواست کی کہ غالب کی خاندانی پنشن ان کے بیٹے حسین علی خاں کے نام منتقل ہو جائے۔ لیکن یہ درخواست نامنظور ہو گئی۔ البتہ یہ حکم ہو گیا کہ بیوہ اگر کچہری میں خود حاضر ہو تو اُسے دس روپے ماہوار گزارے کے لئے مل سکتے ہیں۔ نواب الٰہی بخش خاں کی بیٹی، نواب احمد بخش کی بھتیجی اور غالب کی بیوی دس روپے کے لئے خود کچہری میں حاضر ہونے کا ننگ کیونکر گوارا کر سکتی تھی۔ امراؤ بیگم خود اپنے عریضہ (بہ سرکار نواب کلب علی خاں مرحوم) میں فرماتی ہیں:-

جانا میرا کچہری ہرگز نہ ہو گا۔ گو فاقوں سے مر جاؤں، کیا میں اپنے باپ اور چچا اور شوہر کا نام روشن کروں؟ جو عزت و ریاست میرے چچا کی اور حرمت میرے والد کی اور شوہر کی آگے خاص و عام کے تھی۔ حضور پر روشن ہے[1]۔

اس طرح انگریزی پنشن کا معاملہ ختم ہوا۔ نواب کلب علی خاں کی پیشگاہ میں امراؤ بیگم کی طرف سے کئی عرائض پیش ہوئے۔ جن کا مضمون یہ تھا کہ اوّل غالب کا قرض ادا ہو جائے، دوم گزارے کا اطمینان بخش انتظام کر دیا جائے۔ ان میں سے آخری عریضہ پر جو ۲۵ جمادی الاوّل ۱۲۸۶ھ (یکم اکتوبر ۱۸۶۹ء) کو پیش ہوا تھا یہ حکم نافذ ہوا کہ اس باب میں نواب میرزا داغ[2] کو ہدایت دیدی گئی ہیں۔ کیا ہدایات دی گئی تھیں؟ ان کا کچھ علم نہیں ہو سکا۔ لیکن یہ معلوم ہے کہ سرکار رام پور سے امراؤ بیگم کو حسین علی خاں کی ملازمت کے سوا کچھ نہ ملا۔

---

[1] "مکاتیب غالب" مجموعہ رام پور صفحہ ۱۲۱۔

[2] نواب میرزا خاں داغ اس زمانے میں رام پور میں ملازم تھے۔ اور نواب شمس الدین احمد خاں کے ساتھ تعلق کی وجہ سے وہ خاندان لوہارو میں محسوب ہوتے تھے۔

نواب سر امیر الدین احمد خاں مرحوم فرماتے تھے۔ کہ نواب ضیاء الدین احمد خاں نے قرضخواہوں سے کچھ رقم معاف کرا کے باقی رقم اپنے پاس سے ادا کر دی تھی اور امراؤ بیگم کے لئے پچیس روپے یا پچاس روپے ماہوار تو ہارو سے مقرر ہو گئے جو تا دم وفات انہیں باقاعدہ ملتے رہے۔

غالب کے ملازم

اس ضمن میں غالب کے ملازموں کا ذکر بھی مناسب ہے۔ اگرچہ ابتدائی دور کو چھوڑ کر ان کی مالی حالت کبھی بھی اطمینان بخش نہ رہی۔ لیکن امیرانہ ٹھاٹھ آخر دم تک قائم رہا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے پاس ہر دور میں کم از کم تین چار ملازم ضرور رہے۔ خطوں میں کلیان نامی ایک ملازم کا ذکر بار بار آتا ہے۔ جو کہار تھا۔ خط ڈاک میں ڈالنا ہو۔ پارسل بھیجنا ہو، چیزیں لانی ہو، یا کسی کے پاس پیغام بھجوانا ہو۔ کلیان ہی ان تمام کاموں کا مہتمم نظر آتا ہے۔ بعض خطوں میں ایاز نامی ایک ملازم کا ذکر آیا ہے۔ چند خطوں میں کلو داروغہ کا نام دکھائی دیتا ہے مثلاً قربان علی بیگ سالک کو لکھتے ہیں "کلو داروغہ کورنش عرض کرتا ہے" کلو، رامپور کے سفر میں بھی ساتھ تھا۔ حکیم غلام نجف خاں کو لکھتے ہیں :-

میں بھی خوش، لڑکے بھی خوش، کلو اچھا، گیا ہے۔ سقا، مشعلچی، خاکروب سرکار سے متعین ہیں۔ حجام اور دھوبی نوکر رکھ لیا ہے۔

حکیم ظہیر الدین احمد خاں کے نام کے خط میں جعفر بیگ اور وفادار ملازم کے نام آتے ہیں۔ فرماتے ہیں :-

کلو تا تھ ڈیوڑھی پر آ کر جعفر بیگ وفادار وغیرہ کی تنخواہ بانٹ گیا ہے یا نہیں۔

ایک ملازم عنایت اللہ کا تذکرہ حکیم غلام نجف خاں کے نام کے خطوں میں آیا ہے مثلاً:

لڑکے بھی تندرست، آدمی بھی توانا، مگر ہاں ایک عنایت ودمن سے کچھ بیمار ہے خیر اچھا ہو جائیگا۔

ایک اور خط میں فرماتے ہیں :-

میں نے لیٹے لیٹے یہ سطریں لکھیں۔ اب عنایت اللہ کو تمہارے گھر بھیجتا ہوں اور چھپوا منگاتا ہوں کہ پتا وہاں کیا لکھا جاتا ہے۔

نواب علاء الدین احمد خاں کے نام کے ایک خط میں نیاز علی ملازم کا نام آیا ہے فرماتے ہیں:۔

باقر علی خاں اور حسین علی خاں مع ہمراہیان چھ بڑے اور آٹھ چھوٹے کے دلی کو روانہ ہوئے دو آدمی میرے ان کے ساتھ گئے۔ کلو اور لڑکا نیاز علی یعنی ڈیڑھ آدمی میرے پاس ہیں۔

وفادار جس کا تذکرہ اوپر آچکا ہے، ملازمہ تھی۔ ایک خط میں نواب علاء الدین احمد خاں کو لکھتے ہیں:۔

بی وفادار جس کو تم کچھ اور بھائی (نواب امین الدین احمد خاں) خوب جانتے ہیں، اب تمہاری پھوپھی (امراؤ بیگم) نے انہیں "وفادار بیگ" بنا دیا ہے۔ باہر نکلتی ہیں، سودا تو کیا لائیں گی، مگر خلیق اور ملنسار ہیں۔ رستہ چلتوں سے باتیں کرتی پھرتی ہیں۔ جب وہ محل سے نکلیں گی تو ممکن نہیں کہ اطراف نہر کی سیر نہ کریں۔ ممکن نہیں کہ دروازے کے سپاہیوں سے باتیں نہ کریں۔ ممکن نہیں کہ پھول نہ توڑیں اور بی بی کو لے جا کر نہ دکھائیں اور نہ کہیں کہ یہ پھول تمہارے چچا کے بیٹے کی کائی کے ہیں (یعنی یہ پھول تمہارے چچا کے بیٹے کی کیاری کے ہیں)

غدر میں غالب کی تنگ دستی حد سے گزر چکی تھی قلعہ کی تنخواہ بند تھی اور خاندانی پنشن مسدود کوئی ذریعہ معاش باقی نہ تھا۔ زیور لٹ چکا تھا کپڑے بیچ بیچ کر گزارا کرتے تھے۔ لیکن اس حالت میں بھی بیس آدمیوں کی کفالت اپنے ذمے لے رکھی تھی۔ یوسف مرزا کو لکھتے ہیں:

اب خاص اپنا دکھ روتا ہوں۔ ایک بیوی دو بچے تین چار آدمی گھر کے کلو، کلیان، ایاز یہ باہر۔ مداری گئے جو رہ بچے بدستور گویا مداری موجود ہے۔ میاں گھمن گئے مہینے بھر سے آگئے کہ بھوکا مرتا ہوں۔ اچھا بھائی تم بھی رہو۔ ایک پیسے کی آمد نہیں بیس آدمی روٹی کھانے والے موجود

مداری کا ذکر ایک فارسی خط میں بھی آیا ہے۔ غالب فیروز پور جھرکہ گئے تھے تو وہاں کچھ سامان چھوڑ آئے تھے۔ دہلی سے علی بخش خاں کو لکھتے ہیں :-

مداری خاں مے رسد و نامہ اے رساند آنچہ از کالائے نارواے من وہ آنجا باشد بوے سپارند۔

یوسف مرزا کو لکھتے ہیں :

باقر علی خاں اور حسین علی خاں اپنی دادی کے ساتھ ضیاء الدین خاں کی عالدہ کے پاس قطب صاحب گئے ہوتے ہیں۔ ایاز اور نیاز علی ان کے ساتھ ہیں۔ دو بندگیاں ایک وفا اور دو آفتاب ملتوی دو اکلو اور کالیان کی بندگیاں پہنچیں۔

ایک اور خط میں لکھتے ہیں :

قرض دینے والا میرا ایک مختار، دہ سو دو ماہ برماہ لیا چاہے۔ محل بیں قسط اس کو دینی پڑے۔ انکم ٹیکس جدا، چوکیدار جدا، سود جدا، محل جدا، بی بی جدا، بچے جدا، شاگرد پیشہ جدا، آمد وہی ایک سو باسٹھ۔

اس خط سے بھی ظاہر ہے کہ نوکروں کی خاصی فراوانی تھی۔

غالب باوجود قلت و مع فراوانی مصارف ملازموں کی تنخواہیں ادا کرنے میں بڑا اہتمام فرماتے تھے چنانچہ رامپور گئے تو پوچھتے ہیں کہ کلدار ناتھ نے فلاں فلاں کی تنخواہ ادا کر دی یا نہیں حکیم غلام نجف خاں کو لکھتے ہیں :

ہاں بھائی گھر میں پوچھ لینا کہ کلدار ناتھ نے اندر باہر کی تنخواہ بانٹ دی ؟ میں نے تو وفادار اور علاں خوردی تک کی بھی تنخواہ بھیج دی ہے۔

رندی و آزاد مشربی

یہ عرض کرنا تحصیل حاصل ہے کہ غالب کی جوانی طرح طرح کی رنگینیوں اور آزاد مشربیوں میں گذری بعض واقعات کے متعلق ان کے خطوط میں بھی اشارے ملتے ہیں۔

شجرۂ خاندان لوہارو
خواجہ عبدالرحمن
عارف جان
عالم جان
(ان کی اولاد کا حال معلوم نہیں ہوا)
شرف الدولہ قاسم جان
شرف الدولہ فیض اللہ بیگ خاں
سہراب جنگ
قدرت اللہ بیگ خاں
محمد بخش خاں
محمد علی خاں
ان کی لڑکی سے عارف کی شادی ہوئی تھی
نبی بخش خاں
(ان کے پوتے اکبر علی خاں کی لڑکی سے حسین علی خاں ابن عارف کی شادی ہوئی تھی)
نواب احمد بخش خاں
نواب الٰہی بخش خاں معروف
ان دونوں کے شجرے علیحدہ درج ہیں
معین الدین حسین خاں
محمد حسین خاں
دختر
زوجہ نواب
ضیاء الدین احمد خاں نیر
نواب غلام حسین خاں مسرور ۔ بنیادی بیگم
مرزا زین العابدین خاں عارف
مرزا حیدر حسن خاں
مرزا محمد حسن خاں عرف
خضر مرزا مرحوم
حسین علی خاں
باقر علی خاں
رقیہ سلطان بیگم
عرف مجھن بیگم
فاطمہ سلطان
عرف بندو بیگم
محمد سلطان بیگم
عرف جندو بیگم

الٰہی بخش خاں معروف کا شجرہ

نواب الٰہی بخش خاں معروف

بنیادی بیگم
(اہلیہ نواب غلام حسین خاں مسرور)

زین العابدین خاں عارف و حیدر حسن

امراؤ بیگم
(اہلیہ غالب)

میرزا علی بخش رنجور
غلام فخر الدین خاں ۔ عزیزالنساء بیگم
(دختر میرزا یوسف خاں)

میرزا محمد سعید خاں

میرزا نصر اللہ خاں
صدر محاسب سرکار آصفیہ
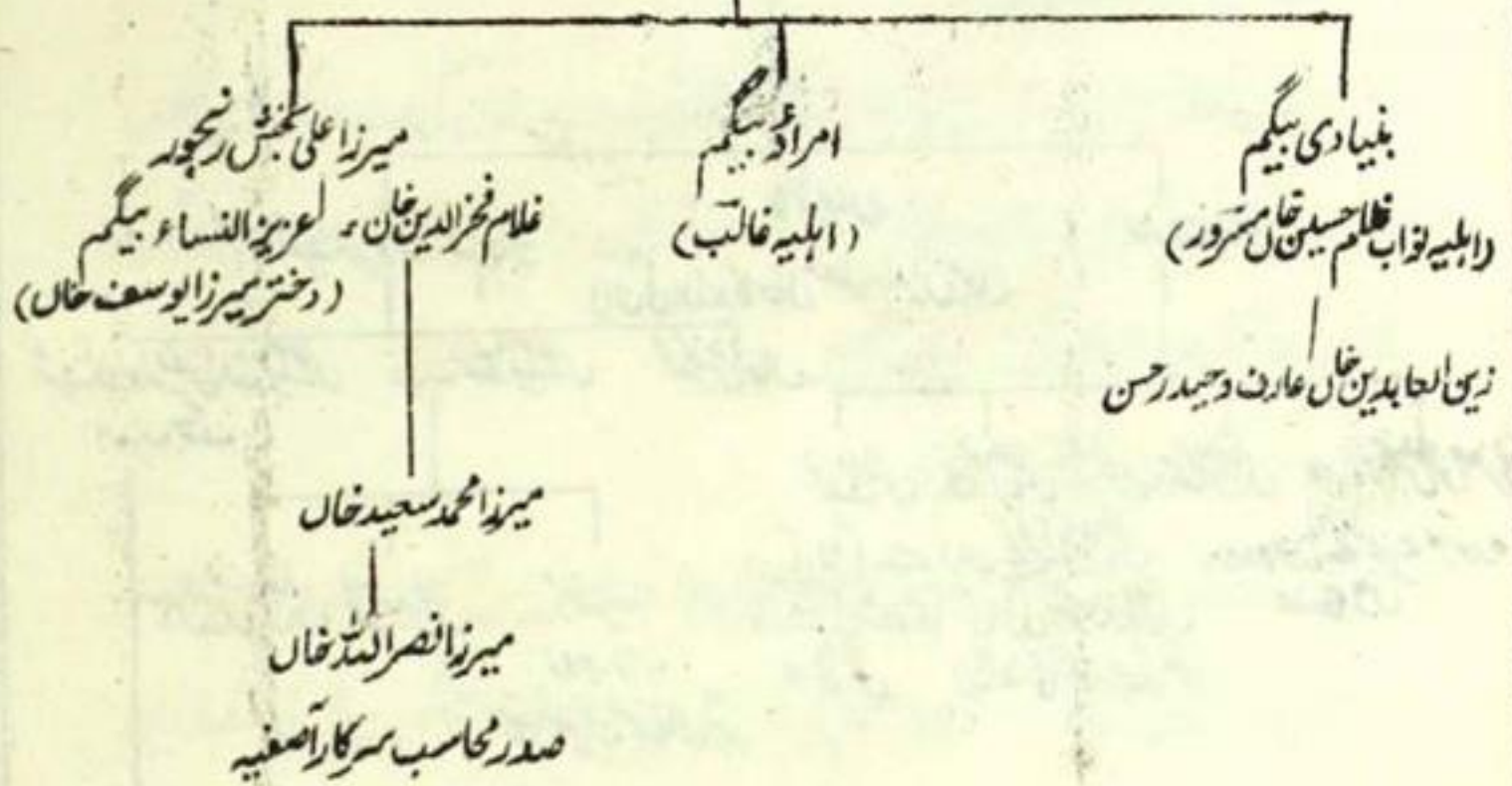
نواب احمد بخش خاں کا شجرہ

فخر الدولہ دلاور الملک نواب احمد بخش خاں بہادر رستم جنگ

شمس الدین احمد خاں

امین الدین احمد خاں

نواب علاؤ الدین احمد خاں

نواب سر امیر الدین احمد خاں

ضیاء الدین احمد خاں

شہاب الدین احمد خاں ثاقب

سعید الدین احمد خاں طالب

شجاع الدین احمد خاں تاباں

بہاء الدین احمد خاں

دختر

(بیگم سر ذوالفقار علی خاں مرحوم)

سراج الدین احمد خاں سائل
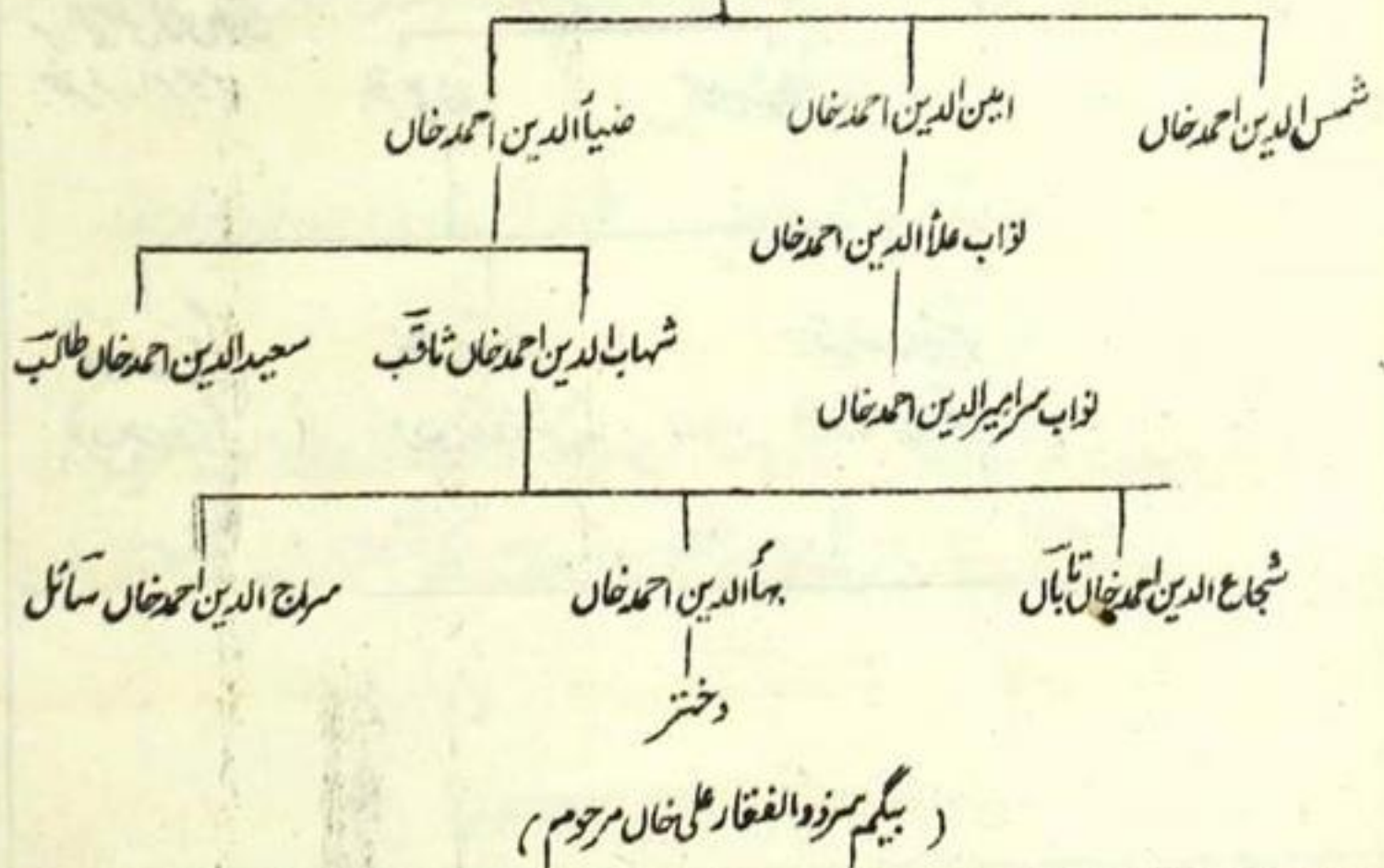
چوتھا باب

دھلی میں سکونت اور مکان

دم از ریاست دھلی نمے زنم غالبؔ
منم زخاک نشینان آں دیار یکے

غالب دہلی میں کب آئے

دہلی میں غالبؔ کی آمدورفت سات برس کی عمر سے شروع ہوگئی تھی۔ چنانچہ ۱۶ر فروری ۱۸۶۲ء کے ایک خط میں نواب علاالدین احمد خاں کو لکھتے ہیں :۔

اے میری جان یہ وہ دلّی نہیں جس میں تم پیدا ہوئے وہ دلّی نہیں جس میں تم نے علم تحصیل کیا ہے وہ دلّی نہیں جس میں تم شعبان بیگ کی حویلی میں مجھ سے پڑھنے آتے تھے۔ وہ دلّی نہیں جس میں سات برس کی عمر سے آتا جاتا ہوں۔ وہ دلی نہیں جس میں اکیاون برس سے مقیم ہوں۔ ایک کیمپ ہے۔ مسلمان اہل حرفہ یا حکام کے شاگرد پیشہ، باقی سراسر ہنود۔

اس خط سے یہ بھی ظاہر ہے کہ دہلی میں آکر ابتدا میں شعبان بیگ کی حویلی میں رہے تھے، جہاں نواب علاؔ الدین احمد خاں ان سے پڑھنے جاتے تھے۔ اگر اکیاون برس کی مدت کو درست مانا جائے تو یہ بھی ظاہر ہے کہ غالبؔ نے ۱۸۱۱ء کے قریب جبکہ ان کی عمر چودہ پندرہ برس کی ہوگی، دہلی میں سکونت اختیار کی۔

لیکن وہ منشی شیو نرائن آرام (آگرہ) کو ان کے دادا منشی بنسی دھر کے حالات میں لکھتے ہیں:

شاید منشی بنسی دھر مجھ سے ایک دو برس بڑے ہوں یا چھوٹے ہوں۔ اُنیس بیس کی میری عمر اور ایسی ہی عمر ان کی۔ باہم شطرنج اور اختلاط اور محبت آدھی آدھی رات گزر جاتی تھی چونکہ گھر ان کا بہت دور نہ تھا، اس واسطے جب چاہتے تھے، چلے جاتے تھے۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ غالب نے اُنیس بیس برس کی عمر تک آگرہ کی سکونت مستقلاً ترک نہیں کی تھی۔ اگر اسے درست سمجھا جائے تو دہلی میں ان کی مستقل سکونت کو ۱۸۱۵ء کے بعد کا واقعہ سمجھنا چاہیئے۔

میر اعظم علی صاحب مدرس مدرسہ اکبر آباد کے نام ایک فارسی خط کلیات نثر میں موجود ہے۔ اس میں اپنی مالی پریشانیوں اور پنشن کے سلسلے میں چارہ جوئی کے لئے سفر کلکتہ کے حالات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

روزگار برگشت۔ کار ساختہ شدہ صورت تباہی گرفت۔ اکنوں ششمیں سال است کہ خانماں بباد دادہ و دل بہ مرگ ناگاہ نہادہ بہ کنجے نشستہ ام و در آمیزش بر روے بیگانہ و آشنا بستہ۔

غالب نومبر ۱۸۲۹ء میں کلکتہ سے واپس آئے۔ لہٰذا مندرجہ بالا خط ۱۸۳۵ء یا ۱۸۳۶ء میں لکھا گیا ہوگا۔ اس خط میں اپنے زمانہ مفارقت کی نسبت لکھتے ہیں:

درازی زمان فراق کہ بہ گمان مخدوم شانزدہ سال است و بہ دانست نامہ نگار کم از بست سال نیست۔

اس سے ظاہر ہے کہ ۱۸۳۶ء میں غالب کو آگرہ چھوڑے ہوئے قریباً بیس برس گزر چکے تھے۔ اس حساب سے دہلی میں مستقل سکونت ۱۸۱۶ء میں اختیار کی گئی جبکہ غالب کی عمر قریباً اُنیس برس کی تھی۔

شیو نرائن آرام کے نام کے جس خط کا حوالہ اوپر آ چکا ہے اسی میں غالب اپنے مکانوں کی تفصیل بتاتے ہوئے لکھتے ہیں:

ایک کٹرہ کہ وہ کشمیرن والا کہلاتا تھا، اس کٹرے کے ایک کوٹھے پر میں پتنگ اڑاتا تھا۔ اور راجہ بلوان سنگھ سے پتنگ لڑا کرتے تھے۔

راجہ بلوان سنگھ بنارس کے مہاراجہ چیت سنگھ کے صاحبزادے تھے۔ مہاراجہ موصوف جب وارن ہسٹنگز کے مالی مطالبوں سے تنگ آکر بنارس چھوڑنے پر مجبور ہوئے تو گوالیار میں پناہ گزیں ہو گئے تھے۔ وہاں انہیں ایک گاؤں بھی جاگیر کے طور پر مل گئے تھے۔ راجہ بلوان سنگھ وہیں ۱۷۹۹ء میں پیدا ہوئے ۱۸۱۰ء میں ان کی والدہ مونڈن کی رسم ادا کرنے کے لئے بنارس کی طرف چلی گئی تھی۔ وہ الہ آباد میں تھی کہ مہاراجہ چیت سنگھ کی وفات کی اطلاع ملی۔ سرکار نے رانی کے لئے دو ہزار روپے ماہوار کا وظیفہ مقرر کیا لیکن شرط یہ تھی کہ وہ اپنے بچے سمیت گوالیار یا آگرہ میں رہے۔ رانی کو اس شرط سے انکار تھا، آخر بڑی کشمکش کے بعد ۱۸۱۳ء میں یہ شرط منظور کر کے رانی نے آگرہ میں اقامت اختیار کی۔[1] غالب نے راجا کے ساتھ پتنگ لڑانے کا جو ذکر کیا ہے وہ ۱۸۱۳ء یا اس کے بعد ہی کا واقعہ ہو سکتا ہے لہذا یہ یقینی ہے کہ ۱۸۱۳ء تک غالب آگرہ ہی میں مقیم تھے۔

کالے میاں کی حویلی | خواجہ حالی فرماتے ہیں کہ غالب نے دہلی میں کوئی مکان اپنے لئے نہیں خریدا تھا۔

---

[1] تاریخ بنارس مولفہ سید مرتضیٰ رضوی غازی مطبوعہ مطبع اسلامیہ لاہور صفحات ۵۸-۱۶۱ و ۱۶۲ مالک رام صاحب "ذکرِ غالب" میں فرماتے ہیں کہ غالب نے ۱۸۱۲ء میں آگرہ چھوڑ دیا۔ اس پر میر اعظم علی کے نام کے اس خط سے بھی استدلال کیا گیا ہے جس کا حوالہ اوپر دیا جا چکا ہے۔ فاضل موصوف کا خیال ہے کہ یہ خط ۱۸۳۲ء میں لکھا گیا تھا اور چونکہ غالب اس سے بیس برس پیشتر آگرہ چھوڑ چکے تھے لہذا ۱۸۱۲ء کا دعویٰ ثابت ہو گیا لیکن اس خط کو ۱۸۳۶ء کیوں نہ سمجھا جا سکتا ہے جبکہ غالب خود لکھتے ہیں کہ کلکتہ سے واپسی پر چھٹا سال گزر رہا ہے۔ لازماً یہ خط ۱۸۳۵ء یا ۱۸۳۶ء میں لکھا گیا ہوگا۔

ہمیشہ کرایہ کے مکانوں میں رہا کئے۔ یا ایک مدت تک میاں کالے صاحب کے مکان میں بغیر کرایہ کے رہتے تھے۔ جب ایک مکان سے جی اکتا یا، اسے چھوڑ کر دوسرا مکان لے لیا مگر قاسم جان کی گلی یا حبش خاں کے پھاٹک یا اس کے قرب و جوار کے سوا کسی اور ضلع میں جا کر نہیں رہے۔ سب سے اخیر مکان جس میں ان کا انتقال ہوا حکیم محمود خاں مرحوم کے دیوان خانہ کے متصل مسجد کے عقب میں تھا جس کی نسبت وہ کہتے ہیں :۔

مسجد کے زیر سایہ اک گھر بنا لیا ہے

یہ بندۂ کمینہ ہمسایۂ خدا ہے

لیکن غالبؔ خود ایک فارسی خط میں لکھتے ہیں :

سی سال است کہ خانہ کاشانہ فروختہ گوشہ بگوشہ گردم مقامے متعین ندارم ہر جا کہ مے بودم دو سہ سال یا کمتر یا بیشتر مے آسایم[1]

اس سے ظاہر ہے کہ دہلی میں غالبؔ کا اپنا مکان بھی تھا جو ممکن ہے سسرال والوں کی طرف سے ملا ہو۔ اسے فروخت کر ڈالا۔ بعد ازاں وہ ہمیشہ کرایہ کے مکانوں میں رہے۔

شیخ نصیر الدین عرف کالے میاں بہادر شاہ کے پیر تھے۔ یہ شیخ قطب الدینؒ کے صاحبزادے اور مولانا فخر الدین فخر عالم رحمۃ اللہ علیہ کے پوتے تھے جو دور آخر میں چشتی خاندان کے بہت بڑے بزرگ گزرے ہیں۔ کالے میاں کو غالبؔ سے بڑی محبت تھی۔ انہوں نے گلی قاسم جان میں اپنی ایک حویلی کرایہ کے بغیر غالبؔ کو رہنے کے لئے دے دی تھی۔ دربار شاہی میں حکیم احسن اللہ خاں کے علاوہ شیخ کالے میاں بھی غالبؔ کی ملازمت کا ایک ذریعہ تھے۔ شعبان بیگ کی حویلی کے

---

[1] کلیات نثر صفحہ ۲۳۵

بعد سب سے پہلا مکان جس میں غالب کے قیام کا پتہ چلتا ہے وہ کالے میاں کی یہی حویلی تھی۔ یہ اب بھی موجود ہے اگرچہ اس کا نقشہ بدل گیا ہے۔

معلوم ہوتا ہے۔ غالب اپنی قید (۱۸۴۷ء) کے بعد تک اسی حویلی میں رہے۔ مشہور ہے۔ کہ رہا ہونے پر کسی دوست نے مبارک باد دی، تو فرمانے لگے:

کون کہتا ہے میں قید سے رہا ہوا ہوں۔ پہلے "گورے" کی قید میں تھا۔ اب "کالے" کی قید میں ہوں،

حکیم محمد حسن خاں کی حویلی | کالے میاں کی حویلی کو چھوڑ کر حکیم محمد حسن خاں کی حویلی کرایہ پر لی وہ اس میں اپنی سکونت ۱۸۵۰ء سے بتاتے ہیں۔ غدر کے بعد دہلی میں جو حالات پیش آ رہے تھے۔ ان کا ذکر کرتے ہوئے میر مہدی مجروح کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

سب تھانوں پر حکم ہے کہ دریافت کرو کون بے ٹکٹ مقیم ہے اور کون ٹکٹ رکھتا ہے۔ تھانوں میں نقشے مرتب ہونے لگے۔ یہاں کا جمعدار میرے پاس بھی آیا میں نے کہا بھائی تو مجھے نقشے میں نہ رکھ میری کیفیت کی عبارت الگ لکھ یہ لکھ کہ اسد اللہ خاں پنشن دار ۱۸۵۰ء سے حکیم پٹیالے[۱] والے کے بھائی کی حویلی میں رہتا ہے۔

لیکن میرا خیال ہے کہ ۱۸۵۰ء والی تاریخ درست نہیں وہ ۲۲ مارچ ۱۸۵۲ء کے ایک مکتوب میں تفتہ کو لکھتے ہیں:

میں کالے صاحب کے مکان سے اٹھ آیا ہوں اور بلی ماراں میں ایک حویلی کرایہ پر لے کر اس میں رہتا ہوں۔

غالب کے ساتھ تفتہ کی خط و کتابت مسلسل جاری تھی۔ بہ ظاہر یہ امر مستبعد

---

[۱] حکیم محمود خاں کے بھائی مہاراجہ پٹیالہ کے ملازم تھے، اس وجہ سے وہ پٹیالہ والے حکیم مشہور تھے حکیم محمد حسن اسی خاندان سے تھے۔

معلوم ہوتا ہے۔ کہ تفتہ کو دو تین تک تبدیل مکان کی اطلاع نہ ملی ہو۔ میرا خیال ہے۔ کہ غالب اواخر ۱۸۵۵ء یا اوائل ۱۸۵۶ء میں حکیم محمد حسن خاں کی حویلی میں آئے ہوں گے۔ اس کے بعد وہ جولائی ۱۸۶۰ء تک اسی میں رہے۔ علاء الدین احمد خاں کو لکھتے ہیں:-

میں دس بارہ برس سے حکیم محمد حسن خاں کی حویلی میں رہتا ہوں اب وہ حویلی غلام اللہ خاں نے مول لے لی۔ آخر جون میں مجھ سے کہا کہ حویلی خالی کردو۔ اب مجھے فکر پڑی کہ کہیں دو حویلیاں قریب قریب مگر ایسی ملیں کہ ایک محل سرائے اور ایک دیوان خانہ ہو نہ ملیں۔ ناچار یہ چاہا کہ بلیماران میں ایک مکان البتہ ملے، جس میں جا رہوں۔ ناگاہ تمہاری چھوٹی پھوپھی نے بیکس نوازی کی، کروڑا والی حویلی مجھ کو رہنے کو دی۔ ہر چند وہ رعایت مرعی نہ رہی کہ محل سرائے قریب ہو مگر خیر بہت دور بھی نہیں۔ کل یا پرسوں وہاں جا رہوں گا۔ ایک پاؤں زمین پر ہے۔ ایک پاؤں رکاب میں۔ نوشتہ کا وہ حال۔ گوشتہ کی یہ صورت۔

اسی مکان کی نسبت ایک خط میں منشی ہرگوپال تفتہ کو لکھتے ہیں:-

دس گیارہ برس سے اس تنگنائے میں رہتا تھا۔ سات برس تک ماہ بہ ماہ چار روپے کرایہ دیا گیا۔ اب تین برس کا کرایہ کچھ اوپر سو روپیہ یک مشت دیا گیا۔ مالک مکان نے مکان بیچ ڈالا جس نے لیا ہے (یعنی غلام اللہ خاں نے) پیام بلکہ ابرام کیا کہ مکان خالی کردو۔ مکان کہیں ملے تو اٹھوں۔ بے درد نے مجھ کو عاجز کیا اور مدد لگا دی وہ صحن بالا خانے کا جس کا دو گز کا عرض اور دس گز کا طول ہے، اس میں پاڑھ بندھ گئی۔ رات کو وہیں سویا۔ گرمی کی شدت، پاڑھ کا قرب، گمان یہ گزرتا تھا کہ یہ کٹہرا ہے اور صبح کو مجھ کو پھانسی ملے گی۔ تین راتیں اسی طرح گزاریں۔ دوشنبہ ۹ جولائی کو (۱۸۶۰ء) دوپہر کے وقت مکان ہاتھ آگیا۔ وہاں جا رہا۔ جان بچ گئی۔

حکیم محمد حسن والے مکان میں اسباب راحت کی قلت تھی۔ ایک خط میں جو پنشن کی بندش کے زمانے میں لکھا گیا۔ یعنی (۱۸۵۸ء یا ۱۸۵۹ء) میں میر مہدی مجروح

کو تحریر فرماتے ہیں:-

برسات کا حال نہ پوچھو، خدا کا قہر ہے، قاسم جان کی گلی سعادت خاں کی نہر ہے۔ میں جس مکان میں رہتا ہوں عالم بیگ کے کٹرہ کی طرف کا دروازہ گر گیا۔ مسجد کی طرف کے دالان کو جاتے ہوئے جو دروازہ تھا گر گیا۔ سیڑھیاں گرا چاہتی ہیں۔ صبح کے بیٹھنے کا حجرہ جھک رہا ہے چھتیں چھلنی ہو گئی ہیں، مینہ گھڑی بھر برسے تو چھت گھنٹہ بھر برسے۔ کتابیں قلمدان سب توشہ خانہ میں فرش پر کہیں لگن رکھا ہوا ہے کہیں چلمچی دھری ہوئی ہے خط کہاں بیٹھ کر لکھوں

بایں ہمہ غالب نے یہ مکان اس وقت تک نہ چھوڑا جب تک نئے مالک مکان نے انہیں نکل جانے کے تقاضوں سے عاجز نہ کر دیا۔

حکیم صاحب والے مکان کا کرایہ چار روپے ماہانہ تھا۔ جب تک پنشن کھلی تھی، کرایہ ماہ بہ ماہ ادا ہوتا رہا۔ غدر میں پنشن بند ہو گئی تو تین برس کا کرایہ چڑھ گیا۔ مئی ۱۸۶۰ء میں چڑھی ہوئی پنشن یکمشت ملی، تو سارا کرایہ ادا کیا۔ کردڑا مل والی حویلی جس کا ذکر جولائی ۱۸۶۰ء کے مکتوب میں ہے غالباً کرایہ پر نہیں لی تھی، بلکہ مفت رہنے کو مل گئی تھی معلوم نہیں ہو سکا کہ اس حویلی میں وہ کب تک رہے۔

نیا مکان

میرا خیال ہے کہ بعد ازاں انہوں نے ایک اور مکان کرایہ پر لے لیا تھا۔ اس لئے کہ جولائی ۱۸۶۴ء کے ایک مکتوب (موسومہ نواب علاء الدین احمد خاں) میں فرماتے ہیں۔ کہ برسات کی شدت کے باعث مکان میں تکلیف ہے مینہ بند ہو تو مالک مکان مرمت کرا دے:

میاں میں بڑی مصیبت میں ہوں۔ محل سرا کی دیواریں گر گئی ہیں۔ پاخانہ ڈھ گیا، چھتیں ٹپک رہی ہیں، تمہاری پھوپھی (بیگم غالب) کہتی ہیں ہائے دبی، ہائے مری، دیوانخانہ کا حال محل سرا سے بدتر ہے۔ میں مرنے سے نہیں ڈرتا، فقدان راحت سے گھبرا گیا ہوں۔ چھت چھلنی ہو گئی ہے۔ ابر دو گھنٹے برسے تو چھت چار گھنٹے برستی ہے۔ مالک اگر چاہے کہ مرمت کرے تو کیونکر

کرے۔ مینہ کھلے تو سب کچھ ہو۔ پھر اثنائے مرمت میں بیٹھا کس طرح رہوں۔ اگر تم سے ہو سکے۔ تو برسات تک بھائی (نواب امین الدین احمد خاں) سے مجھ کو وہ حویلی جس میں میر حسن رہتے تھے، اپنی پھوپھی کے رہنے کو اور کوٹھی میں سے وہ بالاخانہ مع دالان زیریں جو الٰہی بخش خاں مرحوم کا مسکن تھا میرے رہنے کو دلوا دو۔ برسات گذر جائیگی۔ مرمت ہو جائیگی۔ پھر صاحب لوگ (غالب) اور میم (بیگم) اور بابا لوگ (باقر علی خاں اور حسین علی خاں) اپنے قدیم مسکن میں آ رہیں گے۔ تمہارے والد کے ایثار و عطا کے جہاں مجھ پر اور احسان ہیں، ایک یہ مروت کا احسان میرے پایان عمر اور سہی۔

اگر یہ مکان وہی ہوتا، جو مفت رہنے کو ملا تھا، تو مالک مکان سے مرمت کرانے کا سوال درمیان نہ آتا۔

نواب امین الدین احمد خاں نے غالب کی خواہش پوری کر دی، یعنی مطلوبہ مکان ان کے حوالے کر دیئے۔ لیکن اس دوران میں مینہ کا زور ختم ہو گیا۔ اور جس فقدان راحت نے انہیں تبدیل مسکن پر آمادہ کیا تھا۔ وہ زائل ہو گیا۔ لہذا وہ پہلے ہی مکان میں بیٹھے رہے۔ چنانچہ اگست ۱۸۶۴ء کے مکتوب میں نواب علاء الدین احمد خاں کو لکھتے ہیں:۔

تم نے بیاہ بھی گری کی، بھائی نے برادر پروری کی۔ تم جیتے رہو، وہ سلامت رہیں۔ ہم اس حویلی میں تاقیامت رہیں۔ اس ابہام کی توضیح اور اجمال کی تفصیل یہ ہے۔ کہ مینہ کی شدت سے چھوٹا لڑکا (حسین علی خاں) ڈر نے لگا۔ اس کی دادی (بیگم غالب) بھی گھبرائی۔ مجھ کو خلوت خانہ کا دروازہ غرب رویہ اور اس کے آگے کا چھوٹا سا دریا دنہا۔ جب تمہارے پاؤں میں چوٹ لگی تو اسی دروازے سے تم کو دیکھنے آیا تھا۔ یہ سمجھ کر خلوت خانہ کو محل سرا بنایا چاہتا تھا کہ گاڑی، ڈولی، لونڈی، اصیل، کاچھن، تیلن، تنبولن، کہاری، ابنہاری، ان فرقوں کا ممر (گزرگاہ) دروازہ رہیگا۔ میری اور بچوں کی آمد دیوانخانہ میں سے رہیگی۔ عیاذاً باللہ وہ لوگ دیوان خانہ میں سے آئیں، اپنے بیگانے کو ہر وقت بچھلپائیاں نظر آئیں مہندا اس سہ دری کو اپنے آدمیوں کے لئے اور لڑکوں کے مکتب کیلئے ہرگز کافی نہ جانا۔ مور اور کبوتر اور

دُنبہ اور بکری باہر گھوڑوں کے پاس رہ سکتے تھے۔ عزت ربی بقسخ العزائم پڑھا۔ اور چپ ہو رہا۔ مگر تمہاری خاطر جمع رہے، اسباب وحشت و خطرات نہ رہے۔ مینہ کھل گیا ہے۔ مکان کے مالکوں کی طرف سے مدد شروع ہو گئی ہے۔ نہ لڑکا ڈرتا ہے۔ نہ بی بی گھبراتی ہے نہ میں بے آرام ہوں۔ کھلا ہوا کوٹھا، چاندنی رات، ہوا سرد، تمام رات فلک پر امر بیچ پیش نظر، دو گھڑی کے تڑکے زہرہ جلوہ گر۔ ادھر چاند مغرب میں ڈوبا۔ ادھر مشرق سے زہرہ نکلی۔ صبوحی کا وہ لطف، روشنی کا وہ عالم۔

اس خط سے یہ بھی ظاہر ہے کہ غالب ایک جگہ سے اُٹھ کر دوسری جگہ جانے کو بہت بار سمجھتے تھے۔ حکیم محمد حسن خاں صاحب والا مکان اس وقت تک نہ چھوڑا۔ جب تک نئے مالک نے انہیں زبردستی نہ اُٹھایا۔ اور یہ مکان نئی قیام گاہ مفت مل جانے کے باوجود نہ چھوڑا، اگرچہ وہاں آرام نہ تھا۔

پھر مکان بدلا

ستمبر ۱۸۶۵ء میں پھر نئے مکان کی تجویز ٹھہری۔ اور ساڑھے پانچ روپے کرایہ پر ایک مکان روک لیا گیا۔ ایک مہینے کا کرایہ ادا کر دیا گیا۔ لیکن رام پور کے دوسرے سفر تک اس میں منتقل نہیں ہوئے تھے۔ حکیم غلام نجف خاں کو رام پور سے ۱۲ نومبر ۱۸۶۶ء کے خط میں لکھتے ہیں:-

مکان کے روکنے کو اور کس طرح لکھوں؟ شہاب الدین خاں کو لکھا، شمشاد علی بیگ کو لکھا، اب تم کو لکھتا ہوں، ستمبر کے ساڑھے پانچ روپے دے آیا ہوں، اکتوبر، نومبر، دسمبر، یہ ساڑھے سولہ روپے آکر دوں گا بلکہ موقع بنے گا تو یہ سرمایہ یہاں سے بہ طریق ہنڈوی بھیج دوں گا۔ اسماعیل خاں صاحب کو میری دعا کہو اور یہ کہ ڈیوڑھی کی سیڑھی بنوا دیں اور حویلی کے پاخانے کی صورت درست کرا دیں[1]

---

[1] اردوئے معلیٰ میں اس مکتوب پر تاریخ ۱۸۶۵ء کے بجائے ۱۸۶۶ء درج ہے۔ لیکن معلوم ہے۔ کہ غالب نے صرف دو مرتبہ رام پور کا سفر کیا۔ پہلی مرتبہ جنوری ۱۸۶۰ء میں گئے۔ اور مارچ ۱۸۶۰ء میں واپس آئے۔ دوسری مرتبہ نواب کلب علی خاں کی مسند نشینی کے جشن میں شرکت کے لئے اکتوبر ۱۸۶۵ء میں گئے۔ اور جنوری ۱۸۶۶ء میں واپس آئے۔ لہٰذا اس خط کی صحیح تاریخ ۱۲ نومبر ۱۸۶۶ء نہیں بلکہ ۱۲ نومبر ۱۸۶۵ء ہونی چاہیئے۔ مطبوعہ اردوئے معلیٰ میں ایسی کئی غلطیاں ہیں۔ ۱۲

یہی مکان ہے، جس میں غالب کا انتقال ہوا[1]۔

برسات کی تکلیف اس مکان میں بھی باقی رہی۔ اکتوبر ۱۸۶۶ء کے ایک خط میں منشی ہرگوپال تفتہ کو لکھتے ہیں :۔

برسات کا حال تمہیں بھی معلوم ہے اور یہ بھی تم جانتے ہو۔ کہ میرا مکان گھر کا نہیں ہے۔ کرایہ کی حویلی میں رہتا ہوں۔ جولائی سے مینہ شروع ہوا شہر میں سینکڑوں مکان گرے اور مینہ کی نئی صورت دن میں دو چار بار برسے۔ اور ہر بار اس زور سے کہ ندی نالے بہ نکلیں، بالاخانہ کا جو دالان میرے بیٹھنے اٹھنے سونے جاگنے جینے مرنے کا محل ہے اگرچہ گرا نہیں، لیکن چھت چھلنی ہو گئی کہیں لگن، کہیں چلمچی کہیں اُگالدان رکھ دیا۔ قلمدان کتابیں اُٹھا کر توشہ خانہ کی کوٹھڑی میں رکھ دیئے۔ مالک مرمت کی طرف متوجہ نہیں کشتی نوح میں تین مہینے رہنے کا اتفاق ہوا۔ اب نجات پائی۔

مکان اگرچہ اپنا کبھی نہ بنوایا اور معلوم ہوتا ہے۔ کہ کبھی اچھا مکان نہ ملا۔ لیکن معیار اس بارے میں بھی بڑا بلند تھا۔ حکیم غلام نجف خاں نے غالباً ایک مکان تجویز کیا تھا۔ اس کے متعلق صاحب موصوف کو لکھتے ہیں :۔

حضرت غور کی جگہ ہے ایک مکان دلکشا، کوچے کی بسیر بازار کا تماشا، دو کمرے، دو کوٹھڑیاں، آتشدان صحن وسیع۔ اس کو چھوڑ کر وہ مکان لوں جو ایک تنگ گلی کے اندر ہے؟ دروازہ تاریک، کہ دن کو بغیر چراغ کے راہ نہ ملے اور پھر ڈیوڑھی پر حلال خوروں کا مجمع، گوہ کے ڈھیر، کہیں حلال خوری کا بچہ گھس رہا ہے، کہیں بیل بندھا ہوا ہے، کہیں کوڑا پڑا ہے۔ عیاذاً باللہ! خدا نہ لے جائے ایسے مکان میں ؛

---

[1] کوچہ بلیماراں میں سے گلی قاسم جان میں مڑیں تو عین موڑ پر بائیں ہاتھ مسجد ہے۔ اس مسجد کے سامنے کا مکان جو ہندوستانی دواخانہ کی موجودہ عمارت کا ایک حصہ ہے، غالب کا مکان تھا۔ نظر بظاہر اس کی ہیئت اب بدل گئی ہے حضرت مولانا ابوالکلام فرماتے ہیں کہ اسے ہندوستانی دواخانہ نے اپنے گودام کے لئے لے لیا۔ اور کئی تبدیلیاں کرائیں۔ تاہم ایک کمرہ جو سرراہ تھا غالباً پچھلی ہیئت پر باقی ہے۔ اسی میں شب و روز مرزا کی نشست ہوتی تھی ؛

پانچواں باب

سفر کلکتہ

اگر بہ دل نہ خلد ہر چہ از نظر گزرد
زہے روانی عمرے کہ در سفر گزرد

سیاحت کے متعلق غالبؔ کی اُردو اور فارسی تحریرات میں دو متضاد رائیں ملتی ہیں۔ فارسی کے ایک مکتوب میں رائے چھجمل کو لکھتے ہیں:۔

جلاوطن، عزم سفر و آلام غربت معصیتے است کہ نصیب ہیچ آفریدہ مباد!

اُردو کے ایک خط میں میاں داد خاں سیاحؔ کو تحریر فرماتے ہیں:۔

میں تُم سے توقع رکھتا ہوں کہ جس طرح تم نے لکھنؤ سے بنارس تک کے سفر کی سرگزشت لکھی ہے۔ اسی طرح آیندہ بھی لکھتے رہو گے۔ میں سیر و سیاحت کو بہت دوست رکھتا ہوں:۔

اگر بہ دل نہ خلد ہر چہ از نظر گزرد
زہے روانی عمرے کہ در سفر گزرد

خیر اگر سیر و سیاحت میسر نہ سہی ذکر العیش پر قناعت کی۔ میاں داد خاں سیاح کی سرگزشت

سیر و سفر ہی سہی۔

ان دونوں رایوں میں تطبیق مشکل نہیں صرف اتنا جان لینا کافی ہے۔ کہ پہلی رائے اس وقت کی ہے جبکہ غالب خود سفر میں تھے۔ دوسری رائے حالت حضر کی ہے۔ وہ سیر و سیاحت کو واقعی دوست رکھتے تھے لیکن نازک مزاجی کے باعث ان شدائد کے تحمل اور ان تکالیف کی برداشت کے اہل نہ تھے جو لازمۂ سفر ہیں۔ اس لئے جب خود سفر میں تھے۔ اور قدم قدم پر مختلف تکلیفیں پیش آ رہی تھیں یا دورانِ حضر کی بے فکری اور فراغت بال میسر نہ تھی، تو پکار اُٹھے کہ غربت کے آلام خُدا کرے کسی کو نصیب نہ ہوں۔ لیکن جب حالت حضر میں دوسرے شخص کے سفر کے دلچسپ حالات پڑھے تو آرزو پیدا ہوئی۔ کہ ایسے حالات کے مطالعہ سے لطف اندوزی کا سلسلہ منقطع نہ ہونے پائے۔

سفر کلکتہ کی تاریخ غالب نے صرف ایک لمبا سفر کیا ہے۔ جب وہ خاندانی پنشن کے متعلق قانونی چارہ جوئی کے لئے کلکتہ گئے تھے۔ اور کچھ کم تین برس دہلی سے باہر رہے۔ اس کی تاریخ کے متعلق غلط فہمی چلی آتی ہے۔ جو خود غالب کی ایک تحریر سے پیدا ہوئی۔ وہ فرماتے ہیں کہ ۱۸۳۰ء میں کلکتہ گیا تھا[1]۔ سوانح نگاروں نے اس بیان کو بلا تحقیق درست تسلیم کر لیا۔ حالانکہ غالب کی فارسی نثر میں بعض مفصل بیانات موجود ہیں۔ جو اس تاریخ کو غلط ثابت کر رہے ہیں۔ تعجب ہے کہ خواجہ حالی مرحوم بھی اس بارے میں سہو سے محفوظ نہ رہے۔

---

[1] اُردوئے معلیٰ صفحہ ۲۷ خط بنام منشی حبیب اللہ خاں ذکا حیدرآبادی

اس سلسلے میں مندرجہ ذیل حقائق کو پیش نظر رکھیے، حقیقت حال خود بخود واضح ہو جائے گی :-

(۱) غالب دہلی سے روانہ ہوئے تھے تو فخر الدولہ نواب احمد بخش خاں مرحوم والی فیروز پور جھرکہ زندہ تھے۔ کلکتہ کے راستے میں نواب موصوف کے انتقال کی خبر ملی۔ میرزا علی بخش خاں رنجور کو لکھتے ہیں :

میر فضل مولے خاں نام یارے داشتم ادرانا گہ فت درعرض راہ خبر شد در نورد گفتگوہائے ایں وجوہا کہ رفت ازجامہ گزاشتن فخر الدولہ (نواب احمد بخش خاں) بمن خبر داد۔ باز بہ کلکتہ میرزا افضل[1] بیگ و دیگراں برگفتند، آدخ کہ چراغ روشن ایں دودماں مرد۔[2]

نواب احمد بخش خاں کا انتقال اکتوبر ۱۸۲۷ء (مطابق ربیع الاول ۱۲۴۳ھ) میں ہوا۔ تاریخ وفات "مینو مقام فخر الدولہ" ہے۔

اس سے ظاہر ہے کہ غالب اکتوبر ۱۸۲۷ء سے چند ماہ قبل دہلی سے روانہ ہو چکے تھے۔

(۲) کلکتہ جاتے ہوئے وہ لکھنؤ میں بھی ٹھہرے تھے۔ ان کی مختلف تحریرات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانے میں معتمد الدولہ آغا میر اودھ کے نائب السلطنت اور وزیر اعظم[1] تھے۔ اور غازی الدین حیدر کی وفات تک (۱۹ اکتوبر ۱۸۲۷ء مطابق ۲۷ ربیع الاول ۱۲۴۳ھ) مختار کل رہے۔

---

[1] میرزا افضل بیگ (ابن مرزا جیون بیگ کمیدان بدخشی) جو دربار دہلی کی طرف سے کلکتہ میں وکیل تھے۔

[2] کلیات نثر فارسی صفحہ ۶۵ و صفحہ ۱۵۷

اس کے بعد نصیر الدین حیدر کا عہد شروع ہوا چند ماہ کے اندر اندر آغا میر برطرف ہو گئے اور ان کی جگہ اعتماد الدولہ میر فضل علی نائب السلطنت بنے۔ غالب بہرحال آغا میر کے زمانہ اقتدار میں لکھنؤ سے گزر چکے تھے۔ اور یہ واقعہ اکتوبر ۱۸۲۷ء سے پہلے کا ہونا چاہئیے۔

(۳) کلکتہ پہنچ کر غالب نے اپنا مقدمہ کونسل میں پیش کیا تھا تو اس کے ممبروں میں ایک شخص ولیم بیلی تھے۔ غالب ایک مکتوب میں فرماتے ہیں کہ ولیم بیلی سیاحت کے لئے برما چلے گئے ہیں[۱]۔ مقدمہ پیش ہو جانے کے بعد غالب کم و بیش دو برس کلکتہ میں رہے اور ولیم بیلی ۱۸۳۰ء میں پنشن لے کر تمام کاروبار سے سبکدوش ہو چکے تھے[۲]۔ ظاہر ہے کہ ولیم بیلی کے پنشن لینے سے کم از کم دو برس قبل غالب ضرور کلکتہ پہنچ گئے تھے۔

(۴) مقدمہ کونسل میں پیش ہوا تھا تو اس وقت حکومت ہند کے چیف سکرٹری اینڈریو اسٹرلنگ تھے۔ جو غالب کے خاص ہمدرد بن گئے تھے[۳]۔ ان کی مدح میں غالب نے پچپن شعر کا ایک قصیدہ کہا تھا[۴]۔ اسٹرلنگ نے ۲۳ مئی ۱۸۳۰ء کو وفات پائی[۵] جیسا کہ غالب ان کے قطعہ وفات میں فرماتے ہیں:

بہ عہد نشاط سی و پنج سالہ از دنیا   جریدہ رفت و جواناں چناں روند چنیں

---

[۱] کلیات نثر فارسی صفحہ ۱۶۹

[۲] ڈکشنری آف انڈین بایوگرافی صفحہ ۳۱

[۳] کلیات نثر فارسی صفحہ ۱۶۷

[۴] کلیات نظم فارسی صفحہ ۲۸۲

[۵] ڈکشنری آف انڈین بایوگرافی صفحہ ۴۱۵

بہ روز بست و سیم از مئی بہ ہنگامے　　کہ بود خسرو انجم بہ برج ثور مکیں

ہزار و ہشت صد و سی ز عہد عیسےٰ بود

کہ جست برق جہاں سوز ایں الم ز کمیں

اینڈریو اسٹرلنگ کی وفات کے وقت غالب دہلی واپس آچکے تھے[1]۔ لہٰذا انکے سفر کلکتہ کی تاریخ اس واقعہ سے کم و بیش تین برس قبل ماننی چاہیئے۔

(۵۱) غالب کے اپنے بیان سے ثابت ہے کہ وہ دو برس کلکتہ میں گزار کر ۲۲ جمادی الثانی ۱۲۴۵ھ (مطابق ۲۹ نومبر ۱۸۲۹ء) کو دہلی پہنچے۔ خواجہ غلام غوث خاں بے خبر کے نام کے ایک خط میں ۱۸۲۹ء کی واپسی کی تصریح بھی موجود ہے۔ فرماتے ہیں ؛

حضرت وہ شعر بنگالی زبان کا ۱۸۲۹ء میں ضیافت طبع احباب کے واسطے کلکتہ سے ارمغان لایا ہوں۔ صحیح یوں ہے ؛

تم کہے تھے رات میں آئیں گے سو آئے نہیں

قبلہ بندہ رات بھر اس غم سے کچھ کھائے نہیں

بہ ہر حال ۱۸۳۰ء میں کلکتہ جانے کا بیان کسی حالت میں بھی قابل تسلیم نہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ یا تو طباعت کی غلطی ہے یا ماننا پڑیگا کہ غالب کو سہو ہوا اور چونکہ یہ خط سفر کلکتہ سے کم و بیش چالیس برس بعد لکھا گیا۔ اس لئے تاریخ کے باب میں سہو مستبعد نہ تھا۔

---

[1] کلیات فارسی صفحہ ۱۳۰ و ۱۳۱

دہلی سے روانگی

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ غالب دہلی سے کب روانہ ہوئے؟ ایک فارسی مکتوب میں فرماتے ہیں کہ ۲۶ ذی قعدہ کو لکھنؤ سے چل کر ۲۹ ذی قعدہ کو کانپور پہنچا[1]۔ اس میں سال درج نہیں۔ لیکن اس کا فیصلہ مشکل نہیں۔ نواب احمد بخش خاں کی وفات ربیع الاول ۱۲۴۳ھ میں ہوئی اور اس وقت غالب کلکتہ کے قریب پہنچے ہوئے تھے۔ لہذا ماننا چاہیئے کہ وہ ذی قعدہ ۱۲۴۲ھ (مطابق مئی ۱۸۲۷ء) میں لکھنؤ میں تھے۔ اس زمانے میں غازی الدین حیدر پادشاہ اودھ تھے۔ میرے نزدیک اغلب ہے کہ وہ عید شوال ۱۲۴۲ھ کے بعد یعنی اپریل ۱۸۲۷ء میں روانہ ہوئے ہوں[2]۔

خواجہ حالی بیان

خواجہ حالی فرماتے ہیں کہ غالب کلکتہ جاتے ہوئے لکھنؤ پہنچے تھے تو نصیر الدین حیدر فرمانروا اور روشن الدولہ نائب السلطنت تھے[3]۔ یہ خواجہ مرحوم کا سہو ہے

---

[1] کلیات نثر فارسی صفحہ ۱۵۸

[2] غالب کے کلیات نثر فارسی میں ایک نثر بصنعت تعطیل میں ہے جو معتمد الدولہ آغا میر کے لئے لکھی گئی تھی۔ اس پر ۲ محرم الحرام کی تاریخ درج ہے، سال درج نہیں۔ اگر فرض کیا جائے کہ سال ۱۲۴۲ھ تھا تو ماننا پڑیگا کہ غالب محرم ۱۲۴۲ھ (اوائل اگست ۱۸۲۶ء) سے پہلے لکھنؤ پہنچ گئے تھے۔ اسکے بعد وہ ذی قعدہ ۱۲۴۲ھ (مطابق جون ۱۸۲۷ء) تک وہیں مقیم رہے۔ اگر یہ تاریخ ۲ محرم ۱۲۴۳ھ (۲۶ جولائی ۱۸۲۷ء) تسلیم کی جائے اور ذی قعدہ ۱۲۴۲ھ کو لکھنؤ سے چلے جانے کے متعلق غالب کے بیان کو درست سمجھا جائے تو ظاہر ہے کہ وہ ایک مرتبہ لکھنؤ سے بے نیل مرام چلے گئے، کانپور پہنچے تو لکھنؤ کے دوستوں نے انہیں دوبارہ بلایا۔ واپس جا کر وہ مہینا ڈیڑھ مہینا ٹھہرے، پھر حصول مقصد کی طرف سے مایوس ہو کر چلے گئے۔ دونوں صورتیں ممکن ہیں۔ پہلی صورت میں ماننا پڑیگا کہ وہ کم از کم دس مہینے لکھنؤ میں ٹھہرے۔ مجھے یہ امر مستبعد معلوم ہوتا ہے۔ اغلب یہی ہے کہ وہ عید شوال ۱۲۴۲ھ (اپریل ۱۸۲۷ء) میں دہلی سے نکلے، مہینا بھر لکھنؤ میں رہے، پھر سفر پر روانہ ہو گئے۔ کانپور سے دوستوں نے واپس بلا لیا۔ غالباً امید دلائی ہو گی کہ حالات درست ہو گئے ہیں۔ لہذا دوبارہ زحمت سفر گوارا کی، مہینا بھر پھر وہاں ٹھہرے جب کوئی صورت امید کے مطابق نظر نہ آئی تو کلکتہ روانہ ہو گئے۔

[3] یادگار غالب صفحہ ۲۵

غالب کی متعدد تحریرات میں صراحۃً مرقوم ہے کہ ان کے لکھنؤ جانے کے زمانے میں معتمد الدولہ آغا میر نائب السلطنت تھے۔ معتمد الدولہ کے بعد اعتماد الدولہ میر فضل علی نائب السلطنت بنے۔ ان کے بعد منتظم الدولہ حکیم مہدی علی خاں کو نیابت کا منصب عطا ہوا۔ حکیم صاحب کے بعد نومبر ۱۸۳۲ء میں روشن الدولہ نائب السلطنت اور وزیر اعظم بنائے گئے۔ اس وقت غالب کو سفر کلکتہ سے واپس آئے ہوئے کم وبیش دو برس گزر چکے تھے۔ خواجہ مرحوم کو یہ سہو غالباً اس وجہ سے ہوا کہ نصیر الدین حیدر کے قصیدہ میں روشن الدولہ کا بھی ذکر ہے۔

خواجہ صاحب کا یہ ارشاد بھی درست نہیں کہ کلکتہ جانے کے وقت غالب کی عمر "کچھ کم چالیس برس" کی تھی۔ دہلی سے روانگی کے وقت غالب کی عمر سنین قمری کے اعتبار سے چند ماہ اور تیس برس کی ہوگی۔ سنین شمسی کے اعتبار سے چند ماہ کم تیس برس کی ہوگی۔ اگر خواجہ صاحب نے سفر کلکتہ کے متعلق ۱۸۳۰ء والے بیان ہی کو صحیح قرار دے لیا تھا تو اس حالت میں بھی غالب کی عمر زیادہ سے زیادہ تینتیس برس کی ماننی چاہیے تھی اور سیر وسوانح کی کتاب میں تینتیس برس کی مدت کو "کچھ کم چالیس برس" سے تعبیر کرنا محتاط طریق بیان نہیں۔

سفر کلکتہ کی غرض اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ سفر کلکتہ خاندانی پنشن کے مقدمہ میں قانونی چارہ جوئی کے لئے اختیار کیا گیا تھا جس کے تفصیلی حالات ایک علیحدہ باب میں بیان ہوں گے۔ یہاں اختصاراً یہ عرض کر دینا کافی ہے کہ غالب کے خیال کے مطابق جو پنشن انہیں فیروز پور جھرکہ سے ملتی تھی، وہ مقررہ رقم سے کم تھی۔ دعویٰ یہ تھا کہ انہیں اور دوسرے اہل خاندان کو دس ہزار روپے سالانہ ملنے چاہئیں۔ فیروز پور جھرکہ والے تین ہزار روپے سالانہ دیتے تھے۔ جب تک اس ریاست کی عنان انتظام نواب احمد بخش خاں کے ہاتھ میں رہی، غالب خاموش بیٹھے رہے اسکی وجہ غالباً یہ تھی کہ نواب موصوف پنشن کے علاوہ بھی غالب کی امداد فرماتے رہتے تھے لیکن جب

احمد بخش خاں نے ۱۸۲۶ء میں ریاست اپنے بڑے بیٹے شمس الدین احمد خاں کے حوالے کر کے خود گوشہ نشینی اختیار فرمالی، تو جھگڑا پیدا ہو گیا اور غالب کو پوری پنشن کے لئے چارہ جوئی کی ضرورت محسوس ہوئی۔ نواب سر امیر الدین احمد خاں والی لوہارو فرماتے تھے کہ شمس الدین احمد خاں نے پنشن بالکل بند کر دی تھی۔ بہ ہر حال پنشن ہی کے متعلق چارہ جوئی کے سلسلے میں کلکتہ کا سفر اختیار کیا تھا۔

منازل سفر دہلی سے لے کر لکھنؤ تک کے منازل سفر کی نسبت کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔ خواجہ حالی فرماتے ہیں کہ ابتدا میں لکھنؤ ٹھہرنے کا قصد نہ تھا:

> مگر چونکہ لکھنؤ کے بعض ذی اقتدار لوگ مدت سے چاہتے تھے کہ مرزا (غالب) ایک بار لکھنؤ آئیں اس لئے کانپور پہنچ کر ان کو خیال آیا کہ لکھنؤ بھی دیکھتے چلیے۔

قیام لکھنؤ بہ ہر حال غالب ماہ ذی قعدہ ۱۲۴۲ھ میں لکھنؤ میں تھے۔ اکابر لکھنؤ نے ان کا پرتپاک خیر مقدم کیا۔ امید تھی کہ پادشاہ لکھنؤ سے انہیں اچھی رقم مل جائے گی۔ اس وجہ سے وہ کافی دن ٹھہرے رہے یا جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کان پور جا کر دوبارہ لکھنؤ آئے۔ انہوں نے پادشاہ یا نائب السلطنت کے لئے کوئی قصیدہ نہیں کہا تھا۔ آخر الذکر کے ساتھ ملاقات کی صورت سامنے آئی تو جلدی میں ایک نثر بہ صنعت تعطیل لکھ لی، جو ان کے کلیات نثر میں موجود ہے۔[1] خود فرماتے ہیں:

> مہربانان گرد آمدند و بزرگان انجمن شدند در رفتہ رفتہ ذکر خاکساریہائے مرا بر بزم آغا میر نامی از سادات عامہ آں دیار کہ درآں روزہا بہ آہنگ معتمد الدولگی بلند آوازہ بود و بہ نثر خانی فرمانروائے آں کشور و مدار المہامی آں سلطنت اشتہار داشتند رسانیدند تا ازاں جانب ایمائے کششے رفت و ازیں سو تیز آشوبے ہوسے گل کرد چوں ملازمت قرار یافت خواستم دستمایہ عقیدت سر انجام دادن ورہ آورد عالم عبودیتے

---

[1] کلیات نثر فارسی صفحہ ۶۵

عرضہ داشتن۔ طبع از فکر قصیدہ تشنگی کرد و سینہ بریں آرزو تنگی۔ جنون شوقم بہ بیدائے کنار ناپیدائے نثر انداخت و سواد عبارتے ہم در صنعت تعطیل روشن ساخت۔

لیکن معتمد الدولہ سے ملاقات نہ ہو سکی۔ غالب لکھتے ہیں :

اگرچہ وقت اقتضاء دیدن آں جا پسند نہ کرد و آں ہوس از سینہ بدر رفت اما آں مسودہ در سفینہ ماند۔

غالب نے ملاقات نہ ہو سکنے کی وجہ محض یہ لکھی ہے :

آنچہ در باب ملازمت قرار یافت، خلاف آئین خویشتن داری و ننگ شیوہ خاکساری بود تفصیل ایں اجمال و توضیح ایں ابہام جز بہ تقریر بر ادا نتواں کرد۔

خواجہ حالی فرماتے ہیں کہ غالب نے ملاقات کی دو شرطیں پیش کی تھیں۔

(۱) نائب السلطنت غالب کی تعظیم دیں۔

(۲) نذر پیش کرنے سے انہیں معاف رکھا جائے۔

یہ شرطیں منظور نہ ہوئیں اور ملاقات کی صورت بن کر بگڑ گئی۔

آغا میر کے متعلق غالب کی رائے | غالب رائے چھجمل کو معتمد الدولہ کے متعلق لکھتے ہیں :

ہرچہ در آں بلاد از گرم پیشگی و فیض رسانی ایں گدا طبع سلطان صورت اجنبی معتمد الدولہ آغا میر شنیدہ مے شد بخدا کہ حال برعکس است در ابتدائے دولت ہر گاہ آلت حصول مدعائے خود دید مجتبے پیچیدہ لا جرم یک دو کس ہر رنگ متمتع گشتند واکنوں کہ از استحکام اساس دولت خود خاطرش جمع است در بند جمع زر افتادہ است جملہ خانہ زادہائے قدیم لکھنؤ از بیداد ایں بیرحم بہ سیلاب فنا رسیدہ و ناز پروردگان ایں بار آوارۂ جہات گیتی گردیدہ واو خود از تنگدستی و اسراف خود پشیماں شدہ واز ایں شیوہ برگشتہ۔ بالجملہ بازار بیداد گرم است مہاجنان و ساہوکاران و تاجران پنہاں پنہاں زر و مال خود بہ کانپور مے رسانند و ایمن نیند۔ ہر کہ بود گریخت و ہر کہ ہست در بند گریختن است چوں حال ایں بار بدیں رنگ است آں خوشتر کہ سخن از خود بگویم بتاریخ بست و ششم ذی قعدہ روز جمعہ از ستم آباد برآمدم و بتاریخ بست و نہم در دار السرور کانپور رسیدم ایں جا دو سہ مقام گزیدہ رہگرائے باندہ مے شوم۔

معتمد الدولہ آغا میر کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اسے ذاتی ناکامی پر دل تنگی کا نتیجہ قرار نہ دیا جائے بلکہ یہ حرفاً حرفاً درست ہے[1]

غالب کے اردو دیوان میں ایک غزل کے آخر میں قطعہ ہے :

لکھنؤ آنے کا باعث نہیں کھلتا یعنی — ہوسِ سیر و تماشا سو وہ کم ہے ہم کو
مقطعِ سلسلۂ شوق نہیں ہے یہ شہر — عزمِ سیرِ نجف و طوفِ حرم ہے ہم کو
لئے جاتی ہے کہیں ایک توقع غالب — جادۂ رہ کششِ کافِ کرم ہے ہم کو

اشعار سے صاف ظاہر ہے کہ یہ غزل لکھنؤ میں کہی گئی۔ اغلب ہے اس زمانے کے کسی مشاعرہ کی طرح پر کہی گئی ہو اور مشاعرہ میں پڑھی گئی ہو "

[1] آغا میر کا نام سید محمد اور خطاب معتمد الدولہ مختار الملک رستم جنگ تھا۔ وہ اصلاً کشمیری تھا، اور غازی الدین حیدر کی ولیعہدی کے زمانے میں خانساماں کے عہدے پر مامور تھا۔ مسند نشینی کے سلسلے میں اس نے غازی الدین حیدر کی اعانت میں سرگرم حصہ لیا۔ انہی خدمات کے جلدو میں وزارت کا خلعت پایا لیکن تین برس کے بعد وہ معزول ہو گیا۔ جب انگریزی مصالح نے اودھ کو شاہانِ دہلی کے حلقۂ اطاعت سے آزاد کرانا چاہا تو آغا میر پھر بر سرِ اقتدار آ گیا۔ اسی کی تجویز کے مطابق غازی الدین حیدر پادشاہ بنے اور خود اسے نائب السلطنت کا عہدہ مل گیا۔ اس وقت سے لیکر غازی الدین حیدر کی وفات تک آغا میر خود مختار بادشاہ کی طرح کام کرتا رہا۔ جسے چاہا آگے بڑھایا، جسے چاہا پیچھے ہٹایا، جسے چاہا نکالا، جسے چاہا رکھا۔ غازی الدین حیدر کو مسکرات کا عادی بنا کر سارے اختیارات خود سنبھال لئے تھے۔ اسکے زمانۂ اقتدار کے عجیب و غریب واقعات سُنے گئے ہیں۔ مثلاً ایک ساہوکار سے لاکھ روپے کا گوٹا کناری خریدا۔ جب اس نے روپیہ مانگا تو آغا میر نے مشورہ دیا کہ تم پادشاہ سے ملاقات کر لو۔ اقران و اماثل میں تمہارا اعتبار بڑھ جائے گا۔ وہ غریب راضی ہو گیا۔ سوء اتفاق سے اس کا جسم بہت فربہ اور رنگ بہت سیاہ تھا۔ باریابی کے لئے شاہی محل میں پہنچا۔ بادشاہ باہر آئے تو دور سے اسے دیکھتے ہی گھبرا کر پکار اٹھے "یہ کون ہے یہ کون ہے" خدام نے آغا میر کی ہدایت کے مطابق عرض کیا کہ دیو یا جن معلوم ہوتا ہے۔ پادشاہ نے شور مچایا "اسے پکڑو" "اسے پکڑو" اور خود اندر چلے گئے۔ غریب ساہوکار پکڑا گیا۔ جب اس نے دیکھا کہ ذلت انتہا کو پہنچنے والی ہے تو آغا میر کے قدموں پر گر پڑا اور دس لاکھ روپے کی فارغ خطی لکھ دی۔

ایک اور واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ بادشاہ کا ایک منہ چڑھا مصاحب تھا۔ آغا میر نے اسے حکماً گھر بٹھا دیا۔ بادشاہ نے اس کے متعلق بار بار پوچھا لیکن ہر دفعہ جواب ملا کہ وہ مر چکا ہے۔ ایک روز پادشاہ باہر سیر کر رہے تھے تو وہ مصاحب فاصلے پر نظر آیا۔ غازی الدین حیدر نے کہا دیکھو وہ فلاں شخص ہے۔ آغا میر اور اس کے رفیقوں نے متعجب ہو کر عرض کیا خدامِ بارگاہ کو تو نظر نہیں آتا۔ حضور کی آنکھوں پر سب کچھ روشن ہے اس لئے عالمِ ارواح کی مخلوق بھی صاف نظر آتی ہے۔ پادشاہ ہر چند کہتا رہا کہ اسے بلاؤ لیکن آغا میر نے یقین دلایا کہ وہ شخص مر چکا ہے، اور پادشاہ کو شخص اسکی روح مجسم صورت میں نظر آتی ہے۔

غرض آغا میر نے آٹھ دس برس تک اودھ کو بہت بُری طرح برباد کیا۔ آخر میں پادشاہ سے انگریزوں کو قرض دلا کر اس کا سود اپنے نام لکھوا لیا۔ غازی الدین حیدر کی وفات کے بعد نصیر الدین حیدر پادشاہ ہوئے انہوں نے چند ماہ کے بعد آغا میر کو معزول کیا اور اس سے حساب لینے کی کوشش کی لیکن انگریز آغا میر کے معاون بن گئے۔ دو برس تک وہ انگریزوں کی حفاظت کے بھروسے پر لکھنؤ میں خانہ نشین رہا۔ آخر سنہ ۱۸۳۰ء میں انگریزوں کی حفاظت میں لکھنؤ سے نکل کر اپنے مال و متاع سمیت کانپور آ گیا۔ وہیں دو سال کے بعد وفات پائی اس کی اولاد غالباً اب تک کانپور میں ہے ۱۲ -

دیوانِ غالب کے ایک قلمی نسخہ میں جو دورانِ سفر کلکتہ میں لکھا گیا تھا، آخری شعر یوں مرقوم ہے:

لائی یاں معتمد الدولہ بہادر کی اُمید
جادۂ رہ کشش کاف کرم ہے ہم کو

یہ اس حقیقت کا مزید ثبوت ہے کہ غزل لکھنؤ میں کہی گئی "یاں" سے مقصود لکھنؤ ہے اور غالباً کسی ایسی مجلس کے لئے کہی گئی جس میں معتمد الدولہ کے شمول کا یقین تھا۔

لکھنؤ سے باندہ — لکھنؤ سے چل کر غالب کانپور ہوتے ہوئے باندہ پہنچے معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہاں ان کے رشتہ دار بھی تھے[1]۔ مولوی محمد علی خاں صدر امین باندہ کے نام انہوں نے کلکتہ کے راستے سے کئی خط بھیجے۔ جو کلیاتِ نثر میں موجود ہیں۔ ان میں سے بعض کے اقتباسات آگے آتے ہیں۔

دیوانِ[2] غالب کے جس قلمی نسخہ کا ذکر میں اوپر کر چکا ہوں اس کے حاشیہ پر بعض غزلیں مرقوم ہیں۔ اور ان پر لکھا ہوا ہے "از باندہ فرستادہ" اس سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ یہ غزلیں باندہ میں کہی گئی تھیں۔ انہی میں سے دو غزلوں کے مقطع یہ ہیں:

تھی وطن میں شان کیا غالب کہ ہو غربت میں قدر
بے تکلف ہوں وہ مشتِ خس کہ گلخن میں نہیں

[1] اُردوئے معلّٰی میں ایک خط میں نواب امین الدولہ بہادر شفق کو لکھتے ہیں:۔

"میرا ایک بھائی ماموں کا بیٹا کہ وہ نواب ذوالفقار الدولہ کی حقیقی خالہ کا بیٹا ہوتا تھا۔ اور مسند نشین حال کا چچا تھا۔ وہ باعث ہوا تھا میرے باندہ بوندیل کھنڈ آنے کا"!

یہ خط اگرچہ سفرِ کلکتہ سے بیس پچیس برس بعد کا ہے لیکن جو رشتہ غالب نے بیان کیا ہے۔ وہ یقیناً بیس پچیس برس پہلے کا ہوگا

[2] دیوانِ غالب کا یہ قلمی نسخہ حافظ محمود شیرانی مرحوم کے پاس تھا اب پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں ہے جس نے حافظ مرحوم کی کتابوں کا ایک قیمتی ذخیرہ خرید لیا تھا۔

کرتے کس منہ سے ہو غربت کی شکایت غالبؔ
تم کو بے مہری یاران وطن یاد نہیں؟

باندہ سے بنارس تک باندہ سے نکلنے کے بعد مولوی محمد علی خاں صدر امین کو جو خطوط بھیجے ان سے بعد کی چند منزلوں کا حال معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً باندہ سے روانہ ہو کر دو روز موڈہ میں قیام کیا۔ ایک رات روستا میں بسر کی۔ پھر چلہ تارا پہنچ گئے۔ فرماتے ہیں:۔

روز پنج شنبہ در موڈہ رسیدہ تا یک شنبہ بہ آرامش گرائیدد و شنبہ کوس رحیل کوفتہ شبے بہ روستا بسر بردہ سہ شنبہ در چلہ تارا رسیدہ بامداداں اگر حیات باقی است بسیچ راہ فتح پور کردہ خواہد شد۔

موڈہ سے غالبؔ نے سامان کے لئے ایک گاڑی کرایہ پر لی تھی جو بڑی سست رفتار تھی۔ اس کے انتظار میں رات روستا میں بسر کی تھی۔ دوسرے روز غالبؔ چلہ تارا پہنچ گئے۔ لیکن گاڑی وہاں بھی دیر سے پہنچی۔ موڈہ اور چلہ تارا کا درمیانی فاصلہ اگرچہ صرف بارہ کوس کا تھا۔ لیکن گاڑی کی سستی رفتار کے باعث دو روز میں بہ مشکل طے ہوا۔ فرماتے ہیں:

دو شنبہ از موڈہ بر آمدم گردونکے کہ دریں ملک بہ لڑھا موسوم است برائے بارکشیدن یافتم چوں از من ضعیف الخلقت تر افتادہ بود آں آہستہ خرام بلکہ مخرام دوازدہ کردہ راہ نتوانست برید و از موڈہ تا چلہ تارا نہ رسید ناچار شبے بہ دیہے (روستا) اتفاق اقامت افتاد۔ سہ شنبہ آخر شب رواں شدم۔ من خود دو پہر روز بر آمدہ بہ سرائے چلہ تارا رسیدم و آں ہیچ خرام بلکہ مخرام تا ساعتے از شب نہ گذشت، بہ من نہ پیوست۔

میرزا مغل نے باندہ میں کہہ دیا تھا کہ اگر مولوی محمد علی خاں کو خط بھیجنا ہو تو چلہ تارا کے تھانہ دار کو دے دینا۔ غالبؔ نے چلہ تارا پہنچ کر خط لکھا۔ تھانہ دار سرائے میں آیا۔ اور ادھر ادھر پھرنے لگا۔ تو غالبؔ نے ارسال خط کے باب میں اعانت چاہی تھانہ دار

نے خط بھیجنے کی ہامی بھر لی، لیکن انداز گفتار غالباً ناخوشگوار تھا۔ غالب اس سے اتنے مکدر ہوئے۔ کہ خط تھانہ دار کے حوالے کرنے کے بجائے ایک مُسافر کو دے دیا جو باندہ جا رہا تھا۔ لکھتے ہیں:

میرزا مغل صاحب در باندہ فرمودہ بودند کہ عریضہ مولوی صاحب بہ تھانہ دار چلہ تار حوالہ باید کرد تا او خواہد رساند۔ اتفاقاً آخر روز بلکہ اول شب بہ کاروان سرائے چلہ تار در انتظار گردونک واماندگان راہ نشستہ بودم کہ ناگاہ تھانہ دار بہ کاروان سرا رسید و ہر سو خرامیدن آغاز کرد۔ در باب رسال نامہ اعانت جستم، اگرچہ پذیرفت، اما پذیرفتن سخت سفیہانہ بود چنانکہ طبع اباکرد و گوارا نہ شد مکتوب بہ وے دادن۔ رہروے مجہول الاحوال چوں نام جناب از من شنود نامہ بہ عجز از من طلب کرد

پہلے خط میں غالبؔ نے لکھا تھا۔ کہ وہ چلہ تارا سے فتحپور جائیں گے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ گاڑی کی سُستی رفتار سے تنگ آکر مجبوراً فیصلہ کر لیا۔ کہ کشتی میں سوار ہو کر دریا کے راستے الہ آباد پہنچیں۔ وہ لکھتے ہیں:۔

آخر از بیداد گردون دوں ستوہ آمدہ خود را بہ دریا انداختم یعنی ہم ازیں مقام کشتی بہ کرایہ گرفتہ و آدم و متاع ہمہ در وے گنجیدہ و بسم اللہ مجریہا و مرسٰہا بر خواندہ سفینہ در رود جمن رانده ام منظور ایں کہ بہ الہ آباد رسیدہ توقفے کہ در بنارس مے خواستم کرد، ہم دریں بقعہ کار بندم و روزے چند آسایشے کردہ مالیحتاج بہ امضا رسانده رہگرا شوم و دیگر جز مرشد آباد بہ بنگالہ در ہیچ جا توقف نہ گزینم، حال سفر دریا نیز دریں دو سہ روز پنہاں نخواہد ماند۔ کشتی باناں گویند کہ در عرصہ سہ روز بہ الہ آباد رسیدہ خواہد شد۔ مے تواں دید۔ اینک روز چہار شنبہ قریب نیم روز در کشتی نشستہ دل بہ خدا نہ بہ ناخدا، بستہ ام۔

یہ معلوم نہیں ہوسکا۔ کہ غالب الہ آباد میں کتنے روز ٹھہرے۔ اور وہاں سے بنارس پہنچ کر کتنی مدت قیام کیا۔ لیکن یہ یقینی ہے۔ کہ وہ بنارس میں بھی کافی مدت ٹھہرے رہے۔ اس شہر کی تعریف میں ان کی ایک مثنوی موسوم بہ "چراغ دیر" ہے، جو فارسی کلیات نظم میں موجود ہے۔

ایک خط سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ باندہ ہیں وہ درد سر اور بخار سے علیل ہو گئے تھے۔
مولوی محمد علی خاں صاحب صدر امین باندہ کو چلۂ تار سے لکھتے ہیں:

للہ الحمد کہ زحمت صداع و حمی از ساحت طبع رخت بر بست۔

پھر لکھتے ہیں:

للہ الحمد زحمت صداع و حمی ہم از باندہ اثرے در طبع نہ گزاشتہ، ضعف اگر باقی است تردد ے نیست، کہ ایں رفیق است، کہ از وطن تا بہ ہمراہی بستہ است۔

قیام بنارس

بنارس سے رائے چھجمل کو لکھتے ہیں:

چہ نویسم کہ از مناسخ نوشتہ ہا چہ تہی دست افتادہ ام اگر از داخلیات گفتہ آید ہماں رنج معدہ و امعا است و ہماں برودت جگر و حرارت قلب و ضعف قوے، اگر از خارجیات سخن راندہ نشود بیش ازیں نیست کہ:

مغلوب سطوت غم دل غالب حزیں کاندر تنش ز ضعف تواں گفت جاں نبود
گویند زندہ تا بہ بنارس رسیدہ است "ما را زیں گیاہ ضعیف ایں گماں نبود"

بنارس میں قیام کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ غالب خود ایک خط میں مولوی محمد علی خاں کو لکھتے ہیں:

عطوفت نامہ در ایام خاک نشینی ہائے بنارس چشم بخت را ز رے و بخت چشم را عروجے بخشیدہ بود۔

مناسبت مقام کا اقتضاء یہ ہے کہ مثنوی "چراغ دیر" کے بعض اہم حصے یہاں پیش کر دیئے جائیں۔ اس کا آغاز یوں ہوا ہے:

نفس با صور دمساز است امروز خموشی محشر راز است امروز
رگ سنگم شرارے مے نویسم کف خاکم غبارے مے نویسم

احباب دہلی کی شکایت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

ز دہلی تا بروں آوردہ بختم بہ طوفان تغافل دادہ رختم
کس از اہل وطن غمخوار من نیست مرا در دہر پنداری وطن نیست
ز ارباب وطن جو ہم سہ تن را کہ رنگ و روئے اند ایں انجمن را

چو خود را جلوہ سنجِ ناز خواہم
ہم از حق فضل حق[1] را باز خواہم

چو حرزِ بازوے ایماں نویسم
حسام الدین[2] حیدر خاں نویسم

چو پیوند قباے جاں طرازم
امین الدین[3] احمد خاں طرازم

گرفتم کز جہان آباد رفتم
مرا بیناں را چرا از یاد رفتم

مگو داغِ فراقِ بوستاں سوخت
غم بے مہری ایں دوستاں سوخت

جہان آباد گر نبود الم نیست
جہاں آباد باد جاے کم نیست

ان تمہیدات کے بعد بنارس کا ذکر فرماتے ہیں:

تعالے اللہ بنارس چشم بد دور
بہشت خرم و فردوس معمور

بنارس را کسے گفتا کہ چین است
ہنوز از گنگ چینش بر جبین است

بہ خوش پرکاری طرزِ وجودش
ز دہلی مے رسد ہر دم درودش

بنارس کے متعلق ہندوؤں کے عقیدے کی تشریح کرتے ہوئے کہتے ہیں:

تناسخ مشرباں چوں لب کشایند
بہ کیشِ خویش کاشی را ستایند

کہ ہر کس کاندراں گلشن بمیرد
دگر پیوندِ جسمانی نگیرد

چمن سرمایۂ اُمید گردد
بہ مردن زندۂ جاوید گردد

اس کے بعد حسن بنارس کے کیف و جوش کو غالب کی مینائے سخن میں ملاحظہ فرمایئے:

---

[1] مولوی فضل حق خیرآبادی آخری دور میں معقول کے امام تھے۔ غالب کے نہایت عزیز دوست تھے۔ غدر کے بعد انڈمان بھیجے گئے۔ وہیں وفات پائی۔

[2] مبارز الدولہ ممتاز الملک حسام الدین حیدر خاں بہادر حسام جنگ فرمانروایان اودھ کے اقربا میں سے تھے لیکن لکھنؤ سے دہلی چلے آئے دربار شاہی میں ممتاز حیثیت کے مالک تھے غالباً ۱۲۴۲ھ میں فالج سے انتقال ہوا شاعر بھی تھے نامی تخلص فرماتے تھے غالب نے ان کے دیوان کا دیباچہ فارسی میں لکھا ہے۔ جو کلیات نثر میں موجود ہے انکی حویلی بلی ماراں میں تھی نجف قلی خاں آخری دور کے ایک مشہور امیر تھے جو ہندو سے مسلمان ہوئے۔ ان کی صاحبزادی سے حسام الدین حیدر خاں کی شادی ہوئی تھی۔ اور جہیز میں کافی جاگیر ملی تھی۔

[3] نواب امین الدین احمد خاں جو بعد میں لوہارو کے فرمانروا بنے۔

بیا اے غافل از کیفیت ناز ... نگاہے بر پریزاد آتش انداز
ہمہ جانہاے بے تن کن تماشا ... ندارد آب و خاک ایں جلوہ حاشا
نہادِ شاں چو بوے گل گراں نیست ... ہمہ جانند جسمے درمیاں نیست
خس و خارش گلستاں است گوئی ... غبارش جوہرِ جاں است گوئی

. . . .

کفِ ہر خاکش از مستی کنشتے ... سرِ ہر خارش از سبزی بہشتے
سوادش پایۂ تختِ بُت پرستاں ... سراپایش زیارت گاہِ مستاں
عبادت خانۂ ناقوسیان است ... ہمانا کعبۂ ہندوستان است
بتانش را ہیولے اشعلۂ طور ... سراپا نور ایزد چشمِ بد دُور
میاں ہانازک و دلہا توانا ... ز نادانی بہ کارِ خویش دانا
تبسم بسکہ در لبہا طبیعی است ... دہنہا رشکِ گلہاے ربیعی است

. . . .

بہ لطف از موجِ گوہر نرم رو تر ... بہ ناز از خونِ عاشق گرم دو تر
بہ سامانِ دو عالم گلستاں رنگ ... ز تابِ رُخ چراغانِ لبِ گنگ
قیامت قامتاں مژگاں درازاں ... ز مژگاں در صفِ دل نیزہ بازاں

پھر فرماتے ہیں کہ میں نے ایک رات ایک روشن بیان سے جو زمانہ کی گردش کے اسرار سے آگاہ تھا، سوال کیا کہ جہان سے نیکی، وفا اور محبّت رُخصت ہو چکی ہے۔ ایمان کا محض نام باقی رہ گیا ہے۔ باپ بیٹوں کی خونریزی کے درپے ہیں بیٹے آبا کے دشمنِ جاں ہیں، بھائی بھائی سے سرگرمِ جنگ ہے۔ موافقت اُٹھ گئی ہے۔ گویا قیامت کی تمام علامتیں نمودار ہو چکی ہیں، لیکن قیامت کیوں نہیں آتی؟

بہ نفخِ صور تعویق از پئے چیست؟ ... قیامت را عنانگیرِ جنوں کیست؟

سوے کاشی بہ انداز و اشارت | تبسم کرد و گفتا! "ایں عمارت
حقا نیست صانع را گوارا | کہ از ہم ریزد ایں رنگیں بنارا"

آخر میں اپنی دردانگیز حالت نہایت موثر و دلنشیں انداز میں بیان کرتے ہیں:

الا اے غالبِ کارا وفتادہ | ز چشم یار و اغیار اوفتادہ
چو بوئے گُل ز پیراہن بروں آے | بہ آزادی ز بندِ تن بروں آے
مدہ از کف طریقِ معرفت را | سرت گردم بہ گرد ایں شش جہت را
فرو ماندن بہ کاشی نارسائی است | خدارا ایں چہ کافر ماجرائی است
بہ کاشی لختے از کاشانہ یاد آر | دریں جنت ازاں ویرانہ یاد آر
دریغا در وطن وا ماندۂ چند | بخونِ دیدہ ز درق راندۂ چند
ہوس را پائے در دامن شکستہ | بہ اُمید تو چشم از خویش بستہ
بہ شہر از بے کسی صحرا نشیناں | بروئے آتشِ دل جا گزیناں
جگر کاں قوم را دبر آفریدہ | ز سیماب بہ آتش آرمیدہ
ہمہ در خاک و خوں افگندۂ تو | بہ حکمِ بیکسیہا بندۂ تو
چو شمع از داغ دل آزر فشاناں | بہ بزمِ عرضِ دعوٰی بے زباناں
سر و سرمایہ غارت کردۂ تو | ز تو نالاں ولے در پردۂ تو
از آنانت تغافل خوشنما نیست | بہ داغ شاں ہوائے گل روا نیست

غالب کے اہل و عیال کی کیفیت اور اس کیفیت کے لئے غالب کی ذمہ داری اس سے بہتر کیا بیان ہو سکتی ہے؛ اپنے پیش نظر کام کی نسبت لکھتے ہیں:

ترا اے بے خبر کار است در پیش | بیا باتے و کہسار است در پیش

. . . .

ترا از اندوہ مجنوں بود باید | خراب کوہ و ہاموں بود باید

تن آسانی بہ تاراج بلا دہ   چو بینی رنج خود را رو نماده

شرر آسا فنا آمادہ برخیز   بیفشاں دامن و آزادہ برخیز

اس واقعے سے تینتیس برس بعد میاں داد خاں سیاح کے ایک مکتوب کے جواب میں جو سیاح نے بنارس سے لکھا تھا، فرماتے ہیں:

بھائی بنارس خوب شہر ہے اور میرے پسند ہے، ایک مثنوی میں نے اس کی تعریف میں لکھی ہے اور "چراغ دیر" اس کا نام رکھا ہے۔ وہ فارسی دیوان میں موجود ہے، اس کو دیکھنا۔

غالباً بنارس کے کوئی صاحب اشرف حسین خاں تھے جن کا ذکر سیاح نے اپنے خط میں کیا تھا۔ غالب لکھتے ہیں:

اشرف حسین خاں صاحب میرے دوست ہیں۔ فتنہ و فساد (غدر) کے زمانے سے پہلے ان کا خط اور کچھ ان کا کلام میرے پاس آیا ہے۔ ان کو میرا سلام کہنا۔

بنارس سے روانگی

بنارس سے روانگی ہفتے کے دن عمل میں آئی۔ چاند کی نویں یا دسویں تاریخ تھی۔ مہینے کی تصریح موجود نہیں۔ غالب لکھتے ہیں:-

امروز کہ آدینہ بقول جمعے نہم ماہ و بہ اظہار گروہے دہم است در بندر بستن رخت سفرم فردا بہ روز شنبہ از بنارس مے پویم[1]۔

معلوم ہوتا ہے کہ کشتی کی سواری میں بہت آرام ملا تھا لہذا چاہتے تھے کہ کلکتہ تک کشتی ہی میں سفر کیا جائے۔ لیکن کشتی والے کرایہ بہت زیادہ مانگتے تھے اس لئے مجبوراً پٹنہ تک گھوڑے پر جانا پڑا۔ لکھتے ہیں:

ناخدایان ناخدا ترس در باب کشتی مضائقہ کردند چہ بہر گرہ بر خوردم تا کلکتہ کم از صد روپیہ نہ طلبیدند تا پٹنہ افزوں از بست روپیہ نخواست۔ ناچار ہماں اسپ سوار نابداں بقعہ صحرا نخواہم پیمود۔

---

[1] تقویم سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲۴۳ھ میں چاند کی نویں تاریخ اور جمعہ کا دن جمادی الثانی کے مہینے میں تھا۔ گویا بنارس سے غالب ۲۹ دسمبر ۱۸۲۷ء کو روانہ ہوئے۔

لیکن ان کا خیال تھا کہ پٹنہ پہنچ کر پھر کشتی کا بندوبست کریں چنانچہ فرماتے ہیں:

ہنوز ہوائے کشتی از سر بدر نہ رفتہ، در پٹنہ نیز جستجو خواہم کرد۔

کلکتہ پہنچنے کی تاریخ

پٹنہ تک کی منزلیں۔ وہاں کے قیام اور بعد ازاں کلکتہ تک کے مقامات کی نسبت کوئی سراغ ان کی تحریرات میں نہیں مل سکا صرف اتنا معلوم ہو سکا ہے کہ:

گاہے از شدت بردلیانی افسردہ و رنجور دگاہ از سختی گردش ایام تم رسیدہ و نالاں روز سہ شنبہ چہارم شعبان ۱۲۴۳ھ در کلکتہ رسیدہ[1]

"بردلیانی" سے ظاہر ہے کہ بنارس سے کلکتہ تک کا سفر دسمبر جنوری اور فروری میں ہوا یعنی غالب نے لکھنؤ سے نکل کر جہاں سے وہ میرے اندازے کے مطابق ماہ جولائی میں روانہ ہو چکے تھے۔ باندہ، الہ آباد اور بنارس میں کافی وقت گزارا۔ وہ اپریل ۱۸۲۶ء میں دہلی سے نکلے تھے اور ۲۱ فروری ۱۸۲۸ء کو کلکتہ پہنچے اس طرح سفر میں کم و بیش دس ماہ صرف کئے۔

قیام کلکتہ

کلکتہ میں شملہ بازار[2] میں مکان کرایہ پر لیا تھا۔ علی بخش خاں رنجور کو لکھتے ہیں:

[1] تقویم کے رو سے ۴ شعبان ۱۲۴۳ھ کو ۲۱ فروری ۱۸۲۸ء کی تاریخ اور سہ شنبہ نہیں بلکہ چہار شنبہ تھا۔ اگر بنارس سے جمادی الثانی میں روانہ ہوئے تو یہ دسمبر کا مہینہ تھا لا محالہ دسمبر جنوری اور فروری کے مہینے بنارس سے کلکتہ تک قطع مسافت میں بسر ہوئے۔

[2] حضرت مولانا ابو الکلام آزاد فرماتے ہیں:

لارڈ امہرسٹ غالباً پہلے گورنر جنرل ہیں جو شملہ گئے۔ اس وقت سے یہ دستور ہو گیا کہ ہر سال نہیں تو دوسرے سال گورنر جنرل گرمیاں شملہ میں بسر کریں۔ اس زمانے میں ریل نہیں تھی۔ الہ آباد یا کانپور تک کشتی سے اور پھر ڈاک گاڑی اور گھوڑے پر یہ سفر شاہانہ شان و شوکت اور ساز و سامان کے ساتھ ہوتا تھا۔ اس کی تفصیلات پونجر وغیرہ کی زبانی ہمیں معلوم ہوئی ہیں۔ ایک پورا شہر کلکتہ سے شملہ تک اور پھر شملہ سے کلکتہ تک متحرک رہتا تھا اس صورت حال کا نتیجہ یہ نکلا کہ مزدوروں اور ملازموں کا ایک بڑا گروہ کلکتہ میں صرف اسی کام کیلئے رہنے لگا۔ اور ان کے محلہ کا نام شملہ بازار پڑ گیا۔ یہ چیت پور روڈ کے اس حصے میں تھا جو اب گوگنیٹا اور کے نام سے مشہور ہوا ہے معلوم ہوتا ہے یہیں مرزا غالب ٹھہرے تھے۔ اب یہ محلہ بالکل بدل گیا۔ پرانے مکانوں کا نام و نشان باقی نہیں ریل کے جاری ہونے ہی کیمپ کے متعلقات معدوم ہو گئے تھے۔ اس لئے شملہ بازار بھی معدوم ہو گیا۔

فرود آمدن جائے من کاشانہ ایست در شملہ بازار کہ آں را روز ورود ہماں ہنگام ورود بے زحمت جستجو یافتم۔

رائے چھجمل کو اپنا پتہ اس طور پر لکھتے ہیں:

در کلکتہ قریب چیت پور بازار در شملہ بازار نزدیک تالاب در حویلی میرزا علی سوداگر بہ اسد اللہ برسد۔

مکان بڑا کشادہ اور آرام دہ تھا۔ اور اس کا کرایہ صرف دس روپئے ماہانہ تھا مولوی محمد علی خاں صدر امین باندہ کو تحریر فرماتے ہیں:

غریب نواز بہائے دہ باب بے منت را نازم کہ در چنیں دیار خانہ چنانکہ باید و ہر گونہ آسائش را بہ کار آید۔ ہم اندرا بہ اندازۂ فراغ خاطر فضائے و ہم اندروں وے مانند دہان دنیا طلبان بیت الخلائے در گوشۂ صحن پر از آب شیریں چاہے و بر طرف بام در خور اہل تنعم آرامگاہے، بے آنکہ جستجوے شود یا گفتگوے رود بے زحمت و بے منت بہ کرایہ دہ روپیہ ماہانہ بہم رسیدہ۔

کلکتہ کی تعریف — شہر کلکتہ اور بنگال کی آب و ہوا غالب کو بہت پسند آئی تھی۔ فرماتے ہیں:

نگوئی آثار رحمت الٰہی است کہ آب و ہوائے کلکتہ با من نیک در ساخت۔ و دریں لطف آسودہ تر از انم کہ در وطن آرام دادہ ام۔

غالب ز تو در ہر پردہ نوائے دارد ہر گوشۂ از دہر فضائے دارد
بر چیدہ دست از دمانم یکسر بنگالہ شگرف آب و ہوائے دارد

علی بخش خاں رنجور کو کلکتہ کی تعریف میں لکھتے ہیں:

چہ کلکتہ بجہانے از ہر گونہ کالا مالا مال بجز چارۂ مرگ ہر چہ گوئی بیش ہنر و دانش سہل و جز بخت ہر چہ خواہی بہ بازارش ارزاں۔

مولوی سراج الدین احمد کلکتہ میں غالب کے ایک نہایت عزیز دوست تھے۔ دہلی واپس آکر مولوی صاحب موصوف کو جو خط لکھے ان میں سے ایک میں فرماتے ہیں:

شمار ستائے بدیں تازگی و رنگینی کجاست، بخاک نشینی آں دیار از اورنگ آرائی مرز و بوم دیگر خوشتر ہیں و خدا کہ اگر متاہل نبودمے و طوق ناموس عیال بر گردن نہ داشتمے دامن بر ہر چہ ہست افشاندمے و خود۔

راوراں بقدمے رساندمے۔ تازیستمے دراں مینوکدہ بودمے واز رنج ہواہائے ناخوش آسودمے۔ زہے ہواہائے سرد وخوشا آب ہائے گوارا، فرخا بادہ ہائے ناب وخرما ثمرہائے شیریں۔

غالبؔ کو آم ویسے ہی بہت مرغوب تھے۔ بنگالہ کے آم بہ طور خاص پسند آئے۔ خود فرماتے ہیں:

ہمہ گر میوۂ فردوس بہ خوانت باشد
غالبؔ آں انبۂ بنگالہ فراموش مباد

کلیات نظم فارسی میں ایک قطعہ ہے جس میں سفر کلکتہ کی غرض وغائت، دہلی، بنارس، پٹنہ اور کلکتہ کی کیفیت "ساقی بزم آگہی" کی زبان سے بیان کی ہے۔ وہ ہر امر کو بطور سوال "ساقی" کے روبرو پیش کرتے ہیں۔ اور "ساقی" جواب دیتا ہے۔ یہ سوال وجواب بھی ملاحظہ فرمالیجئے:

گفتمش "چیست منشاء سفرم"؟ — گفت "جور وجفائے اہل وطن"
گفتمش "اکنوں بگو کہ دہلی چیست"؟ — گفت "جان است وایں جہانش تن"
گفتمش "چیست ایں بنارس" گفت — شاہدے مست محوِ گل چیدن
گفتمش "چوں بود عظیم آباد"؟ — گفت "رنگیں تر از فضائے چمن"!
گفتمش "سلسبیل خوش باشد" — گفت "خوشتر نہ باشد از سوہن"
حال کلکتہ باز جستم، گفت — "باید اقلیم ہشتمش گفتن"
گفتمش "آدمم بہم رسد در وے"؟ — گفت "از ہر دیارہ از ہر فن"

اس کے بعد انگریزوں کی طرز وروش کو ان لفظوں میں بیان فرماتے ہیں:

گفتمش "ایں جا چہ شغل سود دہد"؟ — گفت "از ہر کہ ہست ترسیدن"
گفتمش "ایں جا چہ کار باید کرد"؟ — گفت "قطع نظر ز شعر وسخن"
گفتمش "ایں ماہ پیکراں چہ کس اند"؟ — گفت "خوبانِ کشور لندن"

غالب جس مقصد کے لئے کلکتہ گئے تھے وہ پورا نہ ہوا یاس کے عالم میں "خوبان کشور لندن" کے متعلق مزید فرماتے ہیں:

گفتم "ایناں مگر دلے دارند؟" — گفت "دارند لیک از آہن"
گفتم "از بہر داد آمدہ ام" — گفت "بگریز و سر بہ سنگ مزن"

کلکتہ کی تعریف میں غالب نے اردو میں بھی چند شعر کہے تھے:

کلکتہ کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں — اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے
وہ سبزہ زار ہائے مطرا کہ ہے غضب — وہ نازنین بتان خود آرا کہ ہائے ہائے
صبر آزما وہ ان کی نگاہیں کہ حف نظر — طاقت ربا وہ ان کا اشارا کہ ہائے ہائے
وہ میوہ ہائے تازہ و شیریں کہ واہ وا — وہ بادہ ہائے ناب گوارا کہ ہائے ہائے

فارسی کی ایک غزل کے مقطع میں فرماتے ہیں:

غالب رسیدہ ایم بہ کلکتہ و بہ مے
از سینہ داغ دوری احباب شستہ ایم

غالب اور کلکتہ کی صحت سرائی — حضرت مولانا ابوالکلام آزاد فرماتے ہیں:

"بنگال کی سرزمین عموماً اور کلکتہ خصوصاً ہندوستان کا سب سے زیادہ نشیبی حصہ ہے آب و ہوا صد درجہ مرطوب" اور بالائی ہند کی تمام صحت افزا خصوصیات سے محروم اقتصادی اور جغرافیائی کوائف کے مصالح نے یورپین اقوام کو مجبور کیا کہ بنگال کا رخ کریں۔ اور انگریز بھی مجبور ہوئے کہ کلکتہ کو اپنے لئے جائے پناہ تصور کریں سمندر سے اس کا قرب اور دریائے ہگلی کا جہاز رانی کے قابل ہونا ان کے مصالح کے لئے نہایت قیمتی بات تھی۔

لیکن اس شہر کی آب و ہوا کی روایت ہمیشہ شمالی ہند کے باشندوں کے لئے ایک ناقابل علاج آفت رہی اٹھارہویں اور انیسویں صدی کی جس قدر تحریرات ملتی ہیں، کلکتہ کو آب و ہوا

کے اعتبار سے بدترین مقام قرار دیتی ہیں۔ سرجان شور کے زمانے میں کہ اٹھارھویں صدی کا اختتام تھا۔ ایک شاعر نے کلکتہ کی مذمت میں قطعہ لکھا تھا:

"شور فرمانروائے کلکتہ آب شور و زمیں سراسر شور

کہ بداں شد بنائے کلکتہ پارۂ از زمین دوزخ بود

ایں ہمہ تحفہ ہائے کلکتہ خارش و داد و پیچش و اسہال

انگریزوں کی شہادت کا بھی قریباً یہی حال رہا ہے ۱۸۶۱ء اور ۱۸۷۰ء کے درمیان سرجان لارنس (جو لارڈ لارنس ہو گئے تھے) لکھتے ہیں:

یہ ناممکن ہے کہ کلکتہ کی ناقص آب و ہوا میں بارہ مہینے رہ کر کام کیا جا سکے۔

امیر دوست محمد خاں کو جب ۱۸۳۸ء میں کلکتہ لائے۔ تو ابتدا میں وہ شہر کی رونق اور دریا کا کنارہ دیکھ کر بہت خوش ہوئے لیکن پھر ایک مہینا بھی پورا نہ کر سکے۔ انہوں نے لارڈ آکلینڈ کو کہلا دیا کہ مجھے کلکتہ سے رخصت کر دو ورنہ دنیا کہے گی کہ بڑے لاٹ صاحب نے دوست محمد کو مارنے کیلئے کلکتہ بلا کر رکھا تھا چنانچہ انہیں فوراً الٰہ آباد بھیج دیا گیا۔

بایں ہمہ یہ عجیب بات ہے کہ مرزا غالب دو سال تک کلکتہ رہے اور آب و ہوا کی ناموافقت انہیں یک قلم محسوس نہ ہوئی۔ اتنا ہی نہیں بلکہ وہ اس کی لطافت و خوشگواری کی مداحی میں رطب اللسان ہیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ مرزا غالب کے بہت سے رجحانات و میلان کی طرح یہ تاثر بھی ایک خاص جذبہ کا نتیجہ تھا۔ انگریزوں کے اوضاع و اطوار سے خوش اعتقادی اور ہر اس چیز کی پسندیدگی جو انگریزوں کے نزدیک پسندیدہ ہو۔ اس اعتبار سے بھی مرزا غالب اپنے عہد کی مستثنیات میں سے ہیں۔ ان کا خاندان انگریزی حکومت سے وابستہ ہو چکا تھا۔ اس لئے آنکھ کھولتے ہی وہ انگریزوں سے آشنا ہو گئے۔ انکے شباب کا زمانہ دہلی و آگرہ میں

انگریزی حکومت کا نیا نیا آغاز تھا، طبیعت چونکہ فطرۃً رسم و تقلید کی بندشوں سے آزاد تھی اور عام راہوں سے اپنی راہ الگ نکالنا چاہتی تھی، اسلئے مذہبی اور ملکی تعصب ان کے لئے سدِ راہ نہ ہو سکا اور وہ انگریزوں کے فضائل و محاسن سے شناسا ہو کر بلا رد ک گرویدہ ہو گئے۔ ہندوستانی زندگی کے تمام سانچے ٹوٹ رہے تھے۔ اور انگریزی اوضاع و اطوار اور ذہن و دماغ کا علو و غلبہ ایک غیر متعصب دماغ کو صاف صاف محسوس ہو رہا تھا۔ کلکتہ کے قیام اور میکناٹن جیسے فارسی دان انگریزوں کے تعلقات نے یقیناً اُن کی غیر متعصب طبیعت کو اور زیادہ متاثر کیا ہوگا۔ وہ قدیم آیین و فنوں کی بے مایگی اور یورپ کی جدید ترقیات و انکشافات سے بھی کافی واقفیت رکھتے تھے اور اس بارے میں ہندوستانیوں کی عام متعصبانہ ذہنیت کا ساتھ نہیں دیتے تھے۔ آیین اکبری کی تقریظ میں انہوں نے کتاب کی اہمیت سے جو انکار کیا ہے اگرچہ وہ صحیح نہیں کیوں کہ تاریخی لحاظ سے اس کی حیثیت واضح اور معلوم ہے۔ لیکن ان کے استدلال سے جدید فنون کے علم و اعتراف کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔"

آیین اکبری کی تقریظ کے وہ اشعار نقل فرمانے کے بعد جن میں جدید فنون کا ذکر ہے حضرت مولانا فرماتے ہیں:

"مرزا غالب کے ذہن کے اسی گوشہ میں ان کے افکار و امیال کی بہت سی گتھیاں سلجھائی جا سکتی ہیں۔ کلکتہ انگریزی دار الحکومت ہے اور انگریزوں کا ایک پسندیدہ مرکز۔ اس لئے عام ہندوستانیوں کی مخالفانہ رایوں کا وہ ساتھ نہیں دینگے، جو کلکتہ کی مذمت کرتے ہیں، بلکہ کلکتہ کی تعریف کریں گے۔ کلکتہ میں انگریزی عہد کے نئے کارخانے دیکھے جا سکتے ہیں وہ دوسری جگہ معدوم ہیں، اس لئے وہ کلکتہ کو تمام شہروں پر فضیلت دیں گے۔ مجھے یقین ہے کہ اُردو نثر نویسی کا جو اسلوب بے اختیار

ان کے قلم سے نکلنے لگا، اس کی تہ میں بھی انگریزوں کے ذوق و مشرب اور پسندیدگی کا اثر مضمر ہوگا۔

فورٹ ولیم کالج کی بناء سے لے کر غالب کے عہد تک انگریزی سر رشتہ تعلیم کے ارکان کی برابر کوشش رہی کہ سہل اور رواں اُردو نثر کی جرأت افزائی کی جائے اور فارسی انشاء پردازیوں کے تکلفات سے اجتناب کیا جائے۔ یہ چیزیں غالب کی نظر سے گزری ہوں گی اور اس کا اثر اندر ہی اندر کام کر رہا ہوگا خط و کتابت میں قدیم اسلوب القاب و تخاطب سے بکلی احتراز اور محض کسی ایک نام و لقب سے یاد کر کے براہِ راست حرفِ مطلب پر آجانا، جو اس عہد میں ایک غیر معمولی بات تھی، یقیناً انگریزی اسلوب کے تاثر سے سامنے آئی ہوگی، خاتمہ پر نئے طریقے سے اپنا نام لکھنا اور لفافے پر عام اسلوب عنوان کی جگہ صاف و سادہ طریقہ اختیار کرنا، اس طرح کے امیال کو بھی اسی روشنی میں لاکر دیکھنا چاہیئے۔ غالب کی ذہنیت کی یہ تحلیل اگر سامنے رکھ لی جائے تو بہت سے سوالوں کا جواب مل سکتا ہے۔

اگرچہ اس کا کوئی ثبوت نہیں کہ غالب نے انگریزی ناولوں کو سُنا ہو، لیکن یہ واقعہ یاد رکھنا چاہیئے کہ ایک دو چیزیں کلکتہ میں ترجمہ ہو کر چھپ چکی تھیں۔ ایک مجتہدانہ ذوق رکھنے والی طبیعت ان سے نتائج اخذ کر سکتی تھی، مثلاً گولڈ اسمتھ کا قصہ دیہاتی زندگی والا (دیکر آف ویکفیلڈ) ایک صاحب نے ترجمہ کر کے ۱۸۲۶ء میں چھپایا تھا۔

ایک اور شہادت

حضرت مولانا کا یہ ارشاد بالکل بجا ہے کہ اٹھارھویں اور انیسویں صدی کی تمام تحریرات میں کلکتہ کو بہ اعتبار آب و ہوا ناخوشگوار مقام قرار دیا گیا ہے بلکہ بعض لوگ آب و ہوا سے گزر کر خود اہلِ کلکتہ کی مذمت میں بھی متامل نہ ہوتے۔ مثلاً شعری کشمیری غالب کے برسوں بعد کلکتہ گئے تھے۔ وہ فرماتے ہیں:

نہ دیدم مردمی در دیدۂ اعیان کلکتہ   ز بینش لاف بے ہودہ زدہ کوران کلکتہ

بہ شب آرام و روز آسایش آنجا کم تواں دیدن — متاعِ لپشہ و مور است در انبان کلکتہ

اگر مشرق بہ پرسی بجانبِ مغرب نمایندت — فریبِ اصلا نخواہی خورد از غولانِ کلکتہ[1]

غالب کے ہمدرد دوست — اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ غالب صرف پنشن کے مقدمہ کیلئے کلکتہ گئے

تھے اور وہ زیادہ تر اسی سلسلے میں حکام سے ملتے رہے۔ اس مقدمے کے پورے حالات ایک علیحدہ باب میں بیان ہوں گے۔ جو اصحاب کلکتہ میں غالب کی مدعا طلبی اور مجوئی میں سرگرمی سے معاون رہے۔ ان میں سے نواب اکبر علی خاں طباطبائی، مولوی سراج الدین احمد اور منشی محمد حسن بہ طور خاص قابل ذکر ہیں۔

نواب اکبر علی خاں طباطبائی امام باڑہ ہوگلی کے متولی تھے۔ مولوی محمد علی خاں صدر امین باندہ نے انکے نام تعارفی خط دیا تھا۔ غالب کلکتہ پہنچ کر دو روز کے بعد ہوگلی بندر گئے۔ نواب صاحب سے ملے اور ان کے تپاک، محبت، ہمدردی اور حسنِ اخلاق سے بے حد متاثر ہوئے۔ خود فرماتے ہیں کہ ایسا عالی پایہ اور صاحب دل امیر بنگال میں دوسرا نہ ہوگا۔ ملاقات کے ساتھ ہی نواب اور غالب کے درمیان محبت و وداد کا مستحکم رشتہ پیدا ہو گیا۔ اس زمانے میں نواب خود امام باڑہ کے مقدمے میں اُلجھے ہوئے تھے۔ غالب لکھتے ہیں :-

آرے کے دریں روزہا نواب را با حکام ہوگلی بندر در خصوص زمینے کہ وقف امام باڑہ است معارضہ بلکہ مجادلہ در پیش و دل سرگرم فکر خویش است للہ در قائل :-

ہمہ را داتی حسرت دنیا دیدم

چوں بہ عشرت کدہ گبر و مسلماں رفتم[2]

مولوی سراج الدین احمد غالباً موہان کے باشندے تھے اور کاروبار کے سلسلے میں

---

[1] دیوان شعری موسوم بہ مراۃ الخیال" [2] کلیات نثر صفحہ ۱۶۷

کلکتہ پہنچے ہوئے تھے۔ ان کے ساتھ گہرے رابطہ مودت کی کیفیت خود غالب کی زبان سے سنئے۔ خواجہ غلام غوث خاں بے خبر کو لکھتے ہیں :-

ستر ہزار آدمی نظر سے گزرے ہوں گے زمرۂ خواص میں سے، عوام کا شمار نہیں۔ دو مخلص صادق الوداد دیکھے: ایک مولوی سراج الدین رحمۃ اللہ علیہ دوسرا منشی غلام غوث خاں سلمہ اللہ تعالےٰ۔ لیکن وہ مرحوم حسن صورت نہیں رکھتا تھا، اور خلوص اخلاص اس کا خاص میرے ساتھ تھا۔

ایک فارسی غزل کے مقطع میں فرماتے ہیں :-

با سراج الدین احمد چارہ جز تسلیم نیست
ورنہ غالب نیست آہنگ غزل خوانی مرا

غالب نے اپنے منتخب اردو اور فارسی اشعار کا جو مجموعہ "گل رعنا" کے نام سے مرتب کیا تھا[1] وہ مولوی سراج الدین احمد ہی کی فرمائش کا نتیجہ تھا۔ جس زمانے میں "دستنبو" چھپی، مولوی صاحب موصوف لکھنؤ آئے ہوئے تھے، چنانچہ "دستنبو" کا ایک نسخہ انہیں بھیجنے کی تاکید کرتے ہوئے منشی شیو نرائن کو ان کا پتہ یہ بتاتے ہیں :

در لکھنؤ بہ احاطہ خانساماں متصل تکیہ شبر علی شاہ بہ مکانات مولوی عبدالکریم مرحوم بخدمت مولوی سراج الدین احمد برسد۔

منشی محمد حسن غالباً گورنر جنرل کے دفتر میں ملازم تھے۔ مثنوی "باد مخالف" منشی صاحب موصوف اور نواب اکبر علی خاں ہی کے ایماء پر لکھی گئی تھی۔

احمد بیگ خاں تپاں اور ابوالقاسم قاسم

غالب کے قیام کلکتہ کے سلسلہ میں تپاں اور قاسم کا ذکر بھی ضروری ہے۔ مرزا احمد بیگ خاں تپاں غالب کے رشتہ داروں

---

[1] افسوس کہ یہ مجموعہ شائع نہ ہوا۔ اس کا ایک نسخہ مولانا حسرت موہانی کے پاس ہے۔

ہیں[1] سے تھے کلکتہ میں وہ صدر دیوانی میں مختار تھے۔ ابوالقاسم قاسم کے متعلق کوئی تفصیل معلوم نہیں ہو سکی وہ فارسی کے شاعر تھے۔ غالب کی مہارت فن طب کی ستائش میں انہوں نے ایک قطعہ لکھا تھا جس کے جواب میں غالب نے دو قطعے لکھے۔ ان کا ذکر پہلے آ چکا ہے۔ ان دونوں کی مدح میں غالب نے ایک غزل بھی کہی تھی۔ جو آج تک اُن کے مجموعہ کلام اُردو میں شامل نہیں ہو سکی[2] غزل یہ ہے:-

دیکھنے میں ہیں گرچہ دو، پر ہیں یہ دونو یار ایک — وضع میں گو ہوئی دو سر، تیغ ہے ذوالفقار ایک

ہم سخن اور ہم زباں حضرت قاسم و تپاں[3] — ایک تپش کا جانشیں، درد[4] کا یادگار ایک

نقد سخن کے واسطے ایک عیار آگہی — شعر کے فن کے واسطے مایۂ اعتبار ایک

ایک وفا و مہر میں تازگی بساط دہر — لطف و کرم کے باب میں زینت روزگار ایک

گلکدۂ تلاش کو ایک ہے رنگ ایک بو — ریختہ کے قماش کو ایک ہے پود تار ایک

مملکت کمال میں ایک امیر نامور — عرصۂ قیل و قال میں خسرو نامدار ایک

گلشن اتفاق میں ایک بہار بے خزاں — میکدۂ وفاق میں بادۂ بے خمار ایک

زندۂ شوق شعر کو ایک چراغ انجمن — کشتۂ ذوق شعر کو شمع سر مزار ایک

---

[1] غالب خود لکھتے ہیں "مرزا احمد بیگ خاں ابن مرزا ہادی بیگ خاں برادر زن مہین برادر نواب احمد بخش خاں مرحوم بود (کلیات نثر فارسی صفحہ ۱۷۰) اس سے خاندان لوہارو کے ساتھ احمد بیگ خاں کی رشتہ داری بالکل آشکارا ہے عبدالغفور خاں نساخ نے خدا جانے کس بنا پر اسے "ولد عطاء اللہ خاں" لکھا (سخن شعرا صفحہ ۳۰۲) نساخ یہ بھی کہتے ہیں۔ کہ وہ تغتمش خاں والی دشت قبچاق کے اخلاف میں سے تھا۔ ۱۸۳۲ء میں وفات پائی

[2] پروفیسر مسعود حسن صاحب رضوی ادیب ایم۔ اے کے پاس ایک قلمی بیاض ہے جس میں غالب کے قریباً پچاس غیر مطبوعہ خطوط اور چند نظمیں ہیں۔ ان کے چند اقتباسات اور قاسم اور تپاں کے مدحیہ اشعار رسالہ الناظر، لکھنؤ (دسمبر ۱۹۳۲ء) میں چھپے تھے

[3] مرزا جان تپش احمد بیگ ان کے شاگرد تھے۔

[4] میر درد دہلوی سے قاسم کا سلسلہ تلمذ غالباً میر درد تک پہنچتا تھا۔

دونوں کے دل حق آشنا، دونوں رسولؐ پر فدا　　ایک محبِ چار یار، عاشقِ ہشت وچار ایک

جانِ وفا پرست کو ایک نسیمِ نو بہار　　فرقِ ستیزہ مست کو ابرِ تگرگ بار ایک

لایا ہے کہہ کے یہ غزل شائبۂ ریا سے دور

کر کے دل و زبان کو غالبؔ خاکسار ایک

ادبی ہنگامہ — سفرِ کلکتہ کی صرف ایک ضروری چیز باقی رہ گئی ہے یعنی وہ ادبی ہنگامہ جس کے نتیجے میں غالبؔ کو مثنوی "بادِ مخالف" لکھنی پڑی۔

انہیں فارسی زبان سے طبعی مناسبت تھی۔ ادبی مذاق نہایت سلجھا ہوا اور اسلوبِ فکر بالکل اچھوتا تھا۔ ملا عبد الصمد کی دو سالہ تربیت نے ان کے نادر طبعی جوہروں کو یگانہ جلا دے دی تھی۔ عنفوانِ شباب ہی میں انہوں نے جو کچھ کہا تھا اسے بے تکلف فارسی زبان کے بہترین اور مشہور ترین اساتذہ کے کلام کے برابر رکھا جا سکتا تھا۔ وہ ہندوستان کے ان فارسی گو شعرا کو کب خاطر میں لا سکتے تھے جن کی زبان، اسلوبِ بیان، اندوختۂ فکر غرض ہر چیز فرومایہ تھی؟ اس زمانے میں قتیلؔ اور واقفؔ کو اساتذۂ فن مانا جاتا تھا۔ انہی کی سندیں مجالسِ شعر و ادب میں معیار کے طور پر پیش ہوتی تھیں۔ غالبؔ خود عرفیؔ، ظہوریؔ، نظیریؔ اور حزیںؔ کی ہم پایگی کے دعویدار تھے اور یہ دعویٰ بے جا نہ تھا۔ ان کی شانِ کمال قتیلؔ و واقفؔ جیسے شاعروں کے سامنے کیونکر سرِ اعتراف خم کر سکتی تھی۔

جس زمانے میں وہ کلکتہ پہنچے، ہر انگریزی مہینے کے پہلے اتوار کو مدرسہ کلکتہ میں مشاعرہ ہوتا تھا، جس میں فارسی اور اردو کے اکثر شعرا شریک ہوتے تھے۔ غالبؔ کے اعزاز میں ایک خاص مشاعرہ منعقد کیا گیا۔ اتفاق سے اس زمانے میں حاکمِ ہرات کی طرف سے ایک سفارت کلکتہ آئی ہوئی تھی، جس کے رئیس کفایت خاں نام ایک خوش ذوق اہلِ علم تھے۔

۱؎ مرزا احمد بیگ جو سنی تھے۔　　۲؎ قاسم جو شیعہ تھے۔

وہ مشاعرے میں شریک ہوئے۔ شعرائے کلکتہ نے اپنی غزلیں سنائیں، تو کفایت خاں ان کے پوچ کلام پر زیرِ لب تبسم فرماتے رہے۔ لیکن جب غالبؔ نے غزل پڑھی تو خان ممدوح نے دل کھول داد دی[1]۔ عام مجلس خواں شعرا کے ضبط و صبر کی فرومایگی اور جذبۂ حسد و رقابت کی ذکاوت معلوم ہے۔ وہ ایک غریب الدیار کے علوِ کمال اور یگانگیِ فن کی قدر شناسی کے بجائے اس کے دشمن بن گئے۔ اور جیسا کہ فرومایہ اور ننگ حوصلہ شعرا کا شیوہ ہے۔ غالبؔ کے کلام میں عیب تلاش کرنے لگے۔ اس مشاعرہ میں غالبؔ نے اپنی مشہور غزل "گماں برخیزد" "میاں برخیزد" پڑھی تھی۔ جس کے چند اشعار یہ ہیں:۔

بچہ گیرند عیارِ ہوس و عشق دگر | رسم بیداد مباد از جہاں برخیزد
زینہار از تعبِ دوزخِ جاوید مترس | خوش بہاریست کز و بیم خزاں برخیزد
عمرہا چرخ بگردد کہ جگر سوختۂ | چوں من از دودۂ آتش نفساں برخیزد
گر دہم شرح ستمہائے عزیزاں غالبؔ | رسم اُمید ہمانا ز جہاں برخیزد

اسی غزل کا ایک شعر یہ ہے:۔

جزوے از عالمم واز ہمہ عالم بیشم | ہم چو موے کہ بتاں راز میاں برخیزد

اس پر اسی مشاعرے میں یا کسی دوسری مجلس میں اعتراض کیا گیا کہ "ہمہ عالم" کی ترکیب درست نہیں، اس لئے کہ عالم مفرد ہے "ہمہ" کے ساتھ اس کا ربط حسب اجتہاد قتیل جائز نہیں۔ نیز یہ اعتراض کیا گیا کہ "موے ز میاں برخیزد" غیر صحیح ہے۔ بعض اور ایرادت بھی پیش ہوئے[2]۔ نواب اکبر علی خاں اور منشی محمد حسن نے ان سب کے جواب دیئے۔

---

[1] کلیات نثر فارسی صفحہ ۱۰۔ [2] مثنوی باد مخالف سے معلوم ہوتا ہے کہ "زدہ" کے کسرہ پر بھی اعتراض ہوا تھا۔ یہ فی الحقیقت یائے وحدت کا بدل تھا، کسرۂ اضافت نہ تھا۔ غالبؔ نے اس کے متعلق بیدل کے کلام سے مثال دی تھی: عاشقے بیدلے جنوں زدۂ
قدحِ آرزو بخوں زدۂ۔ غالب نامہ کے فاضل مؤلف نے اس سلسلے میں مندرجہ ذیل شعر غالبؔ سے منسوب کیا ہے جس پر اعتراض ہوا تھا۔ شور اشکے بہ فشار بنِ مژگاں ارم۔ طعنہ بر بے سروسامانیِ طوفاں زدۂ۔ مجھے غالبؔ کے کلام میں یہ شعر نہیں مل سکا۔ اس زمین میں غالبؔ کی ایک غزل موجود ہے۔ لیکن اس میں منقولہ شعر موجود نہیں۔ قاطع برہان کے فوائد سے معلوم ہوتا ہے کہ "کدہ" کے استعمال پر بھی اختلاف ہوا تھا۔

کفایت خاں نے "ہمہ عالم" کی سند میں اساتذہ کے متعدد اشعار پیش کئے۔ مثلاً:

گر من آلودہ دامنم چہ عجب

"ہمہ عالم" گواہ عصمت اوست (حافظ)

اور:— بہ جہاں خرّم از آنم کہ جہاں خرّم از وست

عاشقم بر "ہمہ عالم" کہ "ہمہ عالم" از وست (سعدی)

کلکتہ کے شعرا کی دستاویز سند و دلیل قتیل کا کلام تھا۔ خواجہ حالی فرماتے ہیں۔ کہ غالب نے قتیل کا نام سُن کر ناک بھوں چڑھائی اور کہا کہ میں فرید آباد کے کھتری بچے کے قول کو نہیں مانتا۔[۲] اس پر کلکتہ کے شعرا اور بھی بگڑ گئے۔[۱] تقلید جب جمود کی انتہا پر پہنچ جائے۔ تو مذہب یا سیاسیات یا معاشرت یا ادب کے مجتہدین طریق اور مجددین فن کو جن احمقانہ مخالفتوں سے سابقہ پڑتا ہے، وہ سب غالب کے گرد و پیش کھڑی ہو گئیں۔ وہ کسی ادبی ہنگامہ یا علمی جہاد کے لئے کلکتہ نہیں گئے تھے۔ بلکہ اپنی پنشن کے متعلق چارہ جوئی کے لئے اس لمبے سفر کی زحمت برداشت کی تھی۔ جب ان کے خلاف شعرا نے ہنگامہ بپا کیا۔ تو بہت گھبرائے انجام کار نواب اکبر علی خاں اور منشی محمد حسن صاحب کی فرمائش پر معذرت میں "باد مخالف" کے نام سے ایک مثنوی لکھی۔ جس میں اپنی مصیبتوں کا حال بیان کیا، آمد کی غرض بتائی، اعتراضات کے جواب دیئے اور فارسی زبان میں اپنے مسلک و مشرب کی وضاحت کی۔

میرے نزدیک اس ہنگامہ کو غالب کی ادبی و علمی زندگی میں بڑی اہمیت حاصل ہے

---

[۱] کلیات نثر فارسی صفحہ ۱۰۔ [۲] قتیل اصلاً کھتری تھے۔ بعد ازاں مسلمان ہو گئے اور لکھنؤ جا کر بڑا عروج پایا۔ میرزا قتیل کہلائے ۱۲۳۳ھ میں لکھنؤ میں وفات پائی۔ بعض اہل تحقیق کو فرید آباد سے قتیل کے انتساب میں کلام ہے۔ میرے پاس اس کے اثبات کی کوئی مثبت دلیل نہیں۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ "برہان قاطع" کے سلسلے میں غالب کے خلاف اعتراضات کا جو طوفان اُٹھا۔ اس میں ہرا ہی اور لغو چیز پیش کر دی گئی۔ لیکن اس انتساب کی تغلیط کسی نے نہ کی۔ اس بنا پر کہہ سکتے ہیں کہ انتساب اصلاً غلط نہیں تھا البتہ اس کی کیفیت بالتحقیق معلوم نہیں۔

وہ شروع ہی سے قتیلؔ، واقف اور اس قماش کے دوسرے شعرا کو خاطر میں نہیں لاتے تھے لیکن کلکتہ میں اس رائے کے اظہار پر جو معرکۂ تعریضات گرم ہوا۔ اس نے غالبؔ کے جذبہ مخالفت میں بہت تندی، تیزی اور تلخی پیدا کر دی۔ یہی جذبۂ مخالفت انجام کار "قاطع برہان" کی شکل میں ظاہر ہوا۔ جو غالبؔ کی طرف سے فارسی دانان ہند کے درجۂ استناد و اعتماد کے خلاف ایک بڑا اجہاد تھا۔ ان کے کلام نظم و نثر میں جا بجا قتیلؔ، واقف، عبدالواسع غیاث الدین رام پوری اور اس قبیل کے دوسرے فرومایگان ذوق ادب کے خلاف جو تحقیر آمیز کلمات ملتے ہیں، ان سب کی تیزی اور تندی کا سرچشمہ یہی کلکتہ والا ہنگامہ تھا۔

مثنوی "باد مخالف" | مثنوی "باد مخالف" میں پہلے یہ بیان کرتے ہیں کہ میں تظلم اور فریاد کے لئے اس شہر میں آیا ہوں۔ مجھے چند روز آرام سے گزارنے دیجئے اور مہمان نوازی کا حق ادا کیجئے۔ پھر اپنی مصیبتوں کی داستان لکھتے ہیں :۔

چہ بلاہا کشیدہ ام آخر | کہ بدیں جا رسیدہ ام آخر
بہ سیہ روز غربتم ببینید | تیرہ شبہائے زحمتم بینید
اندہ دوری وطن نگرید | غم ہجران انجمن نگرید
نہ ہمیں نالہ و فغاں بہ لبم | من و جاں آفریں کہ جاں بہ لبم
تو بہ چوں موئے کردہ است مرا | غصہ بدخوے کردہ است مرا

پھر کہتے ہیں کہ مخالفت کا آغاز میری طرف سے نہیں ہوا بلکہ خود مجھ پر بلاوجہ نادرست اعتراض کئے گئے :۔

"ہمہ عالم" غلط کہ گفت نخست؟ | پارۂ زیں نمط کہ گفت نخست؟
موے را یک کمر کہ گفت غلط؟ | شعر را سر بسر کہ گفت غلط؟

اور جب اعتراضات کا جواب ملنے پر ثابت ہو گیا کہ میں نے جو کچھ لکھا تھا بالکل درست تھا، تو کیا وجہ ہے کہ آپ حضرات نے میری تائید نہ کی۔ اور میری شہرت پر جو

داغ مخالفین نے لگائے تھے۔ انہیں دھوڈالنے کی طرف توجہ نہ فرمائی؟ اس حق ناشناسی کی وجہ سے میری گفتگو کا انداز گلہ مندانہ ہو گیا۔ لیکن جب معلوم ہوا کہ قدرداں اصحاب اس پر ناراض ہو گئے ہیں تو مجھے بڑی پشیمانی لاحق ہوئی۔ کاش میں چُپ رہتا:۔

نہ اُمیدم ز شاعر پیشہ نہ بیم | بود شایستہ مر مرا تسلیم
کاش با اعتراض ساختمے | نالہ در زیرِ لب گداختمے
زانکہ آنہم رضائے یاراں بود | رنگے از جوششِ بہاراں بود
خارِ دامانِ دوستاں بودن | خوشتر از باغ و بوستاں بودن

بعد ازاں اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ میں ادبی بحث سے نہیں ڈرتا، صرف یہ خوف دامن گیر ہے کہ میرے جانے کے بعد لوگ کہیں گے۔ کہ دہلی سے ایک "سفیہ" آیا تھا، اور بزرگوں کے ساتھ معرکہ ستیز گرم کر کے چلتا بنا۔ اس طرح میرے وطن کی عزت و آبرو، بلند نامی اور اعلٰے تربیت کا خون، ناحق میری گردن پر ڈالا جائے گا:

نہ ز آویزشِ بیاں ترسم | من و ایمانِ من کزاں نرسم
کہ پس از من بہ سالہائے دراز | بہ زباں ماند ایں حکایت باز
کہ سفیہے رسیدہ بود ایں جا | چند روز آرمیدہ بود ایں جا
با بزرگاں ستیزہ پیش گرفت | زحمتے داد و راہِ خویش گرفت
ہم سفیہانہ گفتگوے داشت | ہم خرابا بتانہ ہوئے داشت
برگِ دنیا نہ ساز دینش بود | ننگِ دہلی و سرزمینش بود
آہ زاں دم کہ بعد رفتنِ من | خونِ دہلی بود بہ گردنِ من

کلکتہ والے اس بات پر بہت بگڑے تھے کہ غالب نے قتیل کا ذکر تحقیر آمیز انداز میں کیوں کیا۔ اس کے متعلق فرماتے ہیں:۔۔۔

دینکہ در پیش گاہ بزم سخن | بہ زبانہا فتادہ است از من
که فلاں با قتیلؔ نیکو نیست | مگس خوانِ نعمتِ او نیست
زلّہ بر ادر کس چرا باشم | من ہمایم، مگس چرا باشم

پھر کہتے ہیں کہ نہ میں نے قتیلؔ کی صحبت سے فیض حاصل کیا، نہ اس کی شہرت پر رشک ہے، نہ میں اسے برا کہتا ہوں اور جو کچھ کہتا ہوں وہ اپنی طرف سے نہیں کہتا۔ فارسی دان جانتے ہیں کہ قتیلؔ اہل زبان نہ تھا۔ لہذا وہ شایستہ اعتماد نہیں اور اس کے کلام کو سند نہیں مانا جاسکتا اس لئے کہ فارسی اہل ایران کی زبان ہے اور سند وہی مقبول ہوگی جو اہل زبان کے کلام سے مستفاد ہوگی۔ اگر دوستوں کو مجھ پر یہ شکوہ ہے کہ میں قتیلؔ کی پیروی کیوں نہیں کرتا تو خدارا مجھے بتایا جائے کہ حزیںؔ، اسیرؔ، طالبؔ، عرفیؔ نظیریؔ اور ظہوریؔ کو چھوڑ کر قتیلؔ کے پیچھے چلنا کیوں کر گوارا کروں:۔

آنکہ طے کردہ ایں مواقف را | چہ شناسد قتیلؔ و واقف را

آخر میں قتیلؔ کی مدح لکھی ہے، جو حقیقتہً ہجو ملیح ہے۔ فرماتے ہیں:۔

مے شوم خویش را بہ صلح دلیل | مے سرایم تو لے مدح قتیلؔ
گرچہ ایرانیش نخواہم گفت | سعدیِ ثانیش نخواہم گفت
لیک از من ہزار بار بہ است | از من وہم چو من ہزار بہ است
نظمش آب حیات را ماند | در روانی فرات را ماند
نثر او نقش بال طاؤس است | انتخاب صراح و قاموس است

جامد مقلدین اور حقیقت ناشناس رہرو معذرتوں اور مصالحت کوشیوں سے حق بات کو قبول کرنے پر کبھی آمادہ نہیں ہوئے۔ اور غالبؔ کی تو عذر خواہی بھی باوجود ادعائے مصالحت اپنے اندر کئی تیز نشتر رکھتی تھی۔ لہذا اس سے کوئی اچھا نتیجہ برآمد نہ ہوا وہ جب تک کلکتہ میں رہے، یہ معرکہ جاری رہا۔

اردو مکاتیب غالب میں میری تحقیق کے مطابق صرف دو جگہ اس ہنگامہ کا ذکر آیا ہے۔ ایک خط میں سرور مارہروی کو لکھتے ہیں کہ پانچ ہزار کے مجمع میں اعتراض کئے گئے تھے۔ دوسرے خط میں شاگر کو لکھتے ہیں:

فقیر ہمیشہ مورد اعتراضات رہا ہے۔ لیکن اکثر ایسا ہوا ہے کہ بعد دو چار دن کے معترض صاحب کا خط آیا ہے۔ لغت و ترکیب معترض فیہ کی سند سے اشعار حضرت نے اس خط میں درج کئے ہیں۔ اللہ اللہ کلکتہ میں جو شور نشور اٹھا تھا میرا شعر۔

جزوے از عالمم و از ہمہ عالم بیشم ہمچو موے کہ بتاں راز میاں برخیزد

خستۂ جراحتہاے اعتراض ہوا ہے۔ منشأ اعتراض یہ کہ "عالم" مفرد ہے اس کا ربط "ہمہ" کے ساتھ بہ حسب اجتہاد قتیل ممنوع ہے۔ قضارا اس زمانے میں شاہزادہ کامران درانی کا سفیر گورنمنٹ میں آیا تھا۔ کفایت خاں اس کا نام تھا۔ اس تک یہ قصہ پہنچا۔ اس نے اساتذہ کے اشعار پان سات ایسے پڑھے جن میں "ہمہ عالم" و "ہمہ روز" و "ہمہ جا" مرقوم تھا اور وہ اشعار قاطع برہان میں مندرج ہیں۔

حضرت مولانا ابوالکلام آزاد فرماتے ہیں:

کلکتہ میں یہ ہنگامہ جن لوگوں نے بپا کیا تھا۔ میں ان کے نام معلوم کرنا چاہتا تھا مگر بجز دو تین کے معلوم نہ ہو سکے۔ ایک صاحب احمد علی گوپاموی کے (پرنس غلام محمد ٹیپو سوری) کے میر منشی تھے "کارنامہ حیدری" کا انہوں نے اردو نظم میں ترجمہ کیا ہے۔ جس کا نام حملۂ حیدری ہے۔ دوسرے صاحب انہی کے ہم نام مولوی احمد علی مدرسہ عالیہ میں مدرس اور ایشیاٹک سوسائٹی کی فارسی و عربی مطبوعات کے مصحح تھے۔ تیسرے ایک صاحب مولوی

ل ملاحظہ ہو "قاطع برہان" صفحہ ۳۰ ۸ ۔ ہے غالباً یہ وہی مولوی احمد علی تھے جنہوں نے آگے چل کر "قاطع برہان" کے مباحث میں حصہ لیا اور "موئد برہان" لکھی۔ جس کے جواب میں غالب نے اپنا مشہور قطعہ لکھا ہے

مولوی احمد علی احمد تخلص نسخہ در خصوص گفتگوے پارس انشا کردہ است

وجاہت علی لکھنوی گورنر کے دفتر انشاء میں ملازم تھے۔ ان لوگوں نے صرف اعتراضات ہی نہیں کیے تھے بلکہ تحریرات بھی لکھی تھیں اور بعض تحریرات "جام جہاں نما" نے جو فارسی کا ہفتہ وار اخبار تھا چھاپ دی تھیں۔

وجاہت علی قتیل کے شاگرد اور وجاہت تخلص کرتے تھے۔[1]

واپسی کب ہوئی

کلکتہ سے واپسی کی تاریخ کا تعین چنداں مشکل نہیں۔ اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ مسٹر اینڈریو اسٹرلنگ غالب کے خاص ہمدرد تھے ان کا انتقال ۲۳ مئی ۱۸۳۰ء کو ہوا۔ اس واقعہ سے پیشتر غالب دہلی آچکے تھے۔ اس مقدمہ کے بعد اب غالب کے بیان پر نظر ڈالیے۔ ایک فارسی مکتوب میں لکھتے ہیں:۔

> یک شنبہ دوم جمادی الثانی بجنی سعی آوارگی در زاویہ دہلی پائے بدامن کشید۔ نازم بہ غمخواری و جان پروری نکویانے راکہ درین سفر دیدہ روشناس کف پائے آناں گشتہ کہ وطن را بہ مذاق من آشفتہ مشرب تلخ تر از غربت ساختہ رسیدن بہ دہلی تلافی اندوہ ہجران کلکتہ کردتا بہ شادی چہ رسد۔ ہر کہ از اہل نظر مرا نگرد۔ ہرگز نداند کہ رہرو بمنزل رسیدہ و بوطن آرمیدہ ایست بلکہ پندارد کہ دردمندیست از وطن دور افتادہ تازہ بہ داغ غربت مبتلا۔

جب یہ مسلّم ہے کہ مئی ۱۸۳۰ء میں غالب دہلی میں تھے تو سمجھنا چاہیے کہ وہ ۲ جمادی الثانی ۱۲۴۵ھ کو دہلی پہنچے یعنی ۲۹ نومبر ۱۸۲۹ء کو۔

آخر میں اتنا اور عرض کر دینا چاہیے کہ غالب واپسی میں مرشد آباد اور باندہ ضرور ٹھہرے۔

کلکتہ سے واپسی کے سفر میں لکھتے ہیں:

---

[1] "غالب نامہ" کے مصنف نے لکھا ہے کہ مولوی عبدالقادر رامپوری مولوی کرم حسین بلگرامی اور مولوی نعمت علی عظیم آبادی نے اعتراضات کیے تھے۔ مجھے اس بیان کا ماخذ معلوم نہیں ہو سکا لیکن مولوی کرم حسین خاں کو معترضین میں شمار کرنا غالباً درست نہیں موصوف سلطنت اودھ کی طرف سے کلکتہ میں سفیر اور غالب کے عزیز دوست تھے چکنی ڈلی والا قطعہ انہی کے کہنے پر لکھا تھا جیسا کہ غالب نے اردوئے معلی میں خود تصریح کی ہے

امروز کہ روز سہ شنبہ است در مرشدآباد م و کشتی ے جویم امید کہ ہمیں یک دو روز بہ بلدہ دریا رواں گردم (رضوی صاحب کا قلمی بیاض)

ایک خط میں مولوی سراج الدین احمد کو رقم فرماتے ہیں :-

نامۂ نامی کہ در باندہ بہ من رسیدہ و جوابش ہم آنجا منزل مرقوم گردیدہ سطرے از نہضت نواے جہاں کشا گجر زرنی داشت

ایک اور خط سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ یکم جمادی الاول ۱۲۴۵ھ (۲۹ اکتوبر ۱۹۲۹ء) کو باندہ میں تھے۔ اغلب ہے کہ اواخر ستمبر یا اوائل اکتوبر میں کلکتہ سے روانہ ہوئے ہوں۔

کلکتہ ہی میں غالب نے "چکنی ڈلی" کی تعریف میں ارتجالاً وہ قطعہ لکھا تھا جو ان کے اردو دیوان میں موجود ہے۔ فرماتے ہیں :

میرا ایک قطعہ ہے کہ وہ میں نے کلکتہ میں کہا تھا تقریب یہ کہ مولوی کرم حسین میرے ایک دوست تھے۔ انہوں نے ایک مجلس میں چکنی ڈلی بہت پاکیزہ و بے ریشہ اپنے کف دست پر رکھ کر مجھ سے کہا کہ اسکی کچھ تشبیہات نظم کیجیے۔ میں نے وہاں بیٹھے بیٹھے نو دس شعر کا قطعہ لکھ کر ان کو دیا اور صلہ میں وہ ڈلی ان سے لی۔[1]

---

[1] مولانا ابوالکلام کے پاس عبدالغفور خاں نساخ کے دیوان کا ایک نسخہ ہے جسے مصنف نے سادہ اوراق کے اضافہ کے ساتھ مجلد کرا لیا تھا۔ اسمیں وہ اپنا نیا کلام بھی لکھتے تھے کہیں کہیں یادداشتیں بھی قلمبند کی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے مطبوعہ تذکرے کے لئے مزید مواد جمع کر رہے تھے ایک یادداشت میں لکھتے ہیں کہ جب غالب کلکتہ میں مقیم تھے تو شاہ اودھ کے وکیل نے کئی مشاعرے اپنے یہاں منعقد کئے تھے اور کلکتہ کے ایرانیوں کی بڑی تعداد ان میں شریک ہوتی تھی۔ ایک مشاعرہ کی طرح یہ تھی، جا نوشتہ ایم ما نوشتہ ایم۔ غالب نے غزل پڑھی،

تا فصلے از حقیقت اشیا نوشتہ ایم   آفاق را مرادف عنقا نوشتہ ایم

حاجی عبدالکریم اصفہانی کلکتہ کے بہت بڑے تاجر تھے ان کے یہاں ایک ایرانی فاضل مرزا کوچک نام مقیم تھے! جنھوں نے مجلس میں کھڑے ہو کر کہا۔ اس درجہ کا شاعر آج سرزمین ایران میں بھی کوئی نہیں۔

نساخ لکھتے ہیں کلکتہ میں مرزا کا ملنا جلنا زیادہ تر ایرانیوں سے رہا اور انہوں نے پوشش و لباس میں بھی ایرانی وضع اختیار کر لی۔ ایرانی وضع سے مقصود غالباً ایرانی پاپاخ کا استعمال ہوگا۔ ورنہ بہ ظاہر غالب نے اور کوئی وضع مخصوصات ایران میں سے اختیار نہیں کی تھی۔

چھٹا باب

رام پور اور میرٹھ کے سفر

اتفاق سفر افتاد بہ پیری غالب
آنچہ از پائے نیامد ز عصا مے آید

سفر کلکتہ کے بعد غالب کی تحریرات سے صرف تین سفروں کا علم ہو سکا ہے۔ وہ دو مرتبہ رام پور گئے اور ایک مرتبہ نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ سے ملنے کے لئے میرٹھ پہنچے۔ البتہ سفر کلکتہ سے پیشتر وہ فیروز پور جھرکہ یا لوہارو آتے جاتے رہے۔ سنہ ۱۸۲۵ء میں انگریزی فوج نے بھرت پور پر حملہ کیا تھا تو اس موقع پر نواب احمد بخش خاں کے لشکر کے ساتھ گئے تھے، اگرچہ انہیں فوجی خدمات سے کوئی علاقہ نہ تھا۔ وہ خود پنج آہنگ میں لکھتے ہیں:

در سال یکہزار و دو صد چہل و یک ہجری کہ گیتی ستانان انگلشیہ بر بھرت پور لشکر کشیدہ واں رؤسا و ثرواں درمیان گرفتہ اند، من دریں یورش بہ جناب مستطاب عم عالی مقدار فخر الدولہ دلاور الملک نواب احمد بخش خاں بہادر رستم جنگ دام اقبالہ و زاد افضالہ رفیقم و بہ گرامی برادر ستودہ خوے میرزا علی بخش خاں بہادر ہم سفر است

رام پور کا پہلا سفر وہ پہلی مرتبہ اواخر جنوری ۱۸۶۰ء میں رام پور گئے اور مارچ میں واپس آئے۔ تفتہ کو لکھتے ہیں:۔

میاں میں جو آخر جنوری میں رام پور جاکر آخر مارچ میں یہاں آگیا تو کیا کہوں یہاں کے لوگ میرے حق میں کیا کچھ کہتے ہیں۔

قاضی عبدالجمیل بریلوی اور خواجہ غلام غوث خاں بیخبر کے خطوں میں بھی یہ ذکر آیا ہے غدر میں غالب کی پنشن بند ہوگئی تھی اس لئے کہ ان کے خلاف بھی باغیوں کی اعانت کا شبہ تھا۔ جب گورنر جنرل دہلی آئے اور غالب چیف سکرٹری سے ملنے کے لئے گئے تھے۔ تو اس نے پہلے روز بے فرصتی کا عذر کیا دوسرے روز ملا تو کہنے لگا کہ "تم باغیوں سے اخلاص رکھتے تھے، اب گورنمنٹ سے کیوں ملتے ہو"

جب تک پنشن کے کھل جانے کی امید تھی۔ غالب اس وجہ سے رام پور جانے میں متوقف تھے کہ روپیہ ملے اور قرض ادا کریں تو باہر نکلیں سکرٹری کے جواب نے انہیں بالکل مایوس کر دیا تو اس خیال سے رام پور کے لئے تیار ہوئے کہ نواب سیف علی خاں کے ذریعہ سے صفائی کی کوشش کریں۔ نواب صاحب کئی مرتبہ بلا بھی چکے تھے۔ غالب خود لکھتے ہیں کہ بعد فتح دہلی وہ ہمیشہ میرے مقدم کے خواہاں رہتے تھے[۱]

منازل سفر دہلی سے ۱۹ر جنوری ۱۸۶۰ء کو روانگی ہوئی۔ رات مراد نگر میں بسر کی۔ ۲۰ر کو میرٹھ پہنچ کر ایک روز قیام کیا۔ وہاں سے ۲۲ر کو شاہ جہان پور، ۲۳ر کو گڑھ مکتیشر بعد ازاں مراد آباد ہوتے ہوئے رام پور فائز ہوئے

---

[۱] اردوئے معلٰی صفحہ ۲۲۷۔

ہرگوپال تفتہ کو لکھتے ہیں :

بھائی میں نے دہلی کو چھوڑا۔ پنجشنبہ ۱۹ جنوری ۱۸۶۰ء کو مراد نگر۔ اور جمعہ ۲۰ کو میرٹھ پہنچا آج شنبہ ۲۱ کو بھائی مصطفےٰ خاں کے کہنے سے مقام کیا۔ یہاں سے یہ خط تم کو لکھ کر روانہ کیا۔ کل شاہ جہان پور اور پرسوں گڑھ مکتیشر رہوں گا۔ پھر مراد آباد ہوتا ہوا رام پور جاؤں گا۔

حکیم غلام نجف خاں کو لکھتے ہیں :

تم سے رخصت ہو کر اس دن مراد نگر میں رہا۔ دوسرے دن یعنی جمعہ کو میرٹھ پہنچا۔ نواب مصطفےٰ خاں نے ایک دن رکھ لیا۔ آج شنبہ ۲۱ جنوری یہاں مقام ہے۔ نو بج گئے ہیں۔ بیٹھا ہوا یہ خط لکھ رہا ہوں۔ مفت کا کھانا ہے، خوب پیٹ بھر کر کھاؤں گا کل شاہ جہان پور، پرسوں گڑھ مکتیشر، رہوں گا۔ مراد آباد سے پھر تم کو خط لکھوں گا۔

اس سفر میں عارف مرحوم کے دونوں صاحبزادے باقر علی خاں اور حسین علی خاں بھی ہمراہ تھے۔ فرماتے ہیں :

لڑکوں کے ہاتھ کے لکھے ہوئے دو خط ان کی دادی (بیگم غالب) کو بھجوا دیئے ہیں۔ تم اس اپنے نام کے خط کو لے کر ڈیوڑھی پر جانا اور استانی جی (بیگم غالب) کو پڑھ کر سنا دینا اور خیر و عافیت کہنا۔

دھلی سے روانگی کے وقت غالب نے منزل مقصود کو اخفا میں رکھا تھا۔ وہ حکیم غلام نجف خاں کو لکھتے ہیں۔

بھائی میں از روئے مصلحت اپنے کو مختلف مقامات کا عازم کہہ آیا ہوں، اب جو شخص تم سے پوچھا کرے اس سے پردہ نہ کرنا۔ صاف کہہ دینا کہ رام پور کو گیا ہے۔ یعنی سبب

کو معلوم ہو جائے اور کوئی تذبذب میں نہ رہے[1]۔

رام پور کی کیفیت | رام پور کی کیفیت ان لفظوں میں بیان فرماتے ہیں :-

اب میرا حال سنو۔ تعظیم و توقیر بہت ہے۔ ملاقاتیں تین ہوئی ہیں۔ ایک مکان کہ وہ تین مکانوں پر مشتمل ہے رہنے کو ملا ہے۔ یہاں پتھر تو درکنار اینٹ بھی میسر نہیں۔ خشتی مکان گنتی کے ہیں کچی دیواریں اور کھپریل۔ سارے شہر کی آبادی اسی طرح پر ہے مجھ کو جو مکان ملے وہ بھی ایسے ہی ہیں[2]۔ ہنوز کچھ گفتگو درمیان نہیں آئی۔ میں خود ان سے ابتدا نہ کروں گا۔ وہ بھی مجھ سے بالمشافہ

---

[1] غالب نے اس مصلحت کی تفصیل بیان نہیں کی۔ فاضل محترم مولانا امتیاز علی صاحب عرشی جامع مکاتیب غالب فرماتے ہیں -
"اُس وقت تک گورنمنٹ نے میرزا صاحب کی بریت تسلیم نہیں کی تھی اور انہیں غدر کے بعد سفر کا پہلا اتفاق تھا، اسلئے یہ خطرہ لاحق ہوا ہوگا کہ کہیں رام پور جانے سے رُک نہ جاؤں۔ یا کوئی حاسد سرکار کو یہ نہ لکھ دے کہ میرزا صاحب گورنمنٹ کی نظر میں ابھی مشتبہ ہیں انہیں اپنی ریاست میں نہ آنے دیجئے" میرے نزدیک یہ ارشاد نظر ثانی کا محتاج ہے۔ اول اس لئے کہ غدر کے بعد سفر کا یہ "پہلا اتفاق" نہ تھا بلکہ غالب اس سے پیشتر میرٹھ کا سفر فرما چکے تھے۔ دوسرے چند معلوم آدمیوں کے سوا جن کو غدر کے بعد ہی باہر جانے سے یا باہر سے دلی آنے سے روک دیا گیا تھا، عام آدمیوں کو سفر سے روکنے کی کوئی مثال نہیں ملتی بلکہ معلوم ہے خود غالب کے عزیز دوستوں میں سے کئی اصحاب باہر چلے گئے تھے مثلاً نواب حسین مرزا جو ناظر شاہی ہونے کے اعتبار سے غالب کے مقابلے میں زیادہ مورد الزام ہو سکتے تھے اور جن کے بھائی کو بہ الزام شرکت غدر گولی ماردی گئی تھی۔ سوم غالب کے عدم برأت کا معاملہ صرف پنشن کی بندش اور خلعت کی موقوفی تک محدود تھا۔ سکہ گوئی کا الزام ابتدا ہی میں رفع ہو گیا تھا۔ چہارم نواب یوسف علیخاں مرحوم غالب کے تمام حالات سے واقف تھے جانتے تھے کہ انکی پنشن اور خلعت مسدود ہے خود اس باب میں ہر ممکن اعانت کیلئے سرگرم کوششیں فرماتے تھے۔ (دیباچہ مکاتیب غالب صفحہ ۲۹)
اقتباس مکتوب نواب یوسف علیخاں مرحوم ۹ دسمبر ۱۸۵۹ء تک خود باصرار بلا رہے تھے! ان حالات میں کسی حاسد کی غمازی کے موثر ہونے کا کیا اندیشہ تھا۔

[2] مکاتیب غالب سے معلوم ہوا کہ نواب یوسف علیخان نے ابتدا میں چار دن تک غالب کو اپنی کوٹھی میں رکھا۔ بعد کو غالب جس مکان میں فروکش ہوئے وہ محلہ راج دوارہ کی اس شاہراہ پر جو خاص باغ پیلس کو جاتی ہے مولوی محمد یحییٰ صاحب وکیل کے مکان کے متصل واقع تھا۔ آجکل وہاں ایک آہنگر مقیم ہے وزیر اعظم رام پور کے حکم کے مطابق وہاں یادگار کے طور پر ایک پتھر لگا دیا گیا ہے۔

نہ کہیں گے مگر بواسطہ کار پردازان سرکار۔ دیکھوں کیا کہتے ہیں اور کیا قدر کرتے ہیں۔ کھانا دونوں وقت سرکار سے آتا ہے اور وہ سب کو کافی ہوتا ہے۔ غذا میرے بھی خلاف طبع نہیں۔ پانی کا شکہ کس منہ سے ادا کروں، ایک دریا ہے۔ کوسی سبحان اللہ اتنا میٹھا کہ پینے والا گمان کرے کہ یہ پھیکا شربت ہے صاف، سبک، گوارا، سریع النفوذ۔ اس آٹھ دن میں قبض و انقباض کے صدمے سے محفوظ ہوں۔ صبح کو خوب بھوک لگتی ہے لڑکے بھی تندرست آدمی بھی توانا مگر ہاں ایک عنایت دو دن سے کچھ بیمار ہے۔

یہ خط ۳ فروری ۱۸۶۰ء کا لکھا ہوا ہے اس وقت غالب کو رام پور پہنچے ہوئے آٹھ روز ہو چکے تھے۔ لہٰذا سمجھنا چاہیئے کہ وہ ۲۶ یا ۲۷ جنوری ۱۸۶۰ء کو وارد رام پور ہوئے تھے۔

دریائے کوسی | دریائے کوسی کی تعریف غالب نے میر مہدی مجروح کو بھی لکھی تھی :

بیٹھو یہ رام پور دارالسرور ہے جو لطف یہاں ہے وہ اور کہاں ہے۔ پانی سبحان اللہ شہر سے تین سو قدم کے فاصلے پر ایک دریا ہے۔ کوسی اس کا نام ہے۔ بے شبہ چشمہ آب حیات کی کوئی سوت اس میں ملی ہے خیر اگر یوں بھی ہے تو بھائی آب حیات عمر بڑھاتا ہے۔ مگر اتنا شیریں کہاں ہوگا۔

پنشن کے متعلق سفارش کی امید | ۱۴ فروری ۱۸۶۰ء کے خط میں حکیم غلام نجف خاں کو لکھتے ہیں :

نواب لفٹننٹ گورنر آگرہ سے مراد آباد آیا چاہتے ہیں۔ مراد آباد یہاں سے بارہ کوس ہے۔ نواب صاحب دو چار دن میں پھر آئیں گے۔ اگر ان کی ملاقات کو مراد آباد جائیں گے۔ تو میں بھی ساتھ جاؤں گا۔ اگرچہ گورنر غرب و شمال (صوبہ متحدہ آگرہ و اودھ) کو دلی سے کچھ علاقہ نہیں مگر دیکھوں کیا گفتگو درمیان میں آتی ہے۔ جو واقع ہوگا تمہیں لکھوں گا۔

اس سے غالب کا مدعا یہی تھا کہ پنشن کے باب میں جو بات چیت ہوگی اس کی کیفیت لکھوں گا۔ اگرچہ صوبہ جات متحدہ کے گورنر کو دہلی سے کوئی علاقہ نہیں تھا لیکن وہ سمجھتے تھے کہ شاید نواب صاحب کی سفارش سے کوئی راستہ نکل آئے۔

میں حسب الطلب نواب صاحب کے دوستانہ آیا ہوں اور اپنی صفائی بذریعہ ان کے گورنمنٹ سے چاہتا ہوں۔

دیکھوں کیا ہوتا ہے۔ کتاب اور عرضی اواسط ماہ جنوری میں ولایت کو روانہ کرکے یہاں آیا ہوں چھ ہفتے میں جہاز پہنچتا ہے یقین ہے کہ پارسل ولایت پہنچ گیا ہوگا۔

واپسی

اوپر عرض کیا جا چکا ہے۔ کہ غالب آخر مارچ ۱۸۶۰ء میں رام پور سے واپس آگئے۔ دہلی میں ان کی واپسی پر چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں۔ خود فرماتے ہیں:

یہاں ہیں جو آخر جنوری کو رام پور جا کر آخر مارچ میں یہاں آگیا ہوں تو کیا کہوں یہاں کے لوگ میرے حق میں کیا کیا کچھ کہتے ہیں۔ ایک گروہ کا قول ہے کہ یہ شخص والی رام پور کا استاد تھا۔ وہاں گیا تھا۔ اگر نواب نے کچھ سلوک نہ کیا ہوگا۔ تو بھی پانچ ہزار سے کم نہ دیا ہوگا۔ ایک جماعت کہتی ہے۔ کہ نوکری کو گئے تھے۔ مگر نوکر نہ رکھا۔ ایک فرقہ کہتا ہے:۔ نواب نے نوکر رکھ لیا تھا دو سو روپیہ مہینا کر دیا تھا۔ نواب لفٹنٹ گورنر الہ آباد جو رام پور آئے اور ان کو غالب کا وہاں ہونا معلوم ہوا۔ تو انھوں نے نواب صاحب سے کہا کہ اگر ہماری خوشنودی چاہتے ہو۔ تو اسے جواب دے دو نواب نے برطرف کر دیا۔

اس کے بعد خود اصل حقیقت بیان کرتے ہیں:۔

اب تم اصل حقیقت سنو۔ نواب یوسف علی خاں تیس بتیس برس کے میرے دوست اور پانچ چھ برس سے شاگرد ہیں۔ آگے گاہ گاہ کچھ بھیج دیا کرتے تھے اب جولائی ۱۸۵۹ء سے سو روپیہ مہینہ ماہ بماہ بھیجتے ہیں۔ بلاتے رہتے تھے۔ اب میں گیا، دو مہینے رہ کر چلا آیا۔ بشرط حیات بعد برسات کے پھر جاؤں۔

ہرگوپال تفتہ نے قیام رام پور کے دوران میں لکھا تھا۔ کہ مجھے بھی وہیں بلا لیجئے۔ اس کے جواب میں فرماتے ہیں:۔

بالفعل نواب لفٹنٹ گورنر بہادر مراد آباد میں ہیں اور وہاں سے رام پور آئیں گے بعد ان کے جانے کے کوئی طور اقامت یا عدم اقامت کا ٹھہریگا منظور مجھکو یہ ہے کہ اگر یہاں رہنا ہوا تو تم کو بلاؤں گا۔

میر مہدی مجروح نے غالباً جلد واپس آجانے کا سبب پوچھا تھا۔ لکھتے ہیں:۔

میر مہدی تم میری عادت کو بھول گئے۔ ماہ مبارک رمضان میں کبھی مسجد جامع کی تراویح ناغہ ہوئی ہے؟
میں اس مہینے میں رامپور کیوں رہتا؟ نواب صاحب مانع رہے اور بہت منع کرتے رہے۔ برسات کے
آموں کا لالچ دیتے رہے مگر بھائی میں ایسے انداز سے چلا کر چاند رات کے دن یہاں آ پہنچا۔
یک شنبہ کو غرہ ماہ مقدس ہوا۔ اسی دن سے صبح کو حامد علی خاں کی مسجد میں جا کر جناب مولوی
جعفر علی صاحب سے قرآن سنتا ہوں شب کو مسجد جامع میں جا کر نماز تراویح پڑھتا ہوں کبھی جو جی میں آتا ہے
تو وقت صوم مہتاب باغ میں جا کر روزہ کھولتا ہوں اور سرد پانی پیتا ہوں۔

لیکن یہ سب مشاغل محض افسانہ تھے اشوخی طبع کے کرشمے تھے، اصل کیفیت یوں
بیان کرتے ہیں:۔

لڑکوں کو ساتھ لے گیا تھا۔ وہاں انہوں نے میرا ناک میں دم کر دیا۔ تنہا بھیج دینے میں وہم
آیا۔ کہ خدا جانے اگر کوئی امر حادث ہو تو بدنامی عمر بھر کی رہے۔ اس سبب سے جلد چلا آیا
ورنہ گرمی برسات کے دن وہاں کاٹتا۔ اب بہ شرط حیات جریدہ بعد برسات کے جاؤں گا۔
اور بہت دن تک یہاں نہ آؤں گا۔

یوسف میرزا کو لکھتے ہیں:۔

میں ۲۳ شعبان ۱۲۷۶ھ (مطابق ۱۶ مارچ ۱۸۶۰ء) کو رام پور سے چلا اور ۳۰ شعبان
(مطابق ۲۳ مارچ ۱۸۶۰ء) کو دہلی پہنچا۔ اسی دن چاند ہوا۔

اپنی تنخواہ کا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:۔

نواب صاحب دوستانہ و شاگردانہ دیتے ہیں مجھ کو نوکر نہیں سمجھتے۔ ملاقات بھی دوستانہ رہی معانقہ و تعظیم
جس طرح احباب میں رسم ہے، وہ صورت ملاقات کی ہے۔ لڑکوں سے میں نے نذر دلوائی تھی۔ بس
بہر حال غنیمت ہے۔ رزق کے اچھی طرح ملنے کا شکر بجا لانا چاہیئے۔ کمی کا شکوہ کیا۔

نادر شاہ خاں شوخی کا بیان

غالبؔ کے آخری عہد کے ایک شاگرد نادر شاہ خاں شوخی
رام پور کے باشندہ تھے۔ جو کلکتہ میں جا بسے تھے۔ اور وہیں وفات پائی۔ حضرت

مولانا ابوالکلام فرماتے ہیں کہ وہ غالب کے قیام رام پور کے حالات بڑی دلچسپی کے ساتھ بیان کرتے تھے۔ صرف تذکرہ چھیڑ دینے کی دیر تھی، پھر ایک پوری داستان شروع ہو جاتی۔ غدر کے حالات بیان کرنے کا بھی انہیں بڑا شوق تھا۔ دہلی کے معرکوں کے چشم دید شاہد تھے۔ افسوس کہ پچھلی نسل کے ساتھ غدر کے یہ تمام افسانے بھی مدفون ہو گئے۔ اگر قلمبند ہو سکتے تو تاریخ کے لئے قیمتی سرمایہ ہوتا۔

کہتے تھے جب مرزا غالب پہلی دفعہ رام پور آئے تو میں بڑے جوش و عقیدت سے خدمت میں حاضر ہو کر تلمذ کے لئے خواستگار ہوا۔ لیکن مرزا صاحب نے صاف انکار کر دیا۔ فرمایا:۔

"تم جانتے ہو میں نواب صاحب کا بلایا ہوا حاضر ہوا ہوں۔ انہوں نے اصلاح شعر کی خدمت میرے سپرد کی ہے۔ بغیر ان کے حکم و اجازت کے یہاں اور کسی کے کلام پر اصلاح نہیں دے سکتا۔"

بڑی مایوسی ہوئی۔ لیکن صبح و شام برابر حاضری دیتا رہا۔ رام پور میں ان کا (یعنی غالب کا) معمول تھا کہ جس دن نواب صاحب کے یہاں جاتے، سہ پہر کا دیوان خانہ ملتوی رہتا۔ ورنہ سہ پہر کو عام طور پر لوگوں سے ملاقات کرتے۔ ریاست میں جس قدر اہل علم و فن تھے، مرزا کی موجودگی کو مغتنم تصور کرتے اور بالالتزام آیا کرتے۔ شب کی صحبت خاص ہوتی تھی۔ کیونکہ یہ ان کے کیف و سرور کا وقت ہوتا تھا۔ صرف انہی لوگوں کو حاضری کا موقع دیتے، جن سے کسی طرح کا تکلف نہ ہوتا۔

اتفاق سے ایک معاملہ ایسا پیش آ گیا جس نے مجھے خدمت گزاری کا ایک خاص موقع دے دیا۔ مرزا صاحب دہلی سے جب چلے تو انہوں نے اپنے ساتھ عرق (تو تی) کا اتنا سامان لے لیا تھا کہ مہینے بھر کے لئے کفایت کرتا۔ انہیں خیال تھا کہ اس سے زیادہ قیام نہ ہوگا۔ لیکن قیام زیادہ ممتد ہوا۔ جب آخری بوتل کی نوبت آ گئی تو بہت متردد

ہوئے۔ رام پور میں انگریزی شراب کی کوئی دکان نہ تھی۔ بریلی اور مراد آباد سے مل سکتی تھی لیکن جو نوکر ساتھ تھے۔ انہیں اس متاع کے تناسا نہیں سمجھتے تھے حیران تھے کہ کس شخص سے کام لیں۔ میں ایک دن حاضر ہوا۔ تو مجھ سے یہ حال بیان فرمایا۔ میں نے عرض کیا۔ "آپ کا حکم ہو۔ تو شراب اپنے حلق میں انڈیل لوں، خرید کر لانا کون سی بڑی بات ہے" مجھے نام، قسم اور قیمت بتا دیجئے، ابھی جا کر بریلی کے ایک ایک شراب خانہ پر دستک دوں گا۔" فرمایا "نہیں میاں۔ ایک قطرہ بھی نہ پینا۔ اگر پینے پر آجاؤ گے۔ تو مجھے کیا لا کر دو گے۔ ہاں جس طرح بتلادوں، اسی طرح کام پورا کر دو۔"

بہر حال انہوں نے مجھے شراب کا نام بتلایا۔ اس کی خالی بوتل دکھائی۔ زیر استعمال بوتل دکھا کر رنگ و شکل سے آشنا کیا۔ پھر صرف ایک بوتل لانے کا حکم ہوا۔ اگر حسب منشا آئی تو دوبارہ بھیج کر مزید منگوائیں گے۔ قیمت کے علاوہ مجھے دو روپے اور مرحمت فرماتے تھے۔ کہ خرچ کے لئے رکھ لو۔ لیکن میں نے یہ ہزار منت و الحاح اس سے باز رکھا اور عرض کیا، مجھے پہلے وہاں سے ہو آنے دیجئے پھر جو کچھ مطلوب ہو گا عرض کر دوں گا۔

میرے والد فوج میں سردار تھے۔ منتیں کر کے ان سے روپیہ لیا اور بریلی روانہ ہو گیا۔ مرزا صاحب نے صرف ایک بوتل کے لئے فرمایا تھا۔ میں نے پانچ بوتلیں خریدیں۔ اور لا کر سامنے رکھ دیں یہ ٹھیک اُن کی فرمائش کے مطابق تھیں۔ نہایت درجہ خوش ہوئے فرمانے لگے "میاں! کہتے ہیں شراب پینے والے کی دُعا مستجاب نہیں ہوتی اب میں تمہیں دُعا نہ دوں تو اور کیا دوں؟" میں نے عرض کیا "حضور انہی بوتلوں کی شراب نوش جاں فرما کر میرے لئے دُعا کیجئے۔ میرا ایمان ہے۔ کہ انہی دُعاؤں سے میرا عقدہ حل ہو گا۔"

بہت اصرار فرمایا کہ روپے لے لو، مگر میں ارادہ کر چکا تھا۔ کہ کبھی نہ لوں گا۔ دوسرے دن حاضر ہوا تو فرمایا "وہ تمہاری غزل کہاں ہے جو اس دن لائے تھے؟" وہ تو ہر وقت میری جیب میں رہتی تھی۔ میں نے پیش کر دی۔ اسے دیکھ کر جا بجا اصلاح دی۔ اصلاح

دیتے جاتے تھے۔ اور ساتھ ساتھ ہدایات وافادات کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ بس اس فن سے ان کی شاگردی کی سعادت ہاتھ آگئی۔ پھر دہلی گیا اور کئی ماہ تک خدمت میں رہا۔ دہلی میں ایک دن کہنے لگے "تمہارے رام پور کے تعلق نے مجھے موت سے بچا لیا مگر زندگی بھی اجیرن ہو گئی۔ اصل حال خلقت کو معلوم نہیں۔ اتنی بات سن لی ہے کہ رئیس رام پور کے اُستاد ہیں۔ بس ہر شخص اپنے اپنے قیاس کے مطابق میری دولتمندیوں کا حساب لگاتا ہے اور چرچے پھیلاتا ہے۔ عزیز واقارب تک باور نہیں کرتے۔ کہ وہاں سے صرف سو روپیوں پر جی رہا ہوں۔ اہل حاجت آتے ہیں اور اپنی اپنی بربادیوں کی کہانیاں سناتے ہیں۔ ایسا دل کہاں سے لاؤں کہ خشک جواب دے دوں! قرض دام لے کر بھی ان کی حاجت روائی کرنی پڑتی ہے"۔

حضرت مولانا فرماتے ہیں:۔ نادر شاہ خاں نے مجھے اپنا ایک قطعہ بھی دکھایا تھا۔ جس پر مرزا غالب کے قلم کی اصلاح تھی۔ ایک موٹے مقوّے پر لگا کر وصلی کی طرح اسے محفوظ رکھا تھا۔ میں ہمیشہ ان سے کہتا تھا کہ مجھے دیدیجیے۔ مگر ہاں ہاں کر کے ٹال دیتے تھے۔ نہیں معلوم اس کا کیا حشر ہوا۔ میں پھر بمبئی چلا گیا۔ واپس آیا تو اُن کا انتقال ہو چکا تھا۔

دوسرا سفر رام پور غالب نے رام پور کا دوسرا سفر اکتوبر ۱۸۶۵ء میں کیا۔ جنوری ۱۸۶۶ء میں واپس ہوئے۔ نواب یوسف علی خاں نے ۲۴ ذی قعدہ ۱۲۸۱ھ (مطابق ۲۱ اپریل ۱۸۶۵ء) کو وفات پائی۔ اُن کی جگہ نواب کلب علی خاں بہادر مسند نشین ہوئے۔ اس تقریب کے جشن پر غالب دوسری مرتبہ رام پور گئے تھے۔ مولوی عبدالرزاق شاکر کو تحریر فرماتے ہیں:۔

فقیر پا در رکاب ہے سہ شنبہ چار شنبہ ان دونوں میں سے ایک دن عازم رام پور ہوگا۔ تقریب وہاں کے جانے کی رئیس مرحوم (نواب یوسف علیخاں) کی تعزیت اور رئیس حال (نواب کلب علی خاں)

کی نہ نیت تو دو چار مہینے وہاں رہنا ہوگا۔

راستہ اور منازل | یہ سفر غازی آباد۔ پلکھوے، ہاپوڑ اور مراد آباد کے رستے ہوا تھا۔

باقر علی خاں اور حسین علی خاں اس سفر میں بھی ساتھ تھے۔ نواب شہاب الدین احمد خاں ثاقب کو لکھتے ہیں:

غازی آباد کا حال شمشاد علی (شمشاد علی بیگ رضواں) سے سنا ہوگا ہفتے کے دن ۱۷ اکتوبر ۱۸۶۵ء دو تین گھڑی دن چڑھے احباب کو رخصت کرکے راہی ہوا۔ مقصد یہ تھا کہ پلکھوے رہوں۔ وہاں قافلہ کی گنجائش نہ پائی۔ ہاپوڑ کو روانہ ہوا۔ دو نو برخوردار گھوڑوں پر سوار پہلے چل دیئے۔ چار گھڑی دن رہے میں ہاپوڑ کی سرائے میں پہنچا۔ دونوں بھائیوں کو بیٹھے اور گھوڑوں کو ٹہلتے ہوئے پایا۔

ہمراہی پہلے سفر میں بھی کافی تھے اور دوسرے سفر میں بھی ان کی تعداد خاصی معلوم ہوتی ہے۔ کھانے کی کیفیت ان لفظوں میں لکھتے ہیں:

میں نے چھٹانک بھر گھی داغ کیا۔ دو شامی کباب اس میں ڈال دیئے۔ رات ہو گئی تھی۔ شراب پی لی۔ کباب کھالئے۔ لڑکوں نے ارہر کی کھچڑی پکوائی۔ اور خوب[1] گھی ڈال کر آپ بھی کھائی۔ اور سب آدمیوں کو بھی کھلائی۔ دن کے واسطے سادہ سالن پکوایا۔ ترکاری نہ ڈلوائی۔

---

[1] حضرت مولانا ابوالکلام فرماتے ہیں:

اگر کہتے "گھی ڈال کر" تو گھی کے ڈالنے کا تذکرہ تو ہو جاتا۔ مگر اس گھی کا نہ ہوتا۔ جو کھچڑی کا ذائقہ شناس کھچڑی میں ڈالا کرتا ہے۔ اس لئے مقدار کا پہلو ابھارنے کی غرض سے "خوب گھی ڈال کر" قلم سے نکلا۔ کیا قدرت تحریر تھی اور کیا اسلوب و تعبیر کی جزئیات و دقائق کا احاطہ تھا!

پھر فرماتے ہیں :۔

چار پانچ بجے صبح کے عمل میں ہاپوڑ سے چل دیا۔ سورج نکلے بابوگڑھ کی سرائے میں پہنچا۔ چارپائی بچھائی۔ اس پر بچھونا بچھا کر حقہ پی رہا ہوں۔ اور خط لکھ رہا ہوں۔ دو گھوڑے کوتل آ رہے ہیں۔ دونوں لڑکے رتھ میں سوار آتے ہیں وہ آئے، اور کھانا کھالیا اور چلے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سواری کے لئے دو گھوڑے ایک رتھ اور دو گاڑیں تھیں۔ خود غالب پالکی میں سفر کرتے تھے۔ حکیم غلام نجف خاں لکھتے ہیں :

بدھ کا دن ہے۔ پہر بھر دن چڑھا ہوگا۔ فقط میں پالکی پر مراد آباد پہنچا۔ ۲۰ رجمادی الاول ۱۲۸۲ھ کی اور ۱۱ اکتوبر ۱۸۶۵ء کی ہے دونو لڑکے دونو گاڑیاں اور رتھ اور آدمی پیچھے ہیں۔ اب آئے جاتے ہیں۔ رات بخیر گزرے کل رام پور پہنچ جاؤں گا (۱۲ اکتوبر ۱۸۶۵ء کو گھرایا ہوا ہوں) تیسرا دن ہے پاخانہ پھرے کو۔ لڑکے بخیر و عافیت ہیں۔

واپسی | رام پور وہ ۱۲ اکتوبر کو پہنچے تھے۔ ایک خط سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ ۷ اکتوبر کو دلّی سے چلے تھے۔ اس لحاظ سے پانچ روز سفر میں صرف ہوئے۔

رام پور کی سرکار کا فقیر تکیہ دار روزینہ خوار، رئیس حال نے مسند نشینی کا جشن کیا۔ وہاں گوسے دولت کو در دولت پر جانا واجب ہوا۔ ہفتم اکتوبر کو دلّی سے رام پور روانہ ہوا۔ بعد قطع منازل رستہ وہاں پہنچا۔ بعد اختتام جشن عازم وطن ہوا۔ ہشتم جنوری ۱۸۶۶ء کو دہلی پہنچا۔ عرض راہ میں بیمار ہوا۔ پانچ دن مراد آباد میں صاحب فراش رہا۔

باقر علی خاں اور حسین علی خاں ۲۲ دسمبر کو رام پور سے چلے تھے۔ غالب ۲۸ دسمبر کو روانہ ہوئے۔ دیباچہ "مکاتیب غالب" سے واضح ہوتا ہے۔ کہ ان دنوں دریائے رام گنگا میں سرمائی بارش کے سبب سیلاب تھا۔ غالب کی پالکی دریا سے گزر گئی۔ تو پانی کے زور سے پل ٹوٹ گیا۔ اسباب کی گاڑیاں اور خدام دریا کے دوسری طرف رہ گئے۔ غالب مراد آباد کی سرائے میں پہنچے۔ تو ان کے پاس صرف ایک کمبل

تھا۔ رات اسی میں بسر کی۔ بڑھاپے کی کمزوری اواخر دسمبر کی تیز سردی کی تاب نہ لا سکی اور وہ بیمار ہو گئے۔ صاحبزادہ ممتاز علی خاں بہادر کو معلوم ہوا تو انہوں نے دو آدمی بھیجے اور سرائے سے اُٹھا کر سعید الدین خاں کے ہاں لے گئے۔ مولوی محمد حسن خاں صدر الصدور کو معلوم ہوا تو وہ اپنے گھر لے گئے اور پانچ روز انتہائی اہتمام سے ان کی تیمارداری کی۔ نواب مصطفٰے خاں شیفتہ نے بھی وہیں غالب سے ملاقات کی اور رام پور پہنچ کر سارے حالات نواب کلب علی خاں کے گوش گزار کئے۔ نواب مرحوم نے فوراً ایک سوار مراد آباد بھیجا اور فرمایا کہ اگر طبیعت مائل بہ اعتدال نہ ہو تو رام پور آجایئے تاکہ بخوبی علاج ہو سکے۔ لیکن غالب اس سے پیشتر دہلی روانہ ہو گئے تھے۔ جہاں وہ ۸، جنوری ۱۸۶۶ء کو پہنچ گئے۔

حالاتِ زمانہ قیام

۲۱، اکتوبر ۱۸۶۵ء کے ایک خط میں حکیم غلام نجف خاں کو لکھتے ہیں:-

تم کو میرے کھانے پینے کی طرف سے تشویش ہے خدا کی قسم میں یہاں خوش اور تندرست ہوں ان کا کھانا ایسے وقت میں آتا ہے کہ پہر دن چڑھے تک میرے آدمی بھی روٹی کھا چکتے ہیں شام کا کھانا بھی سویرے آتا ہے۔ کئی طرح کا سالن، پلاؤ، متنجن، الپسندے دو دو وقت روٹیاں خمیری، چپاتیاں، مربے، اچار۔ میں بھی خوش، لڑکے بھی خوش۔ کلو اچھا ہو گیا ہے۔ سقا، مشعلچی، خاکروب سرکار سے متعین ہے۔ حجام اور دھوبی رکھ لیا ہے۔ آج تک دو ملاقاتیں ہوئی ہیں تعظیم، تواضع، اخلاق کسی بات میں کمی نہیں۔

پھر لکھتے ہیں:

نواب صاحب کا اخلاص و التفات روز افزوں ہے۔ آج منگل کا دن ۴، جمادی الثانی کی اور ۲۴، اکتوبر کی ہے۔ کھانے اور گھوڑوں اور بیلوں کے گھاس دانے کی نقدی ہو گئی۔ لیکن اس میں میرا فائدہ ہے، نقصان نہیں۔ دسمبر کی پہلی سے جشن شروع ہو گا۔ ہفتہ دو ہفتہ کی مدت اس کی ہے۔ بعد جشن کے رخصت ہوں گا۔

میرزا شمشاد علی بیگ رضوان کو تحریر فرماتے ہیں:

آج ۴؍ نومبر کی ہے۔ پرسوں نواب صاحب دورہ کو گئے ہیں۔ فرما گئے ہیں۔ دو ہفتہ میں آؤں گا۔ اگر چار روز یہاں رہیں گے پھر نمائش گاہ بریلی کی سیر کو جائیں گے وہاں سے پھر کر جب آئینگے تو صاحب کمشنر بریلی کا انتظار فرمائیں گے۔ وہ پانچ دسمبر تک آ جائینگے تین دن جشن رہیگا۔ اسکے دو چار روز بعد غالب رخصت ہوگا۔ خدا کرے تم تک زندہ پہنچ جائے۔

کیفیت جشن ۲؍ دسمبر ۱۸۶۵ء کے مکتوب میں نواب علاء الدین احمد خاں کو لکھتے ہیں:

یہاں جشن کے وہ سامان ہو رہے ہیں کہ جمشید اگر دیکھتا تو حیران رہ جاتا۔ شہر سے دو کوس پر آغا پور نامی ایک بستی ہے آٹھ دس دن سے وہاں خیام برپا تھے۔ پرسوں صاحب کمشنر مع چند میموں اور صاحبوں کے آئے اور خیموں میں اُترے۔ کچھ کم سو صاحب اور میم جمع ہوئے۔ سب سرکار رامپور کے مہمان۔ کل بہ شنبہ ۵؍ دسمبر حضور پر نور بڑے تجمل سے آغا پور تشریف لے گئے۔ بارہ پر دو بجے گئے۔ اور شام کو پانچ بجے خلعت پہن کر واپس آئے۔ وزیر علی خاں خانساماں خواصی میں سے روپیہ پھینکتا ہوا آتا تھا۔ دو کوس کے عرصے میں دو ہزار سے کم نہ نثار ہوا ہوگا۔ آج صاحبان عالی شان کی دعوت ہے۔ کھانا اور شام کا کھانا یہیں کھائیں گے۔ روشنی اور آتشبازی کی وہ افراط کہ رات دن کا سامنا کرے گی۔ طوائف کا وہ ہجوم ہے کہ اگر مجمع اس مجلس کو "طوائف الملوک" کہنا چاہیئے۔"

نواب کلب علی خاں مرحوم نواب کلب علی خاں کا حلیہ یوں بیان کرتے ہیں:

قد و رنگ و شکل و شمائل بعینہ بھائی ضیاء الدین احمد خاں، عمر کا فرق اور کچھ کچھ چہرہ اور لحیہ متفاوت حلیم، خلیق، باذل، کریم، متواضع، متشرع، متورع، سینکڑوں شعر یاد، نظم کی طرف توجہ نہیں، نثر لکھتے ہیں اور خوب لکھتے ہیں۔ جلال الدین طباطبائی کی طرز پر کہنے میں شگفتہ جبیں ایسے کہ ان کو دیکھنے سے غم کوسوں بھاگ جائے۔ فصیح بیان ایسے کہ ان کی تقریر سنکر ایک اور نئی روح قالب میں آئے۔

حکیم غلام نجف خاں کو لکھتے ہیں :-

نواب صاحب حال بہ مقتضائے "الولد سر لابیہ" حسن اخلاق میں نواب فردوس آرامگاہ کے برابر بلکہ بعض شیوہ و روش میں ان سے بہتر ہیں۔ بہ مجرد مسند نشینی کے غلہ کا محصول یک قلم معاف کر دیا۔ علی بخش خان سامان کو تیس ہزار روپیہ بابت مطالبہ سرکار بخش دیا۔ مفصل حالات بذل و نوال عندالملاقات زبانی کہوں گا۔ سنو صاحب میں فقیر آزادہ کیش ہوں، دنیادار نہیں امکان نہیں جس میں جو صفات دیکھتا ہوں بیان کرتا ہوں۔

متفرق حالات اس جشن میں غالب کے نہایت عزیز دوست نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ بھی شریک ہوئے تھے۔ نیز منشی نولکشور مالک مطبع نولکشور نے اپنی صاحبزادی کی شادی کے سلسلے میں مالی امداد کی عرضداشت پیش کر رکھی تھی۔ غالب ۲۰ر نومبر ۱۸۶۵ء کے خط میں ہر گوپال تفتہ کو لکھتے ہیں :-

میں نثر کی داد اور نظم کا صلہ مانگنے نہیں آیا، بھیک مانگنے آیا ہوں۔ روٹی اپنی گرہ سے نہیں کھاتا، سرکار سے ملتی ہے۔ وقت رخصت میری قسمت اور منعم کی ہمت۔ نواب صاحب از روئے صورت روح مجسم و بہ اعتبار اخلاق ابر رحمت ہیں۔ خزانہ فیض کے تحویلدار ہیں۔ جو شخص وفور ازل سے جو کچھ لکھوا لایا ہے۔ اس کے بٹنے میں دیر نہیں لگتی۔ ایک لاکھ کئی ہزار روپے سال کا غلہ کا محصول معاف کر دیا۔ ایک اہلکار پر ساٹھ ہزار کا محاسبہ معاف کیا اور

---

[1] دیباچہ "مکاتیب غالب" سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ نواب کلب علی خاں نے ۸ نومبر ۱۸۶۶ء کو ایک ہزار روپے کی رقم دی تھی، روانگی کے وقت دو سو روپے کی مزید رقم بوجہ زادِ راہ مرحمت فرمائی۔ قیام کے لئے جرنیلی کوٹھی دی جو اس زمانے میں قلعہ معلےٰ کے مشرقی دروازہ کے باہر واقع تھی۔ نواب سید حامد علی خاں مرحوم نے قدیم عمارتوں کو گرا کر نئی عمارتیں تعمیر کرائیں تو یہ کوٹھی قلعہ معلےٰ کے اندر آگئی آجکل یہ عمارت مہمان خانہ کے طور پر استعمال ہوتی ہے۔

بیس ہزار روپیہ نقد دیا۔ منشی نولکشور کی عرضی پیش ہوئی۔ خلاصہ عرضی سُن لیا۔ واسطے منشی صاحب کے کچھ عطیہ بہ تقریب شادی صبیہ تجویز ہو رہا ہے۔ مقدار مجھ پر نہیں کھلی بھائی مصطفےٰ خاں بہ تقریب مسند نشینی و شمول جشن آئے ہوئے ہیں اس وقت تک نہیں آئے واپسی کے بعد دہلی سے تفتہ کو لکھتے ہیں :-

۸ جنوری سال حال (۱۸۶۶ء) دوشنبہ کے دن غضب الہٰی کی طرح اپنے گھر پر نازل ہوا مُراد آباد پہنچ کر بیمار ہو گیا۔ پانچ روز صدر الصدور کے ہاں پڑا رہا۔ انھوں نے تیمارداری اور غمخواری بہت کی۔

غالب نے سفر کلکتہ کے سلسلے میں بنارس پہنچ کر ایک قطعہ لکھا تھا :

مغلوب سطوت غم دل غالب حزیں کاندر تنش ز ضعف تواں گفت جاں نبود
گو بند زندہ تا بہ بنارس رسیدہ است "ما را ازیں گیاہ ضعیف ایں گماں نبود"

سفر رام پور سے واپسی پر اس قطعہ کو یوں بنا دیا :

مغلوب علیہ غم دل غالب حزیں کاندر تنش ز ضعف تواں گفت جاں نبود
از رام پور زندہ بہ دہلی رسیدہ است "ما را ازیں گیاہ ضعیف ایں گماں نبود"

جس زمانے میں وہ رام پور میں تھے قاضی عبد الجمیل صاحب بریلوی نے لکھا تھا۔ کہ بریلی میں نمایش ہو رہی ہے۔ تشریف لائیے اور نمایش کی سیر بھی کیجئے۔ جواب میں لکھتے ہیں :

مسند نشینی کی تہنیت کے واسطے رام پور آیا ہوں کہاں بریلی کہاں۔ ۲۰ اکتوبر کو یہاں پہنچا بہ شرط حیات دسمبر تک دہلی جاؤں گا۔ نمایش گاہ بریلی کی سیر کہاں۔ خود اس نمایش گاہ کی سیر سے جس کو دُنیا کہتے ہیں دل بھر گیا۔ اب عالم بے رنگی کا مشتاق ہوں۔

سفر میرٹھ میرٹھ کے سفر کی تقریب یہ تھی کہ غدر میں دوسرے اکابر کے علاوہ نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ بھی گرفتار ہو گئے تھے ان پر مقدمہ چلا اور سات سال قید کی سزا ہوئی۔

بعد ازاں بے گناہی ثابت ہوئی۔ رہائی کی خبر سنکر غالب اُن سے ملنے کے لئے میرٹھ گئے تھے۔ یہ سفر اواخر جنوری ۱۸۵۹ء میں ہوا۔ تین روز میرٹھ ٹھہرے اور ۲۵ جنوری ۱۸۵۹ء کو دہلی واپس آئے۔ ہرگوپال تفتہ کو لکھتے ہیں:

میں مصطفٰے خاں کی ملاقات کو بہ سپیل ڈاک میرٹھ گیا تھا۔ تین دن وہاں رہا۔ کل وہاں سے واپس آیا۔ آج تم کو یہ خط بھجوایا۔ محررہ و مرسلہ چہار شنبہ ۲۶ جنوری ۱۸۵۹ء۔

پھر لکھتے ہیں:۔

صاحب میرٹھ سے آکر تم کو خط لکھ چکا ہوں شاید نہ پہنچا ہو۔ اس واسطے از روے احتیاط لکھتا ہوں کہ نواب صاحب مصطفٰے خاں کے ملنے کو بہ سپیل ڈاک میرٹھ گیا تھا اور سہ شنبہ کے دن دلی آگیا۔ (صبح یکشنبہ سی ام جنوری ۱۸۵۹ء)

مارہرہ جانے کا ارادہ

غالب کے اور کسی سفر کا علم نہیں ہوسکا۔ البتہ بعض سفروں کے ارادوں اور بعض دعوتوں کا ذکر ان کے خطوط میں جا بجا ملتا ہے۔ لیکن بظاہر نہ یہ ارادے پُورے ہوئے اور نہ غالب نے دعوتیں قبول کیں۔ مثلاً ایک موقع پر مارہرہ کے ایک صاحب سے بہ طریق تمنا ذکر کیا تھا کہ مارہرہ جانے اور پیٹ بھر کر آم کھانے کو جی چاہتا ہے۔ صاحب عالم مارہروی نے جو غالب کے خاص معتقدین میں سے تھے۔ یہ سُنا تو فوراً لکھا کہ جلد مارہرہ آیئے اور دلی سے روانگی کا دن لکھئے۔ جواب میں فرماتے ہیں:۔

حضرت کو کس راہ سے میرے آنے کا انتظار ہے؟ میں نے مرشد زادے کے خط میں کب اپنا عزم لکھا۔ کس نے آپ سے میری زبانی کہا کہ آپ روزِ روانگی کے تقرر سے اطلاع چاہتے ہیں؟ ہاں آپ کی قدم بوسی اور انوار الدولہ کے دیدار کی آرزو حد سے زیادہ ہے۔ اور ایسا جانتا ہوں کہ یہ آرزو گور میں لے جاؤں گا۔

پھر لکھتے ہیں:۔

تھا اور اب مجھے مارہرہ بلاتے ہیں اور میرا قصد مجھے یاد دلاتے ہیں ان دنوں میں کہ دل بھی تھا اور طاقت بھی، شیخ محسن الدین مرحوم سے بہ طریق تمنا کہا گیا تھا کہ جی یوں چاہتا ہے کہ برسات میں مارہرہ جاؤں اور دل کھول کر اور پیٹ بھر کر آم کھاؤں۔ اب وہ دل کہاں سے لاؤں اور طاقت کہاں سے پاؤں۔

کالپی کا ارادہ — نواب انورالدولہ رئیس کالپی کو لکھتے ہیں:

میرا دل جانتا ہے کہ آپ کے دیکھنے کا میں کس قدر آرزومند ہوں میرا ایک بھائی ماموں کا بیٹا یعنی خواجہ غلام حسین خاں کمیدان اکبرآبادی کا پوتا کہ وہ نواب ذوالفقار الدولہ کی حقیقی خالہ کا بیٹا ہوتا تھا، اور مسند نشین باندہ) حال کا چچا تھا اور وہ میرا ہمشیر بھی تھا۔ یعنی میں نے اپنی ممانی اور اس نے اپنی پھوپھی (غالب کی والدہ) کا دودھ پیا تھا۔ وہ باعث ہوا تھا۔ میرے باندہ بو تبدیل کھنڈ آنے کا۔ میں نے سب سامان سفر کر لیا۔ ڈاک میں ڈاک کا روپیہ دے دیا۔ مقصد یہ تھا کہ فتح پور تک ڈاک میں جاؤں گا۔ وہاں نواب علی بہادر رئیس باندہ کے ہاں کی سواری میں باندہ جا کر ہفتہ بھر رہ کر کالپی ہوتا ہوا آپ کے قدم دیکھتا ہوا بہ سبیل ڈاک چلا آؤں گا۔ ناگاہ حضور والا (ابوظفر بہادر شاہ) بیمار ہو گئے۔ مرض نے طول کھینچا۔ وہ ارادہ قوت سے فعل میں نہ آیا اور پھر مرزا اور نگ خاں میرا بھائی مر گیا ع

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

واللہ وہ سفر اگرچہ بھائی کی استدعا سے تھا، مگر نتیجہ اس شکل کا آپ کے دیدار کو سمجھے ہوئے تھا۔

فرخ آباد کا ارادہ — میر احمد حسین خاں میکش کے نام کے ایک فارسی خط سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک مرتبہ نواب تجمل حسین خاں[1] کی دعوت پر فرخ آباد جانے کا قصد فرمایا تھا۔

[1] نواب تجمل حسین خاں بنگش خاندان میں سے تھے۔ محمد خاں بنگش سلطنت مغلیہ کے (بقیہ دیکھو صفحہ ۱۴۲)

لکھتے ہیں :-

دریں فرخندہ ہنگام امیر سلطان شکوہ نصیر الدولہ معین الملک تجمل حسین خاں بہادر حشمت جنگ کہ وسادہ نشین ایالت فرخ آباد است وررد من بہ فرخ آباد آرزو کرد - ہر چند گوشہ نشینی و نامرادی آئین من است اما بہ مشاہدہ مہرے کہ ایں والا جاہ بامن مے ورزو آہنگ آں دارم کہ پائے خوابیدہ را بہ رفتار آرم وازدہلی بہ فرخ آباد پویم وشمارا باخویشتن برم - چہ خوش باشد کہ پیوند اقامت پٹودی کہ نہ براندازہ ارزش شماست بگسلید وہم دریں ہفتہ بہ من پیوندید -

ہلاک شیوۂ تمکیں مخواہ مستاں را
عناں گسستہ تراز بادِ نو بہار بیا

یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ غالب فرخ آباد گئے یا نہیں گئے لیکن بہرحال ان کا قصد ۱۸۴۶ء سے پیشتر کا ہے - اس لیئے کہ ۱۸۴۶ء میں نواب تجمل حسین خاں کا انتقال ہو چکا تھا - غالب کی ایک اردو غزل کے آخر میں تجمل حسین خاں کی مدح میں چند اشعار بطور قطعہ موجود ہیں -

---

بقیہ نوٹ صفحہ ۱۴۱ :- آخری دور کا ایک مشہور سردار اور جرنیل تھا - اسی نے ریاست فرخ آباد کی بنا ڈالی تھی اور فرخ آباد کا قصبہ فرخ سیر کے نام پر آباد کیا تھا - ۱۷۴۳ء میں محمد خاں کا انتقال ہوا تو اس کا بیٹا قاسم خاں جانشین ہوا - وہ لڑائی میں مارا گیا تو اس کا بھائی اسلام خاں رئیس بنا - اسلام خاں کے بعد ایک اور بھائی احمد خاں نے ریاست سنبھال لی - احمد خاں کے بعد اس کا بیٹا مظفر جنگ مسند نشین ہوا - مظفر جنگ نے ۱۷۹۶ء میں وفات پائی تو اس کا بیٹا ناصر جنگ پھر ناصر جنگ کا بیٹا شوکت جنگ گدی پر بیٹھا - نواب تجمل حسین خاں شوکت جنگ کے صاحبزادے تھے - ۱۸۴۶ء میں وفات پائی - چونکہ ان کے اولاد نہ تھی - اس لیئے ان کے چھوٹے بھائی تفضل حسین نے ریاست پائی - لیکن غدر میں تفضل حسین پر بغاوت کا الزام لگا - اور فرخ آباد کی ریاست ضبط ہو گئی - تفضل حسین خاں کے مزید حالات آپ کو باب غدر میں ملیں گے -

دیا ہے خلق کو بھی تا اسے نظر نہ لگے
بنا ہے عیش تجمل حسین خاں کے لئے

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لئے

نصیرِ دولت و دیں اور معینِ ملت و ملک[۱]
بنا ہے چرخِ بریں جس کے آستاں کیلئے

زمانہ عہد میں اس کے ہے محوِ آرائش
بنیں گے اور ستارے اب آسماں کے لئے

گوالیار کا ارادہ میر سید علی خاں بہادر عرف حضرت جی کے نام کے ایک فارسی خط سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ گوالیار جانے کا قصد کیا تھا۔ حضرت جی کو لکھتے ہیں کہ مجھے ولایت سے اپنے مقدمے کے متعلق آخری اطلاع کا انتظار ہے۔ اس کے بعد:

جز آں مایہ مدت کہ بہ سرانجام ضروریات سفر وفا نواند کرد بہ دہلی نپایم در وے بہ گوالیار نہم، واگر روندگان بہ پائے روند امن بہ سر پویم۔

غالباً یہ قصد بھی پورا نہ ہوا۔

سورت کی دعوت غالب کی زندگی کے آخری دنوں میں نواب میر غلام بابا خاں انہیں سورت بلاتے تھے۔ اور کہتے تھے کہ ریل کے سفر میں تکلیف نہیں ہو گی۔ ان کے تقاضے کے جواب میں لکھتے ہیں:۔

یہ سواری ریل روانہ ہونے کی لہر دل میں آئی۔ پاؤں سے اپاہج، کانوں سے بہرا، ضعف بصارت، ضعفِ دماغ، ضعفِ دل، ضعفِ معدہ، اور ان سب پر ضعفِ طالع، کیونکر قصدِ سفر کروں؟ تین چار شبانہ روز قفس میں بسر کروں، گھنٹہ بھر میں دو بار پیشاب کی حاجت ہوتی ہے ایک ہفتہ دو ہفتہ بعد ناگاہ قولنج کے دورے کی شدت ہوتی ہے۔ طاقتِ جسم میں حالت جان میں نہیں، آنا میرا سورت تک کسی صورت حیز امکان میں نہیں۔

---

[۱] نصیر الدولہ۔ معین الملک حشمت جنگ تجمل حسین خاں کے اجزائے خطاب تھے۔

اس سے یہ بھی ظاہر ہے کہ اس زمانے میں ریل تین چار روز میں سورت پہنچتی تھی۔

غالب کے کمالات نگارش کا یہ ایک نمایاں پہلو ہے کہ وہ کسی تفصیل کے عزم و ارادہ کے بغیر مختلف ضروری حالات کو ضمناً بیان کر جاتے ہیں۔ مثلاً اپنی پنشن کے لئے درخواست ولایت بھیجنے کے ضمن میں یہ بیان کر گئے کہ جہاز چھ ہفتے میں لندن پہنچتا ہے۔ اور یہاں سورت تک ریل کے سفر کی مدت بتا گئے۔

انبالہ کا ارادہ

غالب کا دربار، امیر اور خلعت جب سرکار انگریزی سے بحال ہوئے تو لفٹنٹ گورنر پنجاب نے انہیں کہا تھا۔ کہ گورنر جنرل انبالہ میں دربار کریں گے، وہاں جا کر خلعت لے لیجئے۔ اگرچہ غالب نے اس وقت لفٹنٹ گورنر کو یہ جواب دیا تھا کہ انبالہ کہاں جاؤں گا۔[۱] لیکن بعد میں جانے کے لئے تیار ہو گئے۔ بالآخر مختلف وجوہ سے انہیں اپنا یہ ارادہ ترک کرنا پڑا۔[۲]

---

[۱] اردوئے معلیٰ صفحہ ۲۲۶ - [۲] اردوئے معلیٰ صفحہ ۱۱۸

ساتواں باب

پنشن کا مقدمہ

بندہ را بودہ است از سرکار دستمزدِ مشقتِ اسلاف
زرِ سالانہ برائے دوام وجہ شائستہ بقدرِ کفاف
ملزمم کردہ اند ہاں بدروغ حقِّ من خوردہ اندہیں بہ گزاف
آہ از اقربائے بے آزرم
داد از حاکمانِ بے انصاف

خاندانی پنشن کا مقدمہ غالب کی زندگی کا ایک بہت بڑا واقعہ ہے۔ خواجہ حالی نے اس باب میں جو کچھ تحریر فرمایا ہے۔ وہ اتنا مجمل ہے۔ کہ کوئی شخص اس سے غالب کے مطالبات کی صحیح کیفیّت معلوم نہیں کرسکتا۔ اور جس جھگڑے میں ان کی زندگی کا بہت بڑا حصہ صرف ہوا۔ جس کی وجہ سے ان کا دل مسلسل تیس برس تک گوناگوں توقعات کا مولد و مشہد بنا رہا۔ اس کی تفصیلات ظاہر نہیں ہوسکتیں۔ معہذا اس قضیہ کے متعلق غالب کی نظم و نثر میں جا بجا اشارے

ملتے ہیں اور جب تک اصل قضیہ کے پورے حالات معلوم نہ ہوں، نظم و نثر کے وہ حصے ٹھیک ٹھیک سمجھ میں نہیں آسکتے۔ اس لئے میں نے کوشش کی ہے۔ کہ اس داستان کا ایک ایک پہلو واضح ہو جائے۔

خاندانی پنشن کا آغاز

۱۸۰۶ء میں غالب کے چچا میرزا نصراللہ بیگ خاں کا انتقال ہوا۔ وہ لارڈ لیک کے ماتحت چار سو سوار کے بریگیڈیر تھے۔ ایک ہزار روپیہ ماہانہ ان کا ذاتی مشاہرہ تھا۔ لاکھ ڈیڑھ لاکھ روپیہ سالانہ کی جاگیر تھی[1]۔ ان کے انتقال پر جاگیر واپس لے لی گئی اور متعلقین کی پرورش کے لئے دس ہزار روپے سالانہ نواب احمد بخش خاں مرحوم والی فیروز پور جھرکہ کے ذمے لگا دیئے گئے۔ نواب صاحب کو ۱۸۰۴ء اور ۱۸۰۶ء میں دو جاگیریں بہ طور استمرار ملی تھیں۔ ایک فیروز پور جھرکہ اور سانگرس کی جاگیر، دوسری پرگنہ پونا ہانا بچھور اور رنگینہ کی جاگیر۔ اول الذکر کا معاوضہ پانچ ہزار اور آخرالذکر کا بیس ہزار روپے سالانہ تھا۔ یعنی دونوں جاگیروں کے سلسلے میں نواب صاحب پچیس ہزار روپے سالانہ سرکار انگریزی کو ادا کرنے کے ذمہ وار ٹھہرے تھے۔ ان جاگیروں کے باشندے بڑے سرکش اور ہنگامہ پسند تھے۔ اور خاص انتظامات کے بغیر ان کو امن و قانون کا پابند رکھنا غیر ممکن تھا۔ اس وجہ سے لارڈ لیک کو خیال ہو گیا۔ کہ نواب کے ساتھ کسی قدر رعائت ہو جانی چاہیئے۔ اسی اثناء میں نصراللہ بیگ خاں کا انتقال ہو گیا۔ لارڈ لیک نے بتاریخ ۴ مئی ۱۸۰۶ء حکومت کی طرف سے ایک شقہ نواب احمد بخش خاں کے نام اس مضمون کا بھجوا دیا۔ کہ جو پچیس ہزار روپے حکومت کو ادا کرتے ہیں۔ ان میں سے دس ہزار روپے سالانہ میرزا نصراللہ بیگ خاں کے متعلقین کو دیتے رہیں۔ میرزا سے مرحوم

---

[1] ۔ اردوئے معلےٰ صفحہ ۲۰۔ آزاد مرحوم نے خدا جانے کس بنا پر سترہ سو روپے لکھا ہے (ملاحظہ ہو آب حیات)

کے رسالے کے جو پچاس سوار باقی رہ گئے تھے (ان کا افسر خواجہ حاجی تھا) ان کو اپنے انتظام میں لے لیں اور قیام امن کے سلسلے میں حکومت سے کوئی امداد طلب نہ کریں ان شرطوں پر پچیس ہزار روپے کی رقم معاف ہو جائے گی۔ اور جاگیر مستقلاً نواب صاحب اور ان کے وارثوں کے پاس رہے گی۔ یہ نسخہ حکومت کا منظور کردہ تھا اور اس کا مسودہ دفتر میں موجود تھا لیکن معلوم ہوتا ہے۔ کہ ۷ رجون ۱۸۰۶ء کو نواب احمد بخش خاں نے لارڈ لیک سے ایک اور نسخہ حاصل کر لیا۔ جس کا مضمون یہ تھا۔ کہ میرزا نصراللہ بیگ خاں کے متعلقین کو صرف پانچ ہزار روپے سالانہ دیئے جائیں اور ان متعلقین میں خواجہ حاجی کو بھی شامل کر لیا گیا[۱]۔ پانچ ہزار کی تقسیم کا نقشہ یہ تھا

خواجہ حاجی رسالدار	دو ہزار روپے سالانہ
والدہ و ہمشیرگان نصراللہ بیگ خاں	پندرہ سو روپے سالانہ
میرزا نوشہ (غالب) اور میرزا یوسف برادر زادگان نصراللہ بیگ خاں	پندرہ سو روپے سالانہ

[۱] کہا جاتا ہے۔ کہ خواجہ حاجی اور غالب کا سلسلہ نسب بہت اوپر جا کر مل جاتا ہے۔ خواجہ حاجی کی شادی جیون بیگ کمیدان کی صاحبزادی سے ہوئی تھی۔ اور جیون بیگ کا لڑکا اکبر بیگ غالب کی ہمشیرہ سے بیاہا گیا تھا۔ لیکن ظاہر ہے۔ کہ تین خاندانوں میں رشتوں کے ان روابط یا اوپر جا کر نسب کے اتصال کی بنا پر خواجہ حاجی غالب یا میرزا نصراللہ بیگ خاں کے خاندان میں شمار نہیں ہوسکتا تھا۔ تاہم اسے نصراللہ بیگ خاں کے ان متعلقین میں شمار کیا گیا۔ جن کی پرورش بصلہ خدمات مرحوم ضروری قرار پائی۔ اس طرح غالب کی خاندانی پنشن پہلے دس ہزار سے کم ہو کر پانچہزار بنی۔ پھر اس میں سے دو ہزار خواجہ حاجی کی نذر ہوئے۔ بقیہ تین ہزار میں سے نصف خواتین کو ملے، نصف غالب اور ان کے بھائی کو۔

جھگڑے کی ابتدا کیوں کر ہوئی | غالب ۱۸۰۶ء میں صرف نو برس کے تھے۔ جو کچھ ملتا رہا اس پر قانع رہے۔ جب ہوش سنبھالا تو معلوم ہوتا ہے کہ خاندانی جائیداد کو بیچ کر گزارا کرتے رہے۔ نیز نانا کی طرف سے ان کو کافی امداد ملتی ہو گی۔ دہلی چلے آئے۔ تو بعض تحریرات سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ آگرہ سے بھی انہیں وقتاً فوقتاً روپیہ مل جاتا تھا۔ نیز نواب احمد بخش خاں مقررہ وظیفہ کے علاوہ ان کو کچھ نہ کچھ دیتے رہتے تھے۔ نواب موصوف نے خانہ نشینی اختیار کر لی اور نواب شمس الدین احمد خاں فیروز پور جھرکہ کے رئیس بنے تو اس وقت مقررہ وظیفہ کے سوا کوئی ذریعہ معاش باقی نہ رہا بلکہ نواب امیر الدین احمد خاں مرحوم کے بیان کے مطابق شمس الدین احمد خاں نے یہ وظیفہ بھی بند کر دیا تھا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ غالب کی بیگم کو تیس روپے ماہانہ کا جو وظیفہ نواب احمد بخش خاں کے زمانے سے ملتا تھا۔ وہ بھی بند ہو گیا[۱]۔ اس حالت میں غالب کو اپنی خاندانی پنشن کے لئے قانونی

---

[۱] میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ شمس الدین احمد خاں اور لوہارو خاندان کے دوسرے افراد میں شدید کشمکش پیدا ہو گئی تھی۔ غالب بھی اپنی بیگم اور دوسرے رشتہ داروں کی وجہ سے اس کی لپیٹ میں آ گئے ہوں گے۔ شمس الدین احمد خاں کو جب ریاست مل گئی۔ تو انتقاماً اپنے تمام مخالفوں کے ساتھ بدسلوکی کا وطیرہ اختیار کر لیا۔ اس سلسلے میں غالب کے بچے رہنے کی کوئی صورت نہ تھی۔ غرض شمس الدین احمد خاں کے ساتھ غالب کے تعلقات اس طرح بگڑے کہ پھر ان کی درستی نہ ہو سکی۔ یہاں تک کہ نواب کو پھانسی مل گئی۔ اور فیروز پور جھرکہ کی ریاست ہمیشہ کے لئے چھن گئی۔

چارہ جوئی کی ضرورت محسوس ہوئی۔ انہیں پانچ ہزار روپے کے اس شقہ کا غالباً کوئی علم نہ تھا۔ جو نواب احمد بخش خاں نے ۷ جون ۱۸۰۶ء کو لارڈ لیک سے حاصل کیا تھا۔ بلکہ سمجھ رہے تھے۔ کہ ۴ مئی ۱۸۰۶ء کے شقہ کے مطابق دس ہزار روپے سالانہ کی جو پنشن مقرر ہوئی تھی۔ وہی ملنی چاہیئے۔ اس میں سے ان کو اور دوسرے اہل خاندان کو صرف تین ہزار روپے ملتے رہے تھے۔ خواجہ حاجی چونکہ نصر اللہ بیگ خاں کے حقیقی متعلقین میں شامل نہ تھا۔ اس لیئے اس کے دو ہزار روپے کو بھی وہ اپنی خاندانی پنشن میں شامل نہیں کرتے تھے۔ غرض غالب کے مطالبات یہ تھے۔ کہ اوّل دس ہزار کی پوری پنشن بحال ہو جائے، دوم اس میں سے جتنی رقم نہیں ملی۔ وہ مئی ۱۸۰۶ء سے گن کر یک مشت ادا کی جائے۔[1]

مصیبتوں کا ہجوم

اس زمانے میں غالب کی مالی حالت بہت سقیم تھی۔ وہ اپنی آزاد مشربیوں میں کافی روپیہ اُڑا چکے تھے۔ بہت سا روپیہ قرض لے چکے تھے۔ ایک طرف قرضخواہ تنگ کر رہے تھے، دوسری طرف بھائی دیوانگی کے عارضہ میں مبتلا ہو چکا تھا۔ خود فرماتے ہیں :-

آغاز در رو دیدہ ہی کہ دُرد و بادۂ غفلتے بہ قدح داشتم لختے از عمر بہ پیمودن جادہ کامرانی ہوس گزشت

---

[1] مالک رام صاحب مصنف "ذکر غالب" لکھتے ہیں کہ ۱۸۲۶ء میں خواجہ حاجی کا انتقال ہو گیا تھا اور اس کا وظیفہ اس کے بیٹوں خواجہ جان اور خواجہ امان پر منتقل ہو گیا۔ غالب نے اس پر بھی اعتراض کیا۔ لیکن شنوائی نہ ہوئی۔ یہ امر بھی پنشن کے لئے قانونی چارہ جوئی کا محرک بنا۔ لیکن آگے چل کر خواجہ جان اور خواجہ امان کیساتھ خویشی کے روابط ازسرِنو استوار ہو گئے۔ چنانچہ جب خواجہ امان نے بوستانِ خیال کا ترجمہ کیا تو غالب نے اس کا دیباچہ لکھا اور کتاب کی اشاعت میں سعی فرماتے رہے۔

وبے راہہ خرامیدہ شد، تا سراز سرمستی بگردید و اندراں بیخودی پاے مصطبہ پیمائے بہ گوے فرد رفت

. . . . . ہنگامہ دیوانگی برادریک طرف و غوغاے دام خواہاں یک سو، آشوبے پدید آمد کہ نفس راہ لب و نگاہ روزنہ چشم فراموش کرد . . . . . . یا لبے از سخن دوختہ و چشمے از خویش فرو بستہ جہاں جہاں شکستگی و عالم عالم خستگی با خود گرفتم و از بیداد روزگار نالاں و سینہ بردم تیغ مالاں بہ کلکتہ رسیدم۔

نواب کے ساتھ فیصلہ کی کوشش

معلوم ہوتا ہے کہ کلکتہ جانے سے قبل دہلی کے مختلف دوستوں نے مشورہ دیا تھا۔ کہ خود نواب سے مل کر فیصلہ کر لیا جائے۔ چنانچہ وہ اس غرض سے فیروز پور جھرکہ گئے۔ علی بخش خاں رنجور کو لکھتے ہیں:

یک چند بہ اُمید نواب[۱] صاحب ساختم و از تاب آتش انتظار گداختم نشستہ ام بہ عذابے کہ مجرم بہ زنداں نشیند و مے بینم آنچہ کافر بہ جہنم بیند۔ بہ فیروز پور از بہر آں نیامدہ بودم کہ باز م بہ دہلی باید آمد۔ نواب صاحب مرا بہ لطف زبانی فریفتند۔ . . . تا کجا شکیب درزم و خود را بہ ہیچ شادماں دارم۔ از در و دیوار شاہ جہان آباد بلا مے بارد . . . . . میر امام علی را با عرضداشت بہ خدمت نواب صاحب فرستادہ ام۔ زنہار با من زمانہ سازی و از نواب محابا مکنید، و چناں کنید کہ چوں عرضداشت خواندہ شود شما ہم دراں انجمن باشید، تا نگارش را بہ گزارش تیرو دہید . . .

. . . . . . یاراں مے گفتند کہ تو بہ نواب نے گرائی و درد دل باوے نمے گوئی ورنہ از کجا کہ نواب بہ چارہ بر نخیزد . . . . . . اینہا کہ مے کنم از بہر زباں بندی ایں ادا ناشناسان است خدارا طرح آں افگنید کہ میر امام علی زود برگردد و بہ من پیوندد تا دوستاں ناصح را خیر باد گویم و بہ سرو برگے کہ نہ دارم بہ شرق (کلکتہ) پویم۔

کلکتہ میں کوشش

بہ ہر حال غالبؔ کلکتہ پہنچے۔ نواب اکبر علی خان سے ملنے کے لئے

۱؎ نواب سے مراد بہ ظاہر شمس الدین احمد خاں ہیں۔

ہوگلی گئے۔ جن کے نام مولوی محمد علی خاں صدر امین باندہ نے ایک سفارشی خط دیا تھا۔[1] اس کے بعد سیمن فریزر[2] سے ملے جو اس زمانے میں گورنر جنرل کے دفتر فارسی میں اسسٹنٹ سکرٹری کے عہدے پر مامور تھے۔ فرماتے ہیں:-

سیمن فریزر اسسٹنٹ سکرٹری را دریافتم۔ ملاقات شائستہ رو داد و استقبال و مشایعت و معانقہ و عطائے عطر و پان بہ میاں آمد۔ طرز ملاقات ایں ستودہ خوے خرسند و توانا دلم کرد۔ عرضداشت گورنر جنرل بہادر چنانکہ رسم ایں دادگاہ است بہ صاحب سکرٹری بہادر سپردہ اند وہم دریں صحبت۔ صاحب سکرٹری بہادر آں را با پاٹن صاحب سپرد تا آں بہ انگریزی نقل کند۔

اس تحریر سے یہ بھی واضح ہے کہ ۱۸۲۸ء میں انگریز افسر معزز ہندوستانیوں سے کس طریق پر ملتے تھے۔ جب وہ ملنے کے لئے آتے۔ تو افسر اُن کا استقبال کرتے۔ بغل گیر ہوتے۔ عطر اور پان دیتے۔ اور رخصت کے وقت چند قدم چھوڑنے کیلئے ساتھ جاتے۔

چیف سکرٹری سے ملاقات

اینڈریو اسٹرلنگ دفتر فارسی کے سیکرٹری اور پولیٹکل ڈیپارٹمنٹ کے ڈپٹی سکرٹری رہ چکے تھے۔[3] مقدمہ پیش ہونے کے زمانے میں وہ چیف سکرٹری تھے۔[4] غالب نے ان سے بھی ملاقات کی۔ وہ بڑے اچھے فارسی دان اور غالب کے بیان کے مطابق "سخن فہم" تھے۔ بڑے حسن اخلاق سے ملے۔ ان کی مدح میں غالب نے پچپن شعر کا ایک فارسی قصیدہ کہا تھا۔ جس کا ایک حصہ سُنایا۔ صاحب بہت خوش ہُوئے اور وعدہ کیا کہ پوری امداد فرمائیں گے۔ غالب لکھتے ہیں:

---

[1] کلیات نثر فارسی صفحہ ۱۶۶ [2] ولیم فریزر کے بھائی تھے۔ ۱۸۵۳ء میں دہلی کے ریزیڈنٹ مقرر ہوگئے ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کو غدر کے آغاز پر مارے گئے۔ [3] ڈکشنری آف انڈین بایوگرافی صفحہ ۴۰۵۔
[4] کلیات نثر فارسی صفحہ ۱۶۷۔

اندر واسٹرلنگ کہ قوس عروجی کونسل رانقطہ بدایت و قوس نزولی آں رانقطہ نہایت است۔

چوں سراپا بہ علم و آگہی وا رد و سخن را مے فہمد و بہ لطف سخن ولے رسد در مدح وے قصیدۂ مشتمل بر پنجاہ و پنج بیت، انشا کردم و در آخر قصیدہ لختے از حال خویشتن نگاشتم از حسن اتفاق نہ بہ سعی کسے، ملازمتش بہ روش گزیدہ و ایں معنی پسندیدہ بہم داد۔ اعتبار خاکساریہاے من افزود و عیار اُمید واریہاے من کامل بر آمد۔ پارہ از قصیدہ برخواندم، محظوظ شد، دلجوییہا کرد و وعدہ یاریگری داد۔

غالبؔ نے اس قصیدہ میں اپنے متعلق جو کچھ لکھا تھا۔ وہ انہی کی زبان سے سُن لیجئے :۔

من شکستہ دِل بے نوائے ہیچ مداں چگونہ دم زدم از دعوی ثنا خوانی
گدایم و بہ تمنائے داد آمدہ ام بہ درگہے کہ بود قیصرش بہ دربانی
زنانہ ام چہ محابا کہ معدلت کیشی زگدیہ ام چہ خجالت کہ از کریمانی
نہ ملک خواہم و نے مال، ایں قدر خواہم کہ گردِ غم زرخ بخت من بیفشانی
مرادِ لیست زدردِ شکستگی لبریز نہ آرزوئے امیری، نہ حسرت خانی
زلیست سال فزوں بیشود کہ مے سوزد نفس چو رشتۂ شمعم بہ بزم حیرانی
کجاست جیب کہ چاکے درو توانم زد مگر جگر بہ دریدن وہم ز عریانی
ز اہل دہر دریں روزگار بے دردی بہ عید عشرت خویشم نمودہ قربانی
سیاہ مست نہ دارد زکس محابائے شمردہ خون دلم را رحیق ریحانی
شرر بہ پیرہن جاں فشاند، جا نگذاشت کہ شعلہ سر کشد از داغہائے پنہانی
چناں بہ حلقۂ دامم کشید تنگ کہ من بہ بند عجز فرو ماندم از پر افشانی
غریب نیست بہ دردِ دلم رسیدن ہا نہ مدعی عربی و نہ من خراسانی

بہ دادگاہ رسیدم چنانکہ دانستم
برس بہ دادِ غریباں چنانکہ مے دانی

کونسل کا طریق کار

اس زمانے میں دستور تھا کہ جب دو تین مقدمے کونسل میں پیش ہونے کے لئے جمع ہو جاتے تو اسسٹنٹ سکرٹری داد خواہوں کے نام اور مقدمات کے حالات چیف سکرٹری کے روبرو پیش کر دیتا۔ وہ ہر مقدمے کے حالات خود دیکھتا۔ ان پر غور کرتا اور جن مقدمات کو کونسل میں پیش کرنا مناسب سمجھتا، صرف انہیں رکھ لیتا، باقی واپس ہو جاتے۔ غالب یہ تمام حالات بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں،

بارے بہ ہوس شاد مانم کہ داد نامہ من پذیرفتنی د بہ کونسل گزشتنی سنجیدہ شد۔ تا دران انجمن چہ روے دہد و فرمان فرماندہاں در بارہ من چہ باشد۔

دہلی میں مقدمہ پیش کرنے کا حکم

عرضداشت کونسل میں پیش ہوئی تو اس پر حکم صادر ہوا کہ ضابطہ کے مطابق یہ معاملہ سب سے پہلے دہلی کے ریزیڈنٹ کے پاس پیش ہونا چاہیے غالب نے عذر پیش کیا کہ میرے پاس اتنا ساز و سامان اور تاب و توان نہیں کہ کلکتہ سے دہلی جاؤں اور وہاں سے دوبارہ چارہ خواہی کے لئے کلکتہ آؤں۔ اس پر کونسل نے حکم دیا کہ خود یہاں انتظار کرو اور وکیل کے ذریعہ سے دہلی میں مقدمہ پیش کراؤ۔ غالب لکھتے ہیں،

عرضداشت بکونسل گزشت و فرمان صادر گشت کہ ضابطہ مقتضی آن است کہ نخست زمزمۂ تظلم بہ گوش ریزیڈنٹ دہلی رسیدہ آید۔ گفتنم کہ سرو برگ و تاب و توان معاودتم نیست۔ فرمان یافتم کہ خود ایں جا باشد و دکالۃً بہ ریزیڈنسی دہلی گراید۔

اس پر غالب نے کلکتہ سے اپنے ایک دوست کو لکھ کر ایک وکیل کے ذریعہ سے دہلی ریزیڈنسی میں مقدمہ پیش کرایا اور تمام ضروری کاغذات بھی وکیل کے پاس بھیج دیئے۔[۱] یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ کس شخص نے وکالت کی اور کون سے دوست

---

[۱] کلیات نثر فارسی صفحہ ۱۶۸ و ۱۶۹

نے یہ کام اپنے ذمے لیا۔ رائے چھجمل کے نام کے ایک خط سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ ان کو وکیل بنانے کے خواہاں تھے۔ ایک خط سے پتہ چلتا ہے کہ لالہ ہیرالال ان کے وکیل تھے۔

پیشی میں تعویق

مقدمہ تیار ہو چکا تھا لیکن ابھی پیشی نہیں ہوا تھا کہ ایڈورڈ کول بروک ریزیڈنٹ دہلی دورے پر روانہ ہو گئے۔ اس وجہ سے تاخیر ہو گئی۔ غالب لکھتے ہیں:

کاغذ فرستادہ من رسیدہ است کار فرما آں را پزیرفت۔ وکالت نامہ بوکیل داد ہنوز وکالتش از قوۃ بہ فعل نیامدہ بود کہ روشن الدولہ سر ایڈورڈ کول بروک فرمانروائے دہلی بہ ہنجار دورہ بال نہضت کشاد۔ ہر آئینہ انتظار باز گردیدنش پیش وایں درنگ کہ بے خواست در میان آمد بجائے خویش است۔

ادھر کلکتہ میں ولیم بیلی رکن اعظم کونسل برما چلے گئے۔ لارڈ بنٹنک گورنر جنرل شکار کے لئے مالدہ روانہ ہو گئے۔ مولوی عبدالکریم صاحب میر منشی دفتر فارسی آٹھ مہینے کی رخصت لے کر اپنے وطن لکھنؤ چلے گئے[1]

انگریز کرنیل کی سفارش

غالب نے ایک فوجی افسر کرنیل ہنری املاک سے سر ایڈورڈ کول بروک کے نام ایک سفارشی خط لکھوا دیا تھا۔ نیز نواب اکبر علی خاں متولی امام باڑہ ہوگلی سے ایک خط منشی التفات حسین خاں کے لئے حاصل کر لیا تھا۔ جو غالباً ریزیڈنسی کے میر منشی تھے۔ یہ خط لالہ ہیرالال وکیل کو بھجوا دیا گیا۔ علی بخش خاں رنجور کو یہ تمام حالات لکھنے کے بعد فرماتے ہیں:

وقت است کہ رپورٹ مقدمہ من از محکمہ ریزیڈنسی دہلی بال روائی گشاید۔ لاجرم شمارا باید۔

---

[1] کلیات نثر فارسی صفحہ ۱۵۹

[2] کلیات نثر فارسی صفحہ ۱۶۹

[3] سر ایڈورڈ کول بروک ۱۸۲۷ء سے ۱۸۲۹ء تک دہلی میں ریزیڈنٹ تھے۔

بہ منشی التفات حسین سررشتہ گفتگو وا کردن در رنگ آں ریختن کہ تقریباً ذکر سفارش نامہ کرنیل

ہنری املاک بہادر درمیان آورند تا گل مدعا شادمانی پذیرد و وارزش من بہ لطف

در ضمیر حاکم تازہ گردد۔

معلوم ہوتا ہے کہ کرنیل ہنری املاک کی سفارش پر سر ایڈورڈ کول بروک

نے رپورٹ اوپر بھیجی تھی اور وہاں سے اچھا جواب حاصل کر لیا تھا۔ لیکن جواب

ابھی دہلی نہیں پہنچا تھا کہ صاحب موصوف دفعۃً عہدے سے الگ کر دیئے

گئے اور ان کی جگہ فرانسس ہاکنس ریزیڈنٹ مقرر ہو گئے۔ جن کے ساتھ والی فیروزپور

جھرکہ نے دوستانہ روابط پیدا کر لئے۔ ہاکنس نے کول بروک کی رپورٹ کو نظر انداز کر کے

غالب کے مطالبات کے خلاف رپورٹ لکھ بھیجی۔

کول بروک بہ توسط کرنیل ہنری املاک بر من مہربان شود و رپورٹے کہ خوشتر از آں نتواں اندیشید

بہ صدر رفرستد و جوابے کہ سود مند تر از آن نتواں سنجید از صدر حاصل نماید۔ ہنوز آں جواب در راہ

باشد کہ کول بروک معزول گردد، ہاکنس بجائے کول بروک نشیند و آنچہ بہ ہم زدن ہنگامہ

سلطنت راہس باشد، از بہر من بہ صدر نویسد۔

مزید سفارش کی سعی	کلکتہ کے عزیز دوست میرزا ابوالقاسم خاں نے وعدہ کیا تھا کہ وہ

کرنیل ہنری املاک سے فرانسس ہاکنس کے نام بھی سفارشی خط حاصل کر لیں

گے۔ لیکن کرنیل صاحب بیمار ہو گئے اور اسی بیماری میں وفات پا گئے۔

میرزا ابوالقاسم خاں وعدہ دادند کہ چوں کرنیل ہنری املاک را فرجام رنجوری بر خیزد

سپارش نامہ از وے بنام ہاکنس صاحب بہ کف آرند و بہ من رسانند۔ ہم دریں روز ہا

یکے از سترگان فرنگ بہ من گفت کہ کرنیل ہنری املاک از جہاں رفت و اے بروزگار۔

لہ سر ایڈورڈ کول بروک کے بعد چھ ہفتے ولیم فریزر ریذیڈنٹ رہے بعد ازاں نومبر ۱۸۳۰ء

تک ہاکنس کو یہ عہدہ حاصل رہا۔

من کہ دریں دیار بے فرمانروا سربہ سنگ مے زنم و جاں بہ ناکامی مے دہم عدو جاہ مند و مالدار دمن تہی دست و تنہا۔

فرانسس ہاکنس کی مخالف رپورٹ تیار ہونے سے پیشتر غالب کلکتہ سے واپس آچکے تھے۔ وہاں کم و بیش دو برس ٹھہرے رہے۔ اس دوران میں چونکہ دہلی ریزیڈنسی سے کوئی فیصلہ نہ ہوسکا اور ولیم بنٹنگ گورنر جنرل دورے پر دہلی کی طرف آنیوالے تھے۔ اس لئے غالب بھی چلے آئے۔ تاکہ ریزیڈنسی سے رپورٹ پیش کراکے گورنر جنرل کے دورے ہی میں اپنے مقدمہ کا فیصلہ کرالیں۔

ریزیڈنٹ سے بے پروائی

ریزیڈنسی کے دفتر میں جو لوگ غالب کے ہمدرد تھے اور فرانسس ہاکنس کی رپورٹ کے راز سے آگاہ تھے وہ ہرچند متنبہ کرتے رہے کہ ابھی وقت ہے، چارہ کرلیجئے۔ ہاکنس سے مل کر اپنے حالات خود سُنا دیجئے۔ لیکن غالب کے دل میں یہ بات سمائی ہوئی تھی کہ مسٹر اینڈریو اسٹرلنگ چیف سکرٹری حکومت ہند امداد کا حتمی وعدہ کرچکے ہیں۔ اس لئے ریزیڈنٹ کی رپورٹ اگر خلاف بھی ہو تو پروا نہیں۔

مسٹر اسٹرلنگ کا انتقال

لیکن سوء اتفاق دیکھئے کہ ادھر ریزیڈنسی میں غالب کے خلاف رپورٹ تیار ہوئی، ادھر کلکتہ میں اینڈریو اسٹرلنگ کا انتقال ہوگیا اور غالب کی یہ اُمیدگاہ بھی منہدم ہوگئی۔ وہ لکھتے ہیں:

فرمانده ایں خراب آباد کہ فرانسس ہاکنس بہادر ش نامند باد الی فیروز پور پیمان یک دلی بست۔ رپورٹے چنانکہ خواست بہ صدر فرستاد۔ ہرچند پردہ داران درپردہ بارم دادند۔ دریغتے ازاں راز بہ من باز گفتند، مرا دل از جائے نہ رفت۔ گفتم! اسٹرلنگ حق پرست وحق شناس کسے است کہ سررشتہ ہر کار بدست اوست، بچارہ گری خواہد نشست

قضا برمن خندید و طرح آں افگند کہ پیش از انکہ رپورٹ بہ صدر رسد امیدگاہ مرا اجل فرو رسید و چشم جہاں بینش فرو بستہ شد۔

پھر فرماتے ہیں :

حیرتے داشتم کہ بہ مرگ ناگاہ درگزشتن امیر جوان دولت و جوان سال یعنی مسٹر اندر و اسٹرلنگ ستودہ خصال برائے چیست و کارپردازان قضا ازیں سانحہ سترگ کدام نتیجہ منظور دارند ؟ حالیا حالی شد کہ بہ سیلاب فنا دادن بنائے امیدواری غالب رمیدہ بخت مے خواستند۔

ایک اور خط میں فرماتے ہیں :

مسٹر انڈر و اسٹرلنگ مرد و از گیتی جز نام نیکو با خود نہ برد ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اکنوں امید غمخواری از کے باید ہم داشت و دل را بہ خیال گردش چشم کے تسکین باید ہم داد۔ رپورٹے کہ فرانسس ہاکنس بہادر در خصوص دادخواہی من بہ صدر فرستادہ است چہ گویم کہ چہ مایہ امیدگاہ و اندوہ فزا بود است۔ تکیہ بر کارسازی آں چابک خرام بیدائے فنا داشتم اکنوں از شش سوئے فلک بہ کام دشمن است۔

فرانسس ہاکنس کی رپورٹ اینڈریو اسٹرلنگ کے انتقال سے صرف انیس روز قبل یعنی ۴ مئی ۱۸۳۰ء کو دہلی سے روانہ ہوئی تھی۔

بہ روز چہارم از مئی کہ چہار شنبہ بود و با یازدہم ذی قعدہ تطابق داشت، رپورٹ مقدمہ من ازیں داور بیگاہ بہ صدر رواں شد ہے ہے چہ رپورٹ و کو مقدمہ ارپورٹے چوں موئے زنگیاں خم اندر خم، رپورٹے چوں حال دل بستگاں درہم، رپورٹے فتوائے خون یک جہاں آرزو و رپورٹے فرمان ریزش آبرو۔

ہاکنس کی رپورٹ کے متعلق ایک قطعہ بھی لکھا ہے :

ایا ستم زدہ غالب ز ہاکنس مسگال	منہ بہ سینہ پے کینہ از شکایت داغ
اگر بہ صدر خلاف تو کردہ است رپورٹ	دگر بہ خصم بہ قتل تو بستہ است جناغ

قضا بنارِ خرابی فگند و ہم ز نخست ندیدہ کہ ہماں عکسِ غالبؔ است بلاغ

گردشِ روزگار کی بے دردی

اب آپ غالبؔ کی پریشاں حالیوں اور درماندگیوں پر غور فرمائیں۔ دل و دماغ حد درجہ نازک، زندگی کی سب سے بڑی متاع ذکاوتِ حس، مصائب کا ہجوم، رفاقتوں کی بے چارگی! اس الم زار میں ان پر کیا گزرتی ہوگی۔ دہلی سے لے کر کلکتہ تک انہوں نے کامجوئی کے لئے تدبیروں کا جو جال بچھایا تھا اس کے تمام حلقے یکے بعد دیگرے ٹوٹتے گئے۔ انہیں اپنے مطالبات کی قوت پر بڑا اعتماد تھا اگر اعتماد نہ ہوتا تو کلکتہ تک کا سفر کیوں گوارا کرتے۔ وہ سمجھتے تھے کہ صدر دفتر والے مقدمے کو دیکھتے ہی فیصلہ ان کے حق میں صادر کر دیں گے۔ اس ضمن میں انہیں دفتری کاروبار کے آئینی مراحل معلوم کرنے کا بھی خیال نہ آیا۔ کلکتہ پہنچ کر جب یہ کھلا کہ دہلی ریزیڈنسی سے رپورٹ حاصل کئے بغیر صدر دفتر میں کوئی کارروائی نہیں ہو سکتی۔ تو انہوں نے کلکتہ میں بیٹھے بیٹھے وکیل کے ذریعہ سے اس فروگذاشت کی تلافی کرانے کی کوشش کی۔ ریزیڈنٹ اور اس کے میر منشی کے پاس سفارش پہنچائی۔ اپنے حق میں رپورٹ لکھوائی۔ لیکن دفعتہً یہ تدبیر بھی درہم برہم ہو گئی پہلا ریزیڈنٹ علیحدہ ہو گیا اور دوسرے ریزیڈنٹ نے والیِ فیروز کے ساتھ ذاتی تعلقات کی بناء پر خلاف رپورٹ لکھ دی۔ اس کے پاس سفارش پہنچانے کی کوشش کی۔ لیکن جس شخص سے سفارش حاصل کی جا سکتی تھی، اسکا انتقال ہو گیا۔ تدبیر کی یہ کڑی ٹوٹ گئی تو غالبؔ اینڈریو اسٹرلنگ کے وعدے پر بھروسا کئے بیٹھے رہے۔ لیکن دہلی سے مخالف رپورٹ کلکتہ پہنچنے تک اینڈریو اسٹرلنگ کی حیاتِ مستعار کا رشتہ منقطع ہو گیا۔

غالبؔ اگر لکھتے ہیں کہ کارگاہ قضا و قدر میں یہ ساری آفتیں اس غرض سے ڈھلیں کہ مجھے پنشن کا پورا روپیہ نہ مل سکے تو ایک حقیقی شاعر کے لئے ان حالات کی تعبیر کا عام اسلوب اور کیا ہو سکتا ہے؟ ان کی تلوار بزلوں میں درد و یاس کی بے بلاشبہ بہت ابھری ہوئی نظر

آتی ہے۔ اس کا سرچشمہ تلاش کرنا ہو تو ان کی زندگی کے المنامہ پر ایک سرسری نگاہ ڈال لینی چاہیئے۔ ایسے ہی احوال وظروف نے ان سے کہلوایا کہ :

نومیدی ما گردش ایام نہ دارد

روزے کہ سیہ شد سحر و شام نہ دارد

نئے چیف سکرٹری کے پاس کوشش

اینڈریو اسٹرلنگ کی جگہ جارج سونٹن چیف سکرٹری مقرر ہوئے غالب نے ان کے پاس سفارش پہنچانے کیلئے مولوی سراج الدین احمد کو لکھا :

بخدا اگر جارج سونٹن مہربان گردد و در ظہور حق حقیقی کوشد، بہ کام دل رسیدن من آسان است اگر کار خود را کار شما نمے دانستم چگونہ ایں راز سنرگ، درمیان مے نہادم

اس باب میں غالب کو رازداری کا بھی بہت خیال تھا۔ مولوی سراج الدین احمد کو جارج سونٹن تک سفارش پہنچانے کی تحریک کے بعد لکھتے ہیں :

ہر نامہ کہ از من مے رسیدہ باشد۔ بعد خواندن و بہ مولانا نمودن مے دریدہ و بہ آب و آتش افگندہ باشد۔

ہر کوشش ناکام

لیکن تھوڑی مدت کے بعد جارج سونٹن صاحب ولایت چلے گئے غالب ایک خط میں اپنی ناکامی کی داستان درد بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

سُبحان اللہ معزول نہ گردد۔ مگر کول برد ک، بہ مرگ ناگاہ نہ میرد مگر اسٹرلنگ بولایت نہ رود مگر جارج سونٹن۔ در خور صدمہ ہائے جاں کاہ نباشد، مگر اسد اللہ داد خواہ!! اکنوں مصلحت دریں مے بینم کہ ازیں داوری قطع نظر فرمایند و وکالت نامہ من کہ نزد منشی نصر اللہ صاحب است باز ستانند و از ہم درند و بگزرند۔ اللہ بس، ماسوا ہوس ۔

یہ غالب کے مقدمہ کلکتہ کے وہ حالات ہیں جو ان کے مکاتیب سے ماخوذ ہیں ۔

دعوے کی بناء

ان کے مطالبے کی بناء ۴ رمئی ۱۸۰۶ء والا سرکاری شقہ تھا جو لارڈ لیک کی تجویز کے مطابق میرزا نصر اللہ بیگ خاں کے متعلقین کی پرورش کے

باب میں نواب احمد بخش خاں کے نام جاری ہوا تھا۔ اس کے رو سے غالب اور ان کے اقربا کو دس ہزار روپے سالانہ ملنے چاہئیں تھے۔ نواب احمد بخش خاں مرحوم لارڈ لیک کے، ۷ جون ۱۸۰۶ء والے شقّے پر عمل پیرا تھے۔ جس کے مطابق ان پر صرف پانچ ہزار روپے سالانہ واجب تھے اور اس رقم میں بھی دو ہزار کا حقدار خواجہ حاجی تھا۔ غالب آخری شقّے کو جعلی سمجھتے تھے، اور اس حقیقت میں شبہ نہیں کہ اسکا کوئی مسودہ یا نشان سرکاری ریکارڈوں میں موجود نہ تھا۔ علاوہ بریں یہ حکومت کی منظوری سے شائع نہیں ہوا تھا کہ اُسے ۴ مئی ۱۸۰۶ء والے شقّے کا ناسخ تسلیم کیا جاتا۔

خواجہ حالی کا بیان | خواجہ حالی مرحوم فرماتے ہیں،

استرلنگ صاحب سکرٹری گورنمنٹ ہند نے . . . . . وعدہ کیا تھا کہ تمہارا حق ضرور تم کو ملے گا۔ کول بروک صاحب جو اس وقت دلّی میں ریزیڈنٹ تھے انہوں نے دلّی ہی میں میرزا (غالب)، سے عمدہ رپورٹ کرنے کا اقرار کر لیا۔ ان امیدوں کے دھوکے میں وہ پورے دو برس کلکتہ میں رہے مگر آخر کار نتیجہ ناکامی کے سوا کچھ نہ ہوا گورنمنٹ نے سر جان میلکم گورنر بمبئی سے جو لارڈ لیک کے سکرٹری رہ چکے تھے اور انہیں کے روبرو جاگیروں اور پنشنوں کی سندیں، لوگوں کو ملی تھیں، مرزا کے معاملے کی بابت استفسار کیا۔ انہوں نے مرزا کے دعوے کو غلط بتایا اور جس قدر پنشن فیروزپور سے ملنی قرار پائی تھی۔ اس کی مفصل کیفیت، جو مرزا کے دعوے کے بالکل برخلاف تھی، گورنمنٹ میں بھیج دی۔

یہ بالکل درست ہے کہ اینڈریو اسٹرلنگ نے کلکتہ میں غالب کی امداد کا وعدہ کیا تھا لیکن یہ صحیح نہیں کہ کول بروک نے ان کے کلکتہ جانے سے پہلے مفید رپورٹ کا وعدہ کر لیا تھا میرا خیال ہے کہ غالب جب کلکتہ روانہ ہوئے تو اس وقت کول بروک ریزیڈنٹ ہی نہیں بنے تھے جو تحریریں اوپر پیش کی جا چکی ہیں۔ ان سے صاف ظاہر ہے کہ کلکتہ میں مقدمہ

دائر کرنے تک انہیں یہ خیال ہی نہیں تھا کہ ضابطہ کے مطابق مقدمہ پہلے ریزیڈنسی میں پیش ہونا چاہیئے، ورنہ وہ کلکتہ میں بیٹھ کر وکیل کے ذریعہ سے ریزیڈنسی میں مقدمہ پیش کرانے کے بجائے خود دہلی میں اس کا فیصلہ کرا کے کلکتہ جاتے۔ سب سے آخر میں یہ کہ اگر کول بروک ان سے امداد کا وعدہ کر چکے تھے، تو کلکتہ سے کرنیل ہنری املاک کا سفارش نامہ کیوں بھجوایا جاتا۔ نیز نواب اکبر علی خاں طباطبائی سے منشی النفات حسین کے نام خط کیوں لکھوایا جاتا؟

سرجان میلکم نے کیا کہا تھا؟

خواجہ حالی فرماتے ہیں۔ کہ اصل معاملے کے متعلق سرجان میلکم سے استفسار کیا گیا تھا۔ لیکن دہلی ریزیڈنسی کے پرانے ریکارڈوں میں غالب کی پنشن کے متعلق جو کاغذات ہیں، ان سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ صرف ۷ جون ۱۸۰۶ء والا شقہ اس غرض سے سرجان میلکم کے پاس بھیجا گیا تھا۔ کہ اس کی مہر اور دستخط دیکھ کر بتائیں کہ واقعی لارڈ لیک کا ہے یا جعلی ہے؛ سرجان کا جواب یہ تھا کہ مہر اور دستخط واقعی لارڈ لیک کے ہیں۔ غالب کے دعاوی کے متعلق نہ ان سے کچھ پوچھا گیا، اور نہ انہوں نے موافق یا مخالف کوئی بات کہی۔ غالب اس بارے میں ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

> فرمانده دہلی وکیل مرزبان میوات (نواب شمس الدین احمد خاں) را نزد خود خواند و کاغذ گزارنده وے بوے باز داد و گفت کہ جعلی است۔ مہر و دستخط ایں کاغذ ثابت نہ شده و سرجان میلکم بہادر ایں را بہ دیده دری پذیرفت۔ اکنوں مرا گرہے چند بہ سر رشتۂ خیال افتاد، یکے از دیگرے سخت تر و محکم تر۔ نخست اینکہ سرجان میلکم چنانکہ نامہ فارسی بے نام و نشان را باور داشت رپورٹ انگریزی را کہ جگر گوشہ دفتر سرکاری است نیز غلط و انموده است یا نہ؟ دوم اینکہ ہر گاہ ایں خط فارسی نمے تواند کہ رپورٹ انگریزی را ناسخ افتد، بدیں نوودی چرا باز آمد؟ یا لیتنے کہ مقابلہ ایں

سلہ کلیاتِ نثر صفحہ ۱۰۰

ہر دو تحریر بہ میان آمدے تا کار یک سو شدے۔ سوم این کہ ہر گاہ خط فارسی بہ مدعا علیہ کہ این نقش تازہ بر روے کار آوردۂ اوست باز داد ندبہ مدعی چرا نہ گفتند کہ زر مندرجۂ این ابا ید ستد و دیگر نباید خروشید۔

غالب کا دعوٰے مسترد ہو گیا

اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ پانچ ہزار والا شقہ والی فیروز پور جھرکہ نے مقدمہ کے آغاز میں نہیں۔ بلکہ آخری دور میں پیش کیا تھا۔ جارج سوئنٹن کے ایک خط سے جو ریزیڈنسی کے پرانے ریکارڈوں میں موجود ہے ظاہر ہوتا ہے کہ سر جان میلکم کی تصدیق کے بعد غالبؔ پانچ ہزار والے شقہ کی صحت کے منکر نہیں رہے تھے۔ تاہم ان کی رائے یہ تھی کہ اس شقہ سے حکومت کے منظورہ شقہ کی تنسیخ نہیں ہو سکتی۔ لیکن پانچ ہزار والا شقہ ہی صحیح سمجھا گیا اور غالبؔ کا دعوٰے مسترد ہو گیا۔ اس سے ان کے حساس قلب پر جو اثر پڑا۔ اس کا اندازہ ذیل کے الفاظ سے ہو سکتا ہے :۔

کار من بہ دادگاہ دہلی چنانکہ دانستہ باشد تباہی گزید۔ حالیا بر آں سرم کہ اگر مرگ امان دہد باز بداں در (کلکتہ) رسم و درد دل بداں زمزمہ فرو ریزم کہ مرغان ہوا و ماہیان دریا بر خود بگریانم ہیہات اگر معاش من ہمیں پنج ہزار روپیہ سالانہ ہم بدیں تفریق ازروئے دفتر سرکار کہ سادہ لوحان آں را معدلت آثار گویند ثابت شدہ بود بایستے کہ صاحبان صدر مرا از پیش راندندے و گفتندے کہ ہرزہ مخروش، آنچہ تو بازیافت وانمودہ یافتنی از آں فزوں ترنیست۔ قرار داد نیز ہمان است لاجرم دلوانہ بودمے اگر بدیں کشور باز آمدمے و بایک قبیلہ کہ خویشاں و برادران من اند بہ ستیزہ برخاستمے و بہ باطل سیری نام بر آوردمے۔

گورنر جنرل کے پاس اپیل

لیکن غالبؔ اس پر خاموش نہیں رہے۔ انہوں نے پھر براہ راست گورنر جنرل کے پاس اپیل کر دی۔ اس کوشش میں دوبارہ کلکتہ جانے کے آرزو مند تھے لیکن زاد راہ کا سر و سامان نہ تھا۔ اسی زمانے میں انہوں نے شاہ اودھ کی مدح میں ایک

---

[1] یعنی دو ہزار خواجہ حاجی کو یا اس کے خاندان کو بقیہ تین ہزار میں سے پندرہ سو غالبؔ کی دادی اور پھوپھیوں کو، اور پندرہ سو غالبؔ اور اس کے بھائی میرزا یوسف کو۔

قصیدہ بھیجا تھا جس کے صلہ کے منتظر تھے تاکہ سفر خرچ کی طرف سے ایک گونہ اطمینان ہو جائے۔ منشی محمد حسن کے نام کے ایک خط میں اس قصیدہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

بو کہ مرا بہ جائزۂ بادخوانی و صلۂ مدح گستری ایں مایہ سامان فراز آید کہ خود را گرد آوردہ بہ کلکتہ توانم برد۔ و کارے توانم کرد۔ وقت از دست مے رود و ہنگام کارے گزرد۔

سفر کا سامان میسر نہ آسکا اور وہ اس انتظار میں بیٹھ گئے کہ گورنر جنرل بہ سلسلہ دورہ دہلی پہنچیں گے تو ان سے آخری جواب کے لئے تقاضا کیا جائے گا:

چہار سال مے گزرد کہ مقدمۂ من بہ اجلاس کونسل در پیش است و دلم از تفرقۂ امید و بیم ریش حکمے کہ قطع خصومت تواند کرد بر نیامدہ و ہنگام بہ پایان رسیدن تیرہ شب نا امیدی در نیامدہ۔

حالیا برآں سرم کہ چوں جنرل اعظم کونسل اشرف الامرا لارڈ ولیم کونڈس بنٹنک بہادر بدیں دیار در آید بہ دامنش در آویزم و داد خواہم و استدعائے حکم اخیر کنم۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ لاٹ صاحب کا دامن تھام کر غالب نے داد خواہی میں ابرام کیا یا نہیں کیا۔ البتہ یہ معلوم ہے کہ لاٹ صاحب نے ان کے کاغذات منگا لئے غالب فرماتے ہیں:

فرجام داد خواہی من جز ایں قدر نیست کہ لارڈ کونڈس بنٹنک بہادر کاغذ مقدمہ مرا از دفتر دہلی با خود برد۔ کار پردازان دفتر گورنری مے گفتند کہ داد نامہائے پیشیں از دفتر کلکتہ نیز طلب فرمودہ است تا بہ مشاہدہ آں مجموع حکم اخیر توانم داد۔

مایوسی	لیکن ان کا دل مایوس تھا۔ اس بات پر بے حد قلق تھا۔ کہ ایک غیر منظورہ تحریر کی بنا پر حکومت کی منظورہ تحریر منسوخ کر دی گئی:

نظر بہ تفرقہ کہ در قوانین حکومت روئے دادہ و بہ حکم کشاکشے کہ در سر رشتہ کار من افتادہ، اگر فی المثل در بارۂ من حکم قتل صادر گردد بعید نے دانم و اگر بالفرض یک نیمہ از جاگیر فلانے بہ من بخشیدہ

شود شگفت نے پندارم - چوں عدل حقیقی نیست ہر چہ باشد گو باش -

اپیل مسترد ہوگئی

آخر کار غالبؔ کے خلاف فیصلہ صادر ہوا :-

چپراسی سررشتہ اجنٹی دہلی رسید و نامہ مہری ولیم فریزر بہادر بہ من داد - چوں بہ میزان نظر سنجیدم گراں تر ازاں بود کہ آں را یک نامہ تواں انگاشت - بارے از ہم کشودم و دیدم کہ نامہ مہری ولیم مے میکناٹن[۱] صاحب بہادر در نوردآں است - مضمونش اینکہ کاغذ ملتمس مشمول مقدمہ از نظر نواب معلیٰ القاب (گورنر جنرل) مکرر گزشت و فرمان صادر شد کہ تجویز ہاکنس صاحب منظور و مہر و دستخط کاغذ گزرانندہ مرزبان میوات (والی فیروز پور جھرکہ) اصلی و بندوبست مندرجہ دفتر سرکار نامدرج و نامکمل فقط للہ در من قال ؏

درخاندان کسرٰے ایں عدل و داد باشد

گورنر جنرل سے ملاقات بھی نہ کی

غالبؔ اس کے بعد اس درجہ مایوس ہوئے کہ گورنر جنرل دہلی آیا تو ان سے ملنے بھی نہ گئے - وہ خود فرماتے ہیں :-

لارڈ کونٹس بنٹنک بہادر سوئیں نوبت بہ دہلی نزول اجلال فرمودہ نوید بار داد و مرزبانان و مشاہرہ خواران ، بزرگان و مالداران شہر رفتند و نشستند و عطر و پان یافتند - غالبؔ مستمند کہ گشتہ صورت معقول اعمال تر است ، دریں ہنگامہ جا گرم نہ کرد و بہ بارگاہ نہ رسید و چشم بہ راہ پدید آمدن ابر رحمت از جانب محیط کہ اشارہ بہ ورود نواب گورنر جنرل جدید است -

یعنی غالبؔ سمجھ رہے تھے کہ لارڈ بنٹنک تو ان کے ساتھ انصاف نہ کر سکے شاید جدید گورنر جنرل (لارڈ آکلینڈ) ان کی حق رسی پر متوجہ ہوں - اس لئے لارڈ آکلینڈ کے ورود کو "ابر رحمت" قرار دیتے تھے - اور ان کی کشت اُمید اس بادل سے سیرابی و شادابی کے لئے چشم براہ تھی -

---

[۱] سر ولیم ھے مکناٹن ۱۸۳۰ء سے ۱۸۳۳ء تک لارڈ ولیم بنٹنک کے سیکرٹری تھے اور ۱۸۳۳ء سے ۱۸۳۷ء تک حکومت ہند میں پولٹیکل ڈیپارٹمنٹ کے سکرٹری رہے (ڈکشنری آف انڈین بایوگرافی صفحہ ۲۶۶)

ولیم فریزر کا قتل اور شمس الدین احمد خاں کو پھانسی کی سزا۔

اس دوران میں ولیم فریزر کے قتل کا واقعہ پیش آیا۔ جس میں نواب شمس الدین احمد خاں ماخوذ ہوئے۔ انکی ریاست سرکار انگریزی نے اپنی نگرانی میں لے لی۔ ہاتھی، گھوڑے، سانڈنیاں، گائیں، بیل، بیش بہا پارچات کے تھان، بگھیاں اور بہت سا دوسرا ساز و سامان فروخت ہو گیا۔ دو لاکھ ساٹھ ہزار روپیہ کی رقم پرامیسری نوٹوں کی شکل میں حکومت انگلشیہ کے پاس جمع تھی، اس میں سے ڈھائی لاکھ روپے پھانسی سے دو یا تین روز پیشتر نواب نے اپنی بڑی بیگم کے مہر میں لکھ دیئے تھے۔ جیسا کہ ان کے وصیت نامہ سے ظاہر ہوتا ہے۔ نواب کے ذمے مختلف ساہوکاروں کے قرضے تھے۔ ان کی ریاست سے جن لوگوں کو پنشنیں ملتی تھیں ان کے بقائے واجب الادا تھے۔ شمس الدین احمد خاں کی بیگم نے ایک درخواست پیش کر دی کہ ریاست نواب کی صاحبزادیوں (احمد النساء بیگم اور شمس النساء بیگم) کے نام منتقل کی جائے۔ دلیل یہ دی کہ یہ نواب احمد بخش خاں کو استمراراً ملی تھی۔ نواب شمس الدین احمد خاں کے کسی ذاتی فعل کی بناء پر ان کی اولاد کو آبائی حقوق سے محروم کرنا خلاف انصاف ہے۔

غالب کی تازہ درخواست

اس زمانے میں دہلی کا علاقہ آگرہ و الہ آباد کی لفٹنٹ گورنری سے متعلق تھا۔ غالب نے بھی ۳۰ جون ۱۸۳۵ء کو یعنی شمس الدین احمد خاں کی گرفتاری سے قریباً دو ماہ بعد اپنے پرانے مطالبات کے متعلق ایک مفصل درخواست مرتب کر کے لفٹنٹ گورنر آگرہ و الہ آباد کے پاس بھیج دی۔ یہ دہلی ریزیڈنسی کے پرانے ریکارڈوں میں موجود ہے۔ اصل درخواست انگریزی زبان میں ہے۔ آخر میں غالب کی مُہر اور دستخط ثبت ہیں۔ اس میں ۷ جون ۱۸۰۶ء والے شقہ پر (جس کی وجہ سے ابتدا میں ان کا مقدمہ خارج ہوا تھا) مفصل بحث کی ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے:۔

(۱) کوئی پروانہ یا شقہ جاری نہیں ہو سکتا جس کا مسودہ ریکارڈ میں موجود نہ ہو۔ لہذا لارڈ لیک کا جو شقہ والی فیروزپور کی طرف سے پیش ہوا وہ جعلی ہے اس لئے کہ اس کا کوئی مسودہ سرکاری دفتر میں موجود نہیں۔

(۲) اصل شقہ میں "گورنر جنرل" کے نام کے ساتھ "نواب" کا لفظ موجود نہیں اور یہ امر سرکاری دستور تخاطب کے خلاف ہے۔ لہذا یہ شقہ کسی ایسے شخص نے لکھا جو فارسی دفتر کے قواعد سے سراسر نابلد تھا۔

(۳) اس میں خواجہ حاجی کو میرزا نصراللہ بیگ خاں کے اہل خاندان میں شامل کیا گیا ہے۔ حالانکہ خواجہ حاجی نہ اس خاندان کا فرد تھا اور نہ اس خاندان میں اس کی شادی ہوئی تھی۔

(۴) اصل شقہ میں پانچہزار روپے کا ذکر ہے لیکن یہ تصریح نہیں کی گئی کہ پانچ ہزار کی یہ رقم پچیس ہزار کی اس رقم کے علاوہ ہوگی جو نواب احمد بخش خاں کے ذمے لگائی گئی تھی یا اس میں محسوب ہوگی۔

(۵) اگر پانچ ہزار کی رقم کو دس ہزار کی اس رقم کا حصہ قرار دیا جائے جو ۴ مئی ۱۸۰۶ء کو لارڈ لیک کی تجویز اور حکومت کی منظوری کے مطابق میرزا نصراللہ بیگ خاں کے متعلقین کے لئے مقرر ہوئی تھی تو سوال یہ ہے کہ لارڈ لیک ایک ماہ کے اندر اندر اس رقم میں سے نصف حصہ کیونکر حذف کر سکتے تھے؟ اور پھر نہ اس باب میں گورنر جنرل سے منظوری لی گئی اور نہ اس کے متعلق حکومت سے خط و کتابت کی گئی۔ لارڈ لیک بہ اختیار خود گورنر جنرل کی منظورہ رقم میں تخفیف کے مجاز نہ تھے۔

اس بحث کے بعد غالب لکھتے ہیں کہ بے شک سر جان میلکم کی تصدیق سے ثابت ہو گیا کہ والی فیروز پور کا پیش کردہ شقہ لارڈ لیک کی مُہر اور دستخط سے جاری ہوا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ نواب احمد بخش خاں نے لارڈ لیک کے عملہ کو رشوت دے کر شقہ لکھوایا۔ اور دوسرے کاغذات کے پلندے میں رکھ کر اس پر لارڈ موصوف سے دستخط لئے[1]۔

دو لاکھ تین ہزار کا مطالبہ | اس درخواست میں غالب کا مطالبہ یہ تھا کہ فیروز پور جھرکہ کی ریاست

---

[1] مولانا آزاد نے "آب حیات" میں نواب ضیاءالدین احمد خاں کے بیان کے مطابق تحریر فرمایا ہے کہ سر جان میلکم نے غالب کے دعوے کے متعلق یہ لکھا تھا "نواب احمد بخش خاں انگریزوں کا قدیمی دوست اور اسقدر امیر تھا۔ اس پر اتہام ضد سے لگایا گیا ہے"۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ نواب صاحب کا بیان صحیح ہے یا نہیں۔ لیکن غالب کے دعوے کی بنیاد محض یہ نہ تھی کہ نواب احمد بخش خاں نے عملہ کو رشوت دیکر شقہ پر دستخط حاصل کر لئے بلکہ حقیقی بنیاد یہ تھی کہ لارڈ لیک بہ اختیار خود گورنر جنرل کی منظور کردہ تحریر کو منسوخ کرنے کے مجاز نہ تھے۔ عملہ کو رشوت دے کر شقہ حاصل کر لینے کا جو شبہ ظاہر کیا گیا ہے وہ بھی غیر معقول نہیں۔

او اخر اپریل ۱۸۳۵ء تک نواب احمد بخش خاں اور نواب شمس الدین احمد خاں کے پاس رہی اس طرح مئی ۱۸۰۶ء سے لے کر اپریل ۱۸۳۵ء تک سات ہزار روپے سالانہ کے حساب سے دو لاکھ تین ہزار روپے کی رقم جو مجھے ملنی چاہیئے تھی نہ ملی۔ لہذا اب یہ روپیہ اس رقم میں سے ادا کیا جائے۔ جو نواب شمس الدین احمد خاں نے سرکار انگریزی میں جمع کرا رکھا ہے۔
خواجہ حاجی کو جو دو ہزار سالانہ ملتے رہے ہیں، وہ پندرہ ہزار کی اس رقم میں محسوب ہوں جو نصر اللہ بیگ خاں کے متعلقین کی پرورش کے دس ہزار روپوں کے علاوہ والی فیروز پور کے ذمے واجب الادا تھی۔

اس وقت تک شمس الدین احمد خاں کے مقدمے کا فیصلہ نہیں ہوا تھا۔ اور ان کی ریاست اگرچہ سرکار انگریزی کی تحویل میں تھی۔ لیکن ضبطی کے آخری احکام صادر نہیں ہوئے تھے۔ لہذا غالب نے اپنی درخواست میں تصریح کر دی۔ کہ اس باب میں تین صورتیں پیش آسکتی ہیں:

(۱) ریاست شمس الدین احمد خاں یا ان کے وارثوں کو واپس مل جائے۔ اس صورت میں پچیس ہزار روپے کی رقم ہر سال حکومت کو وصول کر لینی چاہیئے۔ جس میں سے دس ہزار روپے مجھے (غالب کو) دیئے جائیں۔ بقیہ روپے سرکار کے خزانے میں جمع ہوں۔

(۲) ریاست کو حکومت خود سنبھال لے اور نواب کے متعلقین کا گزارہ مقرر کرے۔ اس صورت میں بھی دس ہزار مجھے (غالب کو) ملنے چاہئیں۔ اور پندرہ ہزار روپے حکومت خود رکھے۔

(۳) حکومت ریاست کو سنبھال لے اور نواب کے متعلقین کو گزارہ بھی نہ دے۔ اس صورت میں بھی دس ہزار مجھے ملنے چاہئیں اور خواجہ حاجی کے وظیفہ کو ہر حال میں ختم کر دینا چاہیئے۔
اس درخواست کے آخر میں غالب نے اپنے قلم سے پانچ ہزار والا وہ فارسی شقہ نقل

کر دیا جو والی فیروز پور جھرکہ کے جواب دعوے کی بنا رتھا۔

مقدمہ از سر نو دہلی میں

اس درخواست کے جواب میں لفٹننٹ گورنر نے حکم دیا کہ ٹامس تھیوفلس مٹکاف ریزیڈنٹ دہلی اس کے متعلق رپورٹ پیش کریں۔ غالب کو اس حکم کا علم ہوا۔ تو ۱۶ر دسمبر ۱۸۳۵ء کو پھر ایک درخواست لفٹننٹ گورنر کے پاس بھیجی جس میں لکھا کہ مٹکاف صاحب کا عام طریقہ یہ ہے کہ عملہ سے تمام مقدمات کا خلاصہ تیار کراتے ہیں۔ اور ان خلاصوں کی بنا پر اپنی رائیں لکھتے ہیں۔ عملہ والے رشوت کے عادی ہیں۔ میرے پاس روپیہ نہیں۔ اس لئے عملہ کو خوش نہیں کر سکتا۔ ان حالات میں میرے مقدمہ کے متعلق محض خلاصہ پر تکیہ نہ کیا جائے بلکہ اصل کاغذات دیکھے جائیں۔

غالب کو جو پنشن مل رہی تھی اس میں سے بھی کچھ رقم واجب الوصول تھی۔ لہٰذا انہوں نے تیسری درخواست پیش کر دی کہ اوّل نواب فیروز پور کا جو ڈھائی لاکھ روپیہ سرکار میں جمع ہے۔ اس میں سے دو لاکھ تین ہزار روپیہ بہ سلسلہ بقایا دیا جائے۔ نیز تین ہزار روپے جو پنشن کے عام روپے میں سے باقی ہیں، ادا کئے جائیں[ل]۔ جزوی بقائے کا معاملہ الگ چلتا رہا۔ اصل دعوے کے جواب میں لفٹننٹ گورنر کا حکم آیا کہ مقدمہ سوپریم کونسل میں پیش ہو چکا ہے۔ اس لئے لفٹننٹ گورنر اس کے متعلق کوئی کارروائی نہیں کر سکتا سارے کاغذات گورنر جنرل کے پاس بھیجے جائیں۔

گورنر جنرل کے پاس درخواست

۲۳ر مارچ ۱۸۳۶ء کو غالب نے لارڈ آکلینڈ کے پاس دو درخواستیں بھیجیں۔ ان میں اپنے مقدمے کی روداد تحریر کر دی۔ نیز لکھا کہ سکرٹری اور ریزیڈنٹ نے میرا مقدمہ خراب کر دیا ہے اور میرے ساتھ صریح بے انصافی ہوئی ہے آپ خود انگریزی انصاف کے اصول پر اس کا فیصلہ کریں۔ تمام ضروری کاغذات سرکاری دفتر میں

[ل] اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نواب شمس الدین احمد خاں نے پنشن باقاعدہ ادا نہیں کی تھی یا کم از کم آخری چار سال میں ایک حبہ بھی ادا نہیں کیا تھا۔

موجود ہیں۔ اگر دہلی کے حکام میرے مطالبات کے سلسلے میں شبہات پیدا کریں تو میں انہیں دور کر سکتا ہوں۔ انہی درخواستوں میں سے ایک پر غالبؔ نے اپنے قلم سے حکومت کا وہ فارسی شقہ لفظاً لفظاً نقل کر دیا تھا جو لارڈ لیک کی تجویز اور حکومت کی منظوری کے مطابق نصر اللہ بیگ خاں کے متعلقین کیلئے دس ہزار روپیہ سالانہ کے حکم پر مشتمل تھا۔ ان درخواستوں کی رسید کی استدعا بھی کی تھی۔

بقایا کے لئے جھگڑا

تین ہزار کے جس بقائے کا ذکر اوپر آیا ہے اس کے لئے غالبؔ نے ۲۶ اگست ۱۸۳۷ء کو پھر ایک درخواست پیش کی۔ ایجنٹ نے مطالبہ حق بجانب قرار دیا۔ اس پر حکم ہو گیا کہ رقم ادا کر دی جائے۔ ۱۷ اکتوبر ۱۸۳۷ء کو امراؤ بیگم (بیگم غالبؔ) اور ان کی بہن بنیادی بیگم کی طرف سے بھی وظیفے کی بقایا رقوم کے لئے درخواستیں پیش ہو گئیں۔

شمس الدین احمد خاں کو پھانسی مل جانے پر چونکہ ریاست فیروز پور کے خلاف ہر طرف سے مطالبات پیش ہو گئے تھے، اس لئے انگریز حکام نے غالباً ان سب کو قرض تسلیم کر کے یہ شیوہ اختیار کر لیا تھا کہ وہ جس کسی کو دیتے، اصل سے ایک حصہ کم کر کے دیتے۔ غالبؔ نے اس تخفیف سے بچنے کے لئے ۱۳ جولائی ۱۸۳۸ء کو ایک درخواست دی کہ میرے معاملے کو دوسرے لوگوں کے معاملات سے جداگانہ متصور کیا جائے۔ اس پر ۱۴ جولائی کو حکم صادر ہوا کہ امتیازی سلوک کی کوئی وجہ نہیں۔

بقائے کے متعلق اس کے بعد یہ بھی جھگڑا جاری رہا چنانچہ ۱۳ جولائی ۱۸۴۰ء کو بھی غالبؔ نے ایک دعوے کیا تھا، جو بے بنیاد قرار پایا۔ یہ عرض کرنا مشکل ہے کہ یہ دعوے تین ہزار کے متعلق تھا یا دو لاکھ تین ہزار کے متعلق، جس کا حساب غالبؔ نے ۱۸۰۶ء سے لگا رکھا تھا۔

بقیہ حالات مقدمہ

اس کے بعد غالب کی تحریرات سے تفصیلی حالات معلوم نہیں ہوتے وہ مولوی خلیل الدین خاں بہادر کو ایک فارسی مکتوب میں لکھتے ہیں کہ لارڈ ہنٹنگ کے عہد میں سچائی بروئے کار نہ آئی اور دشمن کامیاب ہوگیا۔ لارڈ آکلینڈ کے ہندوستان آنے تک زمانے کے حالات بدل گئے۔ والی فیروزپور کو پھانسی کی سزا مل گئی۔ انکی ریاست سرکار انگریزی کے قبضے میں آگئی۔ ہیں نے سرکار انگریزی کو مدعاعلیہ اور کورٹ آف ڈائرکٹرز کو جج قرار دیا اور مقدمہ ولایت بھیجا۔ لارڈ آکلینڈ کا زمانہ ختم ہوگیا۔ لندن سے مجھے کوئی خبر نہ ملی۔ لارڈ ایلن برا گورنر جنرل بنے تو میں نے اپنی مظلومیت کی داستان انکے سامنے پیش کی اور ایک انگریزی عرضداشت ملکہ وکٹوریہ کے نام لکھ کر خواہش کی کہ اُسے لندن بھیج دیا جائے۔ اس کا جواب چیف سکرٹری صاحب نے الہ آباد کے مقام سے بھیجا کہ عرضداشت دوسرے کاغذات کے ہمراہ ولایت بھیج دی جائے گی[1]

میر سید علی خاں عرف حضرت جی کو ایک فارسی مکتوب میں لکھتے ہیں کہ مدت تک فرمانداں کلکتہ کی انجمن میں پیچ وتاب کھاتا رہا۔ اب دو سال سے میرا مقدمہ ولایت گیا ہُوا ہے[2]

[1] کلیات نثر فارسی صفحہ ۱۹۹ و ۲۰۰۔ "ذکر غالب" میں مرقوم ہے کہ ۱۲ نومبر ۱۸۳۶ء کو غالب نے درخواست دی تھی کہ میرا مقدمہ یا تو صدر دیوانی کلکتہ میں رکھا جائے یا کورٹ آف ڈائرکٹرز کے فیصلے کیلئے ولائت بھیج دیا جائے اسکا جواب ۵ دسمبر ۱۸۳۶ء کو ملا کہ تمہارے کاغذات ولائت بھیج دیئے جائینگے۔ کاغذات (Labelle Alliance) نامی جہاز میں ۱۰ مئی ۱۸۳۶ء کو بھیجے گئے تھے [2] کلیات نثر فارسی صفحہ ۱۸۳۔ "ذکر غالب" سے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ غالب نے ۲۷ دسمبر ۱۸۳۶ء کو ایک درخواست میں گورنر جنرل سے تین مطالبے کئے تھے (۱) دو لاکھ تین ہزار روپے والی فیروزپور کی جمع کردہ رقم میں سے ادا کئے جائیں (۲) تین ہزار عام بقایا ادا کیا جائے (۳) جب تک کورٹ آف ڈائرکٹرز میں مقدمہ کا فیصلہ نہ ہو بجائے تین ہزار روپے باقاعدہ ملتے رہیں۔

لیکن ان درخواستوں سے کوئی نتیجہ یہ نکلا ۱۸۴۲ء میں کورٹ آف ڈائرکٹرز نے بھی فیصلہ کر دیا کہ جو کچھ ہندوستان میں پہلے طے ہو چکا ہے وہی بحال رہیگا۔ غالب نے اس کے بعد ۲۹ جولائی ۱۸۴۳ء کو ملکہ معظمہ وکٹوریہ کے نام ایک میموریل بطور اپیل تیار کیا اور گورنر جنرل کے پاس بھیج دیا۔ آخر وہ ۱۸۴۴ء میں بالکل مایوس ہو گئے۔

اس طرح پنشن کا مقدمہ ختم ہوگیا اور ۱۸۲۶ء سے لے کر ۱۸۴۴ء تک زندگی کے اٹھارہ برس امید و بیم کی کشمکش میں گزار کر جب بہبودِ کار کا ہر رشتہ کٹ گیا اور روشنی کی ہر جھلک ناپید ہوگئی۔ تو چند سال خاموش بیٹھے رہے۔ ۱۸۵۴ء یا ۱۸۵۵ء میں خدا جانے کس کی تحریک پر ملکہ وکٹوریہ کی مدح میں ایک فارسی قصیدہ کہا اور ڈاک کے ذریعہ سے لارڈ ایلن برا کے پاس انگلستان بھیج دیا۔ لارڈ موصوف کی گورنر جنرلی کے زمانے سے ان کے ساتھ روابطہ قائم تھے۔ اغلب ہے بعد میں بھی سلسلہ مکاتبت جاری رہا ہو۔ یہ قصیدہ لارڈ ایلن برا نے "نزدیکان بارگاہ" کے حوالے کر دیا۔ ایک مہینے کے بعد جواب آیا کہ شاعر اپنا مدعا و مقصود ہندوستان کے گورنر جنرل کی وساطت سے پیش کرے۔ اسکے جواب میں غالب نے تین درخواستیں کیں:-

(۱) ملکہ کی طرف سے خطاب دیا جائے۔

(۲) خلعت عطا ہو۔

(۳) پنشن کا بندوبست کیا جائے۔

یہ عرضداشت گورنر جنرل نے لندن بھیج دی۔ غدر سے قریباً تین ماہ پیشتر لندن سے امید افزا جواب آیا۔ لیکن ابھی کچھ طے نہیں ہوا تھا کہ غدر کی آگ بھڑک اُٹھی جس نے خوش کن آرزوؤں کی اس نئی متاع کو بھی جلا کر راکھ بنا ڈالا[1]۔

اُردو کے ایک مکتوب میں خواجہ غلام غوث خاں بیخبر کو لکھتے ہیں:-

"۷ دسمبر ۱۸۵۶ء کا لکھا ہوا حکم وزیر اعظم کا ولائت کی ڈاک میں مجھ کو آیا ہے کہ اس قصیدے کے صلہ اور جائزہ کے واسطے جو بتوسط لارڈ ایلن برا سائل نے بھجوایا ہے خطاب اور خلعت اور پنشن کی تجویز منظور ہے جو حکم صادر ہوگا سائل کو بتوسط گورنمنٹ اسکی اطلاع دینی ضروری ہے۔ یہ حکم مورخہ ۷ دسمبر ۱۸۵۶ء

---

[1] کلیات نثر فارسی صفحہ ۳۹۳ و ۳۹۴

آخر جنوری ۱۸۵۷ء میں میں نے پایا فروری، مارچ، اپریل خوشی اور توقع میں گزرے مئی ۱۸۵۷ء

میں فلک نے یہ فتنہ اٹھایا (یعنی غدر برپا ہو گیا)

غالب کے انگریز ممدوح

غالب کے فارسی کلیات نظم میں متعدد انگریزوں کے مدحیہ قصائد و قطعات موجود ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر اصحاب کی مدح پنشن ہی کے مقدمہ کے سلسلے میں کی گئی تھی۔ مثلاً اینڈریو اسٹرلنگ کے قصیدے کے بعض اشعار اوپر نقل ہو چکے ہیں وہ چیف سکرٹری تھے اور غالب کا مقدمہ انکے پاس پیش ہوا تھا۔ ایک قطعہ ولیم میکناٹن کی ستائش میں ہے، وہ ۱۸۳۰ء سے ۱۸۳۳ء تک گورنر جنرل کے پرائیویٹ سکرٹری اور ۱۸۳۳ء سے ۱۸۳۷ء تک پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کے سکرٹری تھے جیمس ٹامسن جنکی مدح میں ایک قطعہ اور ایک قصیدہ ہے، ۱۸۳۰ء سے ۱۸۳۲ء تک گورنمنٹ کے سکرٹری اور ۱۸۴۲ء سے ۱۸۴۳ء تک فارن سکرٹری تھے۔ بعد میں صوبجات متحدہ کے لفٹنٹ گورنر بن گئے تھے۔ چارلس مٹکاف کی مدح میں ایک قصیدہ ہے۔ وہ ۱۸۲۷ء سے ۱۸۳۴ء تک سوپریم کونسل کے ممبر رہے ٹامس ماڈک کی مدح میں ایک قصیدہ ہے، وہ گورنمنٹ کے سکرٹری تھے بعد ازاں بنگال کے ڈپٹی گورنر بنے۔ کالون کی مدح میں ایک قصیدہ ہے، وہ لارڈ آکلینڈ کے پرائیویٹ سکرٹری تھے۔ بعد ازاں صوبجات متحدہ کے لفٹنٹ گورنر بنے۔ ایڈ منسٹن کی مدح میں ایک قطعہ اور ایک قصیدہ ہے وہ گورنمنٹ کے فارن سکرٹری تھے۔ گورنر جنرلوں کی مدح کا سلسلہ بھی پنشن ہی کے ضمن میں شروع ہوا تھا۔ مثلاً لارڈ ولیم بنٹنگ کے زمانے میں پنشن کا مقدمہ پیش ہوا۔ ان سے پیشتر کے گورنر جنرلوں کی مدح میں کوئی قصیدہ موجود نہیں۔ صرف ایک قطعہ لارڈ بنٹنگ کے ورود دہلی کے متعلق کلیات نظم فارسی میں ہے اس کے بعد ہر گورنر جنرل کی مدح میں ایک ایک قصیدہ موجود ہے۔ لارڈ ایلن برا کی مدح میں دو قصیدے ہیں۔

غالب نے حکومت ہند کے مختلف عہدیداروں اور گورنر جنرلوں کے قصیدوں یا

قطعوں کے سلسلے میں پنشن کے مقدمہ یا اپنی ذات کے متعلق جو کچھ لکھا مناسبت مقام کا اقتضاء ہے کہ اُسے بھی یہاں پیش کر دیا جائے۔

میکناٹن صاحب

میکناٹن کے قطعہ میں لکھتے ہیں،

باچنیں بختے کہ من دارم عجب دارم کہ من | خویشتن را مستحق لطف و احسان دیدہ ام

وہم مستولیست بر من ویں چرا نبود کہ من | خود چہ نومیدی زگردشہائے دوراں دیدہ ام

یک دو پرسش دارم و از لعل گوہر بار تو | آرزو را تشنہ کام پاسخ آں دیدہ ام

سر چارلس مٹکاف

چارلس مٹکاف کے قصیدے میں فرماتے ہیں،

یاد باد آنکہ ازیں[1] مرحلہ تا کلکتہ | کردہ ام طے بہ اُمید تو رہِ دور و دراز

گر نہ اندیشہ بہ عدل تو قوی دل گشتے | ناقہ سعی من از راہ نگردیدے باز

نالہ زارِ من از شدتِ جورِ شرکاست | نے ز دیوانگی و خیرگی و شوخی و آز

بر رُخ من در رزقے کہ کشاید داور | حیف باشد کہ کند خصم[2] بد اندیش فراز

ہفت سال است کہ بایک دگر آویختہ ایم | من و غاصب چو سر رشتہ شمع و دم گاز

او ز خونخوارگی خویش در اندازِ غضب | من ز بیچارگی خویش بہ آدابِ نیاز

. . . .

خود تو دانی کہ ازیں مخمصہ رستن نتواں | جز بہ تائید توائے خسروِ درویش نواز

بو کہ اندازہ در آید بہ درستی ز خلل | بو کہ اندیشہ گراید بہ حقیقت ز مجاز

طاقتم نیست بخاک کف پائے تو قسم | زانکہ غم حوصلہ سوز است و بلا زہرہ گداز

چوں چراغ رہ بادم بہ گزرگاہ فنا | داورا داد دلم از ہرچہ بہ حالم پرداز

پانچ مطالبات

"ہفت سال" سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قصیدہ غالباً ۱۸۳۷ء میں کہا۔

[1] دہلی   [2] والیٔ فیروزپور جھرکہ

گیا۔ اس میں اپنے مطالبات کے متعلق لکھتے ہیں:۔

پنج مطلب ز تو ام ہست بہ صد گونہ امید | خواہم آں پنج علی الرغم حسود و غماز
اوّل این است کہ در باب معاشے کہ مراست | کنی اندیشۂ محکم بہ طریق ایجاز
ہر چہ در دفتر سرکار بود نقش پذیر | ہم بہ اندازۂ آں نقش شوی مائدہ ساز
دوم آں کز اثر عدل تو اے سنجر عہد | غیر با بندہ دریں وجہ نباشد انباز
سوم آن است کہ دیگر نکنم دست طلب | پیش فرمانِ دہ میوات بدریوزہ دراز
ہم بہ گنجینۂ سرکار بر آنسے خواہم | دادہ انصاف بدیں یافتگی اذن جواز
چارم آن است کہ باقی زرِ چندیں سالہ | بے نزاع و جدل و جہد بہ من گردد باز
پنجم آن کز پس ازیں فتح کہ بنیاد روے | دہی ام مژدۂ اکرام و نوید اعزاز
بخشی ام تازہ خطابے و براں افزائی
خلعتے درخور ایں دولت جاوید طراز

غالب کی قادر الکلامی کے کمالات ملاحظہ فرمایئے کہ ہر قسم کے مطالب کس بے تکلفی سے نظم کر جاتے ہیں اور شعر کی دلکشی میں ذرا فرق نہیں آنے دیتے۔ اوپر کے اشعار میں اپنے پانچ مطالبات کس خوبی سے بیان کئے ہیں کہ اول مجھے پنشن سرکار کی منظوری کے مطابق ملے۔ دوم، میری پنشن دوسرے متعلقین سے الگ کر دی جائے۔ سوم مجھے والی فیروز پور جھرکہ کے روبرو دست طلب دراز نہ کرنا پڑے بلکہ پنشن سرکاری خزانہ سے متعلق ہو جائے۔ چہارم، جتنا روپیہ اب تک وصول نہیں ہوا وہ مل جائے پنجم نیا خطاب اور خلعت دیا جائے۔

مقدمہ ولایت جارہا ہے | جس زمانے میں مقدمہ ولایت جارہا تھا حکومت ہند کے

سلہ یہ والی فیروز پور جھرکہ کی طرف اشارہ ہے جن کی ریاست علاقہ میوات میں واقع تھی۔

کسی رکن کو لکھا تھا:

به صد ہمے رود ایں باز پرس بسم اللہ ۔۔۔ ہمیں مراد من است وجز ایں مرادم نیست
تو کردی و تو کنی کارم اعتقاد ایں است ۔۔۔ به کارسازی بخت خود اعتقادم نیست
رسید مے وبپائے تو سودمے سر عجز ۔۔۔ بضاعتِ سفر و دستگاہ زادم نیست
مفید مطلب من ہر کتابتے که بود ۔۔۔ تو جمع کن که لبسازانمیانه یادم نیست
امید لطف تو دل مے دہد، بدیں شادم ۔۔۔ وگرنه تاب صبوری ازیں نہادم نیست
به ذوق قربِ زمان مراد بے تابم ۔۔۔ وگرنه شورش تعجیل در نہادم نیست
به نیم روز به لندن رساند مے زورق ۔۔۔ ولے چه چاره که فرماں بر آب و بادم نیست

| لارڈ آکلینڈ | لارڈ آکلینڈ کے قصیدے میں لکھتے ہیں:

از تو رسیدم به نوش، ورنه ہمه عمر ہا ۔۔۔ سر که ز صہباے جمشید ز ہر ز شکر گرفت
از تو توانا شدم ورنه مرا در ز ہا ۔۔۔ چاره ز بے پائگی صورت ابتر گرفت
خواست دل اندر خیال زخم جگر دوختن ۔۔۔ از پئے آں بخیه تار از تن لاغر گرفت

. . . .

ہم زدم گرم خویش خشک نمودم ورق ۔۔۔ صدره اگر ناله ام از مژه تر گرفت
با تو چه گویم ز جور کاید از انصاف تو ۔۔۔ خانۂ ظالم به سوخت رسم ستم بر گرفت

آخری شعر میں غالباً نواب شمس الدین احمد خاں کی پھانسی اور ریاست فیروزپور جھرکہ کی ضبطی کی طرف اشارہ ہے۔

| لارڈ ایلن برا | لارڈ ایلن برا کے قصیدے میں فرماتے ہیں:

به گفتارم تونگر گر به سیم و زر نہید ستم ۔۔۔ زمین کلبۂ من شد گلستان بعد ویرانی
به رسم نکته سنجاں در سخن نامم بود غالب ۔۔۔ بدیں نام از ازل آورده ام طغرائے سبحانی
مرا در داست اندر دل که جانفرسائی آں را ۔۔۔ ندانم چاره اما ایں قدر دانم که مے دانی

کرم مے کرد گر لارڈ آکلینڈ از راہ غمخواری | تو نیز از راہ غمخواری کرم کن کز کریمانی
ازاں در نامۂ مدح تو آرم بر زباں نامش | کہ با من داشت گوناگوں نوازشہائے پنہانی
گر او در رشتۂ مدح سخنور گوہر آمودے | ترا باید کہ بر فرق سخنور گوہر افشانی

دوسرے قصیدے میں فرماتے ہیں:

رفت آں غم از نہاد و بدیں شاد زیستن | دانم کہ مردہ زندہ شد اندر زمانِ تو
در اجر آنکہ کوششِ من رائگاں رفت | خواہم ز حق حیاتِ ابد رائگانِ تو

وکٹوریہ

وکٹوریہ کے قصیدے میں غالب نے بہ سلسلہ دعا لکھا تھا۔

آں باد دور نیست کہ گفتارِ من مرا | سیمائے عز و جاہ بدیں آستاں دہد
آں باد و زود باد کہ کلکِ دبیر خاص | آوازۂ نوازشِ من در جہاں دہد
آں باد و دور نیست کہ فرماندہی کنم | بر یک دو دہ کہ گنگ بہ ہندوستاں دہد

آں باد و خوش بود کہ شہنشاہ بحر و بر
انجام خواہشش اسد اللہ خاں دہد

میرا خیال ہے کہ غالب کی مالی پریشانیوں میں پنشن کے مقدمہ کا بڑا حصہ تھا۔ اس پر کافی روپیہ صرف ہوا اور مدت مدید تک امید لگی رہی کہ فیصلہ ان کے حق میں ہو جائیگا اس بنا پر وہ بے تکلف قرض لیتے رہے اور انہیں قرض ملتا رہا۔ ایک وقت میں امید پیدا ہو گئی تھی کہ دو لاکھ تین ہزار روپیہ یکمشت مل جائے گا اور اتنی بڑی رقم کے یکمشت مل جانے کی امید پر غالب کو قرض کا بڑے سے بڑا بوجھ اٹھا لینے میں بھی تامل نہیں ہو سکتا تھا سود خوار مہاجنوں کے لئے ایسی موٹی مگر عاقبت نا اندیش اسامی کو زیادہ سے زیادہ قرض دینے میں تذبذب کی کوئی وجہ نہ تھی۔ بہ ہر حال وہ اٹھارہ برس اس قضیہ میں اُلجھے رہے۔ پھر نئی پنشن، نئے خطاب اور نئے اعزار کی توقع پیدا ہوئی جو ۱۸۵۷ء تک خدا جانے کشایش و فراغت بال کے کیسے کیسے

دلکشا خیالی منظر ان کے سامنے پیش کرتی رہی۔ اُمید و آرزو کے یہ تمام رنگین نقوش اس وقت سراب ثابت ہوئے، جب سنین حیات کی اکسٹھ مسافتیں طے ہو چکی تھیں۔ اور شہر خموشاں کا سواد بالکل سامنے آ گیا تھا۔

شجرہ خواجہ حاجی خاں

خواجہ حاجی خاں کے والد خواجہ قطب الدین غالب کے دادا کے ساتھ ہندوستان آئے تھے۔ کہا جاتا ہے۔ کہ وہ غالب کے مورث اعلیٰ شہزادہ ترسم خاں کے بھائی شہزادہ رستم خاں کے اخلاف میں سے تھے۔ خواجہ حاجی خاں کی شادی جیون بیگ کمیدان برلاس سبز پوش کی صاحبزادی امیر النساء بیگم سے ہوئی تھی۔

خواجہ حاجی خان

شمس الدین خاں عرف خواجہ جان | بدر الدین خاں عرف خواجہ امان

خواجہ قمر الدین خاں (بدر الدین خاں عرف خواجہ امان کے بیٹے)
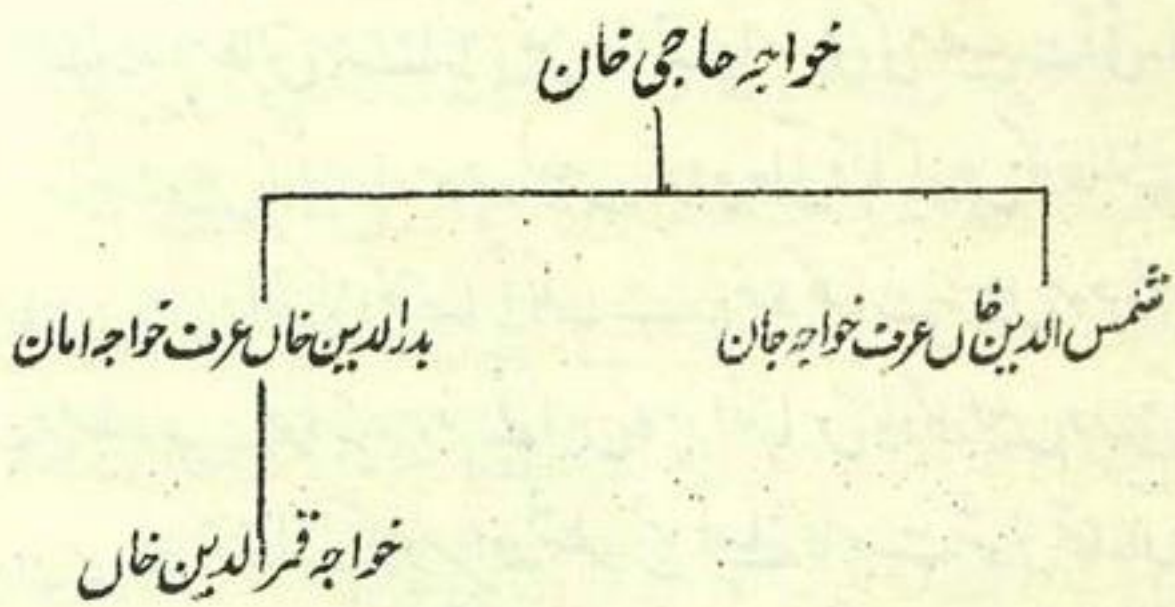
بدر الدین خاں عرف خواجہ امان نے بوستان خیال کا ترجمہ اُردو میں کیا تھا۔

آٹھواں باب

ابتلا اسیری

چرخ یک مرد گراں مایہ بہ زنداں خواہد
یوسف از قید زلیخا بدر آمد گوئی

۱۲۶۴ھ (مطابق ۱۸۴۷ء) میں غالبؔ پر اسیری کی مصیبت آئی۔ اس واقعہ کے متعلق تصانیف میں کوئی مواد موجود نہیں۔ خواجہ حالیؔ فرماتے ہیں کہ غالبؔ نے ایک فارسی خط میں اس واقعہ کو اختصاراً لکھا ہے۔ یہ خط کلیات نثر میں موجود نہیں اور غالباً اب تک غیر مطبوعہ ہے خواجہ مرحوم نے اس کا جو اقتباس "یادگار" میں درج کیا ہے اس کا مضمون یہ ہے۔ کہ غالبؔ کو چوسر اور شطرنج کھیلنے کا بہت شوق تھا۔ اور جب کھیلتے تھے۔ تو برائے نام کچھ بازی بد کر کھیلتے تھے۔ کوتوال دشمن تھا۔ اس نے قمار بازی کا مقدمہ بنا دیا۔ مجسٹریٹ[1] غالبؔ کی حیثیت، مرتبہ اور ذاتی حالات سے ناواقف تھا۔

---

[1] سید ناصر نذیر فراق نے لکھا ہے کہ مجسٹریٹ کنور نوروز علی خاں تھے۔ جو دان پور ضلع بلند شہر کے تعلقدار اور سرکار کمپنی کے معتمد تھے۔ وہ میرٹھ سے بدل کر شاہ جہان آباد آئے تھے۔

اس نے چھ ماہ قید کی سزا دے دی۔ سیشن ججی میں اپیل کی گئی۔ جج اگرچہ غالبؔ کا دوست تھا۔ اور اکثر صحبتوں میں بے تکلف ملتا تھا۔ لیکن اس نے بھی تغافل اختیار کر لیا۔ اور سزائے قید بحال رکھی۔ صدر میں اپیل کی گئی۔ لیکن وہاں بھی کوئی شنوائی نہ ہوئی۔ تین مہینے گزر جانے کے بعد مجسٹریٹ نے خود ہی رہائی کی رپورٹ صدر میں بھیج دی اور غالبؔ رہا ہو گئے۔

خواجہ صاحب فرماتے ہیں کہ قید میں ان کی حیثیت محض نظر بند کی تھی۔ کھانا کپڑا اور ضرورت کی دوسری چیزیں ان کو گھر سے پہنچتی تھیں۔ دوست بے تکلف ملتے تھے۔ لیکن اس زمانے کے حالات اور نوعیت جرم کے اعتبار سے یہ واقعہ سخت ذلّت خیز تھا۔ اور غالبؔ نے اسے بے حد محسوس کیا۔ خواجہ صاحب کے بیان کے مطابق انہوں نے فرمایا:۔

> اگرچہ میں اس وجہ سے کہ ہر کام کو خدا کی طرف سے سمجھتا ہوں اور خدا سے لڑا نہیں جا سکتا، جو کچھ گزرا، اس کے ننگ سے آزاد اور جو کچھ گزرنے والا ہے۔ اس پر راضی ہوں مگر آرزو کرنا آئین عبودیت کے خلاف نہیں ہے۔ میری یہ آرزو ہے کہ اب دنیا میں نہ رہوں اور اگر رہوں تو ہندوستان میں نہ رہوں۔ مصر ہے، ایران ہے، بغداد ہے یہ بھی جانے دو۔ خود کعبہ آزادوں کی جائے پناہ اور آستانہ رحمۃ للعالمینؐ دلدادوں کی تکیہ گاہ ہے۔ دیکھئے وہ وقت کب آئے گا کہ درماندگی کی قید سے جو اس گزری ہوئی قید سے زیادہ جانفرسا ہے۔ نجات پاؤں اور بغیر اس کے کہ کوئی منزل مقصود قرار دوں سر بہ صحرا نکل جاؤں[۱]

اُردوئے معلّٰی میں تفتہ کے نام ایک خط ہے۔ جس پر ۱۰ دسمبر ۱۸۵۲ء کی تاریخ ثبت ہے۔ اس میں یہ الفاظ بھی ہیں:

---

[۱] "یادگار غالب" صفحہ ۲۷ و ۲۸

سرکار انگریزی میں بڑا پایہ رکھتا تھا۔ رئیس زادوں میں گنا جاتا تھا۔ پورا خلعت پاتا

تھا۔ اب بدنام ہوگیا ہوں اور ایک بہت بڑا دھبہ لگ گیا ہے۔

شاید ان الفاظ میں پہلی قید ہی کی طرف اشارہ ہے۔

دہلی میں قماربازی کی وبا خواجہ حسن نظامی نے "دہلی کا آخری سانس" کے نام سے "احسن الاخبار" کے ان فارسی مضامین کا ترجمہ شائع کیا ہے جو دہلی یا دربار شاہی کے حالات پر مشتمل تھے یہ کتاب نومبر ۱۸۴۴ء سے لے کر مارچ ۱۸۴۷ء تک حالات دہلی کا ایک نہایت عمدہ مرقع ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حکام کی توجہ اس زمانے میں قماربازی کے انسداد کی طرف بطور خاص مبذول تھی۔ شاید اس لئے کہ یہ وبا بہت پھیل گئی تھی[1] مثلاً ۲۰ رجون ۱۸۴۵ء کے حالات میں مرقوم ہے:۔

کوتوال شہر نے سولہ آدمیوں کو قماربازی کے جرم میں گرفتار کر کے حاکم کے سامنے پیش کیا۔ نو آدمیوں کو چھ مہینے کی قید اور پچاس روپے جرمانہ اور پانچ آدمیوں کو تین مہینے کی قید اور پچیس روپے جرمانہ اور دو آدمیوں کو ایک مہینے کی قید اور چار روپے جرمانہ کی سزا کا حکم سنایا گیا اور جرمانہ ادا نہ کرنے کی صورت میں حکم ہوا کہ ایسے لوگوں کے پیروں میں بیڑیاں ڈال کر سڑکوں کی تعمیر و درستی کا کام لیا جائے[2]

ظاہر ہے کہ ان حالات میں قماربازی کا برائے نام ارتکاب بھی حکام کی نظروں میں بہت سنگین جرم بن گیا ہوگا۔

غالب کے خلاف مقدمہ اس کتاب میں غالب کی گرفتاری اور مقدمہ کا ذکر سب سے پہلی مرتبہ ۲۵ رجون ۱۸۴۷ء کے حالات میں یوں آیا ہے:۔

---

[1] بعض بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ محبوب علی خاں خواجہ سرا اور کئی معزز آدمی مل کر جوا کھیلتے تھے۔

[2] "دہلی کا آخری سانس" صفحہ ۱۶۱۔

مرزا اسد اللہ خاں بہادر کو دشمنوں کی غلط اطلاعات کے باعث قمار بازی کے جرم میں قید کیا گیا۔ معظم الدولہ بہادر (ریزیڈنٹ) کے نام سفارشی چٹھی (بہادر شاہ کی طرف سے) لکھی گئی۔ کہ ان کو رہا کر دیا جائے۔ یہ معززین شہر میں سے ہیں اور جو کچھ ہوا ہے۔ محض حاسدوں کی فتنہ پردازی کا نتیجہ ہے۔ عدالت فوجداری سے نواب صاحب کلاں بہادر (ریزیڈنٹ) نے جواب دیا۔ کہ مقدمہ عدالت کے سپرد ہے۔ ایسی حالت میں قانون سفارش کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔[۱]

اس سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ غالب ۲۵ جون ۱۸۴۷ء یا اس سے چند روز قبل گرفتار ہوئے۔ بہادر شاہ بادشاہ اور ان کے درباریوں کی رائے بھی یہی تھی۔ کہ گرفتاری محض حاسدوں کی غلط اطلاع کے باعث عمل میں آئی ہے۔ اور غالب قمار بازی کے مرتکب نہیں ہوئے۔ اسی بنا پر ریزیڈنٹ کو سفارشی چٹھی بھیجی گئی۔

۲ جولائی ۱۸۴۷ء کے حالات میں پھر اس مقدمے کا ذکر آیا ہے:۔

مرزا اسد اللہ خاں غالب پر عدالت فوجداری میں جو مقدمہ دائر تھا۔ اس کا فیصلہ سُنا دیا گیا۔ مرزا صاحب کو چھ مہینے کی قید بامشقت اور دو سو روپے جرمانے کی سزا ہوئی۔ اگر دو سو روپے جرمانہ ادا نہ کریں۔ تو چھ ماہ قید میں اور اضافہ ہو جائے گا۔ مقررہ جرمانہ کے علاوہ اگر پچاس روپے زیادہ ادا کئے جائیں تو مشقت معاف ہو جائے گی۔ جب اس بات پر خیال کیا جاتا ہے کہ مرزا صاحب عرصہ سے علیل رہتے ہیں۔ سوائے پرہیزی غذا قلیہ چپاتی کے اور کوئی چیز نہیں کھاتے۔ تو کہنا پڑتا ہے کہ اس قدر مشقت اور مصیبت کا برداشت کرنا مرزا صاحب کی طاقت سے باہر ہے۔ بلکہ ہلاکت کا اندیشہ ہے۔ اُمید کی جاتی ہے

---

[۱] "دہلی کا آخری سانس" صفحہ ۱۷۱

کہ اگر سیشن جج کی عدالت میں اپیل کی جائے۔ اور اس مقدمہ پر نظرِ ثانی ہو تو نہ صرف یہ سزا موقوف ہو جائے بلکہ عدالت فوجداری سے مقدمہ اُٹھا لیا جائے۔ یہ بات عدل و انصاف کے بالکل خلاف ہے۔ کہ ایسے باکمال رئیس کو جس کی عزّت و حشمت کا دبدبہ لوگوں کے دلوں پر بیٹھا ہوا ہے۔ معمولی جرم میں اتنی سزا دی جائے جس سے جان جانے کا قوی احتمال ہے۔[۱]

اس سے ظاہر ہے کہ غالب کو چھ ماہ قید با مشقت کے علاوہ دو سو روپے جرمانے کی سزا دی گئی تھی۔ اور جرمانہ ادا نہ کرنے کی صورت میں مزید چھ ماہ کی قید کا حکم سُنایا گیا تھا البتہ یہ کہہ دیا گیا تھا۔ کہ پچاس روپے دیکر مشقت معاف کرائی جا سکتی ہے۔

اقتباس کا آخری حصہ "احسن الاخبار" کے ایڈیٹر یا اس کے نامہ نگار کا تبصرہ ہے۔ اس سے مندرجہ ذیل نتائج نکالے جا سکتے ہیں:-

(۱) غالب کی صحت اس زمانے میں اچھی نہ تھی اور وہ پرہیزی غذا کھاتے تھے۔

(۲) عام خیال یہ تھا۔ کہ سزا بہت سخت دی گئی ہے۔

(۳) بڑے باکمال رئیس سمجھے جاتے تھے۔ جن کی عزّت و حشمت کا دبدبہ لوگوں کے دلوں پر بیٹھا ہوا تھا۔

(۴) اندیشہ تھا۔ کہ وہ اسیری کی تاب نہ لا سکیں گے۔

میرا خیال ہے کہ مشقت پچاس روپے دے کر معاف کرا لی ہو گی۔ اور جرمانہ بھی یقیناً ادا کر دیا ہو گا۔

غالب کا حبسیہ

قید کی حالت میں غالب نے چوراسی شعر کا ایک فارسی ترکیب بند لکھا تھا۔ جو ان کی بہترین نظموں میں سے ہے۔ لیکن عزیزوں اور دوستوں نے اسے کلیاتِ نظم

---

[۱] "دہلی کا آخری سانس" صفحہ ۱۷۴ و ۱۷۵۔

ہیں شامل نہ ہونے دیا۔ غالباً اس خیال سے کہ اس کی اشاعت سے غالبؔ کی قید ہمیشہ کے لئے منظرِ عام پر آجائے گی۔ انہوں نے یہ نہ سوچا کہ شاعر کی زندگی کا ماحصل محض شعر ہوتا ہے۔ دُنیا کو اس کے عام حالات کی اچھائی یا بُرائی سے براہ راست کیا واسطہ؟۔ اسے تو محض یہ مطلوب ہے کہ مختلف واقعات نے اس کے سازِ سخن سے کیا کیا نغمے پیدا کئے۔ غالبؔ کے دوستوں اور عزیزوں کی غلط اندیشی پر تعجب ہوتا ہے کہ قید کے واقعہ کو چھپانے کے اہتمام میں انہوں نے غالبؔ کی ایک بہترین نظم کو ضائع کرنا پسند کیا۔ کلیاتِ نظم فارسی کے چھپ جانے کے بعد غالبؔ نے "سبد چین" کے نام سے متفرق کلام کا ایک مختصر سا مجموعہ شائع کیا تھا۔ جس میں "حبسیہ" بھی داخل کر دیا تھا۔ افسوس کہ "سبد چین" والا کلام بعد کے ایڈیشنوں میں شامل کلیات نہ ہو سکا۔ میں نے یہ ترکیب بند یہاں پورا درج کر دیا ہے

قید کی حالت خواجہ حالیؔ کا بیان اوپر درج ہو چکا ہے۔ اس میں صاف مرقوم ہے۔ کہ قید میں غالبؔ کی حیثیت محض نظر بند کی تھی۔ کھانا، کپڑا اور دوسری چیزیں ان کو گھر سے پہنچتی تھیں۔ دوست بے تکلّف ملتے تھے۔ عام قرائن بھی اسی بیان کے مؤید ہیں۔ لیکن خود غالبؔ نے "حبسیہ" میں لکھا ہے:

شادم از قید کہ از بندِ معاش آزادم
از کفِ شحنہ رسد جامہ و نانم در بند

میری رائے میں یہ محض سخن گستری ہے یا ممکن ہے ابتدائی ایام کی کیفیت یہی ہو۔ اور پچاس روپے ادا کر دینے پر مختلف سہولتیں بہم پہنچی ہوں۔

غالبؔ کے غیر مطبوعہ اردو کلام کے سلسلے میں مختلف اصحاب نے یہ شعر بھی نقل کیا ہے:۔

جس دن سے کہ ہم خستہ گرفتارِ بلا ہیں
کپڑوں میں جوئیں بخیئے کے ٹانکوں سے سوا ہیں

جناب نظامی بدایونی فرماتے ہیں کہ غالب اتفاقاً قید ہو گئے تھے۔ وہاں کپڑوں میں جوئیں ہو گئی تھیں۔ اُن کو چُن رہے تھے کہ ایک رئیس نے جا کر پرسش مزاج کی غالب نے فی البدیہہ یہ شعر پڑھا۔[۱]

میرا خیال ہے۔ کہ یہ شعر غالب کا نہیں۔ اس سے قطع نظر شعر کی شان نزول قطعاً ناقابل قبول ہے۔ اگر خواجہ حالی کے ارشاد کے مطابق قید میں ان کی حیثیت محض نظر بند کی تھی، یا پچاس روپے ادا کر کے مشقت معاف کرا لی گئی تھی۔ تو بے یاری و درماندگی کی یہ حالت کیوں کر قرین قیاس سمجھی جا سکتی ہے کہ غالب کے کپڑوں میں جُوئیں ہو گئی تھیں۔ اور ایک رئیس ملاقات کے لئے آیا تو وہ جُوئیں نکال رہے تھے۔ علاوہ بریں وہ رئیسوں میں شمار ہوتے تھے۔ یہاں تک کہ وقت کے بادشاہ نے ان کی رہائی کے لئے سفارش کی تھی۔ لہذا جو صورت اس شعر میں پیش کی گئی ہے وہ ہر اعتبار سے مستبعد ہے۔

"حبسیہ" سے ظاہر ہے۔ کہ اِس ابتلا میں نواب مصطفٰے خاں بہادر شیفتہ نے اعانت، غمخواری اور دوست نوازی میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا تھا۔ اسی وجہ سے غالب نے نواب صاحب مرحوم کا خاص طور پر ذکر کیا۔ بلکہ یہ بھی لکھ دیا۔ کہ ایسا غمخوار دوست عزاداری کے لئے موجود ہو تو مرنے کا بھی غم نہیں۔ نیز عید الفطر قید میں گزاری تھی۔ اگر چھ ماہ کی مدت جیل میں پُوری ہوتی۔ تو عید الضحٰے بھی قید ہی میں آتی۔[۲]

---

[۱] دیوان غالب مع شرح نظامی طبع ششم صفحہ ۲۱۸

[۲] ۱۲۶۳ھ کی عید الفطر ۱۳ اگست ۱۸۴۷ء کو تھی، اور عید الضحٰے ۲۰ نومبر ۱۸۴۷ء کو ہوئی۔ اگر یہ درست ہے۔ کہ وہ اواخر جون میں گرفتار ہوئے تو جولائی، اگست اور ستمبر کے مہینے یقینی طور پر جیل میں گذرے۔

مولانا ابوالکلام کا بیان

حضرت مولانا ابوالکلام آزاد نے غالب کی گرفتاری کے متعلق ایک مفصل نوٹ تحریر فرمایا ہے۔ جسے میں حضرت ممدوح کے انتہائی شکریہ کے ساتھ یہاں درج کرتا ہوں۔ فرماتے ہیں:

خواجہ حالی مرحوم نے اس واقعہ کی نسبت جو کچھ لکھا ہے وہ حقیقت کے قطعاً خلاف ہے۔ خواجہ مرحوم سوانح نگاری کو محض مدحت طرازی سمجھتے تھے۔ اس لئے پسند نہیں کرتے تھے کہ ناگوار واقعات کو ابھرنے دیا جائے۔ "حیات جاوید" میں بھی انہوں نے ہر جگہ ایسا ہی کیا ہے۔ سرسید مرحوم کے آخری عہد کے جن حالات سے اس درجہ متاثر ہوئے تھے کہ "حیات جاوید" لکھنے کا خیال تک ترک کر دیا تھا اور صاف صاف کہہ دیا تھا کہ ایسے کاموں پر خاک تک نہیں ڈال سکتا۔ بالآخر انہی معاملات کو پوری رنگ آمیزیوں کے ساتھ لکھا اور جس قدر خاک ڈال سکتے تھے ڈال گئے۔

مولوی وحید الدین سلیم مرحوم کہتے تھے کہ جب خواجہ صاحب نے سرسید کی روش سے سخت برآشفتہ ہو کر حیات جاوید کی تکمیل کا خیال ترک کر دیا۔ تو میں نے ان سے کہا تھا کہ آج آپ ایسا کہہ رہے ہیں مگر چند دنوں کے بعد یہ ساری باتیں بھلا دینی پڑیں گی چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ جونہی سرسید کے انتقال سے ان کے تمام نکتہ چیں دوستوں کی زبانیں خاموش ہو گئیں اور ان کی خدمات کے اعتراف و تحسین کا از سر نو غلغلہ بلند ہوا۔ خواجہ صاحب نے "حیات جاوید" کی تکمیل و تبییض شروع کر دی اور پھر تمام معاملات کو اسی طرح رنگ آمیزیوں کے ساتھ لکھا جس طرح وہ سمجھتے تھے کہ سوانح نگار کو بہ غرض مدحت طرازی لکھنا چاہیئے۔

خواجہ صاحب نے اس معاملے کو اس رنگ میں ظاہر کیا ہے کہ گویا کوئی بات نہ تھی محض چوسر اور شطرنج کا شوق تھا۔ اس شوق کی تکمیل کیلئے برائے نام کچھ بازی بھی بد لیا کرتے تھے۔ کوتوال چونکہ دشمن تھا اسلیئے قمار بازی کا مقدمہ بنا دیا۔ حالانکہ اصلیت بالکل اسکے خلاف ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ پورا قمار بازی کا معاملہ تھا اور نواب امیر الدین مرحوم (والی لوہارو) کے لفظوں میں

"مرزا نے اپنے مکان کو جوا بازی کا اڈا بنا رکھا تھا"

جو تفصیلات مجھے سر امیر الدین مرحوم سے معلوم ہوئی ہیں وہ حسب ذیل ہیں:-

غدر سے پہلے مرزا کی آمدنی کا وسیلہ صرف سرکاری وظیفہ اور قلعہ کے پچاس روپے تھے چونکہ زندگی رئیسانہ بسر کرنا چاہتے تھے اس لئے ہمیشہ مقروض و پریشان حال رہتے تھے۔ اس زمانے میں دہلی کے بے فکر رئیس زادوں اور چاندنی چوک کے بعض جوہری بچوں نے گزران وقت کے جو مشغلے اختیار کر رکھے تھے، ان میں ایک قمار کا بھی مشغلہ تھا گنجفہ عام طور پر کھیلا جاتا تھا اور شہر کے کئی دیوان خانوں کی مجلسیں اس باب میں شہرت رکھتی تھیں مرزا بھی اس کے شائق تھے۔ رفتہ رفتہ ان کے یہاں چاندنی چوک کے بعض جوہری بچے آنے لگے اور باقاعدہ جوا بازی شروع ہو گئی۔ قمار کا عام قاعدہ ہے کہ صاحب مجلس رہا یوں کہا جائے کہ مہتمم قمار خانہ) کا ایک خاص حصہ ہر بازی میں ہوا کرتا ہے۔ جو بھی جیتے فی صدی اتنا صاحب مجلس کا ہوگا مرزا صاحب کے دیوان خانے میں مجلسیں جمنے لگیں تو وہ صاحب مجلس ہو گئے اور ایک اچھی خاصی رقم بے محنت و مشقت وصول ہونے لگی وہ خود بھی کھیلتے تھے اور چونکہ اچھے کھلاڑی تھے۔ اسلئے اس میں بھی کچھ نہ کچھ مار ہی لیتے تھے۔

انگریزی قانون اسے جرم قرار دیتا تھا لیکن شہر کی یہ رسم ٹھہر گئی تھی کہ رئیس زادوں کے دیوان خانے مستثنیٰ سمجھے جاتے تھے۔ گویا ان کی وہ نوعیت مان لی گئی تھی جو آج کل کے کلبوں میں برج کھیلنے کی ہے۔ انہیں از راہ تجاہل رئیسانہ تفریحوں کے ذیل میں تصور کیا جاتا تھا عرصہ تک شہر کے کوتوال اور حکام ایسے لوگ رہے جن سے مرزا غالب کی رسم و راہ رہتی تھی۔ اسلئے انکے خلاف نہ تو کسی طرح کا شبہ کیا جاتا تھا۔ نہ قانونی اقدام کا اندیشہ تھا۔ انہی میں ایک کوتوال قتیل کے شاگرد مرزا خانی[1] بھی تھے جنکی نسبت خواجہ نصیر نے کہا ہے،

---

[1] حضرت مولانا فرماتے ہیں مرزا خانی پھر لکھنؤ میں مقیم ہو گئے تھے میرے کرم فرما دوست مرزا محمد عسکری لکھنوی انہی کے پوتے ہیں "آب حیات" کے بیان کے مطابق انہی مرزا خانی اور مولوی فضل حق خیر آبادی نے غالب کے اردو دیوان کا انتخاب کیا تھا۔

نصیر الدین بیچارہ تو رستہ طوس کا لیتا
نہ ہوتے شحنۂ دہلی اگر یاں میرزا خانی

لیکن غالباً ۱۸۴۵ء میں آگرہ سے تبدیل ہو کر ایک نیا کوتوال آیا۔ یہ میرزا خانی کی طرح نہ تو شاعر تھا نہ نثر طراز کہ غالب کا قدرشناس ہوتا۔ نرا کوتوال تھا۔ اس نے آتے ہی سختی کے ساتھ دیکھ بھال شروع کر دی اور جاسوس لگا دیئے۔ حکام سے قول لے لیا تھا کہ جب تک میرا کوئی جرم ثابت نہ ہو میرے معاملات میں مداخلت نہ کی جائے ورنہ میں شہر کو جرائم سے پاک نہ کر سکوں گا۔ اس زمانے کے بعض دوستوں نے میرزا غالب کو بار بار فہمائش کی کہ ان کی مجلسوں کو ملتوی کر دیں لیکن وہ خبردار نہ ہوئے، اور اس زعم میں رہے کہ میرے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی جا سکتی۔ بالآخر ایک دن ایسے موقعہ پر کہ مجلس قمار گرم اور روپیوں کی ڈھیریاں چنی ہوئی تھیں، کوتوال پہنچا اور دروازہ پر دستک دی۔ اور لوگ تو پچھواڑے سے نکل بھاگے، صاحب مکان یعنی میرزا دھر لئے گئے۔

ان کی گرفتاری سے پہلے چند جوہری پکڑے گئے تھے مگر روپیہ خرچ کر کے بچ گئے تھے۔ مقدمہ تک نوبت نہیں پہنچی۔ میرزا کے پاس روپیہ کہاں تھا، ہاں اعزاز احباب تھے انھوں نے بادشاہ سے سفارش کرائی مگر کچھ نتیجہ نہیں نکلا تو کہہ بیٹھے ہے کوتوال سخت مزاج آدمی تھا۔ دہلی آتے ہی حکام کو ساز گار بنا چکا تھا اور عدم مداخلت کا قرار لے چکا تھا۔ سفارشوں سے کوئی بات بننے والی نہ تھی۔

دوستوں اور عزیزوں کی بے وفائی

اس سلسلے میں واقعہ کا ایک پہلو نہایت عبرت انگیز ہے۔ جس کی تفصیلات مجھے خواجہ حالی مرحوم سے معلوم ہوئیں۔ جونہی میرزا گرفتار ہوئے اور رہائی کی طرف سے مایوسی ہو گئی۔ نہ صرف دوستوں اور جلیسوں نے بلکہ عزیزوں نے بھی یک قلم آنکھیں پھیر لیں اور اس بات میں شرمندگی محسوس

کرنے لگے کہ میرزا کے عزیز و قریب تصور کیے جائیں۔ اس باب میں لوہارو خاندان کا
جو طرزِ عمل رہا وہ نہایت افسوسناک تھا میں نے نواب امیرالدین مرحوم سے اشارۃً تذکرہ
کرکے ٹٹولنا چاہا تو ان کے جوابات سے بھی اس کی پوری تصدیق ہوگئی۔

اس خاندان کا کوئی فرد نہ تو اس زمانے میں میرزا سے ملا اور نہ کسی طرح کی اعانت
کی۔ اتنا ہی نہیں بلکہ جب آگرہ کے ایک اخبار نے میرزا کا ذکر کرتے ہوئے انھیں خاندان
لوہارو کا رشتہ دار ظاہر کیا تو یہ بات ان لوگوں پر بہت شاق گزری اور بہ اہتمام و
تکلف اس کی تغلیط کرائی۔ یہ لکھوایا گیا کہ میرزا صاحب سے خاندان لوہارو کا
کوئی نسبی تعلق نہیں محض دور کا سببی تعلق ہے۔

نواب ضیاءالدین پر میرزا کو جس درجہ ناز تھا وہ ان کے قصیدہ سے ظاہر ہے :۔

ضیاءِ دینِ محمد کہیں برادرِ من ۔۔۔ منم خزینۂ راز و درخزینۂ راز

بود بہ پایہ ارسطوے من سکندرِ من ۔۔۔ اگرچہ اوست ارسطو و من فلاطونم

لیکن نہایت افسوس کے ساتھ لکھنا پڑتا ہے کہ انھوں نے بھی آنکھیں پھیر
لیں اور اسے کسرِ شان سمجھا کہ قید خانہ میں ایک اسیرِ جرم سے ملنے جائیں!

لیکن بے مہری و حق فراموشی کے اس عام منظر میں صرف ایک شخص کا چہرہ
درخشندہ نظر آتا ہے یعنی نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ۔ خواجہ حالی مرحوم کہتے تھے جونہی اس
واقعہ کی خبر ملی فوراً ایک ایک حاکم سے جاکر ملے اور میرزا کی رہائی کے لیے پیہم کوششیں
کیں۔ پھر مقدمہ چلا اور اس کی اپیل کی گئی تو تمام مصارف اپنے پاس سے ادا
کیے۔ جب تک میرزا قید میں رہے ان کا معمول تھا کہ ہر دوسرے دن سوار ہوکر
قید خانے میں جانا اور میرزا سے ملاقات کرنی۔ وہ لوگوں سے کہتے تھے "مجھے میرزا
سے عقیدت ان کے زہد و اتقا کی بنا پر نہ تھی، فضل و کمال کی بنا پر تھی۔ جوئے کا
الزام آج عائد ہوا مگر شراب پینا تو ہمیشہ سے معلوم ہے۔ پھر اس الزام و گرفتاری کی وجہ

سے میری عقیدت کیوں متزلزل ہو جائے ؟ گرفتاری کے بعد بھی ان کا فضل و کمال ویسا ہی ہے جیسا پہلے تھا!

مرزا کے ترکیب بند کا آخری بند دوستوں کی بے مہریوں اور طوطا چشمیوں کا نہایت لطیف پیرایہ میں افسانہ سُناتا ہے:

روزے از مہر نہ گفتید فلانے چوں است
بارے از لطف بگوئید چسانید ہمہ

مصطفےٰ خاں شیفتہ کی اس سچی دوست نوازی کا مرزا غالب کے دل پر جو اثر پڑا ہوگا وہ ان کے ترکیب بند سے ظاہر ہے۔ غدر کی گرفتاری کے بعد جب شیفتہ رہا ہوئے تو مرزا غالب اپنا جوش محبت ضبط نہ کر سکے اور ڈاک کی سواری میں میرٹھ جاکر ان سے ملاقات کی۔ ان کی رہائی کے لئے بھی جس قدر کوشش کر سکتے تھے کرتے رہے۔ جب معلوم ہوا کہ مومن علی خاں صدر الصدور کو اس مقدمہ کے فیصلہ میں دخل ہے اور وہ صدیق حسن خاں کے دوست ہیں، تو بھوپال خط لکھ کر صدر الصدور کے نام خط منگوایا اور شیفتہ کو ایک خاص معتمد کے ہاتھ بھجوا دیا۔ نواب صدیق حسن خاں نے فارسی کی چند نثریں مرزا غالب سے پڑھی تھیں اسلئے مرزا کے خط کو استاد کا خط سمجھ کر بلا تامل تعمیل کی۔ وہ خود بھی شیفتہ سے واقف تھے۔"

آخر میں "حبسیہ" پر میں اس باب کو ختم کرتا ہوں:

خواہم از بند بہ زنداں سخن آغاز کنم	غم دل پردہ دری کرد فغاں ساز کنم
بہ نوائے کہ ز مضراب چکاند خوناب	خویشتن را بہ سخن زمزمہ پرداز کنم
در خرابی بہ جہاں میکدہ بنیاد نہم	در اسیری بہ سخن دعویٰ اعجاز کنم
بے مشقت نبود قید، بہ شعر آویزم	روز کے چند رسن تابی آواز کنم
چوں سرایم سخن انصاف ز مجرم خواہم	چوں نویسم غزل اندیشہ ز غماز کنم
تا چہ افسوں بہ خود از ہیبت صیاد دہم	تا چہ خوں در جگر از حسرت پرواز کنم

یار دیرینہ قدم رنجہ مفرما کاینجا آں نہ گنجد کہ تو در کوبی و من باز کنم
ہائے ناسازی طالع کہ بہ من گرد و باز باخرد شکوہ گر از طالع ناساز کنم
اہل زنداں بہ سرو چشم خودم جا دادند تا بدیں صدر نشینی چہ قدر ناز کنم
بلہ دزداں گر فتار وفا نیست بہ شہر خویشتن را بہ شما ہمدم و ہمراز کنم
من گرفتارم و ایں ائرہ دو زخ تن زن در سخن پیروی شیوۂ ایجاز کنم

گرچہ توقیع گرفتاری جاویدم نیست
لیکن از دہر دگر خوش دلی اُمیدم نیست

شمع ہر چند بہ ہر زاویہ آساں سوزد خوشتر آں است کہ بر نطع در ایواں سوزد
عود من ہرزہ مسوزید دگر سوختنی است بگزارید کہ در مجمر سلطاں سوزد
خانہ ام ز آتش بیداد عدو سوخت دریغ سوختن داشت ز شمعے کہ شبستاں سوزد
منم آں سوختہ کہ گر زخم جگر بنمایم بر من از مہر دل گبر و مسلماں سوزد
منم آں قیس کہ گر سوے من آید لیلےٰ محمل از شعلۂ آوازِ حدی خواں سوزد
تا چسانم گزرد روز بہ شبہا در یاب از چراغے کہ عسس بر در زنداں سوزد
تنم از بند در انبوہ رقیباں لرزد دلم از درد برانبوہ اسیراں سوزد
از نم دیدۂ من فتنۂ طوفاں خیزد از تف نالۂ من جوہر کیواں سوزد
آہ زیں خانہ کہ روشن نشود در شب تار جز بداں خواب کہ در چشم نگہباں سوزد
آہ زیں خانہ کہ در وے نتواں یافت ہوا جز سمومے کہ خس و خار بیاباں سوزد

اے کہ در زاویہ شبہا بہ چراغم شمری
دلم از سینہ بروں آر کہ داغم شمری

پاسباناں بہم آئید کہ من مے آیم درِ زنداں بکشائید کہ من مے آیم
ہر کہ دیدے بہ در خویش سپاسم گفتے خیر مقدم بہ سرائید کہ من مے آیم

جادہ نشناسم و زانبوہ شماے ترسم راہم از دور نمائید کہ من مے آیم

رہرو جادۂ تسلیم درشتی نکند سخت گیرندہ چرائید کہ من مے آیم

خست تن دررہ و تعذیب ضرور است اینجا نمک آرید و بہ سائید کہ من مے آیم

عارض خاک بہ پاشیدنِ خوں تازہ کنید رونق خانہ فزائید کہ من مے آیم

چوں من آیم بہ شما شکوۂ گردوں نہ رواست زیں سپس ژاژ مخائید کہ من مے آیم

ہاں عزیزاں کہ دریں کلبہ اقامت دارید بخت خود را بہ ستائید کہ من مے آیم

تا بہ دروازہ زنداں پئے آوردن من قدمے رنجہ نمائید کہ من مے آیم

چوں سخن سنجی و فرزانگی آئین من است بہرہ از من بہ ربائید کہ من مے آیم

بخود از شوق بہ بالید کہ خود باز روید بر من از مہر گرائید کہ من مے آیم

بسکہ خویشاں شدہ بیگانہ ز بدنامی من

غیر نشگفت خورد گر غم ناکامی من

آنچہ فرداست ہم امروز در آمد گوئی آفتاب از جہت قبلہ برآمد گوئی

دل و دستے کہ مرا بود فروماند زکار شب و روزے کہ مرا بود سرآمد گوئی

سرگزشتم ہمہ رنج و الم آرد گفتی سرنوشتم ہمہ خوف و خطر آمد گوئی

بہرۂ اہل جہاں چوں ز جہاں دردو غم است بہرۂ من ز جہاں بیشتر آمد گوئی

خستن و بستن من حد عسس نیست برو بر من اینہا ز قضا و قدر آمد گوئی

ہنرم را نتواں کرد بہ خستن ضائع خستگی غازۂ روے ہنر آمد گوئی

غم دل داشتم اینک غم جانم دادند زخم را زخم دگر بر اثر آمد گوئی

چرخ یک مرد گرانمایہ بہ زنداں خواہد یوسف از قید زلیخا بدر آمد گوئی

مژدہ امشب ز کجا ایں ہمہ خوناب آورد ایں چنیں گرم ز زخم جگر آمد گوئی

خود چرا خوں خورم از غم کہ بہ غمخواری من رحمت حق بہ لباس بشر آمد گوئی

خواجہ ہست دریں شہر کہ از پرسش وے — پایۂ خویشتنم در نظر آمد گوئی

مصطفیٰ خاں[1] کہ دریں واقعہ غمخوار من است
گر بہ میرم چہ غم از مرگ عزادار من است

خواجہ دانم کہ بسے روز نہ مانم در بند — لیک دانی کہ شب و روز ندانم در بند

نہ پسندم کہ کس آید، نتوانم کہ روم — جانب دریچہ حسرت نگرانم در بند

خستہ ام خستہ من و دعوی تمکیں حاشا — بند سخت است تپیدن نتوانم در بند

شادم از بند کہ از بند معاش آزادم — از کف شحنہ رسد جامہ و نانم در بند

آمہ و جامہ بیارید و سجل بنویسید — خواب از بخت ہمے وام ستانم در بند

یارب ایں گوہر معنی کہ فشانم ز کجاست — بند در تن بود و نیست زبانم در بند

ہر کس از بند گراں نالد و ناکس کہ منم — نالم از خویش کہ بر خویش گرانم در بند

خوے خوش بہر مصیبت زدہ رنج و گراست — رنجہ از دیدن رنج دگرانم در بند

رفتہ در بارۂ من حکم کہ با درد و دریغ — شش مہ از عمر گرامی گزرانم در بند

اگر این است خود آن است کہ عید اضحے — گزرد نیز چو عید رمضانم در بند

مدت قید اگر در نظرم ہست چرا — خون دل از مژہ بے صرفہ چکانم در بند

نیستم طفل کہ در بند رہائی باشم
ہم ز ذوق است کہ در سلسلہ خائی باشم

من نہ آنم کہ ازیں سلسلہ ننگم نبود — چہ کنم چوں بہ قضا زہرۂ جنگم نبود

زیں دو رنگ آمدہ صد رنگ خرابی بظہور — گلہ نیست کہ از بخت دو رنگم نبود

---

[1] نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ نے قید کے زمانے میں دوستی کا حق بطریق احسن ادا کیا تھا یہ اور اس سے پہلے دو شعر نواب صاحب کی سچی اور مخلصانہ دوستی کا ایسا وثیقہ ہیں جو اس وقت تک قائم رہیگا جب تک غالب کا کلام دنیا میں موجود رہے گا۔

راز دانا غم رسوائی جاوید بلاست بہر آزار غم از قید فرنگم نبود

لرزم از خوف درین حجرہ کہ از خشت و گل است ورنہ در دل خطرہ از کام نہنگم نبود

زین دو سرہنگ کہ پوشیدہ ہمے ترسم بیمے از شیر و ہراسے ز پلنگم نبود

منم آئینہ و این حادثہ زنگ است ولے تاب بدنامی آلایش زنگم نبود

آہ از آں دم کہ سرایند ز زنداں آمد اندریں دائرہ گیرم کہ درنگم نبود

ہمدماں دارم امید رہائی در بند دامن از بعد رہائی نہ سنگم نبود

جور اعدا رود از دل بہ رہائی لیکن طعن احباب کم از زخم خدنگم نبود

حاش للہ کہ دریں سلسلہ باشم خوشنود چہ کنم چوں سر ایں رشتہ بچنگم نبود

بہ صریر قلم خویش بود مستی من

اندریں بند گراں بین و سبکدستی من

ہمدماں در دلم از دیدہ نہانید ہمہ غالب غم زدہ را روح و روانید ہمہ

للہ الحمد کہ در عیش و نشاطید ہمہ للہ الشکر کہ با شوکت و شانید ہمہ

ہم در آئین نظر سحر طرازید ہمہ ہم در اقلیم سخن شاہ نشانید ہمہ

چشم بد دور کہ فرخندہ لقائید ہمہ شاد باشید کہ فرخ گہرانید ہمہ

سود بینا و وفا دیدہ و نورید ہمہ زندہ مانید، صفا قالب و جانید ہمہ

من بخوں خفتہ و بینم ہمہ بے بینید ہمہ من جگر خستہ و دانم ہمہ دانید ہمہ

درمیاں ضابطۂ مہر و وفائے بود است من بر آنم کہ ہر آئینہ بر آنید ہمہ

روزے از مہر نگفتید فلانے چون است بارے از لطف بگوئید چسانید ہمہ

گر نباشم بہ جہاں خار و خسے کم گیرید اے کہ سرو و سمن باغ جہانید ہمہ

چارۂ گر نتواں کرد دعائے کافی است دل اگر نیست خداوند زبانید ہمہ

ہفت بند است کہ در بند رقم ساختہ ام بنویسید و بہ بگیرید بخوانید ہمہ

آں نہ باشم کہ بہ ہر بزم زمن یاد آرید
دارم اُمید کہ در بزم سخن یاد آرید

حضرت مولانا ابوالکلام آزاد فرماتے ہیں :-

۱۹۳۲ء میں جب مَیں دہلی سنٹرل میں اسیر تھا تو مجھے ایک دن خیال ہوُا۔ کہ کیا مرزا غالب اسی قید خانے میں رکھے گئے تھے ؟ آصف علی صاحب سے اس کا ذکر کیا تو انہوں نے کہا۔ کہ غدر سے پہلے بھی قید خانہ یہی تھا۔ یقیناً اسی احاطہ کے کسی حصہ میں اسیر رہے ہوں گے۔

بعد کو تفتیش کی تو معلوم ہوا یہاں پہلے بھولی بھٹیاری کی سرائے تھی۔ بھٹیاری کو بعض تو "بھٹیاری" ہی سمجھتے ہیں بعض "بختیاری" کی تخریب سمجھتے ہیں۔ فتح دہلی کے بعد انگریزی حکومت نے سرائے کو قید خانہ بنا دیا اور پھر مزید عمارتوں کا اضافہ ہوتا رہا وسطی عمارت جو ہم لوگوں کو دی گئی تھی واقعی قدیم طرز کی معلوم ہوتی ہے اور ٹھیک ٹھیک سرائے کی طرح ہے[1]۔ غدر سے پہلے اس کے سوا کوئی قید خانہ نہ تھا۔ اس لئے تمام قیدی یہیں رکھے جاتے ہوں گے اور مرزا غالب نے یہیں کہا ہو گا کہ :-

ہلہ دزداں گرفتار وفا نیست شہر
خویشتن را بہ شما ہمدم و ہمراز کنم

---

[1] غالب نے ترکیب بند میں صرف یہ تفصیل بیان کی ہے کہ جس کوٹھری میں انہیں رکھا گیا تھا۔ وہ "خشت و گل" سے بنی ہوئی تھی۔ نیز سامنے دو سپاہی پہرہ دیتے تھے :-

لرزم از خوف دریں حجرہ کہ از خشت و گل است ورنہ در دل خطر از کام نہنگم نبود

زیں دو سرہنگ کہ پو بینند ہم مے ترسم
ہیمے از شیر و ہراسے ز پلنگم نبود

نواں باب

مالی حالات، مدح گوئی اور صلہ یابی

گفتنی نیست کہ بر غالبِ ناکام چہ رفت

مے تواں گفت کہ ایں بندہ خداوند نداشت

غالب کی زندگی مالی مشکلات کی پریشانی و درماندگی کے حبسِ ماتم وحسرت میں گزری
اس کا صحیح نقشہ اوپر کا شعر پیش کر رہا ہے اسی مضمون کو وہ اُردو میں یوں لکھتے ہیں:۔

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب

ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خُدا رکھتے تھے

وہ بڑے خوشحال گھرانے میں پیدا ہُوئے۔ باپ اور چچا کا سایہ کمسنی ہی میں
ان کے سر سے اُٹھ گیا۔ فطرۃً لا اُبالی تھے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ثروت کی بسیہ مستیوں
اور فارغ البالی کی سرخوشیوں نے انہیں حد درجہ مسرف وغیر محتاط بنا دیا۔ جب
دولت وثروت کے جمع شدہ ذخیرے ختم ہو گئے۔ تو اپنی روش بدلنے کے بجائے
بڑھے ہوئے مصارف کی تکمیل کے لئے بے تکلف قرض لیتے لگے۔ انجام یہ ہُوا کہ

اسراف ان کی فطرت کا جزو بن گیا۔ شراب کی عادت ایسی پڑی کہ آخری دم تک نہ چھوٹی۔ ذاتی آمدنی کے وسائل بہت محدود تھے۔ لیکن جمع شدہ دولت نے ابتدا میں وسائل کی کمی کا احساس نہ ہونے دیا۔ جیب تنگ ہوئے تو پنشن پوری نہ ملنے کی جانب خیال منتقل ہو گیا۔ اور مقدمہ کا سلسلہ جاری کیا جو ۱۸۲۶ء سے شروع ہو کر قریباً ۱۸۴۴ء تک قائم رہا۔ اس سلسلے میں مسلسل اُمید لگی رہی۔ کہ فیصلہ ان کے حق میں ہو جائے گا اور بقائے کا بہت سا روپیہ یک مشت ملے گا۔ ادھر سے مایوسی ہوئی۔ تو حکومت انگلشیہ کی طرف سے نئے صلے کی توقع پیدا ہو گئی۔ جس میں وہ غدر تک اُلجھے رہے۔ بہرحال مختلف توقعات کی بنا پر قرض لیتے رہے اور آمدنی کا بیشتر حصہ سود میں ضائع کرتے رہے۔ دوسری مصیبت یہ پیدا ہوئی کہ ان کے لئے کشایش کے جتنے وسیلے آتے رہے یا تو اُن میں ناکامی ہوئی یا اگر کامیابی ہوئی تو وسیلے زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکے۔ اس لئے اپنی زندگی کے متعلق غالب کے نظریہ میں روشنی اور اُمید کی کوئی جھلک باقی نہیں رہی تھی۔

یاس کی تیرگی صاحب عالم مارہروی کے نام ایک خط میں آمدنی کے مختلف وسائل کا حال بتاتے ہوئے پہلے خاندانی پنشن اور اس کے لئے مقدمے کا ذکر کرتے ہیں۔ پھر فرماتے ہیں:۔

> بعد ایک زمانے کے بادشاہ دہلی نے پچاس روپے مہینہ مقرر کیا۔ اس کے ولیعہد نے چار سو روپیہ سال۔ ولی عہد اس تقرر کے دو برس بعد مر گئے۔ واجد علی شاہ بادشاہ اودھ کی سرکار سے بہ صلۂ مدح گستری پانسو روپے سال مقرر ہوئے وہ بھی دو برس سے زیادہ نہ جئے یعنی اگرچہ اب تک جیتے ہیں۔ مگر سلطنت جاتی رہی اور تباہی سلطنت دو ہی برس میں ہوئی۔ دلّی کی سلطنت کچھ سخت جان تھی۔ سات برس مجھ کو روٹی دیکر بگڑی۔ ایسے طالع مربی کش اور محسن سوز کہاں پیدا ہوتے ہیں۔ اب میں جو والیٔ دکن کی طرف رجوع کروں یاد رہے یا متوسط

مرجائیگا۔ یا معزول ہو جائیگا۔ یہ دونوں امر واقع نہ ہوئے تو کوشش اس کی رایگاں جائیگی۔ اور روانی شہر مجھ کو کچھ نہ دے گا۔ اور اچھا نا اگر اس نے کچھ سلوک کیا تو ریاست خاک میں مل جائیگی۔ اور ملک میں گدھے کے ہل پھر جائیں گے۔

غالب کی کم نصیبی

تصانیف سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ انہوں نے وظیفہ یا فتوح کے لئے ہر اس مقام پر کوشش کی جہاں سے کامیابی کی کچھ بھی اُمید دلائی گئی۔ ایسے لوگوں کے قصیدے لکھے جو اگرچہ والیان ریاست تھے۔ یا بڑے بڑے سرکاری عہدے دار تھے۔ لیکن غالب جیسے نادر روزگار شاعر کے موزوں ممدوح نہ تھے۔ ان قصیدوں کے صحیح مخاطب سنجر، اکبر، جہانگیر، شاہ جہان اور خانخاناں جیسے لوگ تھے۔ لیکن سخنوروں کی پایہ شناسی اور قدر دانی کا یہ زرّیں دور غالب سے بہت پہلے گزر چکا تھا۔ خانخاناں اور ذوالفقار خاں کی جگہ آکلینڈ، ایلن برا، ہارڈنگ اور کیننگ نے لے لی تھی۔ اور غالب کو احتیاج سے مجبور ہو کر انہی کا رُخ کرنا پڑا۔ لیکن ان فرومایہ چشموں سے اس بلانوش کی پیاس کیا بجھ سکتی تھی۔ انہیں زندگی میں سکون اور ضروریات سے فراغ میسر نہ آیا۔ اپنے عہد کی خیرہ ذوقی اور جوہر ناشناسی کے متعلق جو درد انگیز خیالات جا بجا ظاہر کیے ہیں۔ ان کو محض سخن گستری نہ سمجھنا چاہیئے بلکہ وہ واقعات وحقائق ہیں۔ روزگار کی ستم پیشگی اور جفا آرائی اس سے بڑھ کر کیا ہو گی کہ جو شخص قصائد میں عرفی کا ہمسر اور غزل میں نظیری کا ہم پلہ تھا۔ جو مثنوی میں فارسی کے بہترین مثنوی نگاروں سے ٹکر کھاتا تھا۔ جو رباعیات میں عمر خیام اور سحابی استرآبادی سے کم نہ تھا۔ اور نثر میں ابوالفضل اور ظہوری سے بہتر تھا۔ اسے تہتر برس کی عمر میں ایک خانخاناں یا ایک ذوالفقار خاں بھی نہ ملا۔ مغلیہ سلطنت نے ذوق کو "خاقانی ہند" بنا دیا۔ اور ان کے لئے ایک معقول تنخواہ اور جاگیر مقرر کر دی۔ لیکن غالب کو یہ سلطنت صرف پچاس روپے ماہوار دے سکی۔ اور یہ بھی تاریخ نگاری کی مُزد تھی جس سے زیادہ

قیمت آج غالب کا ایک غیر مطبوعہ اُردو خط پا سکتا ہے اور جس سے چار گُنا قیمت پر ہمارے زمانے میں اُردو دیوان غالب کے مصوّر ایڈیشن کا ایک ایک نسخہ بِک چکا ہے۔

مشہور ہے کہ عرفی نے خانخاناں کی مدح میں ترسٹھ شعر کا قصیدہ کہا تھا۔ جس کا مطلع یہ تھا:۔

اے داشتہ در سایۂ ہم تیغ و قلم را
وے ساختہ آرایش ہم فضل و کرم را

دریا دل اور قدر شناس خانخاناں نے ترسٹھ ہزار روپیہ دیا۔ غالب نے اسی زمین میں وزیرالدولہ مرحوم والی ٹونک کی مدح میں اُنہتر شعر کا قصیدہ کہا۔ جو عرفی کے قصیدے سے کسی حالت میں بھی کم پایہ نہیں۔ لیکن غالب کو ٹونک سے غالباً اُنہتر سو روپے بھی نہ ملے۔

مشہور ہے کہ ناصر علی سرہندی نے ذوالفقار خاں کی خدمت میں ایک مختصر سی مدحیہ غزل پیش کی تھی جس کا پہلا شعر یہ تھا:

اے شانِ حیدری ز جبین تو آشکار
نام تو در نبرد کند کار ذوالفقار

ذوالفقار خاں نے صرف مطلع سُنکر روک دیا اور کہا کہ مجھ میں مزید اشعار کا صلہ دینے کی قدرت نہیں۔ ناصر علی کو جو کچھ ملا۔ وہیں فقرا میں بانٹ دیا اور یہ مقطع پڑھتا ہُوا خالی ہاتھ چلا آیا:۔

ناصر علی تراز تو خواہد مراد و بس
اے ابرِ فیض بر ہمہ عالم گہر ببار

غالب نے اس زمین میں راجہ شیو دھیان سنگھ والی الور کی مدح میں چالیس شعر کا قصیدہ لکھا۔ ریاست الور کی خدمت میں غالب کے والد نے جان قربان

کی تھی۔ اور راجہ شیبو دھیان سنگھ غالبؔ کے قدردان بھی تھے۔ لیکن کون کہہ سکتا ہے۔ کہ الور سے غالبؔ کو اس کا بیسواں حصہ بھی ملا، جتنا ذوالفقار خاں نے ایک شعر کے صلہ میں ناصر علی کو دے ڈالا تھا۔ ناصر علی اپنا صلہ فقرا میں بانٹ آیا۔ لیکن غالبؔ کی زبان کو اس شکوے سے فراغ نصیب نہ ہوا:

نہ بخشندہ شاہے کہ بارم دہد
بہ ہر بار زر بیل بارم دہد
کزنا پیل زا انجا برانگیزمے
زرش برگدایاں فروریزمے

بہرحال غالبؔ کی مالی مشکلات کی داستان بڑی ہی درد انگیز ہے اور اس جیسے نازک دل اور نازک دماغ شاعر پر ان مشکلات کے انبوہ میں جو قیامت گزرتی ہوگی۔ اس کا صحیح اندازہ آج کون کر سکتا ہے۔

دہلی کی ابتدائی زندگی غالبؔ جب دہلی آئے۔ تو ان کی مالی حالت یقیناً اچھی ہوگی۔ نواب الٰہی بخش خاں معروفؔ اور نواب احمد بخش خاں زندہ تھے۔ اُن کی موجودگی میں غالبؔ کو کوئی مالی دقّت پیش نہیں آسکتی تھی۔ علاوہ آمدنی کے دوسرے وسائل بھی موجود تھے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس زمانے میں بھی قرض لیتے تھے۔ نواب علاء الدین احمد خاں کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

بھائی (امین الدین احمد خاں والی لوہارو) سے کہنا صاحب وہ زمانہ نہیں کہ ادھر متھرا داس سے قرض لیا ادھر دربار ی مل کو جا مارا۔ ادھر خوب چند چین سکھ کی کوٹھی لوٹی۔ ہر ایک کے پاس تمسک مہری موجود، شہد لگاؤ چاٹو نہ مول نہ سود۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ روٹی کا خرچ بالکل پھوپھی کے سر باایں ہمہ کبھی خان نے (غالبؔ خان سے مُراد نواب احمد بخش خاں ہیں) کچھ دے دیا۔ کبھی الور سے کچھ دلوا دیا۔ کبھی ماں نے آگرہ سے کچھ بھیج دیا۔ اب میں اور باسٹھ روپے آٹھ آنے کلکٹری کے

سو روپے رام پور۔

تنگدستی کے بیان کے نئے نئے اسلوب | اپنی تنگ دستی اور مصائب و آلام کے ہجوم کو نئے نئے اسلوبوں اور نئے نئے عنوانوں سے بیان کرتے ہیں۔ پھر بھی نہیں تھکتے۔ گویا یہ موضوع ان کے فکر و تخئیل پر بہ طور خاص حاوی تھا۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

یہاں خدا سے بھی توقع نہیں، مخلوق کا کیا ذکر۔ اپنا آپ تماشائی بن گیا ہوں۔ رنج و ذلت سے خوش ہوتا ہوں یعنی میں نے اپنے آپ کو اپنا غیر تصور کر لیا ہے جو دُکھ مجھے پہنچتا ہے، کہتا ہوں کہ "لو غالب کے ایک اور جوتی لگی"، بہت اتراتا تھا کہ میں بہت بڑا شاعر ہوں اور فارسی داں ہوں، آج دُور دُور تک میرا جواب نہیں۔ لے اب قرضداروں کو جواب دے۔ سچ تو یوں ہے کہ غالب کیا مرا، بڑا مرد مرا، بڑا ملحد مرا، بڑا کافر مرا، ہم نے ازرہِ تعظیم جیسا بادشاہوں کو لوگوں نے "جنت آرامگاہ" اور "عرش نشیمن" خطاب دیئے ہیں چونکہ یہ اپنے آپ کو شہنشاہ قلمرو سخن جانتا تھا، "سقر مقر" اور "ہاویہ زاویہ" خطاب تجویز کر رکھا ہے۔ "آئیے نجم الدولہ بہادر" ایک قرضخواہ کا گریبان میں ہاتھ، ایک قرضخواہ بھوگ سُنا رہا ہے۔ میں ان سے پوچھ رہا ہوں، "اجی حضرت نواب صاحب! نواب صاحب کیسے اوغلان صاحب! آپ سلجوقی و افراسیابی ہیں یہ کیا بے حرمتی ہو رہی ہے کچھ تو اکسو، کچھ تو بولو"، بولے کیا بے حیا، بے عزت کوٹھی سے شراب، گندھی سے گلاب، بزاز سے کپڑا، میوہ فروش سے آم، صراف سے دام قرض لئے جاتا تھا۔ یہ بھی تو سوچا ہوتا کہ کہاں سے دُوں گا۔

خاندانی پنشن | غالب کی جو آمدنی ابتدا سے آخر تک مستقل طور پر قائم رہی وہ خاندانی پنشن تھی۔ ریاست فیروز پور جھرکہ کی ضبطی کے بعد یہ سرکار انگریزی کے خزانے سے متعلق ہو گئی تھی اس کی مقدار سات سو پچاس روپے سالانہ یا ساڑھے باسٹھ روپے ماہانہ تھی۔ اس کے ملنے میں صرف دو مرتبہ عارضی خلل پیدا ہوا۔ ایک مرتبہ نواب شمس الدین احمد خاں کے ساتھ جھگڑے

کے دوران میں دوسری مرتبہ غدر کے آغاز سے لے کر باغیوں کی اعانت کے الزام سے غالب کے مبرا ثابت ہونے تک۔ لیکن دونوں مرتبہ جمع شدہ روپیہ مل گیا۔

قلعہ کی ملازمت

شاہ دہلی نے شیخ نصیر الدین عرف کالے میاں اور حکیم احسن اللہ خاں کی سفارش پر ۱۸۵۰ء میں غالب کو تیموری خاندانی کی تاریخ لکھنے کے لئے مقرر کیا تھا۔ اور نجم الدولہ، دبیر الملک، نظام جنگ کے خطابات کے علاوہ خلعت اور پچاس روپے ماہانہ تنخواہ مقرر کی تھی، یہ تنخواہ آغاز جولائی ۱۸۵۰ء سے لے کر آخر اپریل ۱۸۵۷ء تک ملتی رہی۔ حکیم احسن اللہ خاں، جمع و تحقیق حالات پر مامور تھے جو کچھ لکھ کر حوالے کر دیتے۔ غالب اس کو بہار آفریں نثر کا جامہ پہنا دیتے۔ ۱۸۵۲ء تک تاریخ کا پہلا حصہ جو ابتدائے آفرینش سے لیکر ہمایوں پادشاہ کی وفات تک کے حالات پر مشتمل تھا، مکمل ہوا۔ اس کا نام "مہر نیمروز" تھا۔ دوسرے حصے میں اکبر کی تخت نشینی سے لے کر بہادر شاہ ثانی تک کے حالات مدون کرنے کی تجویز تھی۔ اس کا نام غالب نے "ماہ نیم ماہ" رکھا تھا۔ لیکن یہ حصہ شروع نہ ہوا اور غدر کی آگ بھڑک اٹھی جس نے تیموری خاندان کے رخت وجود ہی کو را کھ بنا ڈالا۔

غدر ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کو ہوا۔ اس لئے میرا خیال ہے کہ قلعہ سے آخری تنخواہ اپریل ۱۸۵۷ء کی ملی ہو گی۔

ملازمت سے پیشتر کا تعلق

خواجہ حالی فرماتے ہیں کہ ملازمت سے قبل بھی غالب قلعہ میں آتے جاتے تھے۔ مختلف تقریبات پر بادشاہ کی خدمت میں قصیدے گزرانتے تھے اور خلعت پاتے تھے۔ اس کی تائید غالب کے کلیات سے بھی ہوتی ہے۔ مثلاً ایک قصیدہ اکبر شاہ ثانی کی مدح میں ہے۔ جن کا انتقال ۱۸۳۷ء میں یعنی قلعہ کے ساتھ ملازمت کا تعلق پیدا ہونے سے تیرہ برس

پیشتر ہوا۔ بہادر شاہ ثانی کی مدح میں غالب کے فارسی کلام میں دو مثنویاں ایک ترکیب بند اور پندرہ قصیدے ہیں۔ نیز اردو میں دو قصیدے اور چند چھوٹے بڑے قطعات ہیں۔ ان سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ قلعہ کے ساتھ ملازمت سے پہلے بھی روابط قائم تھے۔ لیکن یہ عرض کرنا مشکل ہے کہ قصائد کا صلہ کیا ملتا رہا۔ اور خلعت کی حیثیت کیا تھی۔

شش ماہہ تنخواہ کا حکم

قلعہ والی تنخواہ میں غالب کے لئے صرف ایک مرتبہ ناگوار[1] صورت پیدا ہوئی۔ یعنی یہ حکم ہو گیا تھا کہ ملازمین قلعہ کو ماہ بہ ماہ کے بجائے چھ ماہ کی اکٹھی تنخواہ ملا کرے۔ غالب کی پوری زندگی مختلف النوع مالی احتیاجات میں بسر ہو رہی تھی۔ وہ اپنے کسی ذریعہ معیشت میں ذرا سا توقف بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ اس لیے ششماہہ تنخواہ کا حکم بڑی مصیبت کا پیش خیمہ نظر آیا۔ ناچار اس سے مستثنےٰ کئے جانے کے متعلق اردو میں ایک قطعہ لکھکر بادشاہ کی بارگاہ میں گزارا جس میں اپنی ضروریات و مشکلات کو نہایت موثر انداز میں بیان کیا۔ فرماتے ہیں:

مری تنخواہ جو مقرر ہے ۔۔۔ اس کے ملنے کا ہے عجب ہنجار
رسم ہے مُردے کی چھ ماہی ایک ۔۔۔ خلق کا ہے اسی چلن پہ مدار
مجھ کو دیکھو کہ ہوں بہ قید حیات ۔۔۔ اور چھ ماہی ہو سال میں دو بار

---

[1] مولانا ابو الکلام آزاد فرماتے ہیں: "یہ نہ کہئے کہ 'صرف ایک مرتبہ' ایک مرتبہ حالات نے ایسی شکل اختیار کی کہ عرضداشت منظوم لکھنی پڑی لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس زمانے میں قلعہ کی تنخواہیں ماہوار بہ آسانی مل جایا کرتی تھیں تنخواہ کے تقرر سے کہیں زیادہ مشکل اس کا ماہ بہ ماہ وصول کرنا تھا۔ اکثر ایسا ہوا کرتا تھا کہ جب تین چار ماہ کی رقم چڑھ جاتی تو خزینہ دار کہتا دو ماہ کی تنخواہ لے کر یا تین ماہ کی لے کر بقایا کے تصفیہ کی رسید دے دو اہل غرض بہ ہزار شکر و منت اسے غنیمت سمجھ کر رسید دے دیتے۔

بسکہ لیتا ہوں ہر مہینے قرض   اور رہتی ہے سود کی تکرار

مری تنخواہ میں تہائی کا   ہو گیا ہے شریک ساہوکار

آخر میں لکھتے ہیں ،

مری تنخواہ کیجے ماہ بہ ماہ   تا نہ ہو مجھ کو زندگی دشوار

اس پر غالب کے لئے ماہ بہ ماہ تنخواہ کا حکم جاری ہوگیا۔ بادشاہ کی طرف سے پچاس روپے ماہانہ کے علاوہ شہزادہ[1] فتح الملک کی طرف سے بھی چار سو روپے سالانہ تنخواہ ملتی تھی۔ لیکن شہزادہ کی وفات کے بعد یہ سلسلہ بھی ختم ہوگیا۔ خود غالب فرماتے ہیں کہ دو برس سے زائد فائدہ نہ اٹھا سکے۔

رام پور کا وظیفہ

غالب کی زندگی کے آخری دس برس میں انہیں رام پور سے سو روپے ماہانہ مستقل طور پر ملتے رہے۔ فرمانروایان رام پور کے خاندان کے ساتھ غالب کے تعلقات اسی زمانے میں قائم ہو گئے تھے۔ جب نواب سید غلام محمد خاں خلف نواب سید فیض اللہ خاں ریاست میں داخلی کشمکش کے باعث دہلی چلے آئے تھے۔ ان کے تین فرزند تھے۔ نواب سید محمد سعید خاں جو ۱۸۴۰ء میں مسند نشین ریاست ہوئے۔ نواب سید عبداللہ خاں، جو میرٹھ میں صدر الصدور بن گئے تھے اور نواب سید عبدالرحمن خاں۔ نواب سید محمد سعید خاں کے فرزند نواب سید یوسف علی خاں فردوس مکان تھے جو ۱۸۱۶ء میں پیدا ہوئے

[1] شہزادہ غلام فخر الدین عرف مرزا فخرو مخاطب بہ فتح الملک بن بہادر شاہ اپنے بڑے بھائی میرزا دارا بخت ولی عہد اول کے انتقال (۱۱ر جون ۱۸۴۹ء) کے بعد ولی عہد بنے۔ وہ غالب کے شاگرد تھے "مہر نیمروز" انہی کے حکم سے ۱۸۵۴ء میں طبع ہوئی تھی۔ ۱۰ر جولائی ۱۸۵۶ء کو وفات پائی۔ بعض لوگوں کو شبہ تھا کہ انہیں زہر دیا گیا۔

۹ر جولائی کی رات کو انہیں خلاف عادت چار مرتبہ اجابت ہوئی۔ بھوک لگی تو شوربا چاول کھائے اجابت بند کی اور کمزوری بڑھتی گئی۔ حکیم احسن اللہ خاں کو بلایا گیا۔ انہوں نے نسخہ تجویز کر کے بادشاہ کو اطلاع دی۔ ۱۰ر جولائی کی شام کو ان پر نیم بے ہوشی کی کیفیت طاری ہوگئی۔ سات بجے کے قریب انتقال ہوگیا۔ اس وقت چالیس برس کی عمر تھی۔

اور ۱۸۵۵ء میں عنان حکومت سنبھالی۔ قیام دہلی کے دوران میں انہوں نے مفتی صدرالدین آزردہ مرحوم مولانا فضل حق خیرآبادی اور غالب سے عربی اور فارسی پڑھی تھی ۱۸۵۵ء میں غالب نے پرانے دوستانہ روابط کی بنا پر قطعہ جلوس نواب یوسف علی خاں کی خدمت میں بھیجا لیکن اسکا کوئی جواب نہ آیا۔ ۲۸ جنوری ۱۸۵۷ء کو مولانا فضل حق خیرآبادی کی تحریک پر ایک قصیدہ مع عرضداشت بھیجا جس کا مطلع یہ ہے:

ہمانا اگر گوہر جاں فرستم

بہ نواب یوسف علی خاں فرستم

یہ عرضداشت اور قصیدہ پہنچنے کے ساتھ ہی نواب یوسف علی خاں نے شاعری میں غالب کی شاگردی اختیار کرلی اور ڈھائی سو روپے کی رقم شیرینی کے طور پر بھیج دی۔ غالباً نواب صاحب استاد کی تلاش میں تھے۔ مولانا فضل حق خیرآبادی نے غالب کا نام پیش کیا۔ اس کے ساتھ غالب کو قصیدہ اور عرضداشت کیلئے لکھا۔ اس طرح دیرینہ روابط تازہ ہو گئے۔ نواب یوسف علی خاں اشعار کے ساتھ وقتاً فوقتاً روپیہ بھی بھیج دیتے تھے۔ غالب لکھتے ہیں:

۱۸۵۷ء[1] میں نواب یوسف علی خاں بہادر والی رام پور، کہ میرے آشنائے قدیم ہیں۔ میرے شاگرد ہوئے ناظم ان کو تخلص دیا گیا۔ بیس پچیس غزلیں اُردو کی بھیجتے، میں اصلاح دیکر بھیج دیتا۔ گاہ گاہ کچھ روپیہ ادھر سے آتا رہتا۔ قلعہ کی تنخواہ جاری، انگریزی پنشن کھلا ہوا ان کے عطایا یعنی نواب کے عطایا، فتوح گنے جاتے تھے۔ جب یہ دونوں تنخواہیں جاتی رہیں

---

[1] اُردوئے معلےٰ میں ۱۸۵۵ء میں درج ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ نقل وکتابت کی غلطی ہے۔ غالب کے مجموعہ مکاتیب رام پور سے ثابت ہو چکا ہے۔ کہ نواب یوسف علی خاں ۱۸۵۷ء میں شاگرد ہوئے۔

تو زندگی کا مدار ان کے عطیہ پر رہا۔

مستقل تنخواہ کا مطالبہ غدر کے بعد جب قلعہ کی تنخواہ بند ہوگئی، خاندانی پنشن التوا میں پڑ گئی اور غالب کی مصیبتوں کا پیمانہ لبریز ہو گیا تو نواب یوسف علی خاں نے مستقل طور پر دو سو روپے ماہوار تنخواہ مقرر کر دی۔

نواب یوسف علی خاں غالب کو وظیفہ خوار نہیں بلکہ ایک گراں مایہ دوست سمجھتے تھے۔ غالب نے اس کا اعتراف کیا ہے۔ یہاں تک کہ وظیفہ کی ہنڈی اپنے خط میں رکھ کر بھیجتے اور کبھی اس کی رسید طلب نہ فرمائی۔ ایک موقع پر نواب مرحوم کی طرف سے خط و کتابت میں توقف ہوا تو غالب نے تغافل کے شکوہ میں ایک بدیع قصیدہ لکھا جس کے چند اشعار درج کئے جاتے ہیں:

چوں نیست مرا شربت آبے ز تو حاصل — دانم کہ تو دریائی و من سبزۂ ساحل
در بادیہ بر گور غریباں ز چہ سوزد — آں شمع فروزاں کہ بود در خور محفل
زاں خسرو خوباں چہ قدر چشم وفا بود — صد حیف کہ شد نقش امیدم ہمہ باطل
افسانۂ غم گر بسرایم بنود عیب — با دوست کہ پیوستہ ہمے برد غمم از دل
مے گویم و ہمدم زندم طعنہ کہ تن زن — چوں مے ندہد داد ز فریاد چہ حاصل

. . . .

یارب چہ شد اینک کہ نگیرد خبر از من — بر لبستہ بہ رویم در ارسال رسائل

. . . .

چون است کہ گاہے نہ کنی روے بدیں سوے — چون است کہ ہرگز نہ دہی گدیہ بہ سائل
گر جاں دہم از غصہ تو دانی کہ بہ گیتی! — حرفے غلط از صفحۂ ہستی شدہ زائل
خواہی کہ مرا بنگری از دور بہ فرماے — تا نزد تو آرند یکے طائر بسمل
غالب بہ سخن نام من آمد ازل آورد — دانی کہ دریں شیوہ نیم عامی و جاہل

در فنِ سخن دہم مزن از عرفی و طالب | ایں آیۂ خاص است کہ بر من شدہ نازل
من گنجم و گرد دل بہ گل اندودہ درم را | مے ہیں دری گنج ار چہ کشودن شدہ مشکل
خود در خور ویرانہ بود گنج گران مند | غم نیست گر آبادی دہلی شدہ زائل

ہاروت فسونِ نفسِ گرم چہ داند
اعجاز ز دہلی بود و سحر ز بابل

اس کے بعد توقیع بریلی کی مبارک باد دیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ میں مفتی یا قاضی یا شحنہ یا عامل کے عہدے کا طلبگار نہیں بلکہ صرف یہ چاہتا ہوں کہ میرا حصہ مجھے ہر سال پہنچتا رہے۔

نواب یوسف علی خاں کی وفات کے بعد ان کے ہنر پرور اور قدر شناس جانشین نواب کلب علی خاں مرحوم نے بھی یہ وظیفہ بہ دستور قائم رکھا۔

متفرق عطایا | اس کے علاوہ بھی نواب یوسف علی خاں وقتاً فوقتاً متفرق رقمیں بھیجتے رہتے تھے۔ غالب ۱۸۶۵ء کے ایک مکتوب میں سیف الحق میاں داد خاں صاحب سیاح کو لکھتے ہیں:

ایک قرن سے فردوس مکان نواب یوسف علی خاں والی رام پور اپنے اشعار میرے پاس بھیجتے تھے اور سو روپیہ مہینہ ماہ بہ ماہ بہ سبیل ہنڈوی بھیجتے تھے اس مغفور کی اندازہ دانی دیکھئے کہ کبھی مجھ سے اس روپے کی رسید نہ ملی۔ اپنے خط میں ہنڈوی بھیجا کرتے تھے، میں خط کا جواب لکھ بھیجتا۔ اس ماہانہ کے علاوہ بھی کبھی دو سو کبھی ڈھائی سو بھیجتے رہتے۔ فتنہ و فساد (غدر) کے دنوں میں قلعہ کی آمد مفقود، انگریزی پنشن مسدود۔ یہ بزرگوار وجہ مقرری ماہ بہ ماہ اور فتوح گاہ گاہ بھیجتا رہا۔ تب میری اور میرے متوسلوں کی زیست ہوئی۔

آخری لفظوں سے شاید کسی صاحب کے دل میں خیال پیدا ہو کہ نواب یوسف علی خاں شاگردی کے آغاز ہی سے سو روپے ماہانہ مستقل بھیجتے رہے۔ یہ خیال صحیح نہ ہوگا۔ غالب نے

خود میرزا تفتہ کے موسومہ خط میں تصریح کی ہے کہ مستقل وظیفہ جولائی ۱۸۵۹ء سے شروع ہوا۔ فرماتے ہیں :۔

نواب یوسف علی خاں تیس برس کے میرے دوست، اور پانچ چھ برس سے میرے شاگرد ہیں آگے گاہ گاہ بھیج دیا کرتے تھے۔ اب جولائی ۱۸۵۹ء سے سو روپیہ مہینا ماہ بہ ماہ بھیجتے ہیں۔ بلاتے رہتے تھے۔ اب میں گیا۔ دو مہینے رہ کر چلا آیا۔ بہ شرط حیات بعد برسات کے پھر جاؤں گا۔ وہ سو روپیہ مہینا، یہاں رہوں یا وہاں رہوں، خدا کے ہاں سے میرا مقرر ہے۔

نواب کلب علی خاں کا عہد

اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ نواب یوسف علی خاں کے انتقال کے بعد نواب کلب علی خاں نے بھی یہ وظیفہ جاری رکھا تھا۔ غالب لکھتے ہیں :

رئیس حال (نواب کلب علی خاں) کو خدا بہ دولت و اقبال ابد الآمو بد اسلامت رکھے وجہ مقرری کی ہنڈوی ہر مہینے حسب دستور قدیم اپنے خط میں بھیجے جاتا تھا۔ فتوح کی رسم دیکھئے جاری رہے یا نہیں۔

قاطع برہان کی طباعت میں امداد

غالب خود بھی خاص ضرورتوں کے موقع پر روپیہ مانگ لیتے تھے مثلاً "قاطع برہان" کی چھپائی کے لئے دو سو روپے منگانے کا واقعہ معلوم ہے۔ خود لکھتے ہیں :

میرے پاس روپیہ کہاں جو "قاطع برہان" کو دوبارہ چھپواؤں ؟ پہلے بھی نواب مغفور (نواب یوسف علی خاں) نے دو سو روپے بھیج دیئے تھے۔ تب پہلا مسودہ صاف ہو کر چھپوایا گیا تھا۔ اب بھی وعدہ کیا تھا کہ اپریل کی وجہ مقرری کے ساتھ دو سو روپے پہنچیں گے۔ وہ (نواب صاحب) آخر اپریل ۱۸۶۵ء میں مر گئے۔ اپریل کا روپیہ رئیس حال سے میں نے پایا مصرف کتاب کا روپیہ نہ آیا۔ مگر اس مرحوم (نواب یوسف علی خاں) کا سر رشتہ دفتر سے نہ تھا

جو از روئے دفتر اس کی تصدیق ہو۔

اصلاح اشعار سے معذرت غالبؔ نے ایک مرتبہ اصلاح اشعار سے معذرت بھی لکھ بھیجی لیکن نواب کی طرف سے مقررہ وظیفہ بہ دستور پہنچتا رہا میرزا تفتہ کو لکھتے ہیں:

رئیس رام پور سو روپیہ مہینا دیتے ہیں۔ سال گذشتہ ان کو لکھ بھیجا کہ اصلاح نظم حواس کا کام ہے اور میں اپنے میں حواس نہیں پاتا۔ متوقع ہوں کہ اس خدمت سے معاف رہوں جو کچھ مجھے سرکار سے ملتا ہے۔ عوض خدمات سابقہ میں شمار کیجئے۔ تو میں سکہ لمبر سہی، ورنہ خیرات خوار سہی اور اگر یہ عطیہ بہ شرط خدمت ہے تو جو آپ کی مرضی وہی میری قسمت ہے۔ برس دن سے ان کا کلام نہیں آتا۔ فتوح مقرری نومبر تک آئی ہے۔ اب دیکھئے آگے کیا ہونا ہے۔ آجتک نواب صاحب ازراہ جوانمردی دیئے جاتے ہیں۔

نہ محض اصلاح اشعار ہی کی خدمت معاف تھی۔ بلکہ رام پور جانے کی بھی پابندی نہ تھی غالبؔ خود فرماتے ہیں:۔

حق تعالےٰ والی رام پور کو صد دسی سال سلامت رکھے۔ ان کا عطیہ ماہ بہ ماہ مجھ کو پہنچتا ہے۔ کرم گستری اور استاد پروری کر رہے ہیں۔ میرے رنج سفر اٹھانے اور رام پور جانے کی حاجت نہیں۔

رام پور میں قیام کے زمانے کی تنخواہ دوران قیام رام پور میں مقررہ وظیفہ کے علاوہ سو روپیہ بنام دعوت ملتا تھا۔ وہ خود فرماتے ہیں:۔

نواب صاحب جولائی ۱۸۵۹ء سے جس کو یہ دسواں مہینا ہے سو روپے مجھے ماہ بماہ بھیجتے ہیں۔ اب جو میں وہاں گیا تو سو روپے مہینا بنام دعوت اور دیا۔ یعنی رام پور میں رہوں تو دو سو روپیہ مہینا پاؤں اور دلی رہوں تو سو روپیہ۔

اودھ کے ساتھ تعلقات سلطنت اودھ کے ساتھ غالبؔ کے تعلقات کی نسبت ایک اقتباس اوپر پیش کیا جا چکا ہے، جس میں وہ فرماتے ہیں کہ واجد علی شاہ کی سرکار سے

ان کے لئے بہ صلہ مدح گستری پانسو روپے سالانہ مقرر ہوئے۔ لیکن یہ وظیفہ مقرر ہونے کے بعد سلطنت اودھ دو برس سے زیادہ قائم نہ رہی۔ اس سے مستفاد ہوتا ہے۔ کہ پانسو روپے سالانہ کا یہ وظیفہ ۱۸۵۳ء کے اواخر یا ۱۸۵۴ء کے اوائل میں مقرر ہوا تھا۔ اس لئے کہ واجد علی شاہ ۱۸۵۶ء میں معزول ہوئے۔

غالبؔ کے سفر کلکتہ کے سلسلے میں قیام لکھنؤ کے جو حالات بیان ہو چکے ہیں۔ ان سے ظاہر ہے۔ کہ دربار لکھنؤ کے ساتھ ۱۸۲۷ء میں روابط پیدا کرنیکی کوشش کی گئی تھی۔ خواجہ حالیؔ فرماتے ہیں:

اس زمانے میں نصیر الدین حیدر فرمانروا اور روشن الدولہ نائب السلطنت تھے۔ اہل لکھنؤ نے مرزا کی عمدہ طور پر مدارات کی اور روشن الدولہ کے ہاں بہ عنوان شایستہ ان کی تقریب کی گئی۔ مرزا سے اس پریشانی کے عالم میں قصیدہ تو سر انجام نہ ہو سکا۔ مگر ایک مدحیہ نثر صنعت تعطیل میں جو ان کے مسودات میں موجود ہے۔ نائب السلطنت کے سامنے پیش کرنے کے لئے لکھی تھی۔

ہم اوپر بتا چکے ہیں۔ کہ غازی الدین حیدر نے ۲۷ ربیع الاول ۱۲۴۳ھ (مطابق ۱۹ اکتوبر ۱۸۲۷ء) کو وفات پائی۔ اور اس کا بیٹا نصیر الدین حیدر پادشاہ بنا۔ غالبؔ اس سے قبل لکھنؤ سے گزر چکے تھے۔ بلکہ باندہ سے بھی آگے نکل گئے تھے۔ لہذا یہ صحیح نہیں۔ کہ وہ نصیر الدین حیدر کے زمانے میں لکھنؤ گئے۔

اس زمانے میں روشن الدولہ کے نائب السلطنت ہونے کا بیان دیکھ کر تو خیال ہوتا ہے۔ کہ "یادگار" کی ترتیب کے وقت غالبؔ کی کلیات نثر فارسی خواجہ صاحب مرحوم کے پیش نظر ہی نہیں تھی۔ اس لئے کہ جس نثر کا خواجہ حالیؔ نے

---

[۱] تاریخ اودھ حصہ چہارم صفحہ ۲۰۴

ذکر فرمایا ہے۔ اس کی داستان ترتیب غالبؔ خود یوں بیان کرتے ہیں۔ کہ لکھنؤ کے دوستوں نے رفتہ رفتہ میرا ذکر سید آغا میر کی بزم میں پہنچایا جو معتمد الدولہ کے خطاب سے مشرف تھے۔ اور بہ نزخانی فرمانروائے آں کشور و مدار المہامی آں سلطنت اشتہار داشت[۱]۔ پھر لکھنؤ سے رائے چھجمل کو لکھتے ہوئے فرماتے ہیں:

ہرچہ دراں بلاد از کرم پیشگی وفیض رسانی ایں گدا طبع سلطان صورت یعنی معتمد الدولہ آغا میر شنیدہ مے شد بخدا کہ حال برعکس است[۲]۔

ان اقتباسات سے ظاہر ہے۔ کہ نہ اس زمانے میں روشن الدولہ نائب السلطنت تھے۔ نہ زیر غور نثر ان کے لئے لکھی گئی۔ نہ غالب کی تقریب روشن الدولہ کی بزم میں ہوئی۔

یہ بھی معلوم ہے۔ کہ غازی الدین حیدر کے بعد نصیر الدین حیدر کے ابتدائی دور میں روشن الدولہ نہیں بلکہ معتمد الدولہ آغا میر ہی مدار المہام تھے۔ انکی معزولی کے بعد اعتماد الدولہ میر فضل علی مدار المہام بنے۔ پھر منتظم الدولہ حکیم مہدی علی خاں نیابت و مدار المہامی پر مامور ہوئے[۳]۔ اس سے کم و بیش ایک سال قبل غالبؔ کلکتہ میں دو برس رہ کر دہلی آچکے تھے۔ اگست ۱۸۳۲ء میں حکیم مہدی علی خاں معزول ہوئے[۴]۔ اور نومبر ۱۸۳۲ء میں یعنی غالبؔ کے لکھنؤ جانے سے قریباً سوا پانچ برس روشن الدولہ کو وزارت کا منصب عطا ہوا[۵]۔

---

[۱] کلیات نثر فارسی صفحہ ۶۵۔ [۲] کلیاتِ نثر فارسی صفحہ ۱۵۷

[۳] تاریخ اودھ حصہ چہارم صفحہ ۲۵۵۔

[۴] تاریخ اودھ حصہ چہارم صفحہ ۲۹۲۔

[۵] تاریخ اودھ حصہ چہارم صفحہ ۳۰۰۔

سلاطین اودھ کے قصائد

غالب کے کلیات نظم فارسی میں شاہان اودھ کے لئے پانچ قصیدے ہیں۔ اور ایک قطعہ ہے۔ پہلا قصیدہ نصیر الدین حیدر کی مدح میں ہے چونکہ اس میں روشن الدولہ کا ذکر ہے۔ اس لئے ظاہر ہے۔ کہ وہ بہرحال نومبر ۱۸۳۲ء کے بعد پیش ہؤا۔ دوسرا قصیدہ امجد علی شاہ کی مدح میں ہے۔ تیسرا بھی امجد علی شاہ ہی کی مدح میں لکھا گیا تھا۔ لیکن غالب کی ایک تحریر سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس میں بعد ازاں امجد علی شاہ کی جگہ واجد علی شاہ کا نام داخل کر دیا تھا۔ بہرحال وہ واجد علی شاہ ہی کی بارگاہ میں پیش ہوا[1]۔ بقیہ دونوں قصیدے واجد علی شاہ کی مدح میں ہیں۔ قطعہ نصیر الدین حیدر کی شادی کی تقریب میں لکھا گیا تھا۔ جس سے ۱۲۴۴ھ (مطابق ۲۹-۱۸۲۸ء) تاریخ نکلتی ہے۔ میری تحقیق کے مطابق اودھ کے شاہی خاندان کے ساتھ غالب کے روابط کی پہلی کڑی یہی قطعہ ہے۔ اسی کے متعلق کلکتہ میں بیٹھے ہوئے مولوی کرم حسین خاں سفیر شاہ اودھ مقیم کلکتہ کو لکھتے ہیں:

> آنچہ من در صلۂ نگارش ایں قطعہ دست مزد خویش مے سنجم روشناسی خسروست و تشریف قبول و نوید التفات و عطیہ فتوح۔ اما کشایش طلسم ایں مدعا در گرو آن است کہ پایہ و مقام ستایش گر بہ حضرت ممدوح شمردہ مے شود تا بہ اندازہ ارزش وے عطا تواند کرد۔ ورنہ پیداست کہ جایزہ بادشاہان تا چہ قدر است۔

اس کے بعد نصیر الدین حیدر کی مدح میں قصیدہ بھیجنے تک غالب کی طرف سے اودھ کے ساتھ رابطہ پیدا کرنے کی غالباً کوئی کوشش نہیں ہوئی۔

نصیر الدین حیدر کا قصیدہ

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے۔ یہ قصیدہ نومبر ۱۸۳۲ء

---

[1] اردوئے معلّٰی صفحہ ۲۷۔

کے بعد لکھا گیا[1]۔ اس لئے کہ اس میں روشن الدولہ کا بھی ذکر ہے۔ جو نومبر ۱۸۳۲ء میں وزیر اعظم ہوئے:

روشن الدولہ بہادر کہ بہ ایثار و عطا — حاتمش گفتم و شرمندۂ نقصاں رفتم

برمکیند ہمہ برمکیاں زہر ز رشک — چو ثنا خوان ثنایش بر آناں رفتم

پادشاہ سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں:

تو سلیمانی و آں آصف و من مور ضعیف — راہ نسبت طلبی بیں کہ چہ شایاں رفتم

بہ دیہیم لبسپرد بنولیس برانم بردے — تا بدانم کہ بہ آصف ز سلیماں رفتم

سبحان علی خاں قوم کے کمبوہ اس زمانے میں ایک نہایت فاضل اور دانشمند شخص

---

[1] مولانا ابوالکلام فرماتے ہیں: اس قصیدہ کی تشبیب سے معلوم ہوتا ہے کہ کم از کم تشبیب کا بڑا حصہ سفر کلکتہ میں ضرور لکھا گیا۔ کیونکہ صریح ان حالات پر مشتمل ہے جو سفر کا باعث ہوئے تھے۔ یعنی اقارب کا جور وستم اہل وطن کی بے اعتنائی۔ حکام کا تغافل اور پھر اتنا ہی نہیں صاف لفظوں میں سفر کا بھی ذکر کیا ہے:

بہ چہرہ اندوہ بگردو مژہ آغشتہ بخوں — خود گواہم کہ ز دہلی بہ چہ عنوان رفتم

باقی رہی یہ بات کہ غالب نے قیام لکھنؤ کی تالیفات میں صرف نثر بہ صنعت تعطیل کا ذکر کیا ہے، قصیدہ کا ذکر نہیں کیا نیز ممدوح نصیر الدین حیدر ہے نہ کہ غازی الدین حیدر تو اس کی توجیہہ یوں ہو سکتی ہے کہ قصیدہ لکھنے کا خیال ہوا تھا۔ اور تشبیب کا بڑا حصہ انجام بھی پا گیا تھا۔ مگر معتمد الدولہ کا حال دیکھ کر طبیعت افسردہ ہو گئی یا پریشانی سفر کی وجہ سے تکمیل تک معاملہ نہ پہنچا۔ پھر روشن الدولہ کے زمانے میں مدح کے اشعار بڑھا کر قصیدہ مکمل کر دیا گیا۔ غالب نے قصائد میں اس طرح کی تبدیلیاں اکثر کی ہیں۔"

ایک پہلو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ شاہ اودھ کا قصیدہ لکھتے وقت تشبیب کے لئے سفر لکھنؤ کا مضمون موزوں معلوم ہوا۔ اور غالب نے پانچ برس پیشتر کے واقعات کا پورا نقشہ تشبیب میں کھینچ دیا۔

لیکن اب مدت سے میرا خیال بھی یہی ہے کہ قصیدہ کا ابتدائی حصہ یقیناً سفر کلکتہ کے دوران میں لکھا گیا۔ اور "رفتم" کی ردیف والی زمین اختیار کرنے سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے +

تھے جو معتمد الدولہ آغا میر کے منشیِ خاص رہ چکے تھے اور روشن الدولہ نے بھی اپنے زمانے میں انہیں اپنا منشیِ خاص بنا لیا تھا۔ غالبؔ اسی قصیدے کے متعلق سُبحان علی خاں کو لکھتے ہیں:

این عرضداشت بہ فروغ نگاہ قبول آصف ثانی در روشن الدولہ مشرقستان گردد این قصیدہ بہ بزم مینو مثال سلیمانی (نصیر الدین حیدر) خواندہ شود نامراکہ سخن پیوند ستایش نگارم بہ جائزۂ خسروی رُخ امتیاز افروزش پذیرد، وانگاہ صلہ بداں گرانمایگی کہ ہم بہ ہرم بلند نامی و ہم در نظر خویشتن گرامی کند۔[1]

سبحان علی خاں کے نام غالبؔ کے مکاتیب فارسی میں دو اور خط ہیں جن میں سے ایک میں لکھتے ہیں کہ قصیدہ اور عرضداشت مدت ہوئی آپ کے پاس پہنچ چکے ہیں۔ یہ بھی سُن چکا ہوں کہ وزیر اعظم نے اس قصیدے کو بہت پسند کیا، لیکن معلوم نہ ہوا کہ یہ بارگاہ شاہی میں پہنچایا نہیں گیا۔ منشی محمد حسن خاں کو بھی اسی کے متعلق تحریر فرماتے ہیں کہ اگر صلہ مل جائے۔ تو میں مقدمہ کی پیروی کے لئے دوبارہ کلکتہ جانے کا انتظام کروں۔[2]

پانچ ہزار کا صلہ متوسطہ کھا گئے

اُردو کے ایک مکتوب سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قصیدہ پر پانچ ہزار روپے ملے تھے۔ لیکن تین ہزار روپے روشن الدولہ نے ہضم کر لئے جیسے غالبؔ نے ایثار و عطا میں حاتم سے بھی بلند تر قرار دیا تھا۔ اور جس کے جود و سخا کی داستان سنا کر برمکیوں کو زہر کھلایا تھا۔ دو ہزار منشی محمد حسن کو دیئے اور کہا کہ جو کچھ مناسب سمجھو غالبؔ کو بھیجدو لیکن اس مسکین کو ایک حبہ بھی نہ ملا۔ وہ لکھتے ہیں:

یہ قصیدہ منشی محمد حسن کی معرفت روشن الدولہ کے پاس اور روشن الدولہ کے توسط سے

---

[1] کلیات نثر فارسی صفحہ ۱۱۲۔ [2] کلیات نثر فارسی صفحہ ۱۷۶۔

نصیر الدین حیدر کے پاس گزرا۔ جس دن گزرا اسی دن پانچ ہزار روپے بھیجنے کا حکم ہوا۔ متوسط یعنی منشی محمد حسن نے مجھ کو اطلاع نہ دی۔ مظفر الدولہ[1] مرحوم لکھنؤ سے آئے۔ انہوں نے یہ راز مجھ پر ظاہر کیا۔ اور کہا خدا کے واسطے منشی محمد حسن کو میرا نام نہ لکھنا۔ ناچار میں نے امام بخش ناسخ کو لکھا کہ تم دریافت کر کے لکھو کہ میرے قصیدہ پر کیا گزری۔ انہوں نے جواب لکھا کہ پانچ ہزار روپے ملے، تین ہزار روپے روشن الدولہ نے کھائے دو ہزار منشی محمد حسن کو دیئے اور فرمایا کہ اس میں سے جو مناسب سمجھو غالب کو بھیج دو۔ کیا اس نے ہنوز تم کو کچھ نہ بھیجا؟ میں نے لکھ بھیجا۔ کہ مجھے پانچ روپے بھی نہیں ملے۔ اس کے جواب میں انہوں نے لکھا کہ اب تم مجھے خط لکھو۔ اس کا مضمون یہ ہو۔ کہ میں نے پادشاہ کی تعریف میں قصیدہ بھیجا ہے۔ اور یہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ وہ قصیدہ حضور میں گزرا مگر یہ نہیں جانا کہ اس کا صلہ کیا مرحمت ہوا۔ میں کہ ناسخ ہوں، اپنے نام کا خط پادشاہ کو پڑھوا کر ان کا (روشن الدولہ وغیرہ کا) کھایا ہوا روپیہ ان کے حلق سے نکال کر تم کو بھیج دوں گا۔ بھائی! یہ خط لکھ کر میں نے ڈاک میں روانہ کیا۔ آج خط روانہ ہوا۔ تیسرے دن شہر میں خبر اڑی کہ نصیر الدین مر گیا۔ اب کہو میں کیا کروں اور ناسخ کیا کرے۔

یہ اس نادر الوجود شخص، آخری دور کے سب سے بڑے شاعر، پرانی طرزوں کے خاتم اور نئی طرز کے موجد اول کی حالت تھی۔ کہ اس کا جو قصیدہ[2] فارسی زبان کے بہترین قصائد کے مقابلے میں بے تامل پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس پر شاہ اودھ پانچ ہزار انعام دیتا ہے۔ لیکن سارا روپیہ متوسط ہضم کر جاتے ہیں اور اس غریب کے ہاتھ پانچ پیسے بھی نہیں آتے بلکہ صلہ یابی کی اطلاع بھی دوسرے ذریعہ سے ملتی ہے۔

---

[1] ۔ مظفر الدولہ سیف الدین خاں خلف اکبر نواب حسام الدین حیدر خاں بہادر۔

[2] ۔ مولانا ابو الکلام فرماتے ہیں: یہ قصیدہ غالب کے بہترین قصائد میں سے ہے عرفی کے تتبع میں لکھا گیا ہے۔ لیکن اس کی تشبیب کسی طرح بھی عرفی کی تشبیب سے گری ہوئی نہیں ہے۔

امجد علی شاہ کا قصیدہ

نصیر الدین حیدر نے ۱۸۳۷ء میں وفات پائی۔ اور محمد علی شاہ بادشاہ ہوئے۔ لیکن غالب نے ان کے ساتھ کوئی رابطہ پیدا نہ کیا۔ امجد علی شاہ کا زمانہ آیا تو پھر ایک قصیدہ لکھا۔ جس کی بیت اسم یہ ہے:

امجد علی شہ آنکہ بہ ذوق دعائے او

صدرہ نماز صبح قضا کرد روزگار

اس قصیدہ کے سلسلے میں بھی عجیب واقعہ پیش آیا۔ غالب جب آگرہ میں تھے۔ تو ایک صاحب ان سے ملے تھے، بڑے زبان آور اور چالاک۔ کہیں تحصیلدار رہ چکے تھے۔ آگرہ میں ملازمت کی جستجو کی لیکن کوئی صورت نہ بنی اور وہاں سے چلے گئے۔ غالب دہلی میں آ رہے۔ کافی مدت کے بعد امجد علی شاہ کے زمانے میں لکھنؤ سے ان کا خط آیا۔ جس میں لکھا تھا کہ وزیر سے ملا ہوں بہت عنایت کرتے ہیں، بادشاہ کی ملازمت انہی کے ذریعہ سے حاصل ہوئی ہے "خان" اور "بہادر" کا خطاب ملا ہے۔ مصاحبوں میں نام درج ہوا ہے۔ وزیر آپ کا بہت مداح ہے۔ اگر آپ قصیدہ اور عرضداشت بھیجیں تو بادشاہ آپ کو بلائیں گے۔[1] غالب لکھتے ہیں کہ قصیدہ تیار تھا۔ لیکن:

> متردد تھا کس کی معرفت بھیجوں۔ توکلت علی اللہ اس شخص کے پاس بھیج دیا۔ رسید آ گئی۔ دو ہفتے کے بعد ایک خط آیا۔ کہ قصیدہ وزیر تک پہنچا۔ وزیر پڑھ کر بہت خوش ہوا بہ آئین شائستہ پیش کرنے کا وعدہ کیا۔ میں متوقع ہوں کہ میاں بدرالدین مہر کن سے میری مہر خطابی کھدوا کر بھیج دیجئے۔ چاندی کا نگینہ مربع اور قلم جلی فقیر نے سرانجام کر کے بھیج دیا۔ رسید آئی اور قصیدہ کے بادشاہ تک گذرنے کی نوید۔ بس پھر دو مہینے تک ادھر سے کوئی خط نہ آیا۔ میں نے جو

---

[1] اردوئے معلّٰی صفحہ ۲۴۵-۲۴۶-

خط بھیجا اُلٹا پھر آیا۔ ڈاک کا یہ توقیع کہ مکتوب الیہ یہاں نہیں۔ ایک مدت کے بعد حال معلوم ہوا کہ اس بزرگ کا وزیر تک پہنچنا اور حاضر رہنا سچ۔ پادشاہ کی ملازمت اور خطاب ملنا غلط۔ بہادروی کی مہر تم سے حاصل کر کے مرشد آباد کو چلا گیا۔ چلتے وقت وزیر نے دو سو روپے دیئے تھے۔

گویا یہ قصیدہ بھی بے صلہ رہا۔

واجد علی شاہ سے تعلق

واجد علی شاہ کے زمانے میں غالب نے پھر سلسلہ جنبانی کی۔ شاہ کے مصاحبوں میں اس وقت ڈوموں کا بڑا زور تھا اور انہیں بڑے بڑے خطاب ملے ہوئے تھے مثلاً رضی الدولہ، نجیب الدولہ، قطب الدولہ، وہاج الدولہ۔ غالب نے قطب الدولہ[1] کی وساطت سے قصیدہ واجد علی شاہ کی بارگاہ میں بھیجا۔ مولانا ضمیر نے اسے بارگاہ میں پڑھا۔ حکم ہوا کہ اس کے صلہ کا مسئلہ دوسرے وقت میں پیش کیا جائے۔ لیکن ابھی کچھ طے نہیں ہوا تھا۔ کہ قطب الدولہ اور دوسرے تمام ڈوم واجد علی شاہ کی مصاحبی سے نکالے گئے۔ ان کے اخراج کا واقعہ ۲ / جون ۱۸۵۰ء کو پیش آیا[2]۔ لیکن یہ امر قابلِ ذکر ہے۔ کہ قطب الدولہ نے اپنے اخراج پر قصیدہ مع عرضداشت بجنسہ غالب کے پاس بھیج دیا[3]۔ نواب محمد علی خاں عرف میرزا حیدر کے نام کے خط سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ قصیدہ مع عرضداشت دوبارہ ان کی وساطت سے بھیجا گیا تھا[4]۔

---

[1] مولانا ابو الکلام فرماتے ہیں: یہ قطب الدولہ دہلی کا گویا تھا۔ اس کا خاندان اب بھی دہلی میں موجود ہے اس خاندان کے ایک گویے عارف کو حکیم صاحب (مسیح الملک حکیم اجمل خاں مرحوم) نے مالیر کوٹلہ میں ملازم رکھوا دیا تھا۔ ادھر کچھ عرصے سے نظر نہیں آیا۔ پہلے جب کبھی دہلی جاتا تھا اور یہ دہلی میں موجود ہوتا تھا تو آتا تھا۔ اسے بہادر شاہ کی بہت سی غیر مطبوعہ ٹھمریاں یاد تھیں۔

[2] تاریخ اودھ حصہ پنجم صفحہ ۱۶۹

[3] کلیات نثر فارسی صفحہ ۲۲۰

[4] کلیات نثر فارسی صفحہ ۲۲۰

مجتہد العصر کی وساطت

یوسف میرزا کے نام کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب کو واجد علی شاہ کے دربار سے خلعت مجتہد العصر کی وساطت سے ملا تھا فرماتے ہیں،

یہ چودہ پارچے کا خلعت ایک بار اور ملبوس خاص در رومال و دوشالہ ایک بار پیش گاہ حضرت سلطان عالم سے پاچکا ہوں مگر یہ بھی جانتے ہو وہ خلعت مجھ کو دو بار کس کے ذریعہ سے ملا ہے! یعنی جناب قبلہ و کعبہ مجتہد العصر مدظلہ العالی۔ اب آدمیت اس کی مقتضی نہیں ہے کہ بے ان کے توسط کے مدح گستری کروں۔ چنانچہ قصیدہ لکھکر اور جیسا کہ میرا دستور ہے کاغذ کو ہنواکر حضرت پیر و مرشد کی خدمت میں بھیج دیا ہے یقین ہے کہ حضرت نے وہاں بھیج دیا ہوگا اور ہیں تم کو بھی لکھ چکا ہوں کہ میں نے قصیدہ لکھنؤ کو بھیج دیا ہے

یہ خط ۵ نومبر ۱۸۵۹ء کا ہے اور یوسف میرزا اس زمانے میں کلکتہ میں تھے۔ واجد علی شاہ ۱۸۵۶ء میں سلطنت سے علیحدہ کئے جاچکے تھے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سلطنت اودھ ختم ہوجانے کے بعد بھی شاہ کے ساتھ غالب کا تعلق قائم رہا۔ یوسف میرزا کے نام کے ایک اور خط سے بھی جو ۲۸ نومبر ۱۸۵۹ء کا مرقومہ ہے، اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ لکھتے ہیں،

بہ مرتضیٰ علی پہلے سے نیت میں ہے کہ جو شاہ اودھ سے ہاتھ آئے حصہ برادرانہ کردوں نصف حسین مرزا اور تم اور سجاد، نصف میں مفلسوں کا داہل و عیال غالب کا مدار سیانت

یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ کلکتہ سے واجد علی شاہ نے کوئی رقم کبھی بھیجی یا نہ بھیجی

حیدرآباد سے تعلق

صاحب عالم مارہروی نے غدر کے بعد حیدرآباد سے روابط پیدا کرنے کی تحریک کی تھی۔ لیکن غالب نے اپنے طالع کی ناسازی اور مسلسل ناکامیوں کی داستان بیان کرنیکے بعد لکھا کہ حیدرآباد میں کوشش کی جائے گی تو یا تو متوسط مرجائیگا یا معزول ہوجائیگا۔ یا مقصد میں ناکامی ہوگی۔ بالفرض اگر کچھ مقرر ہوجائیگا تو ریاست برباد ہوجائے گی۔

شمس الامرا کا قصیدہ

لیکن بعد میں غالب نے کوشش کی۔ اس کی تقریب یہ ہوئی کہ مدینہ منورہ کے ایک سید جن کا نام عبدالرزاق تھا حیدرآباد ہوتے ہوئے دہلی پہنچے۔ انہوں نے بیان

کیا کہ نواب شمس الامرا[1] بہادر والی پائیگاہ کی محفل میں غالب کا ذکر آیا تھا۔ بس یہی امر تعلقات پیدا کرنے کا محرک بن گیا چنانچہ انہوں نے ۷۰ شعر کا ایک قصیدہ شمس الامرا کی مدح میں لکھا اور ایک مکتوب کے ساتھ جس کی تاریخ معلوم نہیں ہو سکی حیدرآباد بھیج دیا۔ مکتوب میں لکھتے ہیں کہ ابتدا میں اردو شعر کہتا تھا اور ایک دیوان مرتب کر لیا تھا۔ اب تیس برس سے صرف فارسی شعر کہتا ہوں۔ قصیدہ کے متعلق فرماتے ہیں،

چہ قصیدہ از سینہ کہ تاب غم دراں آتش افروخت نیم سوختہ آبے واز خرمنے کہ برق آں را پاک سوخت دو دانہ دوہ گیا ہے۔ فرخابخت عریضہ نگار کہ دستمایہ چشمداشت قبول روزے چند دل بہ شادمانی نہد و دریں تنہائی داد ہمدمی خویش دہد ۔

به النفقات نیرزم در آرزو چہ نزاع | نشاط خاطر مفلس زکیمیا طلبی است

اس فارسی قصیدے کے صرف دو شعر مکتوب میں درج ہیں، لیکن پورا قصیدہ نہ غالب کے کلیات نظم فارسی میں موجود ہے "نہ سبد چیں" میں ہے، نہ کسی اور جگہ شائع ہوا ہے، نہ یہ بتایا جاسکتا ہے کہ یہ کہاں گیا اور اگر ضائع ہوا تو کیسے؟ دو شعر یہ ہیں،

اے مظہر کل در ازل آثار کرم را | منت بہ سر لوح ز اسم تو قلم را
شمس الامرا کز شرف نسبت نامش! | خور قبلہ بُد اورنگ نشینانِ عجم را

ممکن ہے خاندان شمس الامرا کے پرانے کاغذات میں غالب کا یہ قصیدہ مل جائے۔ اگر کوئی صاحب اسے تلاش کر سکیں تو یہ بہت بڑی ادبی خدمت ہو[2] گی۔ شمس الامرا کی طرف سے غالباً اس قصیدے کا کوئی صلہ نہیں ملا۔

سالار جنگ کا قصیدہ اس کے بعد غالب نے نواب مختار الملک سرسالار جنگ اول کی مدح میں قصیدہ لکھا فارسی مکاتیب میں ایک عرضداشت نواب صاحب مرحوم کے نام موجود ہے جسمیں لکھتے ہیں۔

---

[1] فخر الدین شمس الامرا امیر کبیر ثانی ولادت ۱۱۹۴ھ (۱۷۸۰ء) وفات ۱۲۷۹ھ (۱۸۶۲ء)

[2] "قلم را و علم را" کی زمین میں عرفی کی طرح غالب کے بھی دو قصیدے ہیں۔ ایک حضرت عباس علمدار کی منقبت میں دوسرا وزیر الدولہ بہادر والی ٹونک کی مدح میں۔ ممکن ہے شمس الامرا کی طرف سے مایوس ہو جانے کے بعد انہی کا قصیدہ معمولی ترمیم کیساتھ وزیر الدولہ کے پاس بھیج دیا گیا ہو۔

قصیدہ مدحیہ فرستادہ باشم و نہ دانستہ باشم کہ بہ نظر گاہ خدایگاں گزشت یا خود عریضہ در عرض راہ تلف گشت۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ غالب نے کب یہ قصیدہ نواب مختار الملک کی خدمت میں بھیجا؟ جس مکتوب یا عرضداشت کا حوالہ اوپر دیا چکا ہے۔ اس پر تاریخ ثبت نہیں لیکن اس کے آخر میں یہ شعر درج ہے۔

تا چرخ کشد محمل برجیس بقا باد
نواب فلک محمل برجیس شیم را

یہ نواب وزیر الدولہ والی ٹونک کے قصیدہ کا دعائیہ شعر ہے اور تاریخ ٹونک سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قصیدہ ۱۲۷۸ھ (مطابق ۱۸۶۱ء) میں ٹونک بھیجا گیا تھا۔ لہذا سمجھنا چاہیئے کہ مختار الملک کا قصیدہ ۱۸۶۱ء میں یا اس کے بعد لکھا گیا۔

اسی زمانے میں ایک مکتوب منشی حبیب اللہ خاں ذکا حیدرآبادی کو بھیجا گیا تھا جو مختار الملک کے میر منشی تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب نے اپنے اردو دیوان کا ایک نسخہ موم جامہ میں لپیٹ کر نواب موصوف کو بھیجا تھا[1]۔ ذکا نے اس کی رسید بھیجی

---

[1] اردو دیوان کے دو ایڈیشن غدر سے پہلے چھپ چکے تھے تیسرا ایڈیشن محرم ۱۲۷۸ھ (مطابق ۱۸۶۱ء) میں دہلی کے مطبع احمدی میں چھپا اس میں بہت سی غلطیاں رہ گئیں تھیں، اور غلط نامہ ساتھ شامل کرنا پڑا تھا۔ اسی ایڈیشن کی تصحیح کے بعد دیوان چوتھی بار مطبع نظامی کان پور میں چھپوایا گیا۔ اور ذی حجہ ۱۲۷۸ھ میں چھپکر شائع ہوا منشی حبیب اللہ خاں ذکا نے اردو دیوان کے پارسل کی رسید بھیجتے ہوئے فارسی کلام طلب کیا تھا جس کے جواب میں غالب نے ۱۸ ربیع الاول ۱۲۷۸ھ کو اطلاع دی کہ فارسی کلام چھپوانے کی فکر میں ہوں چھپ جائے گا۔ تو بھیج دوں گا۔ اس سے ظاہر ہے کہ نواب مختار الملک کو احمدی مطبع والا دیوان بھیجا گیا ہوگا۔

اور فارسی کلام طلب کیا۔ غالب کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ یہ طلب غالباً نواب کے ایما سے ہوتی ہے۔ فرماتے ہیں کہ میرا کلام غدر میں ضائع ہو گیا۔ میرے ایک عزیز نے بعد غدر پنجاہ جزو کے قریب جمع کیا۔ اب اسے چھپوانے کی فکر میں ہوں لیکن چھپائی کے مصارف ادا نہیں کر سکتا۔ آخر میں لکھتے ہیں :

آں خواہم کہ رسیدن و نارسیدن دیوان اُردو باز دانم و نیز بدانم کہ طلب کلیات فارسی چنانکہ گمان بردہ ام بہ فرمان حضرت نواب صاحب معلےٰ القاب است یا ہمیں از جانب جناب صحیفہ طراز۔ در ہر دو صورت فرمان پذیری آئین خواہد بود۔ والسلام بالوف الاحترام سہ شنبہ یازدہم ربیع الاول ۱۲۷۹ھ ؟

غالب کی اپنی داستان | نواب مختار الملک والے قصیدے میں غالب اپنے متعلق لکھتے ہیں :

روشن دلِ آتشیں زبانم — اندودہ و دود ماں نگویم
در نظمِ بلند پایہ رندم — والا ئی خانداں نگویم
عشق است ظہیر و انوری را — از سنجر و ارسلاں نگویم
والا گہرا! سپہر جاہا! — اینہا ز رہ گماں نگویم
تنگ است دل از ہجوم اندوہ — میرم اگر آنچناں نگویم
کس نیست متاع را خریدار — با آنکہ بہا گراں نگویم
زاں رو کہ سخنوران گیتی — رنجند چو قدرداں نگویم
ناچار متاع عرضہ دارم — بے رونقی دکاں نگویم
سرمایہ ز دست رفتہ وانگاہ — گاہے سخن از زیاں نگویم

حسن طلب ملاحظہ فرمایئے :

امید کہ جز سوال نبود — حرفے کہ دریں میاں نگویم

ننگم ز سوال نیست اما — با کلک سیہ زباں نگویم
گر وایہ رسد بہ من نسویت — با غالبؔ خستہ جاں نگویم
کاں خود ز من است ناتواں تر
با وے سخن از تواں نگویم

یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ مختار الملک نے غالبؔ کے ساتھ کچھ سلوک کیا یا نہیں[1]۔

وزیر الدولہ والی ٹونک کی مدح

نواب وزیر الدولہ بہادر والی ٹونک کی مدح میں دو قصیدے ہیں۔ پہلا قصیدہ ۱۲۷۸ھ (مطابق ۱۸۶۱ء) میں بھیجا گیا تھا۔ اس وقت غالبؔ کی عمر چونسٹھ پینسٹھ برس کی تھی۔ چنانچہ اس میں بڑھاپے کا ذکر بھی موجود ہے:

---

[1] مولانا ابوالکلام فرماتے ہیں۔ یہ قصیدہ نہیں غالبؔ کے بجھے ہوئے دل کا آخری دھواں ہے۔

زاں رو کہ خرد دراں گیتی — رنجند چو قدرداں نگویم
ناچار متاع عرضہ دارم — بے رونقی دکاں نگویم

جس دل سے یہ اشعار نکلے ہیں اس کی مایوسیوں اور تلخ کامیوں کا کیا حال ہوگا؟ اس کا اندازہ صرف وہی دل و دماغ کر سکتے ہیں۔ جنہوں نے زمانے کی قدر ناشناسیوں اور خیرہ امتیازیوں کے خود زخم کھائے

کس نیست متاع را خریدار — با آنکہ بہا گراں نگویم
صرف نمد و پلاس دارم — حرف خز و پرنیاں نگویم

ہر چند بہ پیری شدہ دل سرد ز ہستی / از سردی موسم چہ زیاں گرمی دم را

دارم نفس گرم در افسردہ دلی نیز / از بہمن و دے تپ نہ رود شیراجم را

برنائی اگر رفت نہ آنست کہ بر من / حقے نبود پرورش آموز ہرم را

فرخ دم پیری کہ کند در نظرم خوار / خوبان قمر طلعت و ناہید نغم را

پشتم بہ سوے سجدہ ز خم راہ نماید / باریست گراں منت غمخواری غم را

با پشت خم آسودہ تواں زیست بہ گیتی / اما چہ کنم کج روی بخت دژم را

چادر دو جہاں آنقدرم نیست کہ وقتے / بیروں نہم از دائرۂ پاس قدم را

اس میں ایک غزل بھی کہی ہے جس کے چند اشعار ملاحظہ فرمایئے۔

در ہند تنگ مایہ جو رند نکویاں / یارب بچہ اقلیم برم ذوق ستم را

شیرینیِ جاں بر لب من موج زد اما / ایں شہد نہ برد از دہنم تلخیِ سم را

آسودہ دلاں چوں شنوند آہ و فغانم / دانند کہ من مردنیم رنج و الم را

غافل کہ ہم از ہول نگونساری بخت است / فریاد گر از لب جہد ار باب ہمم را

غم جست درون من و خونتابہ آں زخم / بر چشم روا داشت بروں دادن نم را

در سرمہ فرو خفتنہ گدایانہ خروشیست / پیش آمدہ روز سیہ حرف و رقم را

آخر میں فرماتے ہیں:

گفتم کہ گدائیم ز گدایاں نہ شماری! / در ہم نفساں نیز، بود تفرقہ ہم را

ہر چند بہ دریوزۂ عزت ز عزیزاں / با خود بہ شفاعت نتواں برد قسم را

سوگند خورم گر بہ فروغ گہر خویش / فیض از دم سوگند رسد صبح دوم را

من وا بہ ز شہ جویم و شہ معرفت از من / رخ جانب کشکول من است افسر جم را

ہنگام گدائی فتد از شرم سوالم / لعل و گہر از لرزہ ز دست اہل کرم را

تاریخ ٹونک سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس قصیدے کے صلہ میں تاخیر ہوگئی تو غالب

نے ایک قطعہ بھیجا جسے خواجہ حالی مرحوم نے "یادگار" میں ہجو ملیح کی مثال کے طور پر نقل فرمایا ہے[1]۔ اور جو غالب کے کلیات میں شامل نہ ہو سکا لیکن "سبد چیں" میں چھپ گیا تھا میری رائے میں یہ قطعہ محض حسن طلب کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے بعد غالب کو صلہ بھیجا گیا تھا[2]۔ لیکن اس کی مقدار و نوعیت معلوم نہیں ہو سکی۔

دوسرا قصیدہ عیدالاضحےٰ کے موقع پر بھیجا گیا تھا۔ اس کے دعائیہ اشعار کا انداز بہت اچھوتا اور دلکش ہے۔ فرماتے ہیں:

چند چیز است کہ در پیشگہ اہل تمیز ۔۔۔ بہ گرانمایگی آرایش گیہاں آمد
آں درخشندہ درفشے کہ بہ یغمائے عرب[3] ۔۔۔ در زمان عمرؓ از لشکر ایران آمد
آں فروزندہ و فیروزہ و دل افروز نگیں[4] ۔۔۔ کہ روائی وہ فرمان سلیماں آمد
دیگر آں جام جہاں بیں[5] کہ بہ روشن روشی ۔۔۔ عالم افروز تر از مہر درخشاں آمد
دیگر آں تخت[6] سبک سیر کہ از تیز روی ۔۔۔ ہمدم باد چو بوئے گل و ریحاں آمد
ہفت گنجینۂ پرویز کہ در ہفت اقلیم ۔۔۔ بہ نموداری ہفت اختر تاباں آمد
فہم ہر نکتۂ غامض کہ پیمبر فرمود ۔۔۔ فیض ہر آیت رحمت کہ بہ قرآں آمد
یارب ایں ہا بہ تو بخشند و بر آں افزایند ۔۔۔ دم آبے کہ ز سرچشمۂ حیواں آمد[7]

تجمل حسین خاں والی فرخ آباد

مسلمان ریاستوں میں اس زمانے میں فرخ آباد بھی خاص اہمیت رکھتی تھی۔ یہ بنگش خاندان نے فرخ سیر کے عہد میں قائم تھی اور غدر کے بعد

---

[1] یادگار غالب صفحہ ۸۵
[2] بہ حوالہ رسالہ "رومان" بابت جون ۱۹۳۵ء
[3] درفش کاویانی
[4] خاتم سلیمانی
[5] جام جم
[6] تخت سلیمانی

[7] دوسرا قصیدہ بھیجنا بجائے خود اس امر کی دلیل ہے کہ پہلے کا صلہ اچھا مل گیا ہوگا۔

ہوئی۔ اس کے والی نواب تجمل حسین خاں کے ساتھ غالب کے تعلقات بہت اچھے تھے۔ اردو کی ایک غزل میں نواب ممدوح کی مدح میں ایک قطعہ موجود ہے جس کا پہلا شعر یہ ہے۔

دیا ہے خلق کو بھی تا اسے نظر نہ لگے
بنا ہے عیش تجمل حسین کے لئے

تجمل حسین خاں نے ایک مرتبہ غالب کو فرخ آباد بلایا تھا ایک فارسی مکتوب میں میکش کو لکھتے ہیں کہ "امیر سلطان شکوہ نصیر الدولہ معین الملک تجمل حسین خاں بہادر حشمت جنگ" فرخ آباد بلا رہے ہیں۔ میں نے ان کی محبت کے تقاضے سے جانا منظور کر لیا ہے۔ اور تمہیں بھی (میکش) کو ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔ لہٰذا پاٹودی سے اسی ہفتے دہلی پہنچ جاؤ۔ غالباً وہ فرخ آباد نہ جا سکے لیکن میرا خیال ہے کہ انہیں رئیس فرخ آباد سے ضرور کچھ ملا ہوگا۔

الور کے ساتھ روابط ریاست الور کے ساتھ غالب کے روابط بہت دیرینہ تھے خواجہ حالی نے لکھا ہے کہ ان کے والد کی وفات پر راجہ بختاور سنگھ نے دو گاؤں میرحاصل اور کسی قدر روزینہ مرحوم کے دونوں بچوں (غالب اور یوسف خاں) کیلئے مقرر کر دیا تھا جو مدت دراز تک جاری رہا لیکن اس معاش کی بندش کا سبب نہیں کھلا۔ اس میں شبہ نہیں کہ ورود دہلی کے بعد بھی غالب کو الور سے کچھ نہ کچھ ملتا رہا۔ وہ خود فرماتے ہیں:

صاحب وہ زمانہ نہیں کہ ادھر متھرا داس سے قرض لیا۔ ۔ ۔ ۔ اس سے بڑھ کر یہ روٹی کا خرچ پھوپھی کے سر بایں ہمہ کبھی خان نے کچھ دے دیا، کبھی الور سے کچھ دلوا دیا۔

گل کیوڑہ کا عطیہ مہاراجہ راؤ بینی سنگھ نے ایک مرتبہ کیوڑہ کے پھول تحفۃً

۱؎ کلیات نثر فارسی صفحہ ۲۱۸ ۲؎ یادگار غالب صفحہ ۱۱ ۳؎ اردوئے معلےٰ صفحہ ۳۴۹

۴؎ مہاراجہ راؤ بینی سنگھ ۱۸۱۵ء سے لیکر ۱۸۵۷ء تک الور کے رئیس رہے ۱۲

بھیجے تھے۔ غالب نے ان کی تعریف میں ایک مثنوی لکھی جو ایک خط کے ساتھ مہاراجہ کو بھیجی گئی۔ یہ کلیاتِ نظم میں شامل نہیں ہوئی۔ فرماتے ہیں:

خوشا کاوی و بوے جاں پرورش
زخود بہ بہ پرواز بو شہپرش

شمیم روان پرورش دادہ اند
وگر صورت شہپرش دادہ اند

ازاں روست کایں گل بہ نشر شمیم
نہ زیباست منت پرست نسیم

تو گوئی بہاراں فرخندہ خوے
کہ رسام رنگ است و قسام بوے

پے تازہ گلہاے اُردی بہشت
براتِ روان بخشی بو نوشت

شمیمے کزاں تازہ گردد دماغ
فزوں آمد از ظرف گلہاے باغ

نگہداشت آں مایہ دلفروز
بہ کاوی بہ بخشید اندر تموز

تموز از دمش نو بہاراں شدہ
شرفنامۂ روزگاراں شدہ

اگر حور را رخت شادی بود
زا کسون گلہاے کاوی شدہ

شمال و صبا بینکارش بہ باغ
گل از شبنم آئینہ وارش بہ باغ

بدیں ارمغانے کہ فرخ دم است
چنیں تازہ برگے دریں جا کم است

بد انساں کہ جاں است از تن سپاس
فرستندہ را باد از من سپاس

بود تا کہ زیب بساط سپہر
ز نسرین ماہ و گل سرخ مہر

ہر آں گل کہ آرد بہ گلزار یاد
مہاراجہ را دفف دستار باد

"گل کیوڑہ" کا تحفہ بھیجنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ مہاراجہ کے ساتھ روابط محض رسمی نہ تھے۔ بلکہ ان میں دوستی کا رنگ نمایاں تھا۔

الور کے سلیمان دیوان

منشی امین اللہ خاں دیوان الور کے بھائی منشی فضل اللہ خاں کے نام ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ کہیں سے سُنا تھا کہ مہاراجہ کی خدمت میں ایک عرضداشت خود غالب کی طرف سے پیش ہوئی۔ حالانکہ ایسی کوئی چیز نہیں

بھیجی گئی تھی۔ منشی فضل اللہ خاں کو لکھتے ہیں کہ بھائی (امین اللہ خاں) سے پوچھ کر لکھو یہ عرضداشت کون لایا تھا۔

تیسرا خط میرزا اسفندیار بیگ دیوان الور کے نام ہے جس میں میرزا صاحب کے دیوان بننے پر مبارکبادی دی گئی ہے۔ نیز ان کے حسن انتظام کی داد دیتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

توانگراں را بایمنی بشارت و تہیدستاں را بہ بخشش صلا۔ دادگری را روز بازار خواہد بود و خردوری را گرمی ہنگامہ بیابان ہا گلستان ہا خواہد شد و دمن ہا چمن ہا۔ ہر اگہ گوشہ نشینم و چوں چشم بدازاں فرخ انجمن دور یا کشور و اہل کشور چہ کار و از آبادی ملک و آزادگی خلق چہ سخن ۔ ۔ ۔ ۔ آخر از دیریں بندگان آں دولتم و از کہن خاک نشیناں آں درگاہ شگفت کہ چوں اساس کار بہ آئین دانش و داد نہند گوشہ و توشہ دیرینہ من بہ من باز دہند[1]

مہاراجہ شیو دھیان سنگھ

مہاراجہ راؤ بنی سنگھ نے پانچ برس فالج میں مبتلا رہ کر ۱۸۵۷ء میں وفات پائی۔ اور ان کا کم سن بیٹا شیو دھیان سنگھ مسند نشین ہوا۔ اس کے ابتدائی عہد میں امین اللہ خاں دیوان تھے۔ اور اسفندیار بیگ نائب لیکن بعد میں کشمکش شروع ہو گئی۔

امین اللہ خاں عرف اموخاں ایک معمولی آدمی تھے۔ ترقی کرتے کرتے وہ الور میں مختاری کے عہدے پر پہنچ گئے۔ انہوں نے اپنے منجھلے بھائی فضل اللہ خاں کو نائب دیوان اور چھوٹے بھائی انعام اللہ خاں کو فوج کا بخشی مقرر کر دیا۔ یعنی ریاست کے تمام امور پر حاوی ہو گئے۔ تینوں بھائی بڑے ذکی۔ زیرک اور ہوشیار تھے۔

اسفندیار بیگ پہلے فیروز پور جھرکہ میں ملازم تھا۔ پھر الور پہنچ گیا۔ شروع میں وہ اور امین اللہ خاں ایک دوسرے کے بہی خواہ تھے۔ پھر کسی بات پر ناچاقی ہو گئی اور اسفندیار بیگ نے بھائیوں کے خلاف سازشیں شروع کر دیں۔

---

[1] ۔ ممکن ہے یہ اسی "توشہ" کی طرف اشارہ ہو جسکا ذکر خواجہ حالی نے دو گاؤں بسیر حاصل اور کسی قدر روزینہ کی شکل میں یادگار میں کیا ہے ۔

امین اللہ خاں نے شیودھیان سنگھ کی والدہ کو بہن بنا لیا تھا۔ اسی وجہ سے راجہ اسے ماموں کہہ کر پکارتا تھا۔ بلکہ کہا جاتا ہے کہ ایک وقت میں وہ تینوں بھائیوں میں سے کسی ایک کی بیٹی سے شادی کے لئے تیار ہو گیا تھا۔ اس کا میلان مسلمانوں کی طرف بہت زیادہ تھا۔ اسفندیار بیگ نے اسی بات کو مخالفانہ سازش کی بنا بنا لیا۔ اور راجپوت ٹھاکروں سے کہنا شروع کیا کہ مسلمان سارے کاروبار پر حاوی ہو گئے ہیں۔ اگر یہی صورت کچھ دیر اور قائم رہی تو راجہ مسلمان ہو جائے گا۔

ایک ٹھاکر نے جوش میں آکر رات کے وقت امین اللہ خاں کے مکان پر حملہ کر دیا۔ جس میں دیوان کا ایک بیٹا اور ایک خدمتگار مارے گئے۔ اور تینوں بھائیوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ راجہ نے انہیں رہا کر کے دہلی بھجوایا۔ پھر ایک ریجنسی کونسل بنی۔ جس کے صدر کپتان امپے تھے۔ انہوں نے اصلاح کی ہر چند کوشش کی لیکن راجہ کے صرف تین مطالبے تھے۔ جو آخری وقت تک قائم رہے (۱) مجھے اختیارات دیئے جائیں (۲) دیوان بھائیوں کو واپس بلایا جائے۔ (۳) ٹھاکروں کو سزا دی جائے۔

۱۸۶۳ء میں راجہ کو اختیارات ملے۔ کچھ مدت تک کام بڑی اچھی طرح جاری رہا۔ لیکن پھر بدنظمیاں پیدا ہو گئیں اور راجپوت موقوف ہونے لگے، جن سے راجہ کو سخت نفرت تھی۔ اس کے برعکس مسلمانوں کے ساتھ گہرا میل جول تھا۔ ۱۸۷۰ء میں پھر راجہ صاحب بے اختیار کر دیئے گئے۔ ۱۱ اکتوبر ۱۸۷۴ء کو وفات پائی۔

قصیدہ غالب نے شیودھیان سنگھ کی مدح میں ایک قصیدہ غالباً ۱۸۶۸ء میں لکھا تھا اس میں اپنے والد کی شہادت کا ذکر بھی کرتے ہیں:

در پنج سالگی شدہ ام چاکر حضور	رنگیں سخن طرازم و دیرینہ وظیفہ خوار
باید شنود راز زاعیان بارگاہ	باید شنفت قصہ ز پیران آں دیار
کافی بود مشاہدہ شاہد ضرور نیست	در خاک راج گڑھ پدرم را بود مزار

توقعات پوری نہ ہوئیں راجہ سے غالب کو بڑی توقعات تھیں میر مہدی مجروحؔ کو ایک خط میں لکھتے ہیں :

راجہ صاحب کے سلوک کا حال ہم پہلے ہی سُن چکے تھے۔ الحمد للہ علیٰ کل حال۔ دیکھئے اب معاودت کب کرتے ہیں۔ موافق اپنے دعدے کے ہم کو کب طلب کرتے ہیں۔ کلکتہ جاتے وقت فرما گئے ہیں کہ میں آکر اسد کو بلاؤں گا۔ البتہ وہ بلائیں گے تو میں کیوں کر نہ جاؤں گا۔

ایک مکتوب سے جو رام پور سے لکھا گیا ظاہر ہوتا ہے کہ الور سے غالب کی توقعات پوری نہ ہوئیں کم از کم ۱۸۶۵ء تک وہ مایوس تھے۔ حکیم غلام نجف خاں کو لکھتے ہیں :

بھائی فضل اللہ خاں کی غمخواری و مددگاری کا کیا کہنا ہے مگر الور سے مجھ کو کہنا نہیں یاد رکھنا وہاں سے مجھے کچھ نہ آئے گا۔ بہ فرض محال اگر ملا تو ڈھائی سو روپیہ اسو وہ بھی مجھے بھائی فضل اللہ خاں برادر ابن اللہ خاں سابق دیوان الور کا دینا ہے ان کا قرض ادا ہو جائے گا۔ احیاناً اگر خلاف میرے عقیدے کے پانسو روپے کا حکم ہوا اور وہ آجائیں تو تم بعد اطلاع ڈھائی سو میاں فضل کو دیکر مجھ کو کہ باقی کے واسطے میں جس طرح لکھونگا اس طرح کرنا

"سبد چین" میرزا باقر علی خاں کو ۷؍ دسمبر ۱۸۶۷ء کے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں :-

میں نے اگلے مہینے میں (یعنی نومبر میں) "سبد چین" کی ایک جلد مع عرضی اقبال نشان میرزا افضل حسین خاں کی معرفت اور کو بھجوائی تھی اسا بکے ہفتے میں حضور پر نور مہاراو راجہ بہادر کا خط انہی کی معرفت مجھ کو آیا حضور نے ازراہ بندہ پروری وذرہ افزائی القاب بہت بڑا مجھے لکھا خط میں فقرے بہت عنایت اور التفات کے بھرے ہوئے درج کئے

میرزا باقر علی خاں اس زمانے میں الور میں تھے اوپر کے حالات کا ذکر کرنیکے بعد انہیں لکھتے ہیں :-

تم تو وہیں تھے تم کو اس کی اطلاع ہوگئی تھی یا نہیں ؛ اور اگر ہوگئی تھی تو تم نے مجھ کو کیوں نہیں لکھا ؟

اب میں تم سے یہ پوچھتا ہوں کہ کبھی دربار میں میرا بھی ذکر آتا ہے یا نہیں ؛ اور اگر آتا ہے تو کس طرح آتا ہے ؛ حضور سُن کر کیا فرماتے ہیں ؛

جے پور سے امداد ہر گوپال تفتہ کے نام کے خطوں سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب کو جے پور سے

سلہ شیو دھیان سنگھ ۱۸۶۷ء میں کلکتہ گئے تھے۔

بھی کافی روپیہ ملنے کی اُمید دلائی گئی تھی، لیکن صرف پانسو ملے۔ فرماتے ہیں:۔

تمہارا دعا گو اور امور میں عالی پایہ نہیں رکھتا۔ مگر احتیاج میں اس کا پایہ بہت عالی ہے۔ یعنی محتاج ہوں سو دو سو میں میری پیاس نہیں بجھتی۔ تمہاری ہمت پر سو ہزار آفرین۔ چھ پورے اگر دو ہزار ہاتھ آجاتے، تو میرا قرض رفع ہو جاتا۔ اور پھر اگر دو چار برس کی زندگی ہوتی تو اتنا ہی قرض اور ہل جاتا۔ یہ پانسو تو بھائی تمہاری جان کی قسم متفرقات میں جاکر سو ڈیڑھ سو بچ رہیں گے، اس کے میرے صرف میں آئیں گے۔ مہاجنوں کا سودی قرض ہے۔ وہ بقدر پندرہ سولہ سے کچھ باقی رہے گا۔

پانسو روپے | یہ پانسو روپے ہنڈی کے ذریعہ سے بھیجے گئے تھے۔ جس کے جلد نہ پہنچنے کی وجہ سے بڑا اضطراب تھا۔ اس کے ساتھ دریا دلی کا یہ عالم تھا۔ کہ ہنڈی لانے والے کو پچیس روپے انعام دینے اور اس کے آنے جانے کے مصارف ادا کرنے پر آمادہ تھے۔ خود فرماتے ہیں:۔

بھائی آج تک ہنڈی نہیں آئی۔ میں حیران ہوں۔ یہ حیرانی کی یہ ہے۔ کہ اس ہنڈوی کے بھروسے پر قرضداروں سے وعدہ جون کے اوائل کا تھا۔ آج جون کی پانچویں ہے۔ (۱۸۵۳ء) وہ تقاضا کرتے ہیں اور میں آج کل کر رہا ہوں۔ شرم کے مارے بابو صاحب کو کچھ لکھ نہیں سکتا۔ جانتا ہوں کہ وہ بینکڑہ پورا کرنے کی فکر میں ہوں گے۔ پھر وہ کیوں اتنا تکلف کریں؟ اُنیس روپے کی کون سی بات ہے؟ اگر مصارف ہردیو سنگھ (ہنڈی لانے والے کا نام) میرے ہاں سے مجرا ہوئے تو کیا غضب ہوا؟ اُنیس اور پچیس (انعام کے) پچون نکال ڈالیں، باقی ارسال کریں۔

۲۴ر جون ۱۸۵۳ء کے ایک خط میں فرماتے ہیں:۔

تیسرے دن ہردیو سنگھ کی عرضی اور پچیس روپے کی رسید اور پانسو کی ہنڈی پہنچی۔ تم سمجھے؟ بابو صاحب نے پچیس روپے ہردیو سنگھ کو دیئے اور مجھ سے مجرا نہ لئے۔ بہرحال ہنڈوی

بارہ دن کی میعادی تھی چھ دن گزر گئے تھے۔ چھ دن باقی تھے۔ مجھ کو صبر کہاں۔ منتی کاٹ کر روپے لے لئے، قرض متفرق سب ادا ہو گیا۔ سینتالیس روپے نقد بکس میں اور چار بوتل شراب اور تین شیشے گلاب کے توشہ خانہ میں موجود ہیں۔ الحمد للہ علےٰ احسانہ۔

مزید عطایا

مزید عطایا کے باب میں فرماتے ہیں :۔

بندہ پرور بابو صاحب نے پہلی بار تو مجھ کو دو ہنڈویاں بھیجی ہیں سو سو روپے کی۔ ایک میر احمد حسین میکش کے واسطے راجہ صاحب کی طرف سے تاریخ تولد کنور صاحب کے انعام میں اور ایک اپنی طرف سے مجھ کو بہ طریق نذر شاگردی بعد اس کے دو ہنڈویاں سو سو روپے کی بعد چار چار پانچ پانچ مہینے کے آئیں۔ مع میر احمد حسین کے صلہ روپوں کے چار سو اور اس سے علاوہ تین سو اور یہ کہ چار سو یا تین سو کتنے دن میں آئے۔ اس کا حساب کنور صاحب کی عمر پر حوالے ہے اگر وہ دو برس کے ہیں تو دو برس میں اگر وہ تین برس کے ہیں تو تین برس میں۔

گوالیار کے ساتھ تعلق

معلوم ہوتا ہے کہ گوالیار سے بھی غالبؔ کو عطیہ کی توقعات تھیں میر سید علی خاں بہادر عرف حضرت جی کے نام فارسی کے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں کہ میں اپنے مقدمہ پنشن کے متعلق آخری فیصلے کا منتظر ہوں۔ فیصلے کی اطلاع ملتے ہی گوالیار کی طرف چل دوں گا۔

پٹیالہ

ایک فارسی قصیدہ نرندر سنگھ والی پٹیالہ کی مدح میں بھی ہے۔ جو غالبؔ حکیم محمود خاں مرحوم کے بھائیوں کی وساطت سے پیش ہوا ہوگا۔ اس میں اپنے متعلق لکھتے ہیں :۔

لبے ز درد دل آمادہ فغاں دارم ــــ فغاں اگر دلت از تنگی ؛ان گیرد
نہ دیدہ ونہ بینی مرا بہ بیں کہ منم ــــ کسیکہ از غمش آور بہ استخواں گیرد
بجوئی حال من از قال من کہ کار شناس ــــ سراغ آتش سوزندہ از دخاں گیرد
مرا کہ نام مرا بے ادب نہ گیرد کس ــــ فلک نگر کہ بہ بازیچہ ناگہاں گیرد

پیہر اعمی و من گوشہ گیر درہ بہ نشیب | فغاں ز نطق کہ خصمم بدیں نشاں گیرد
حریر فکر مرا ہر نور دصد رنگ است | خوشم کہ دیدہ وراز من بہ امتحاں گیرد
بہ مشتری چہ رسیم اُترکِ چرخ در راہ است | کہ جان و جامہ و جاہر سہ رایگاں گیرد
من آں متاعِ گرانمایہ بہ سبک قدرم | کہ گر بہ ہیچ خرد کس ہماں گراں گیرد
دلم کہ چارہ نہ دارد ہمے جز ایں کہ ترا | بحالِ خویش در اندیشہ مہرباں گیرد

والیانِ ممالک اور امراء کے مشاہروں یا عطیوں کے تذکرے کے بعد غالبؔ کے شاگردوں اور نیاز مندوں کے ہدایا کا ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔

تفتہ کا ہدیہ

تفتہ کے نام ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ ۲۳ فروری ۱۸۵۸ء کو ان کی طرف سے سو روپے کی ہنڈوی آئی تھی اس کا ذکر فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:-

ایک آدمی رسید لیکر نیل کے کٹڑے چلا گیا اور سو روپیہ چہرہ شاہی لے آیا۔ آنے جانے کی دیر ہوئی اور بس۔ چوبیس روپے داروغہ کی معرفت اٹھے تھے وہ دیئے گئے پچاس روپے محل میں بھیج دیئے چوبیس روپے باقی رہے۔ وہ بکس میں رکھ لئے (حساب کے مطابق چھبیس باقی رہنے چاہئیں ممکن ہے دو روپے کسی کو انعام میں دیئے ہوں)

غالباً اسی ہدیہ کے متعلق "دستنبو" میں فرماتے ہیں:

میرزا تفتہ ..... از میرٹھ سفتہ زر بہ من فرستاد و جامہ و نامہ پیوستہ مے فرستد۔

انور الدولہ کے ہدایا

انور الدولہ نواب سعد الدین خاں بہادر شفیق رئیس کدورا کالپی بھی وقتاً فوقتاً روپیہ بھیجتے رہتے تھے۔ ایک خط میں انہیں لکھتے ہیں:

ستتیس ۳۷ روپے کی ہنڈوی پہنچی اس کا بھی حال سابق کی سی ہنڈوی کا سا ہے یعنی ساہوکار کہتا ہے کہ ابھی ہم کو کالپی کے ساہوکار کی اجازت نہیں آئی۔ جو روپیہ دیں۔ اگر سرکار کے کارپرداز وہاں سے ساہوکار کو کہہ کر اجازت لکھوا بھیجیں تو مناسب ہے۔

میر ابراہیم علی خاں کا ہدیہ

میر احمد حسین مودودی نے غالباً نواب میر ابراہیم علی خاں کی طرف سے

پوچھا تھا۔ کہ آیا کچھ روپیہ بھیجا جائے؟ جواب میں لکھتے ہیں:

سیّد صاحب قبلہ کیوں تکلیف کرتے ہیں اگر یہی مرضی ہے تو اتحاف واہدائے تکلف محض ہے۔ فقیر بے سوال ہوں۔ اگر کچھ بھیج دیں گے تو رد نہ کروں گا۔ کم و بیش پر نظر نہ کریں۔ جتنے کا چاہیں نوٹ خط میں لپیٹ کر بھیج دیں۔

پھر ۲۵ ستمبر ۱۸۶۶ء کے خط میں فرماتے ہیں:۔

جب نوٹ بھیجئے تو اہل کلکتہ کی طرح آدھا آدھا دو بار کر کے نہ بھیجئے گا۔ میرے نام کا لفافہ جس شہر سے چلے اُسی شہر کے ڈاک گھر میں رہ جائے تو رہ جائے۔ ورنہ دلی کے ڈاک خانہ میں پہنچ کر کیا امکان ہے کہ تلف ہو۔

انھوں نے غالباً سو روپے کا نوٹ بھیجا تھا۔ اس لئے کہ ۸ اکتوبر ۱۸۶۶ء کے ایک خط میں فرماتے ہیں:

حضرت یہ آپ کے جد امجد کا غلام تو مر لیا۔ کثرت احکام و تواتر ورود اشعار پھر یہ ہنجار کہ سو روپے کے نوٹ کی رسید سو بار مانگتے ہو۔

میر غلام باباخاں کا ہدیہ نواب میر غلام باباخاں سورتی نے بھی مالی امداد فرمائی۔ مثلاً اُردوئے معلّٰی سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ "قاطع برہان" دوبارہ چھپوانے کی غرض سے غالبؔ نے روپیہ مانگا۔ میر غلام باباخاں نے گھڑی بھیج دی۔ غالبؔ نے اس کے متعلق شکایتی خط سیاح کو لکھا جو میر غلام باباخاں کے مصاحب بن گئے تھے[1]۔ اس کے بعد میر صاحب نے سو روپیہ بھیج دیا۔ جس کی رسید ستمبر ۱۸۶۵ء کے ایک مکتوب میں ان لفظوں میں بھیجتے ہیں:

سو روپے ...... صراف سے وصول ہو گئے چھوٹے صاحب (نواب میر غلام باباخاں)

---

[1] اردوئے معلّٰی صفحہ ۱۷۱۔

نے بڑی جوانمردی اور بڑی ہمت کی۔ اس صرف میں میرا کام اور ان کا نام ہوا۔ اللہ اللہ
اب بھی ہندوستان میں ایسے لوگ ہیں کہ نہ میں نے ان کو دیکھا، نہ انہوں نے مجھے دیکھا
نہ میرا کوئی حق ان پر، نہ ان کو کوئی خدمت مجھ سے لینی منظور۔ خیر فقیر ہوں جب
تک جیوں گا دعا کروں گا۔

محمد علی خاں کا ہدیہ
مولوی ولایت حسین کے نام کے ایک فارسی خط سے معلوم ہوتا ہے کہ محمد علی خاں کی طرف سے ایک موقع پر دو سو روپے وصول ہوئے تھے[1]۔

فتوحات وعطایا کے اس تفصیلی ذکر کے بعد غالب کی مالی حالت کے متعلق مزید تفصیل کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ یہ ظاہر ہے کہ زندگی کے ابتدائی دور کو چھوڑ کر وہ عمر بھر انبوہ مشکلات میں گھرے رہے۔ قرض غالباً کسی زمانے میں بھی ختم نہ ہوا۔ کسی جگہ سے روپیہ آتا تو پہلا قرض اتار دیتے، لیکن پھر اس بھروسے پر ادھار لینا شروع کر دیتے کہ اور روپیہ آجائیگا۔ بڑی مدت تک یہ امید لگی رہی کہ ان کی خاندانی پنشن کا سارا بقایا یکمشت مل جائے گا، جو مئی ۱۸۳۵ء میں ان کے حساب کے مطابق دو لاکھ تین ہزار تھا۔ اس کے بعد سات ہزار روپے سالانہ کے حساب سے اس میں اضافہ ہوتا گیا۔ اس روپے کا داغ عمر بھر ان کے دل سے نہ مٹا۔ اسی کے لئے مقدمے اور اپیلیں کرتے کرتے وہ ملکہ وکٹوریہ کی مدح گوئی پر متوجہ ہوئے۔ وہاں سے جب پوچھا گیا کہ جو کچھ چاہتے ہو گورنر جنرل کی وساطت سے لکھ بھیجو تو غالب کی امیدوں کے خزاں زدہ باغ میں پھر بہار آگئی۔ غرض وہ ۱۸۵۷ء تک مسرت افزا توقعات کے چکر میں الجھے رہے۔ نیز میرا خیال ہے کہ فتوحات وعطایا کے سلسلے میں ان کے سامنے صرف دو حقیقتیں تھیں۔ اول بڑے بڑے شعرائے ماضی کے ساتھ وقت کے سلاطین

---

[1] کلیات نثر فارسی صفحہ ۱۲۹

دامرا کا شاندار سلوک۔ دوم اپنی شاعری کا کمال۔ وہ اسی توقع پر قصائد ممدوحین کی خدمت میں بھیجتے تھے کہ ان کے کمال شاعری کی قدر شناسی میں کوتاہی نہ ہوگی۔ لیکن یہ توقع کبھی پوری نہ ہوئی۔ صرف ایک قصیدہ ہے۔ جس پر پادشاہ اودھ نے پانچ ہزار روپے دیئے۔ لیکن اس رقم میں سے غالب کو ایک حبہ بھی نہ ملا۔

خرچ مسلسل بڑھتا رہا اور آمدنی کسی وقت بھی مصارف کا ساتھ نہ دے سکی۔

مالی مشکلات میں افزایش

سفر کلکتہ کے گرانبہا مصارف کے بعد ان کی مالی مشکلات خاص طور پر بڑھ گئی تھیں۔ وہ اس خیال میں تھے کہ پنشن کا بقایا یک مشت مل جائیگا اور سارے قرض بے باق ہو جائیں گے۔ لیکن مقدمہ نے طول کھینچا جب فیصلہ خلاف ہوا اور روپیہ ملنے کی کوئی امید نہ رہی تو دو ساہوکاروں نے دعوے دائر کرکے ڈگریاں لے لیں۔ یہ ۱۸۳۵ء کی بات ہے۔ غالب نے گرفتاری کے خوف سے دن کے وقت گھر سے باہر نکلنا چھوڑ دیا تھا اور صرف رات کی تاریکی میں سیر کے لئے جاتے تھے۔ چنانچہ خود فرماتے ہیں:

نخستین شرارہ کہ در خرمن صبر و ثبات زدند آں بود کہ دو تن از گروہ وام طلباں چنانچہ قاعدہ عدالت انگریزی است، ڈگری بحق من از عدالت حاصل کردند۔ چوں فرجام آں است کہ یا زر مندرجہ ڈگری گزاردہ شود یا تن بہ بند و زنداں دادہ آید و دریں بارہ شاہ و گدا برابر است۔ آرے از بہر نام اوران ایں قدر ہست کہ سرہنگ عدالت بہ کاشانہ شاں نتواند انداخت، تا خود بہ رہ گذر یافتہ نشوند، بہ اسیری نہ روند۔ چوں گنجایش ادائے زر نبود لاجرم بہ پاس آبرو خود را گرد آوردم و ترک نشاط سواری کردم۔

قرض کی کوشش

نواب حسام الدین حیدر خاں بہادر کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

کس فرستادہ اندر حیثیت دہیر الال را بہ حضور بخوانند و در انجمن بنشانند۔ وانگاہ مرا یاد فرمائید تا بیایم و سر قلادۂ گفتگو بکشایم۔ آنچہ گفتہ آید ما حصل آنہمہ حرف و سخن ایں باشد کہ اسداللہ دام پرست شماست و سر رشتہ توانائیش بہ دست شماست۔ حالیا از اندوہ تنگ دستی دلریش و درماندہ بہ کار خویش است و ستش بگیرید و بہ یک ہزار روپیہ دیگرمہ بہ کارش آئید سعی شما ضائع نخواہد رفت و سود مند خواہد افتاد۔

اس خط کی صحیح تاریخ معلوم کرنے کا کوئی قرینہ موجود نہیں۔ لیکن اغلب ہے۔ یہ قرض سفر کلکتہ کے سلسلے میں لیا گیا ہو۔ اس لئے کہ اتنی بڑی رقم یک مشت لینے کی بہ ظاہر اور کوئی ضرورت نہ تھی۔ اور چونکہ خط میں دو ساہوکاروں کا نام آیا ہے۔ شاید یہ وہی دو شخص ہوں جنہوں نے بعد ازاں غالب کے خلاف ڈگری حاصل کی تھی۔

۱۸۵۳ء کی حالت قرض کا سلسلہ بہ دستور جاری رہا۔ مثلاً ۱۸۵۳ء میں جے پور سے پانسو روپے آئے تھے تو اس وقت بھی غالب پر پندرہ سو روپے کا سودی قرض تھا۔ قرض متفرق اس کے علاوہ تھا۔ غدر کے دنوں میں وہ کپڑے بیچ بیچ کر گزارہ کرتے رہے اور بے حد تنگ دست ہو گئے تھے۔ اس زمانے کی حالت مختلف خطوں سے ظاہر ہوتی ہے ایک خط میں پنجابی کی مثل لکھتے ہیں،

پنشن مل جائے حواس ٹھکانے ہو جائیں تو کچھ فکر کروں۔" پیٹ پڑیں روٹیاں تو سبھے گلاں موٹیاں" (مرقومہ ۴ جنوری ۱۸۵۹ء)

۱۸۵۹ء کی حالت ایک اور خط میں جو نومبر ۱۸۵۹ء کا لکھا ہوا ہے فرماتے ہیں:۔

بھائی! نہ کاغذ، نہ ٹکٹ۔ اگلے لفافوں میں سے ایک بیرنگ لفافہ پڑا ہے۔ کتاب میں سے کاغذ پھاڑ کر تم کو خط لکھتا ہوں۔ غمگیں نہ ہونا۔ کل شام کو فتوح کہیں سے پہنچ گئی ہے۔ آج کاغذ ٹکٹ منگا لوں گا۔

ایک اور جگہ فرماتے ہیں،

جانتے ہو علی کا بندہ ہوں اس کی قسم کبھی جھوٹ نہیں کھاتا۔ اس وقت کلو (غالب کا داروغہ) کے پاس ایک روپیہ سات آنے باقی ہیں۔ بعد اس کے نہ کہیں سے قرض ملنے کی امید ہے، نہ کوئی جنس رہن و بیع کے قابل۔ اگر رام پور سے کچھ آیا تو خیر ورنہ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

غدر سے تین برس بعد جب پنشن کا سہ سالہ جمع شدہ روپیہ یک مشت ملا تو غالب کے ذمے سات کم پندرہ سو روپیہ سودی قرض اور گیارہ سو کئی روپے متفرق قرض تھا۔[1]

آخری ایام منشی حبیب اللہ خاں ذکا کے نام کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ زندگی کے آخری ایام میں بھی غالب کا خرچ کم و بیش تین سو روپیہ ماہانہ تھا۔ اگرچہ آمدنی صرف ایک سو باسٹھ روپے تھی۔ فرماتے ہیں:

ایک سو باسٹھ روپے آٹھ آنے کی آمد، تین سو روپے کا خرچ۔ ہر مہینے ایک سو چالیس کا گھاٹا، کہو زندگی دشوار ہے یا نہیں۔

تین سو روپے کہاں خرچ ہوتے تھے؟ اس کی تفصیل بتانا مشکل ہے ان کے مکان کا کرایہ پانچ چھ روپے ماہانہ سے کبھی زائد نہیں ہوا۔ ملازموں کی تنخواہیں زیادہ سے زیادہ پچیس تیس روپے ہوں گی۔ گھر کا خرچ بھی زیادہ نہ تھا۔ میرا خیال ہے کہ اس آخری دور میں بھی وہ پرانے قرض اتارتے رہتے تھے اور ان کی آمدنی کا بڑا حصہ مختلف قرضوں کی قسطوں میں جاتا تھا۔

مجموعہ مکاتیب رام پور سے ظاہر ہوتا ہے کہ وجہ مقررہ کے علاوہ والیان رامپور

---

[1] اردوئے معلیٰ صفحہ ۷۰

عطیات بھیجتے رہتے تھے۔ بایں ہمہ آخری دنوں میں غالب کے ذمہ آٹھ سو روپے سودی قرض تھا، نیز حسین علی خاں کی شادی کے لئے کوئی سر و سامان نہ تھا۔ پہلے وہ شادی کے خرچ اور ادائے قرض دونوں کے طلب گار رہے۔ آخر میں صرف یہ درخواست کرتے رہے کہ قرض سے سبکدوشی کا بندوبست کر دیا جائے۔ نواب کلب علی خاں مرحوم کی طرف سے معین انتظام میں توقف ہوا، تو غالب نے سکوت اختیار کر لیا۔ اور وفات کے وقت ان پر آٹھ سو روپے کا قرض بہ دستور باقی رہا۔ جو نواب ضیاء الدین احمد خاں نے ادا کیا۔

دسواں باب

داستانِ غدر

بہ ناگرفت چناں صرصرے فزید بہ دہر | کزاں بر آئنہ آسماں غبار آمد
شرارہ بار غبارے ز معبرِ خاک انگیخت | سیاہ روپہے کاندریں دیار آمد
تو گوئی آنچہ من آں را غبارمے گویم | زبہر گشتن من ابر تگرگ بار آمد

یوں تو غالب کے الم نامہ حیات کا کوئی ورق بھی ایسا نہیں جس کی سیاہی مصیبتوں اور دل شکستگیوں پر آہ و فغاں کے دھوئیں سے تیار نہ ہوئی ہو یا جس کے بین السطور کی آرایش میں دل و جگر کا خون بے دریغ صرف نہ کیا گیا ہو لیکن اس جلیل القدر انسان کے اندوہ و ماتم کا سب سے بڑھ کر دردناک باب سلطنت تیموریہ کے زوال کا وہ خونچکاں واقعہ ہے، جو عام طور پر "غدر" کے نام سے معروف ہے۔

تیموریوں کا زوال تیموریوں کی سطوت و شوکت تو حقیقتہً عالمگیر اعظم کے ساتھ ہی رخصت ہو چکی تھی۔ مشین اگر پوری تیزی سے چل رہی ہو تو انجن کے اچانک رک جانے پر بھی پہیہ تھوڑی دیر تک بہ دستور گھومتا رہتا ہے۔ عالمگیر کی وفات کے بعد سلطنت مغلیہ کا وجود پہیہ کی اس عارضی گردش سے مختلف نہ تھا۔ خانہ جنگیوں کے تواتر، غرض پرست امرا کی کامجوئیوں کے تسلسل، دشمنوں کے ہجوم اور جانشینوں کی نالائقی نے حکومت کا شیرازہ اس طرح پریشان کر ڈالا کہ اس کے دوبارہ مرتب و استوار ہونے کی

بظاہر کوئی صورت باقی نہ رہی۔ فتنوں کے بند یکے بعد دیگرے ٹوٹتے گئے۔ تباہی خیز طوفانوں کا تلاطم بڑھتا گیا۔ شاہ عالم ثانی کے عہد میں بادشاہ کے اضطرار و بیچارگی کی یہ کیفیت ہو گئی تھی جیسے کوئی خزاں زدہ پتا ہو اور ہوا کا ہر جھونکا اسے جس طرف چاہے اُڑائے پھرے۔ جس سلطنت کے حدود کسی زمانے میں کابل اور قندھار سے برما اور راس کماری تک پھیلے ہوئے تھے۔ وہ سمٹ کر لال قلعہ کی چار دیواری میں محصور ہو چکی تھی۔ تاہم اس کا نام باقی تھا اور ہندوستان کے بڑے بڑے اقطاع کے فرمانروا اپنی حکمرانی کی دستاویزوں پر لال قلعہ کے انہی مجبور اور بے دست و پا سلاطین سے مہریں لگوانے کے آرزومند رہتے تھے۔ اس لیے کہ ان مہروں کے بغیر کسی کی فرمانروائی کا سکہ چل نہیں سکتا تھا۔ تخت طاؤس افسانہ بن چکا تھا۔ لیکن جس دیوان خاص نے دو سو برس تک اس تخت کے جلال و شکوہ کی بہاریں دیکھی تھیں وہ موجود تھا۔ بابر امید کا ایک جھلملاتا ہوا چراغ لے کر اس غربت کدہ میں آیا تھا لیکن دیکھتے دیکھتے اس کی روشنی اتنی پھیلی کہ سارا ہندوستان بقعۂ نور بن گیا۔ تین سو برس کے بعد حوادث کی تیز آندھیاں اس شدت سے پے بہ پے چلیں کہ سب چراغ بجھ گئے سب شمعیں گل ہو گئیں، ہر طرف اندھیرا چھا گیا، صرف دہلی کے لال قلعہ میں ایک ٹمٹاتا سا دیا باقی تھا۔ جس کی جھلک دیکھنے والوں کے دلوں میں عہد رفتہ کی ضو افشانیاں تازہ کر دیتی تھی۔

بظاہر اس بگڑے ہوئے نقشے کے دوبارہ جمنے کا کوئی امکان نہ تھا اور شام یاس کے بعد صبح امید کے طلوع کی کوئی صورت باقی نہیں رہی تھی۔ لیکن لال قلعہ کی سطوت کے مٹتے ہوئے نقوش بھی بہتوں کے دلوں کی تسکین کا سامان تھے۔ آہ! قدرت کو تسکین قلوب کا یہ بے حقیقت سا سہارا بھی گوارا نہ ہوا اور "غدر" کی بادِ تند نے اس چراغ کو بھی بجھا دیا۔ جس کا سارا فتیلہ قریب قریب جل چکا تھا اور تیل کا آخری

قطرہ سنبھالے کی جھلملاہٹ میں صرف ہو رہا تھا۔

غالب کے "صریر خامہ" کی نوائے سروش" نوا نہ تھی بلکہ اسی بربادی کا نوحہ اور اسی تباہی کا مرثیہ تھی:

یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشہ بساط	دامانِ باغبان وکفِ گل فروش ہے
لطفِ خرام ساقی و ذوقِ صدائے چنگ	یہ جنتِ نگاہ، وہ فردوسِ گوش ہے
یا صبح دم جو دیکھئے آکر تو بزم میں	نے وہ سرور و سوز نہ جوش و خروش ہے

اور آخر یہ بھی دیکھنا پڑا،

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

بہادر شاہ اور غدر

میرٹھ کی سپاہ جب اپنے انگریز افسروں کو قتل کر کے دہلی پہنچی اور بہادر شاہ کی مستقل پادشاہی کا اعلان کیا گیا تو ممکن ہے بعض لوگوں کو خیال گزرا ہو کہ سلطنت مغلیہ دوبارہ زندہ ہو گئی ہے اور اکبر و عالمگیر کی سطوت نے پھر خواب سے آنکھیں کھولی ہیں۔ لیکن خود بہادر شاہ کی نظروں کے سامنے حقیقت حال بالکل بے نقاب تھی۔ مرحوم ظہیر دہلوی "داستانِ غدر" میں فرماتے ہیں کہ پادشاہ ایک روز تسبیح خانہ میں سنگ مرمر کے تخت پر تشریف فرما تھے۔ میں (ظہیر مرحوم) حمید خاں جمعدار خاص برادران، فتح علی جمعدار کہاران اور حسین بخش عرضی بیگی حاضر تھے،

حضور نے ہم سے مخاطب ہو کر فرمایا "تم جانتے ہو آج کل جو سامان ہو رہا ہے اس کا انجام کیا ہونے والا ہے"؟ حمید خاں جمعدار نے ہاتھ باندھ کر عرض کی "حضور! ڈیڑھ سو برس کے بعد حضور کا اقبال یاد رہوا ہے، گئی ہوئی سلطنت پھر واپس آتی ہے" پادشاہ سلامت نے فرمایا "تم لوگ نہیں جانتے جو کچھ میں جانتا ہوں۔ مجھ سے سن لو کہ میرے بگڑنے کا کوئی سامان نہ تھا۔ یعنی بنائے فساد مال و دولت، خزانہ، ملک و سلطنت وغیرہ ہوا کرتے ہیں میرے

پاس اِن میں سے ایک چیز بھی موجود نہ تھی۔ میں تو پہلے ہی فقیر ہوا بیٹھا تھا۔ مجھ کو کسی سے کیا خصومت تھی۔۔۔۔۔۔ میں تو اک گوشۂ ایزدی میں فقیر کا تکیہ بنائے ہوئے، چار صورتوں کو ہمراہ لئے ہوئے بیٹھا روٹی کھاتا تھا۔ میرے بگڑنے کا کوئی سامان نہ تھا۔ اب جو منجانب اللہ غیب سے میرٹھ میں آگ لگی اور دلّی میں آکر بھڑکی۔ فتنہ برپا ہوا، فلک غدار اور زمانہ ناہنجار کو میرے گھر کی تباہی منظور رہے۔ آج تک سلاطین چغتائیہ کا نام چلا آتا تھا اور اب آیندہ کو نام ونشان یک قلم نابود ہو جائے گا۔ یہ نمک حرام جو اپنے آقاؤں سے منحرف ہو کر یہاں آکر پناہ پذیر ہوئے ہیں۔ کوئی دن میں ہوا ہوئے جاتے ہیں۔ جب یہ اپنے خاوندوں کے نہ ہوئے تو میرا ساتھ کیا دیں گے۔ یہ بد معاش میرا گھر بگاڑنے آئے تھے۔ بگاڑ چلے۔ اس کے بعد انگریز لوگ میرا اور میری اولاد کا سر کاٹ کر قلعہ کے کنگرے پر چڑھا دیں گے اور تم لوگوں میں سے کسی کو باقی نہ چھوڑیں گے۔ اگر کوئی باقی رہ جائیگا۔ تو آج کا میرا قول یاد رکھے[1]۔

تیموری خاندان کا آخری نام لیوا یقیناً مجبور اور بے بس تھا۔ لیکن قدرت کی عطا کی ہوئی بصیرت سے محروم نہ تھا۔ اس کی زبان پر جو کچھ جاری ہوا۔ آخر پورا ہو کر رہا۔

"دستنبو"

غالب نے حالات غدر کے متعلق ایک مستقل رسالہ قدیم فارسی زبان میں لکھا ہے۔ جو ان کے کلیات نثر میں موجود ہے۔ اسے حقیقتاً غالب کا ایک پرائیویٹ روزنامچہ سمجھنا چاہیئے۔ اس کی تسوید شروع ہوئی تھی۔ تو غالب یا کسی دوسرے شخص کو یقین نہ تھا۔ کہ انگریز ضرور کامیاب ہو جائیں گے۔ لہٰذا یہ نہیں کہا جا سکتا۔ کہ رسالہ انگریزوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے خیال سے لکھا گیا تھا۔ البتہ یہ ممکن ہے۔ بعض حالات کو مصلحتہً نظر انداز کر دیا ہو۔

---

[1] "داستانِ غدر" صفحہ ۹۹ و ۱۰۰۔

غدر پر کم و بیش اسّی برس گزر چکے ہیں۔ اس مدت میں ملک کی سیاسی فضا کا رنگ
بالکل بدل گیا ہے۔ زاویہ نگاہ میں تغیر پیدا ہو گیا ہے۔ پرانے نظریات کی صفیں منتشر
ہو چکی ہیں، ان کی جگہ نئے نظریات کے عساکر نے لے لی ہے۔ ممکن ہے آج غالب
کی رائے بے لوث نہ سمجھی جائے یا اس کی تصویب میں بار بار تامل ہو۔ لیکن پس منظر کو
پیش نظر رکھتے ہوئے اسے بے لوث سمجھنے میں تامل کی کوئی وجہ نہیں۔ غالب نے
غدر کے متعلق اچھی رائے ظاہر نہیں کی بلکہ اس کی تاریخ ہی "رستخیز بیجا" سے نکالی
تھی۔ اس کے متعدد وجوہ ذہن میں آتے ہیں:-

(۱) وہ طبعاً سکون پسند اور امن دوست تھے۔ اور خونریز ہنگامہ آرائی سے
نفور تھے۔

(۲) دہلی میں یا دوسرے شہروں میں انگریز مردوں، عورتوں اور بچوں پر
بیکسی کے عالم میں جو ظلم وستم ہوئے تھے۔ ان سے غالب کے انسانیت دوست
دل پر سخت چوٹ لگی تھی۔

(۳) جو انگریز مارے گئے تھے ان میں غالب کے دوست، محب اور شاگرد بھی تھے۔

(۴) مغلیہ سلطنت کے احیاء کے لئے جو کوشش کی گئی تھی۔ وہ بالکل غیر منظم تھی
اور اس کا نتیجہ یہ نکلا۔ کہ مسلمان اور بھی تباہ ہوئے اور سلطنت مغلیہ کا آخری
نقش بھی کلیتہً محو ہو گیا۔

(۵) متعدد اکابر مارے گئے۔ ان کے گھر بار لٹے، جائدادیں تباہ ہوئیں، اونچے
درجے کے خاندانوں کی بساطیں الٹ گئیں اور وہ نان شبینہ تک کے لئے محتاج ہو گئے۔

دہلی کی تباہی کا مرثیہ

لیکن انگریزوں کی فیروزی و فتح مندی کے بعد اہل دہلی، شاہی متوسلین
اور دوسرے لوگوں پر جو ظلم وستم ہوئے ان کے اظہار میں بھی غالب نے تامل نہیں کیا۔
"دستنبو" میں بھی ان سختیوں اور شدتوں کا ذکر ہے۔ لیکن ان کے اردو مکاتیب کا تو

ہر گوشہ ماتم کے آنسوؤں سے تر نظر آتا ہے۔ ذاتی حالات اور مالی پریشانیوں کے علاوہ غالبؔ کے دردمندوں نے جس موضوع کو تواتر کے ساتھ لی الفاظ کا ماتمی لباس پہنایا۔ وہ دہلی کی تباہی تھی۔ اس تباہی کا یہ منثور نوحہ جو اپنی المناکی اور درد انگیزی میں کسی منظوم نوحہ سے کم نہیں۔ چونکہ منتشر و متفرق تھا۔ اس لئے اس کی اہمیت پوری طرح واضح نہ ہو سکی۔ میں نے کوشش کی ہے۔ کہ یہ داستانِ غم مرتب ہو جائے۔ غالبؔ کی حالت یہ تھی کہ جہاں موقع مل جاتا، خون کے آنسوؤں سے دامنِ تحریر کو رنگیں بنا لیتے میں نے ان تمام آنسوؤں کو یکجا کر دیا ہے تاکہ غالبؔ کے قلبِ حزیں کی اس اشکباری کے آئینہ میں دہلی مرحوم کی صحیح تصویر آنکھوں کے سامنے آجائے۔ جو غالباً کسی اور مرقع میں نظر نہ آسکے گی۔

دستنبو کا خلاصہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلے "دستنبو" کے اہم مطالب پیش کر دیئے جائیں۔ جس کا موضوع ہی غدر تھا۔ یہ بتا دینا بھی ضروری ہے کہ غدر کا سارا زمانہ غالبؔ خانہ نشیں رہے۔ اور وہ تمام حوادث کے شاہد و ناظر نہ تھے بلکہ جو کچھ سن لیتے۔ لکھتے جاتے بے شک حالات سنانے والے معتبر آدمی ہوں گے یا ممکن ہے غالبؔ مختلف ذرائع سے ہر روایت کی تصدیق کر لینے کے بعد اسے قلمبند کرتے ہوں۔ یہ مرقع نہ مفصل ہے۔ اور نہ تمام واقعات و حوادث ترتیب کے ساتھ اس میں آئے ہیں۔ بلکہ رسالہ بہت مختصر ہے۔ نیز اس میں ذاتی حالات یا دوستوں اور عزیزوں کے واقعات کا بھی کافی حصہ ہے۔

غدر کا آغاز غدر کا آغاز ان لفظوں میں بیان فرماتے ہیں:

"دریں سال کہ شمارہ آں را بہ آئین برآورد (یعنی تاریخ نکالنے کے طریق پر) از "رستخیز بیجا" برآورند واگر آشکارا پرسی یک ہزار و دولیست و ہفتاد و سہ (۱۲۷۳ھ) شمرند۔ دوشنبہ شانزدہم ماہ روزہ (رمضان المبارک) و پانزدہم مئی سال یک ہزار و ہشت صد و پنجاہ و ہفت ناگرفتہ اچانک

درو دیوار یارہ دبارِ قلعہ فصیل دہلی بجنبید۔ وآں جنبش زمین را فراگرفت . . . . . درآں روز جہاں سوز بخت برگشتہ و سرگشتہ چند از سپاہ کینہ خواہ میرٹھ بہ شہر آمدند۔ ہمہ پے آزرم وشور انگیز و در خداوندکشی تشنہ خون انگریز۔ دیدبانان دروازہ ہائے شہر . . . . . . ہم پاس نمک و ہم پاس شہر گزاشتند۔ مہمانان ناخواندہ یا خواندہ را گرامی داشتند۔ آں سواران سرگران و سبک جلو و پیادگان تندخو و تیزرو چوں درہا باز و دربانان را مہمان نواز یافتند دیوانہ وار ہر سو شتافتند و ہر کرا از فرماندہان و ہر کجا آرامش گاہ آں مہان یافتند تا زارنہ کشتند و پاک نہ سوختند۔ روئے ازاں سو برنتافتند۔

قلعہ دار اور ایجنٹ کا قتل اپنے متعلق لکھتے ہیں کہ چند گوشہ نشین فقیر جو انگریزی بخشش کی طفیل معمولی ما یحتاج سے بہرہ مند تھے۔ شہر کے مختلف حصوں میں جابجا آباد تھے ان لوگوں کو رزم و پیکار کے ہنگاموں سے کوئی مناسبت نہ تھی اور ہوتی بھی تو ظاہر ہے۔ کہ غدر کے ہمہ گیر سیلاب میں ان کی حیثیت محض تنکوں کی سی تھی۔ وہ اس فتنہ کے انسداد میں اپنے آپ کو عاجز د معذور سمجھ کر گھروں میں بیٹھ گئے:۔

یکے ازاں ماتم زدگان منم کہ در خانہ خویش بودم۔

میں نے شور سنا اور اس کی علت بھی دریافت نہ کر سکا تھا کہ انگریز ایجنٹ اور انگریز قلعہ دار کے مارے جانے کی خبر ملی۔ ہر طرف سواروں کے دوڑنے اور پیادوں کے پہنچنے کا شور پڑ گیا۔ پھر تو:۔

ہیچ مشت خاکے نماند کہ از خون گل اندامان ارغوان زار نہ شد . . . . ہائے آں جہاں داران داد آموز دانش اندوز انگریز نکو خوے نکونام، وآہ ازاں خاتونان پری چہرہ نازک اندام یارقسے چوں ماہ تابے چوں سیم خام ودریغ آں کودکان جہان نادیدہ کہ در شگفتہ روئی بہ لالہ و گل مے خندیدند۔ و در خوش خرامی بہ کبک و تذرو آہو مے گرفتند کہ ہمہ یک بار بہ گرداب خون فرو رفتند۔ عیب لگاتے تھے

غدر کی غائت و مقصد میں اختلاف رائے ہو سکتا ہے، لیکن اس ہنگامہ کو کون ایک لمحہ کے لئے بھی جائز قرار دے سکتا ہے؟

آتش غدر کا اشتعال

غالب لکھتے ہیں کہ انگریزوں کے قتل کے بعد باغیوں نے شہر میں جا بجا ڈیرے ڈال دیئے۔ قلعہ میں باغ سلطانی کو اپنے گھوڑوں کا اصطبل بنا لیا۔ اور شاہی نشیمن کو خوابگاہ کے طور پر استعمال کرنے لگے۔ رفتہ رفتہ مختلف مقامات سے خبریں آنے لگیں کہ سپاہیوں نے اپنے سپہ سالاروں کو قتل کر ڈالا ہے۔ اس طرح سپاہیوں اور کسانوں کے جتھے یکدل ہوتے گئے۔ اگرچہ ان کے درمیان کوئی سازباز اور کوئی سمجھوتہ نہیں ہوا تھا۔ لیکن سب نے ایک مقصد پر کمر باندھ لی۔ گویا جھاڑو کی تیلیوں کی طرح سب ایک کمربند میں بستہ تھے۔ بے شک ہندوستان کو آرایش و آسائش سے بالکل پاک کرنے کے لئے ایسے ہی جھاڑو کی ضرورت تھی۔

آرے رفت ز روے ہند بوم بد انساں کہ آرایش و آسایش اگر جوید بہ اندازہ پرہ، کاہے نیابد ہمچنیں جاروب گیتی آشوب ہمے خواست۔

نظم و ترتیب کا فقدان

غدر کے تھوڑے ہی دن بعد دہلی میں عام بے نظمی شروع ہو گئی تھی۔ "داستانِ غدر" میں جو چشم دید حالات پر مشتمل ہے۔ اس کے حالات تفصیل سے ملتے ہیں۔ غالب لکھتے ہیں کہ لشکر موجود تھے۔ لیکن لشکر آرا نہ تھے۔ سپاہ حاضر تھی لیکن سپہدار ناپید تھے۔ فرمانرواؤں کی مصیبت اور ہندوستان کی ویرانی پر کیوں رونا نہ آئے۔

شہرہائے بے شہریار پُر از بندہ ہائے بے خداوند، چنانچہ باغہائے بے باغبان از درختاں نابرومند۔ رہزن از گیرودار آزاد و بازرگان از نخا۔ خانہ ہا ویرانہ ہا و کلبہ ہا خوان یغما، (سوداگر، محصول)
گمنامان نہان خانہ نشین نا خویش را آرایند و شوخ چشمی خویش بہ مردم نمایند روہ بہ پردہ چوں مژہ ہا خنجرہا آختند و نیک مردان آسودگی گزیں دمیکہ بہ رفتار آیند تا از خانہ بہ بازار

آئینہ ہزار جا بپر انداختہ۔

روشن گھروں پر مصیبتیں اور ناکسوں کی شادمانیاں

پھر فرماتے ہیں کہ چور لوٹ مار سے امیر بن گئے۔ اور مخمل و ریشم کے بستروں پر استراحت کرنے لگے۔ روشن گھروں کے گھر میں تیل بھی نہ رہا کہ چراغ جلا سکیں۔ رات کی تاریکی میں انہیں پیاس لگتی تو بجلی چمکنے کے منتظر رہتے اور اسی روشنی میں کوزہ و پیمانہ کو دیکھ کر پانی پیتے تھے[1]۔ جو لوگ مٹی فروخت کرنے کے لئے زمین کھودتے تھے۔ وہ زردار بن گئے جنکی بزم میں آتش گل سے چراغ روشن ہوتے تھے، وہ تاریک گھروں میں ناکامی کے داغ سے جلنے لگے۔ قاصدوں نے خط لے جانے ترک کر دیئے۔ ڈاک کا سلسلہ درہم برہم ہو گیا۔ سارے قاعدے اُلٹ گئے۔ دلیر اپنے سایہ سے ڈرنے لگے۔ سپاہی شاہ و درویش پر حکم چلانے لگے۔ کیا یہ صورت حال سزاوار ماتم نہ تھی اور اس زار نالی کی ہنسی اُڑانا جائز ہے؟ عجیب بات یہ ہے کہ ان مصیبت ناک واقعات سے بیزاری کا اظہار کیا جاتا تو لوگ ضعف ایمان اور خرابی مذہب کے طعنے دینے لگتے[2]۔

ہنگامہ عام

باغی شروع میں جو روپیہ اپنے ہمراہ لائے تھے، شاہی خزانہ میں داخل کر دیا۔ آہستہ آہستہ ہر طرف سے سپاہی جمع ہونے لگے، یہاں تک کہ شہر دہلی کے اندر اور باہر سوار و پیادہ کی تعداد پچاس ہزار تک پہنچ گئی۔ بادشاہ نہ اتنے بڑے لشکر کو قابو میں رکھ سکتا تھا، نہ اس کا انتظام کر سکتا تھا۔ لہذا خود لشکر کے قابو میں آگیا۔ ؎

شاہ را در میاں گرفت سپاہ   دیں گرفتن بود گرفتن ماہ

---

[1] غالباً یہ واقعہ خود غالب پر گزرا تھا۔

[2] میرا خیال ہے کہ یہ بیان بھی ذاتی تجربہ پر مبنی ہے۔

ماہِ نو ہیچ گہ نمے گیرد　　جز مہ چاردہ نمے گیرد

شاہ ماہ گرفتہ را ماند　　نہ کہ ماہ دو ہفتہ را ماند

گویا بادشاہ کی حیثیت اس چاند کی سی تھی جس کے گرد ہالہ پڑا ہوا ہو۔ باغی جہاں سے گزرتے تھے، جیل خانوں کے دروازے توڑ کر قیدیوں کو آزاد کر دیتے تھے۔ رہا شدہ قیدی پادشاہ کے حضور میں آکر سرداری کی درخواستیں کرتے۔ اور صوبیداریاں مانگتے۔ کوئی نہیں بتاتا کہ ہر خواہشمند کو بار اور ہر پناہ طلب کو پناہ کیوں دیئے جاتے ہیں۔

باغیوں اور انگریزوں میں لڑائی انگریزوں کے قبضے میں صرف وہ پہاڑی رہ گئی تھی۔ جو شہر سے جانب شمال مغرب واقع ہے۔ اور زیادہ دور نہیں۔ انہوں نے اسی پہاڑی پر دمدمے اور مورچے بنا کر توپیں چڑھالیں۔ ادھر باغیوں کے قبضے میں جو توپیں آئیں شہر کی فصیل پر جا بجا نصب کر دی گئیں۔ لڑائی شروع ہو گئی۔ اور رات دن پتھروں کی طرح گولے برسنے لگے۔

حکیم احسن اللہ خاں پر مصیبت حکیم احسن اللہ خاں کے ایک پالک نے ناجائز طریقوں سے روپیہ جمع کر لیا تھا۔ حکیم صاحب اس راز سے آگاہ تھے۔ پالک نے اپنی بددیانتی پر پردہ ڈالنے کی غرض سے افواہ اڑادی کہ احسن اللہ خاں انگریزوں کا بہی خواہ ہے اور ان کے لئے جاسوسی کی خدمت انجام دے رہا ہے۔ باغی بگڑ گئے۔ اور حکیم صاحب کے قتل کی نیت سے ان کے مکان پر چڑھ دوڑے۔ حسن اتفاق سے حکیم صاحب اس وقت قلعہ میں پادشاہ کے پاس موجود تھے۔ باغی تعاقب میں قلعہ پہنچے اور جاتے ہی حکیم صاحب کو گھیر لیا۔ خادم نواز بادشاہ نے اپنے آپ کو حکیم صاحب پر ڈال دیا۔ اس طرح جان بچ گئی۔ لیکن باغیوں نے حکیم صاحب کا سامان لوٹ لیا۔ اور مکان کو آگ لگادی۔ سارا مکان جل کر راکھ بن گیا۔ دیواریں دھوئیں سے سیاہ ہو گئیں۔ گویا مکان کے ماتم میں انہوں نے سیاہ لباس پہن لیا۔

لکھنؤ، رام پور اور فرخ آباد کے حالات دہلی سے باہر کے حالات لکھتے ہوئے فرماتے ہیں کہ تفضل حسین خاں

رئیس فرخ آباد نے پادشاہ کی خدمت میں عرضداشت بھیجی۔ خان بہادر خاں نے بریلی میں لشکر جمع کیا۔ ایک سو ایک اشرفی، نقرئی ساز و سامان سے آراستہ گھوڑا اور ہاتھی کی نذر بدرگاہ شاہی میں پیش کی۔ نواب یوسف علی خاں والی رام پور دل سے انگریزوں کے دوست تھے۔ لیکن ہمسایوں کے طعنوں اور تبرپا انگریزوں سے بچنے کے لئے انہوں نے بھی مصلحتہً پادشاہ کی خدمت میں زبانی پیام ارسال کیا۔ لکھنؤ سے کچھ انگریز بھاگ کر محفوظ جگہوں پر پہنچ گئے۔ جو باقی بچے وہ بیلی گارد میں حصار بند ہو گئے۔ شرف الدولہ نے ان کے وجود سے بے پروا ہو کر واجد علی شاہ کے ایک دہ سالہ فرزند (برجیس قدر) کو تخت پر بٹھایا اور اسے پادشاہ ہند کا وزیر قرار دیا اور اپنے لئے وزیر کے "پیشکار دستیار" کا لقب تجویز کیا[۱]۔ پادشاہ کے لئے ایک گراں بہا نذر بھیجی جس میں دو گھوڑے اور دو ہاتھی تھے۔ ایک زرین کلاہ ارسال کی جو رنگ رنگ کے نایاب گوہروں سے مزین تھی نیز الماس کے بازو بندوں کی جوڑی اور بعض دوسری چیزیں اس نذر میں شامل تھیں۔

کشمیری دروازے پر انگریزوں کا حملہ

یہ حالات لکھنے کے بعد غالب دفعتہً ۱۴ ستمبر کے واقعات پر پہنچ گئے جب انگریزی سپاہ نے کشمیری دروازہ پر حملہ کیا اور باغی شہر چھوڑ کر بھاگ گئے۔ انگریزی حملے کی کیفیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

مئی گر ز دہلی بروں برد داد	ستمبر ستم برد، آورد داد
پس از چار ماہ و پس از چار روز	فرو زندہ شد مہر گیتی فروز
تہی گشت دہلی ز دیوانگاں	بہ مردی گرفتند فرزانگاں

[۱] - ابتدا میں والیان اودھ شاہان دہلی کے وزیر تھے اور ان سب کو نواب وزیر اودھ کہا جاتا تھا۔ غازی الدین حیدر کے زمانے میں دہلی کے اثر و رسوخ کو کمزور کرنے کی غرض سے انگریزوں نے اودھ میں بادشاہی کا ڈول ڈالا اور غازی الدین حیدر نواب وزیر کے بجائے "شاہ" کے لقب سے ملقب ہوئے۔ شرف الدولہ نے دہلی کے ساتھ پرانے تعلقات کی تجدید کو پیش نظر رکھتے ہوئے برجیس قدر کو "شاہ" نہیں بلکہ "نواب وزیر" بنایا۔

ہر چند از یازدہم مئی تا چہاردہم ستمبر چہار ماہ و چہار روزہ درنگ است تا پس از آنجا کہ اندازہ
بست و کشاد کار بدیں رنگ است کہ شہر بروز دوشنبہ از دست رفت و ہم بروز
دوشنبہ فیروز چنگ آمد می تواں گفت کہ از دست رفتن و بدست آمدن شہر ہماں
(قبضے میں آیا)
در یک روزہ بود است ۔

یعنی ۱۱ مئی کو پیر کے دن شہر پر باغیوں کا قبضہ ہوا اور ۱۴ ستمبر کو پیر ہی کے دن انگریز دوبارہ اس پر قابض ہوئے ۔ لہذا اگرچہ چار ماہ اور چار دن کی مدت گزر چکی تھی لیکن دن کو پیش نظر رکھتے ہوئے ۔ یہ کہنا بجا ہے کہ شہر جس دن قبضے سے نکلا اسی دن دوبارہ قبضے میں آیا ۔

انگریزی فوج کی زیادتیاں یہاں تک باغیوں کی چیرہ دستیوں اور ستم انگیزیوں کا بیان تھا اب انگریزوں کی زیادتیوں کی کیفیت سنیئے ۔ غالب لکھتے ہیں کہ فتح مند لشکر شہر میں داخل ہوا تو لوگ بے امتیاز قتل ہونے لگے ۔ معزز اصحاب نے گھروں کے دروازے بند کر لیے ۔ ان کے نزدیک آبرو بچانے کا اور کوئی طریقہ نہ تھا ۔ شہر میں جو باغی رہ گئے تھے ۔ انہوں نے مقابلہ کیا ۔ دو تین روز کشمیری دروازہ سے لے کر چاندنی چوک تک ہر کوچہ رزمگاہ بنا رہا ۔ اجمیری دروازہ ، ترکمان دروازہ اور دہلی دروازہ باغیوں کے قبضے میں تھے[1] ۔ جب انگریزوں نے شہر میں داخل ہو کر غصے اور غیظ کے عالم میں چند بے نواؤں کو مارنا اور چند گھروں کو جلانا روا رکھا تو اس اظہار خشم و کین سے سب پر خوف طاری ہو گیا ۔ بیشمار چھوٹے بڑے ، نامدار و خاکسار مذکورہ بالا تینوں دروازوں کے راستے شہر سے باہر جانے لگے اور بیرون شہر کی چھوٹی چھوٹی بستیوں یا مقبروں میں پناہ گزیں ہو گئے بعض نے وہاں بھی دم نہ لیا ، بلکہ مصیبتیں اٹھاتے اور سختیاں سہتے دوسرے مقامات کی طرف نکل گئے ۔

ذاتی حالات اپنی کیفیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ میرا مکان شہر کے اندر کشمیری دروازہ

[1] انگریزوں نے حملہ مشرقی سمت سے کیا تھا ۔ یہ تینوں دروازے شہر کے مغربی حصے میں تھے ۔

اور دہلی دروازہ کے درمیان واقع ہے اور دونوں دروازوں سے قریباً یکساں فاصلہ پر ہے۔ لوگ جوق در جوق شہر سے نکلنے لگے لیکن میرے دل میں نہ گھبراہٹ پیدا ہوئی اور نہ میں اپنی جگہ سے ہلا۔

گفتم کہ چوں گنہگار نیستم بہ سرزنش سزاوار نیستم۔ نہ انگلیسیاں بہ گناہ کُش، نہ آب و ہوائے شہر ناخوش۔ مرا چہ افتاد کہ در اندیشہ ہائے تباہ افتم وافتاں وخیزاں براہ افتم درگوشۂ بے توشہ، باخامۂ سیاہ ہم زبانم ہم از مژہ شورابہ بارد ہم از رگ خامہ خونابہ فشاں۔

پُر تہید ستم دلے برگ خدایا تا چند

بہ سخن شاد شوم کایں گہر از کان من است

دہلی پر انگریزوں کا قبضہ

۱۸ ستمبر کو شہر و قلعہ پر انگریزوں کا پورا قبضہ ہو گیا۔ اس کے بعد:

غوغائے زد و کشت دگیر و دار بدیں کوچہ نیز رسید و ہمہ را از بیم دل دو نیم شد۔ باید دانست کہ ایں کوچہ جز یک راہ و بیش از دہ دوازدہ خانہ نہ دارد و جز دو چاہ دریں کوے نیست۔ بیشتر از زن و مرد بدیں نورد کہ زن را بچہ در آغوش است و مرد را شتوارہ بر دوش، بدر زدند و تنے چند کہ بجا ماندہ اند بہ ہم داستانی من . . . دراز در وں ببستند و بیرامن آں سنگ بہ سنگ بہم پیوستند تا کوچہ چنانکہ سربستہ بود دربستہ نیز شد۔

مہاراجہ پٹیالہ کی سعی

اسی کوچہ میں شریف خانی خاندان مقیم تھا۔ حکیم محمود خاں، حکیم مرتضٰے خاں اور حکیم غلام اللہ خاں جو حکیم شریف خاں کی اولاد میں سے تھے، سرکار پٹیالہ میں ملازم تھے۔ مہاراجہ پٹیالہ نے محاصرہ دہلی میں انگریزوں کی پوری امداد کی تھی اور عہد لے لیا تھا کہ فتح کے بعد حکیموں کے کوچے پر پٹیالہ کا پہرہ بٹھایا جائے گا تاکہ انگریزی لشکر اہل کوچہ کو گزند نہ پہنچا سکے۔ چنانچہ ۱۸ ستمبر کو مہاراجہ کے سپاہی اس

کوچہ کی حفاظت کے لئے پہنچ گئے۔

شہر کی حالت

غالب لکھتے ہیں کہ ۱۵ ستمبر سے شہر کے تمام مکان اور دکانیں بند ہو گئی تھیں۔ نہ گندم فروش تھا جس سے دانہ خریدیں نہ دھوبی تھا جس سے کپڑا دھلوائیں نہ حجام تھا جس سے اصلاح بنوائیں، نہ خاک روب تھا جس سے مکان صاف کرائیں۔ جب تک کوچے کا دروازہ کھلا تھا چیزیں لے آتے تھے لیکن جب دروازہ بند کر کے پتھر چن دیئے گئے تو جو کچھ پاس تھا اسی پر قوت لایموت کا مدار رہ گیا۔ یہ سامان خورد و نوش ختم ہو گیا تو دو راتیں اور دو دن بھوکے پیاسے گزارے۔

پانی کی تلاش

جب مہاراجہ کے پہرہ دار آگئے تو انہوں نے بتایا کہ کوچہ میں چاندنی چوک تک تو پھر سکتے ہو، اس سے آگے جانا خطرناک ہے۔ چنانچہ دروازہ کھولا اور مختلف گھروں سے آدمی ڈول، مشک یا کھال وغیرہ لے کر پانی لانے کے لئے نکلے غالب کے دو ملازم بھی ساتھ تھے۔ میٹھا پانی دور تھا اور وہاں تک پہنچنا دشوار تھا، ناچار نیم شور پانی لے کر واپس آئے۔ جو لوگ پانی لانے گئے تھے انہوں نے واپس آکر بیان کیا کہ لشکریوں نے چند مکانوں کے دروازے توڑے لیکن نہ آٹا ملا نہ گھی میسر آیا۔

بدرستی کہ زندانیانہ زندگی میگزرانیم نہ کس مے آید کہ گفتارش بگوش خورد و نہ خود بروں مے رویم تا دیدہ دیدہا نگرد۔ ہر آئینہ مے توانم گفت کہ گوشہائے ما کر است و چشمہائے ما کور دبیرون ازاں گو مگوئے و کشمکش نان ما شیرین است و آب ما شور۔ روزے ناگہاں ابر آمد و باراں بارید چادرے بستیم و خمے زیرآں نہادیم و آب گرفتیم۔ گویند ابر آب از دریا آرد و بروئے زمین فرو بارد دریں بار ابر گرانمایہ . . . . آب از چشمہ زندگی آورد و ہر آئینہ آنچہ سکندر در پادشاہی جست دنیا فت ایں تلخ کام شور آشام در تباہی یافت۔

یہ غالب کی حالت تھی جس کے کوچے کی حفاظت کیلئے مہاراجہ پٹیالہ کے سپاہی

مقررہتے کہ پینے کو پانی میسر نہیں آتا تھا۔ مینہ برستا تو چادر باندھ کر اس میں مینہ کا پانی جمع کیا اور مٹکا بھرا۔ اس سے اندازہ کیجئے کہ ان غریبوں اور مسکینوں کی کیا کیفیت ہوگی جن کا کوئی نگران و پاسبان نہ تھا۔ یہ ہے کہ دہلی والوں نے جس طرح عشرت و شادمانی کے بہترین دور دیکھے اسی طرح بدترین دوروں کی تلخ کامیاں بھی برداشت کیں ان کی نگاہوں نے جہاں عظمت و جلال کے درخشاں مناظر میں صدیوں غواصی کی وہاں نادرشاہی ترکتاز اور غدر کی ہنگامہ آرائی کے خونین سیلاب بھی اپنے سروں سے گزارے۔ آج کون اندازہ کر سکتا ہے کہ ان کم نصیبوں نے کیسے کیسے دُکھ سہے ہونگے اور کیسی کیسی سختیاں اٹھائی ہوں گی!

غالب نے ضمناً اپنے خاندانی سوانح بھائی کی دیوانگی اس کا گھر بار لٹنے اور مرنے کے حالات بھی لکھے ہیں۔ انگریزی فوج کی تعدیاں بیان کرنے میں بھی تامل نہیں کیا لیکن لکھتے ہیں کہ خود انگریزوں پر جو سختیاں ہو چکی تھیں ان کے انتقام میں اگر وہ دہلی میں کتوں اور بلیوں کو بھی زندہ نہ چھوڑتے تو بجا ہوتا۔ تاہم انہوں نے اپنے غصے کو ضبط کیا اور جو زیادتیاں کیں ان کی نسبت یوں سمجھ لو کہ جب کسی جگہ کو جنگ کے بعد فتح کرتے ہیں تو وہاں کے آدمیوں پر لازماً اس قسم کی سختیاں ہوتی ہیں۔

| اہل شہر کی پریشانیاں |

پھر فرماتے ہیں:-

> از فرو ماندگان شہر بسیارے را بروں راندہ اند و اندکے ہم چنیں در بند بیم و امید فرو ماندہ اند۔ درباره بیابان گردان و مخول نشیں ہیچ فرمان نیست مگر در دبیرون رفتگان درون تفتگاں را درماں نیست۔ کاش درونیاں و بیرونیاں را از مرگ فرتیست یک دگر آگہی بودے تابے تابی و پراگندگی روے نہ نمودے۔

| غالب انگریز کرنیل کے پاس گئے |

۵ اکتوبر کو چند گورے دیوار پھاند کر اس کوچے میں آ گھسے جہاں غالب کا مکان تھا۔ مہاراجہ پٹیالہ کے سپاہیوں کی روک تھام بے اثر رہی۔ وہ دوسرے

گھروں کو چھوڑ کر غالب کے مکان میں پہنچ گئے، لیکن سامان کو ہاتھ نہ لگایا، بلکہ غالب کو باقر علی خاں، حسین علی خاں، چند ملازموں اور دوسرے ہمسایوں سمیت کرنیل براؤن کے پاس لے گئے جو دو تیر پرتاب کے فاصلے پر قطب الدین سوداگر کے مکان میں مقیم تھا۔ کرنیل نے نام، پتہ اور حالات پوچھ کر اسی روز سب کو واپس کر دیا۔[1]

خاندان لوہارو کی مصیبتیں

امرا کے حالات بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جب شہر فتح ہوا تو امین الدین احمد خاں اور ضیاء الدین احمد خاں اہل وعیال سمیت تین ہاتھیوں اور چالیس گھوڑوں کے ساتھ لوہارو کی طرف روانہ ہو گئے۔ آرام کی غرض سے دو تین روز کے لئے مہرولی میں ٹھہرے۔ اس اثنا میں لشکریوں نے ان کا سارا سامان لوٹ لیا اور صرف تین ہاتھی باقی رہ گئے۔ بے سروسامانی کے عالم میں دوجانہ پہنچے جہاں کے رئیس حسن علی خاں نے ان کے ساتھ وہ سلوک کیا جو بادشاہ ایران نے ہمایوں کے ساتھ کیا تھا۔ کمشنر دہلی کو ان کے حالات کی اطلاع ملی تو امین الدین اور ضیاالدین کو اپنے پاس بلا لیا اور درشت گفتگو کی لیکن نرم جواب سن کر کچھ نہ کہا۔ ایوان خانسامانی کے پہلو میں قلعہ میں ٹھہرنے کا حکم دیا۔ جو سامان ساتھ لے کر نکلے تھے وہ مہرولی میں غارت گروں کی نذر ہوا۔ دہلی میں ان کے مکان میں پتھروں اور اینٹوں کے سوا کوئی چیز باقی نہ رہی۔ زر وسیم اور گستردنی و پوشیدنی کے نقصان کا اندازہ مشکل ہے۔

دوسرے رؤسا کی گرفتاری

دو تین روز کے بعد عبدالرحمٰن خاں والی جھجھر کو پکڑ لائے اور دیوان عام ٹھہرایا۔ ۳۰ اکتوبر کو احمد علی خاں والی فرخ نگر کو لے آئے۔ ۲ نومبر کو بہادر جنگ خاں والی بہادر گڑھ گرفتار ہوتے اور ۷ نومبر کو راجہ ناہر سنگھ والی بلب گڑھ اسیر ہو کر آئے۔ دہلی کے ماتحت سات جاگیرداریاں تھیں جنہیں ریاست ہفت گانہ کہتے

[1] بیان کیا جاتا ہے کہ کرنیل نے غالب سے پوچھا تھا کہ تم مسلمان ہو؟ جواب دیا کہ آدھا، شراب پیتا ہوں سور نہیں کھاتا۔

تھے۔ یعنی لوہارو جھجر۔ بہادر گڑھ۔ بلب گڑھ، فرخ نگر۔ دوجانہ اور پاٹودی۔ پانچ جاگیردار پکڑے آئے بقیہ دو معرض بیم میں تھے یعنی رئیسان دوجانہ و پاٹودی۔

حسام الدین حیدر خاں کے خاندان کی تباہی	مظفر الدولہ سیف الدین حیدر خاں اور معین الدولہ ذوالفقار الدین حیدر خاں حسین مرزا جو حسام الدین حیدر خاں کے فرزند اور شہر کے

معزز آدمیوں میں سے تھے اپنا بھرا گھر چھوڑ کر زن و فرزند سمیت باہر نکل گئے۔ گھر لٹ گیا بیش بہا ساز و سامان غارت گروں نے اٹھا لیا، بعد ازاں مکان کو آگ لگا دی غارت گری سے جو کچھ بچا تھا وہ آگ کی نذر ہو گیا۔

باشاہ اور شہزادے	شہزادوں اور بادشاہ کے متعلق لکھتے ہیں،

از شہزادگاں بیروں ازیں نتواں سرود کہ اندے را اژدہائے مرگ بہ دہان زخم گلولہ تفنگ فرو بردو چندے را جسم بند چاتو بہ کشاکش رسن رواں در تن فسرد۔ افسردۂ چندا ازاں میان زنداں نشین اند و شمردۂ چند ازاں دودماں آوارۂ روئے زمین۔ بہ بادشاہ اژگ آرامگاہ کہ ماتم زدہ ناب و توان است فرمان گیرودار بہ انداز بازپرس روان است۔

یعنی شہزادے یا گولی سے مارے گئے یا پھانسی پا گئے۔ جو باقی بچے وہ یا تو قید ہو گئے یا چھپ چھپا کر بھاگ نکلے اور آوارہ و سرگرداں پھر رہے ہیں۔ بادشاہ ضعیف و ناتواں پر مقدمہ چل رہا ہے۔ جھجر، بلب گڑھ اور فرخ نگر کے رؤسا کو ایک ایک کر کے پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ غالب کس درد سے لکھتے ہیں :۔

گوئی بدانسان کشتند کہ کس نیارد گفت خون ریختند۔

مسلمانوں پر سختیاں	جنوری ۱۸۵۸ء میں ہندوؤں کو شہر میں آباد ہونے کی اجازت

مل گئی لیکن غالب فرماتے ہیں :۔

مسلمانان از خانماں آوارہ را از بسکہ از رستن سبزہ در و دیوار خانہ ہائے آناں سبز است ہر دم از زبان سبزۂ سر دیوان این نوا بہ گوش مے خورد کہ "جائے مسلمانان سبز است"۔

مسلمانوں پر سختی کی کیفیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ جب کسی شخص نے حاکم شہر کے پاس شکایت کی کہ شریف خانی خاندان کا مکان مہاراجہ پٹیالہ کی حفاظت میں ہونیکے باعث مسلمانوں کی جائے پناہ بن گیا ہے، ممکن ہے اس میں باغی بھی چھپے بیٹھے ہوں تو ۲ر فروری ۱۸۵۸ء کو سپاہیوں کا ایک دستہ مکان پر پہنچا اور حکیموں کو ساٹھ آدمیوں سمیت لے گیا۔ ۵ر فروری کو حکیم محمود خاں، حکیم مرتضےٰ خاں اور انکے عم زاد بھائی عبدالحکیم خاں عرف کالے حکیم صاحب رہا ہو کر آ گئے۔ چند روز کے بعد کچھ اور آدمی چھوٹ آئے۔ بقیہ اپریل میں رہا ہوئے۔

۲۷ر فروری ۱۸۵۸ء کے حالات

۲۷ر فروری کے واقعات میں لکھتے ہیں:۔

چوں روز شب گشت وازاں شب سہ بہرہ گزشت درد دل داد خواہاں بر ماہ شب افروز بدانساں راہ گرفت کہ نگرندگاں بے خواست فغاں برداشتند کہ ماہ گرفت تا دانی کہ دریں شہر زنداں از شہر بیروں است نوا خانہ اندروں دریں ہر دو جا آنمایہ مردم را بہم در آوردند کہ پنداری پیکر در پیکر ہے خزد شمارہ آناں کہ ازیں ہر دو بندی خانہ در روزہائے ہمانا نہ بہ پیچش ریسمان جاں باختہ اند (یعنی پھانسی پا گئے) فرشتہ (عزرائیل) جانستاں مے اند

غدر ۱۱ر مئی ۱۸۵۷ء کو ہوا۔ ۱۸ر ستمبر کو انگریز دوبارہ دہلی پر قابض ہو چکے تھے لیکن غالب ۲۷ر فروری ۱۸۵۸ء کے حالات میں لکھتے ہیں:۔

مسلمانان در شہر از ہزار کس افزوں نیابی۔ نامہ نگار (غالب) نیز دراں ہزار یکے است۔

گویا پانچ ماہ دس روز گذر چکنے کے بعد بھی مسلمانوں پر سختی کا یہ عالم تھا کہ شہر میں ان کی تعداد ایک ہزار سے زیادہ نہ تھی۔ غالب لکھتے ہیں کہ کچھ مسلمان اس قدر دور نکل گئے تھے کہ گویا وہ دہلی کے باشندے ہی نہ تھے۔ بہت سے شہر کے ارد گرد دو دو چار چار کوس پر گڑھوں، چھپروں اور کچے مکانوں میں اپنے نصیبے کی طرح سوئے پڑے تھے۔

قیمتی اشیا لُٹ گئیں

غالب امیر آدمی نہ تھے۔ ان کا گزارا پنشن اور تنخواہ پر تھا۔ آمدنی کے یہ دونوں ذریعے غدر کے ساتھ ہی مسدود ہو گئے تھے۔ اثاثہ بیت میں سے جو قیمتی چیزیں پاس تھیں۔ ان کی کیفیت سُن لیجیے۔

کہ بانو (یعنی بیگم غالب) بے آنکہ بہ من گوید چیز ہائے گراں ارز از زیور و رخت ہر چہ داشت نہانی در خانۂ کالے صاحب، پیرزادہ فرستاد تا در آنجا در نہانخانہ نگاہ داشتند و در بہ گل اپناشتند چوں لشکر آرایاں شہر را کشودند و لشکریان فرمان یغما یافتند، رازداں آں راز با من در میان نہاد کار از دست رفتہ بود و رفتن و آوردن را گنجائی نہ ماندہ۔ تن زدم و خود را بداں فریفتم کہ چوں تقدیر چنیں بود، نیک است کہ از خانہ من نہ رفت۔

اس کے بعد فرماتے ہیں کہ پنشن کا سر رشتہ گم ہے اوڑھنے بچھونے کی چیزیں بیچ بیچ کر تن پروری کر رہا ہوں۔ دوسرے روٹی کھاتے ہیں اور میں کپڑا کھاتا ہوں۔ اب اندیشہ یہ ہے کہ جب کپڑے ختم ہو جائیں گے تو برہنگی اور گرسنگی دونوں کا شکار ہو جاؤں گا۔

بہادر جنگ اور لوہارو والوں کا فیصلہ

بہادر جنگ خاں رئیس بہادر گڑھ کا فیصلہ ۷ رجون ۱۸۵۸ء کو ہوا۔ اُن کی ریاست چھن گئی، ایک ہزار روپیہ ماہانہ پنشن مقرر ہوئی اور انہیں لاہور روانہ کر دیا گیا۔ امین الدین احمد خاں اور ضیاء الدین احمد خاں بیگناہ ثابت ہوئے اور ان کی ریاست واپس مل گئی۔ لیکن یہ واقعہ "دستنبو" میں مذکور نہیں جو جولائی ۱۸۵۸ء تک کے واقعات پر مشتمل ہے اور لوہارو کی جاگیر جولائی کے بعد واگزار ہوئی۔

ناقابل بیان مصیبتیں

اب اردو مکاتیب میں غدر کے واقعہ ہائلہ کی نوحہ خوانی ملاحظہ فرمایئے۔ ابتدائی تحریرات اگرچہ بہت مجمل ہیں لیکن بے حد درد انگیز ہیں مثلاً حکیم غلام نجف خاں کو لکھتے ہیں اور اردو میں غدر کے متعلق غالب کی شاید یہ پہلی تحریر ہے

میاں حقیقت حال اس سے زیادہ نہیں ہے۔ کہ اب تک جیتا ہوں۔ بھاگ نہیں گیا۔ نکالا نہیں گیا۔ لٹا نہیں۔ کسی محکمہ میں اب تک بلایا نہیں گیا۔ معرض بازپرس میں نہیں آیا۔ آیندہ دیکھئے کیا ہوتا ہے۔

پھر ۲۶ر دسمبر ۱۸۵۷ء کے مکتوب میں لکھتے ہیں،

انصاف کرو لکھوں تو کیا لکھوں؟ کچھ لکھ سکتا ہوں یا لکھنے کے قابل ہے؟ تم نے جو مجھ کو لکھا تو کیا لکھا۔ اور اب میں جو لکھتا ہوں تو کیا لکھتا ہوں۔ بس اتنا ہی ہے کہ اب تک تم ہم جیتے ہیں۔ زیادہ اس سے نہ تم لکھو گے، نہ میں لکھوں گا۔

۹ر جنوری ۱۸۵۸ء کے ایک مکتوب میں حالات دہلی کی بے یقینی کا نقشہ ان لفظوں میں کھینچتے ہیں،

جو دم ہے غنیمت ہے۔ اس وقت تک مع عیال و اطفال جیتا ہوں۔ بعد گھڑی بھر کے کیا ہو کچھ معلوم نہیں۔ قلم ہاتھ میں لئے پر جی بہت کچھ لکھنے کو چاہتا ہے مگر کچھ لکھ نہیں سکتا۔ اگر مل بیٹھنا قسمت میں ہے تو کہہ لیں گے، ورنہ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ہولناک انقلاب غدر ایک زلزلہ تھا، جس نے سب کچھ زیر و زبر کر ڈالا تھا۔ غالب کے دل پر اس انقلاب کا اتنا گہرا اثر ہوا کہ غدر سے پیشتر کے دور اور بعد کے دور کو دو الگ الگ عالم سمجھنے لگے تھے، یا کہنا چاہیئے کہ ہندوؤں کے اسلوب تعبیر کے مطابق جون بدل گئی تھی، جنم تبدیل ہو گیا تھا۔ ہرگوپال تفتہ کو لکھتے ہیں،

صاحب تم جانتے ہو کہ یہ کیا معاملہ ہے اور کیا واقعہ ہوا؟ وہ ایک جنم تھا جس میں ہم تم باہم دوست تھے اور طرح طرح کے ہم میں تم میں معاملات مہر و محبت در پیش آئے، شعر کہے، دیوان جمع کئے۔ اس زمانے میں ایک بزرگ تھے اور ہمارے تمہارے دلی دوست تھے۔ منشی نبی بخش ان کا نام اور حقیر ان کا تخلص۔ نہ وہ زمانہ رہا، نہ وہ اشخاص، نہ وہ معاملات، نہ وہ اختلاط، نہ وہ انبساط۔ بعد چند مدت کے پھر دوسرا جنم ہم کو ملا۔ اگرچہ صورت اس جنم کی بعینہ مثل پہلے جنم کے ہے، یعنی ایک خط میں نے منشی صاحب کو بھیجا، اس کا جواب آیا۔ ایک خط تمہارا کہ تم بھی موسوم بہ منشی ہرگوپال و متخلص بہ تفتہ ہو اور میں جس شہر میں رہتا ہوں اس کا نام دلی اور اس محلے کا نام بلی ماراں کا محلہ، لیکن ایک دوست اس جنم کے دوستوں سے

نہیں پایا جاتا۔

پھر اپنی حالت لکھتے ہیں کہ میں حکیم محمد حسن خاں کے مکان میں رہتا ہوں دیوار بہ دیوار حکیموں کے گھر ہیں جو راجہ نریندر سنگھ والی پٹیالہ کے ملازم ہیں:

راجہ نے صاحبان عالی شان سے عہد لیا تھا کہ بوقت غارت دہلی یہ لوگ محفوظ رہینگے چنانچہ بعد فتح راجہ صاحب کے سپاہی یہاں آ بیٹھے اور یہ کوچہ محفوظ رہا ورنہ میں کہاں اور یہ شہر کہاں۔

| ہمہ گیر ویرانی | ویرانی شہر کی کیفیت یوں بیان فرماتے ہیں،۔

مبالغہ نہ جاننا، امیر غریب سب نکل گئے۔ جو رہ گئے وہ نکالے گئے۔ جاگیردار پنشن دار دولت مند اہل حرفہ کوئی بھی نہیں مفصل لکھتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ ملازمان قلعہ پر شدت ہے۔ بازپرس اور دار وگیر میں مبتلا ہیں مگر وہ لوگ جو اس ہنگام میں نوکر ہوئے ہیں اور ہنگامہ میں شریک رہے ہیں:

| غدر سے بے تعلقی | غالب نے اگرچہ غدر میں کوئی حصہ نہیں لیا تھا تاہم قلعہ کے ساتھ ملازمت کا تعلق بہرحال موجود تھا۔ اس لئے اپنی بے گناہی اور سرکشوں سے بے تعلقی کا پہلو ابھارنے کے لئے اس دیرینہ تعلق کو بھی بے حقیقت ظاہر کر رہے ہیں۔ فرماتے ہیں:

میں غریب شاعر دس برس سے تاریخ لکھنے اور شعر کی اصلاح دینے پر متعین ہوا ہوں خواہی اس کو نوکری سمجھو خواہی مزدوری۔ اس فتنہ و آشوب میں کسی مصلحت میں میں نے دخل نہیں دیا۔ اور نظر اپنی بے گناہی پر شہر سے نکل نہیں گیا۔ میرا شہر میں ہونا حکام کو معلوم ہے۔ مگر چونکہ میری طرف بادشاہی دفتر میں سے یا مخبروں کے ہاں سے کوئی بات نہیں پائی گئی لہٰذا طلبی نہیں ہوئی۔ ورنہ جہاں بڑے بڑے جاگیردار بلائے گئے۔ (مثلاً لوہارو والے) یا پکڑے ہوئے (مثلاً جھجر، بلب گڑھ، بہادر گڑھ، فرخ نگر،

والے) آئے ہیں، میری کیا حقیقت ہے۔

مارشل لاء

شہر کی ویرانی کا نوحہ ایک اور جگہ ان الفاظ میں لکھتے ہیں:

اپنے مکان میں بیٹھا ہوں، دروازے سے باہر نہیں نکل سکتا۔ سوار ہونا اور کہیں جانا تو بڑی بات ہے۔ رہا یہ کہ کوئی میرے پاس آوے، شہر میں ہے کون جو آوے، گھر کے گھر بے چراغ پڑے ہیں۔ مجرم سیاست پاتے جاتے ہیں۔ جرنیلی بندوبست (مارشل لاء) یازدہم مئی سے آج تک یعنی شنبہ پنجم دسمبر ۱۸۵۷ء تک بدستور ہے۔ کچھ نیک و بد کا حال مجھ کو نہیں معلوم، بلکہ ہنوز ایسے امور کی طرف حکام کی توجہ ہی نہیں۔ دیکھئے انجام کیا ہوتا ہے۔

قلزم خوں میں شناوری

چودھری عبدالغفور خاں سرور مارہروی کو لکھتے ہیں:

میں مع زن و فرزند ہر وقت اسی شہر میں قلزم خون کا شناور رہا ہوں۔ دروازے سے باہر قدم نہیں رکھا۔ نہ پکڑا گیا، نہ قید ہوا، نہ مارا گیا۔ کیا عرض کروں میرے خدا نے مجھ پر کیسی عنائت کی اور کیا نفس مطمئنہ بخشا۔ مال و آبرو میں کوئی فرق نہیں آیا۔

انگریز افسروں سے نہ ملے

غالب نے غدر کے بعد خود بھی کسی انگریز افسر سے ملنے کی کوشش نہیں کی حالانکہ دار و گیر کے زمانہ میں اکثر لوگ اپنے بچاؤ کے لئے جھوٹے افسانے بنا بنا کر حکام کی نظروں میں اعتبار حاصل کر رہے تھے۔ جعلساز مخبروں کا بہت زور ہو گیا تھا۔ بہتیرے ان مخبروں ہی کی غلط بیانیوں کے باعث پھانسی پا گئے۔ غالب لکھتے ہیں:

فراری نہیں ہوں، روپوش نہیں، بلایا نہیں گیا۔ دار و گیر سے محفوظ ہوں۔ کسی طرح کی باز پرس ہو تو بلایا جاؤں گا۔ مگر ہاں جیسا بلایا نہیں گیا خود بھی بروئے کار نہیں آیا۔ کسی حاکم سے نہیں ملا۔ خط کسی کو نہیں لکھا۔ کسی سے درخواست ملاقات نہیں کی۔ مئی سے پنشن بند ہے۔ کہو یہ دس مہینے کیونکر گزرے ہونگے۔ انجام کچھ نظر نہیں آتا کہ کیا ہوگا۔

مسلمان ہدفِ ستم تھے

جیسا کہ "دستنبو" میں بیان ہو چکا ہے مسلمانوں پر سب سے بڑھ کر سختی تھی۔ غالب فرماتے ہیں :۔

واللہ ڈھونڈھے کو مسلمان اس شہر میں نہیں ملتا۔ کیا امیر، کیا غریب، کیا اہل حرفہ، اگر کچھ ہیں تو باہر کے ہیں۔ ہنود البتہ کچھ کچھ آباد ہو گئے ہیں :۔

یعنی شہر سے نکلنے میں ہندو اور مسلمان برابر تھے لیکن آبادی میں ہندوؤں کے ساتھ رعایت برتی گئی اور مسلمانوں پر بدستور سختی اور شدت جاری رہی ایک اور جگہ لکھتے ہیں :۔

ابھی دیکھا چاہیئے مسلمانوں کی آبادی کا حکم ہوتا ہے یا نہیں۔

بلا اجازت قیام کی ممانعت

غدر کے بعد کچھ مدت تک یہ حالت رہی کہ نہ باہر سے کوئی شخص بے اجازت شہر میں آ سکتا تھا اور نہ بے اجازت قیام کر سکتا تھا۔ اسی زمانے میں چودھری عبد الغفور خاں سرور مارہروی نے غالب سے ملنے کے لئے دلّی آنے کا قصد کیا لیکن چودھری صاحب کے چچا نے انہیں روک دیا۔ یہ حالات غالب کو معلوم ہوئے تو لکھا :

آپ کے چچا صاحب نے کرامت کی جو آپ کو منع کیا۔ ڈاک کی سواری پر اگر اس شہر میں میرے مکان تک آجاتے تو ممکن تھا، مگر رہنا شہر میں بے حصول اجازت حاکم احتمال ضرر رکھتا ہے۔ اگر خبر نہ ہو تو نہ ہو اگر خبر ہو جائے تو البتہ قباحت ہے زنہار کبھی گمان نہ کیجیے گا کہ دلّی کی عملداری میرٹھ، آگرہ یا بلاد شرقیہ کی مثل ہے۔ یہ پنجاب احاطہ میں شامل ہے، نہ قانون نہ آئین۔ جس حاکم کی جو رائے ہو وہ ویسا ہی عمل کرے۔

دہلی والوں پر مسلسل جو سختیاں ہو رہی تھیں ان کی کیفیت ایک مکتوب میں یوں بیان فرماتے ہیں :۔

رفع فتنہ و فساد اور بلاد میں مسلّم، یہاں کوئی طرح آسائش کی نہیں ہے۔ اہل دہلی عموماً بُرے ٹھہر گئے ہیں۔ یہ داغ ان کی جبین حال سے عموماً مٹ نہیں سکتا۔

میر مہدی مجروح نے پنشن کے متعلق پوچھا لکھتے ہیں :

کیسا پنشن اور کہاں اس کا ملنا، یہاں جان کے لالے پڑے ہوئے ہیں ،

ہے موجزن اک قلزم خوں، کاش یہی ہو
آتا ہے ابھی دیکھئے کیا کیا میرے آگے

اگر زندگی ہے اور پھر مل بیٹھیں گے تو کہانی کہی جائے گی ۔

شہر سے باہر کے مکانوں کا انہدام

مسلمانوں کو مدت تک شہر میں آنے کی اجازت نہ ملی، ناچار بعض نے شہر سے باہر مکان بنانے شروع کر دیئے۔ لیکن حکم ہوا کہ یہ مکان منہدم کر دیئے جائیں۔ غالب لکھتے ہیں :

کل سے یہ حکم نکلا کہ یہ لوگ شہر سے باہر مکان دکان کیوں بناتے ہیں، جو مکان بن چکے ہیں انہیں گرا دو اور آیندہ کو ممانعت کا حکم سنا دو ...... آج تک یہ صورت ہے دیکھئے شہر کے بسنے کی کونسی صورت ہے۔ جو رہتے ہیں وہ بھی اخراج کئے جاتے ہیں یا جو باہر پڑے ہیں وہ شہر میں آ گئے ہیں۔ الملک اللہ والحکم اللہ

شہر کی آبادی کی افواہ

اواخر دسمبر ۱۸۵۸ء میں افواہ اُڑی تھی کہ جنوری ۱۸۵۹ء سے سب لوگوں کو شہر میں آباد ہونے کی اجازت مل جائے گی۔ غالب کہتے ہیں :

خلق نے از روئے قیاس جیسا کہ دہلی کے خبر تراشوں کا دستور ہے، یہ بات اُڑا دی ہے اور سارے شہر میں شہرہ ہے کہ جنوری شروع سال ۱۸۵۹ء میں لوگ عموماً شہر میں آباد کئے جائیں گے اور پنشن داروں کو جھولیاں بھر بھر کر روپے دیئے جائیں گے۔ خیر آج بدھ کا دن ۲۲ دسمبر کی ہے۔ اب کے شنبہ کو بڑا دن اور اگلے شنبہ کو جنوری کا پہلا دن ہے اگر جیتے ہیں تو دیکھ لیں گے ۔

یہ افواہ غلط نکلی۔ کافی دیر کے بعد پہلے یہ حکم ہوا کہ صرف مالکان مکان شہر میں آباد ہوں، کرایہ دار آباد نہ ہوں۔ بعد ازاں کرایہ داروں کو بھی آبادی کی اجازت ملی

غالب ۹ر نومبر ۱۸۵۹ء کے مکتوب میں لکھتے ہیں :-

آگے حکم تھا کہ مالکان مکان رہیں کرایہ دار نہ رہیں پرسوں سے حکم ہو گیا کہ کرایہ دار بھی رہیں کہیں یہ نہ سمجھنا کہ تم یا میں یا کوئی اور اپنے مکان میں کرایہ دار کو آباد کرے۔ وہ لوگ جو گھر کا نشان نہیں رکھتے اور ہمیشہ کرایہ کے مکان میں رہتے تھے، وہ بھی آ رہیں مگر سرکار کو کرایہ دیں۔

شہر کے دروازوں پر پہرے

انگریز ۱۸ر ستمبر ۱۸۵۷ء کو دہلی پر دوبارہ قابض ہو گئے تھے۔ لیکن جنوری ۱۸۵۹ء تک شہر کے دروازوں پر پہرے بیٹھے ہوئے تھے۔ غالب اواخر جنوری ۱۸۵۹ء میں نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ سے ملنے کیلئے میرٹھ گئے تھے۔ تین چار روز کے بعد واپس آئے، تو ایک خط میں مجروح کو لکھتے ہیں :-

روز اس شہر میں ایک حکم نیا ہوتا ہے
کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ کیا ہوتا ہے

میرٹھ سے آکر دیکھا کہ یہاں بڑی شدت ہے اور یہ حالت ہے کہ گوروں کی پاسبانی پر قناعت نہیں۔ لاہوری دروازہ کا تھانہ دار مونڈھا بچھا کر سڑک پر بیٹھتا ہے، جو باہر کے گورے کی آنکھ بچا کر آتا ہے اس کو پکڑ کر حوالات میں بھیج دیتا ہے۔ حاکم کے ہاں پانچ پانچ بید لگتے ہیں، یا دو روپیہ جرمانہ لیا جاتا ہے۔ آٹھ دن قید رہتا ہے۔

ان کوائف کا اندازہ کیجئے اور سوچیئے کہ اہل شہر کی کیا حالت ہو گی :-

ایک اور خط میں جو اواخر مارچ ۱۸۵۹ء کا ہے، فرماتے ہیں :

اوائل ماہ انگریزی میں روک ٹوک کی شدت ہوتی تھی، آٹھویں دسویں سے وہ شدت کم ہو جاتی تھی۔ اس مہینے میں برابر وہی صورت ہے۔

پھر لکھتے ہیں :

شہر کی آبادی کا حکم عام ہوا۔ کرایہ کو مکان ملنے لگے۔ چار پانسو گھر آباد ہو گئے تھے کہ پھر وہ

قاعدہ مٹ گیا۔ اب خدا جانے کیا دستور جاری ہوا ہے۔

مسلمانوں کے املاک	دسمبر ۱۸۵۹ء کے آخر میں مسلمانوں کی ملکیتیں واگزار ہوئیں۔

غالب فرماتے ہیں:

مسلمانوں کی املاک کی واگزاشت کا حکم عام ہوگیا ہے۔ جن کو کرایہ پر ملی ہیں ان کو کرایہ معاف ہوگیا ہے۔ آج یک شنبہ یکم جنوری ہے۔ پہر دن چڑھا ہے کہ تم کو (مہدی مجروح کو) یہ خط لکھ رہا ہوں اگر مناسب جانو تو آؤ۔ اپنی املاک پر قبضہ پاکر چاہو یہیں رہو، چاہو چلے جاؤ۔

شراب ناپید تھی	غالب کے لئے غدر کے بعد ایک بڑی مصیبت یہ تھی کہ شراب

نہیں ملتی تھی یا بہت گراں ملتی تھی۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:

نہ کہیں جانے کا ٹھکانا ہے نہ کوئی میرے پاس آنے والا ہے۔ وہ عرق جو بہ قدر ضرورت طاقت بنائے رکھتا تھا، میسر نہیں۔

۱۲ر دسمبر ۱۸۵۸ء کے خط میں بابو گوبند سہائے کو لکھتے ہیں:

دو قسم کی انگریزی شراب ایک تو کاس ٹیلن اور ایک اولڈ ٹام میں ہمیشہ پیا کرتا تھا اور یہ دونوں قسم بیس روپے حد چوبیس روپے درجن آتی تھی۔ اب یہاں پہلے تو نظر ہی نہیں آتی تھی۔ اب پچاس روپے اور ساٹھ روپے درجن آتی ہے۔ وہاں سے تم دریافت کرو اس کا نرخ کیا ہے اور یہ بھی معلوم کرو کہ بہ طریق ڈاک پہنچ سکتی ہے۔ یا نہیں۔ جاڑوں میں مجھ کو بہت تکلف ہے۔ یہ گڑ چھال کی شراب میں نہیں پیتا۔ یہ مجھ کو مضرت کرتی ہے اور مجھے اس سے نفرت ہے۔

سلہ ایک قصیدہ میں فرماتے ہیں

شراب قندی ہندوستان دماغم سوخت زشیرہ خانہ کشمیر آورند شراب

دوسری جگہ لکھتے ہیں،

غالب شراب قندی ہندم دماغ سوخت زیں بعد بادہ ہائے گوارا کشیدہ باد

محکمہ معاوضہ | کچھ مدت گزر جانے کے بعد ایک محکمہ معاوضہ قائم ہوا تھا:

ایک محکمہ لاہور میں معاوضہ نقصان رعایا کے واسطے قائم ہوا ہے اور حکم یہ ہے کہ
رعیت کا مال جو کالوں نے لوٹا ہے البتہ اس کا معاوضہ بہ حساب وہ یک (دس روپے میں
سے ایک روپیہ) سرکار سے ہوگا یعنی ہزار میں سے ایک سو روپے ملیں گے اور جو گوروں
کے وقت کی غارت گری ہے وہ ہدر اور بحل ہے۔ اس کا معاوضہ نہ ہو گا۔

ظاہر ہے کہ کالوں کے ہاتھوں وہی لوگ لٹے ہوں گے جو انگریزوں کے وفادار تھے یا جن پر وفاداری کا شبہ ہو سکتا تھا۔ ان کو معاوضہ ⅒ ملا جو لوگ گوروں کے ہاتھوں لٹے وہ زیادہ تر بے قصور تھے۔ غدر میں کوئی حصہ نہیں لیا تھا۔ البتہ وہ دہلی کے باشندے تھے۔ اور غدر ہو جانے پر بھی شہر کی سکونت ترک نہیں کی تھی۔ مثلاً خود غالب کے بھائی کا مکان لٹا، بیگم کا زیور اور دوسری قیمتی چیزیں لٹیں۔ لوہارو والوں کا گھر لٹا۔ حالانکہ ان میں سے کوئی بھی انگریزوں سے باغی نہ تھا۔ اور نہ غدر میں کسی نے سرکشوں کا ساتھ دیا۔ ان لوگوں کو کوئی معاوضہ نہ ملا۔

دوستوں کے مفارقت کا قلق | غالب کو ایک بڑا رنج اس بات کا تھا کہ ان کے اکثر دوست اور ملنے والے غدر میں مارے گئے یا تباہ ہو گئے۔ فرماتے ہیں:

کوئی یہ نہ سمجھے کہ اپنی بے رونقی اور تباہی کے غم میں مرتا ہوں جو دکھ مجھ کو ہے اس کا بیان
تو معلوم مگر اس بیان کی طرف اشارہ کرتا ہوں۔ انگریز کی قوم میں سے جو ان روسیاہ کالوں
کے ہاتھوں قتل ہوئے ان میں سے کوئی میرا امید گاہ تھا اور کوئی میرا شفیق اور کوئی میرا
دوست، اور کوئی میرا یار، اور کوئی میرا شاگرد۔ ہندوستانیوں میں کچھ عزیز، کچھ دوست
کچھ شاگرد، کچھ معشوق۔ سو وہ سب کے سب خاک میں مل گئے۔ ایک عزیز کا ماتم کتنا سخت
ہوتا ہے جو اتنے عزیزوں کا ماتم دار ہو اس کو زیست کیوں کر نہ دشوار ہو۔ ہائے اتنے یار مرے کہ

جواب میں مروں گا تو میرا کوئی رونے والا بھی نہیں ہوگا۔

پھر لکھتے ہیں:

بھائی وہ زمانہ آیا ہے کہ سینکڑوں عزیز راہی ملک عدم ہو گئے۔ سینکڑوں ایسے مفقود الخبر ہوئے کہ انکی مرگ و زیست کی خبر نہیں جو دو چار باقی رہے ہیں خدا جانے کہاں بستے ہیں کہ ہم انکو دیکھنے کو ترستے ہیں۔

ایک اور خط میں فرماتے ہیں:-

ہزار ہا دوست مر گئے۔ کس کس کو یاد کروں اور کس سے فریاد کروں، جیوں تو کوئی غمخوار نہیں اور مروں تو کوئی عزادار نہیں۔

ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے:

سینکڑوں بلکہ ہزاروں دوست اس باسٹھ برس میں مر گئے۔ خصوصاً اس فتنہ و آشوب میں (غدر میں) تو شاید میرا کوئی جاننے والا نہ بچا ہوگا۔

غالب بہت معزز تھے۔ تمام حکام ان سے دوستانہ ملتے تھے لیکن غدر میں ہر شے منقلب ہو گئی، نہ وہ حکام جن کو میں جانتا تھا نہ وہ عملہ جن سے میری ملاقات تھی۔ نہ وہ عدالت کے قواعد ہیں جن کو پچاس برس میں نے دیکھا ہے۔ ایک کونے میں بیٹھا ہوا نیرنگ روزگار کا تماشا دیکھ رہا ہوں یا حافظ و یا حفیظ ورد زباں ہے۔

فقرا اور اصحاب اسلحہ پر پابندی

جب خاص پابندیاں اٹھ گئیں اور شہر میں آمد و رفت کی اجازت ہو گئی تو فقیروں اور ہتھیار والوں کو اس اجازت سے مستثنیٰ رکھا گیا تھا۔

فقیر اور ہتھیار جس پاس ہو وہ نہ آئے باقی ہندو مسلمان عورت مرد، سوار پیادہ جو چاہے چلا جائے چلا آئے مگر بغیر اجازت کے رات کو شہر میں رہنے نہ پائے۔

شہر میں کون تھا

اسی زمانے میں منشی شیو نرائن آرام نے آگرہ سے اخبار نکالا تھا اور غالب سے بھی التدعا کی تھی کہ کچھ خریدار فراہم کیے جائیں۔ جواب میں ارشاد ہوتا ہے:

یہاں آدمی کہاں ہیں کہ اخبار کے خریدار ہوں مہاجن لوگ جو یہاں بستے ہیں وہ یہ ڈھونڈتے پھرتے ہیں کہ گیہوں کہاں سستے ہیں بہت سخی ہو گئے تو جنس پوری دیں گے، کاغذ اخبار لینے بیچنے کا کیوں مول لیں گے۔

غالب کے کمالات نگارش کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ ضمناً بعض نہایت اہم باتیں فرما جاتے ہیں۔ مثلاً خریداری اخبار کے ضمن میں مہاجنوں کے کیرکٹر کا پورا نقشہ چند الفاظ میں کھینچ دیا۔

ایک اور خط میں اسی قسم کی خواہش کا جواب یوں دیتے ہیں:

مسلمان امیروں میں تین آدمی: حسن علی خاں[۱]، نواب حامد علی خاں[۲]، حکیم احسن اللہ خاں[۳]، سو ان کا یہ حال کہ روٹی ہے تو کپڑا نہیں۔ معتمد ایہاں کی اقامت میں تذبذب۔ خدا جانے کہاں جائیں کہاں رہیں۔ حکیم احسن اللہ خاں نے آفتاب عالمتاب کی خریداری کر لی ہے۔ اب وہ مکرر حالات دربار شاہی کیوں لیں گے۔ سوا ساہوکاروں کے یہاں کوئی امیر نہیں، وہ لوگ اس طرف کیوں توجہ کریں۔

ٹکٹ دہلی کی فتح کے بعد اول کسی کو شہر میں آباد ہونے کی اجازت نہ تھی۔ پہلے ہندوؤں کو اجازت ملی۔ بہت دیر بعد مسلمان مکانداروں کو اجازت ملی۔ آخر میں کرایہ داروں کو بھی اجازت مل گئی کہ شہر میں رہیں۔ لیکن کرایہ سرکار کو دیں۔ اسی دوران میں ٹکٹ بھی جاری ہو گئے تھے جن کے بغیر شہر میں جانے یا باہر نکلنے یا پھرنے کی اجازت نہ تھی۔ ان کی قیمت ہر شخص کی حیثیت کے مطابق حاکم خود مقرر کرتا تھا۔

[۱] نجابت علی خاں والی جھجر کے چھوٹے بیٹے تھے۔ اپنے بڑے بھائی فیض محمد خاں کے عہد حکومت میں جرنیل رہے۔ فیض محمد خاں کے انتقال کے بعد انکے بیٹے فیض علی خاں مسند نشین ہوئے تو ان سے اختلاف ہوگیا۔ مقدمہ بازی تک نوبت پہنچی۔ انگریزی حکومت نے صلح کرائی۔ حسن علی خاں کا تین ہزار روپیہ ماہانہ مقرر ہوا۔ جو ریزیڈنسی کی معرفت ملتا تھا اور وہ دہلی میں مقیم ہو گئے۔ غدر کے دنوں میں کبھی کبھی بادشاہ کے پاس جاتے تھے۔ جب انگریز دہلی پر قابض ہوئے تو سب کچھ چھوڑ کر بھاگ گئے۔ کچھ مدت روپوش رہے اور یکم جنوری ۱۸۶۱ء کو واپس آئے۔

[۲] نواب حامد علی خاں، اعتماد الدولہ میر فضل علی خاں وزیر شاہ اودھ کے بھانجے اور داماد تھے۔ میر فضل علی خاں سید تھے۔ ان کے والد میر غلام حسین شاہی فیلبان تھے۔ آداب شاہی میں ایک بات یہ ٹھہر گئی تھی کہ کوئی شخص بادشاہ کی طرف پشت کر کے نہ بیٹھے۔ صرف سید اولاد رسول ہونے کے باعث اس سے مستثنیٰ تھے۔ اس بنا پر فیلبان شاہی کا عہدہ سادات سے مخصوص ہو گیا تھا۔ جب حکومت دہلی کو زوال ہوا میر غلام حسین لکھنؤ چلے گئے۔ جہاں ان کی بہن بادشاہ بیگم کی سرکار میں معلمہ اور مغلانی تھی۔ اسی کی وساطت سے میر صاحب بیگم کے ہاں داروغہ مقرر ہوئے۔ جب بادشاہ بیگم اور معتمد الدولہ آغا میر میں جھگڑا چلا تو میر فضل علی نے وفاداری سے بیگم کا ساتھ دیا اور بڑی تکلیفیں اٹھائیں۔ آخر معتمد الدولہ کی علیحدگی پر میر فضل علی کو عروج حاصل ہوا۔ نائب السلطنت بنے۔ اور اعتماد الدولہ ضیاء الملک سہراب جنگ کا خطاب پایا۔ مارچ ۱۸۳۲ء میں وفات پائی۔ لڑکا کوئی نہ تھا صرف تین لڑکیاں تھیں سامرادہ بیگم، ورحاجی بیگم ایک تیسری۔ پہلی یہ میر حامد علی خاں اور میر حیدر حسین کو بیاہی گئیں تیسری لڑکی جعفری بیگم کی شادی میر محمد علی لکھنوی سے ہوئی۔ میر حامد علی خاں کی بیوی کو باپ کے ترکہ سے نو لاکھ روپیہ ملا۔ اعتماد الدولہ کے انتقال کے بعد حامد علی خاں دہلی چلے آئے۔ روپیہ شاہی خزانہ میں جمع کرا دیا، جس کا سود ساڑھے چار ہزار روپیہ ماہانہ ملتا تھا۔ وہ بہادر شاہ کے [illegible] بھی بن گئے تھے۔ غدر کے بعد چودہ مہینے حوالات میں رہے فروری ۱۸۵۹ء میں رہا ہوئے۔

[۳] بہادر شاہی دربار کے ایک رکن تھے۔ ان کے حالات دوسری جگہ درج ہیں۔

یہ بھی مشہور ہے کہ پانچ ہزار ٹکٹ چھاپے گئے ہیں۔ جو مسلمان شہر میں اقامت چاہے بقدر مقدور نذرانہ دے۔ اس کا اندازہ قرار دینا حاکم کی رائے پر ہے۔ روپیہ دے اور ٹکٹ لے۔

ایک اور خط میں لکھتے ہیں:

اب یہاں ٹکٹ چھاپے گئے ہیں۔ میں نے بھی دیکھے۔ فارسی عبارت یہ ہے "ٹکٹ آبادی درون شہر بہ شرط ادخال جرمانہ"۔ مقدار روپے کی حاکم کی رائے پر۔ آج پانچ ہزار ٹکٹ چھپ چکا ہے کل اتوار تعطیل ہے۔ پرسوں دوشنبہ سے دیکھئے یہ کاغذ کیوں کر تقسیم ہوں۔

تفتہ کو لکھتے ہیں:

یہاں باہر سے اندر کوئی بغیر ٹکٹ کے آنے جانے نہیں پاتا۔ تم زنہار یہاں کا ارادہ نہ کرنا۔

تھانوں پر حکم پہنچ گیا تھا۔ کہ دریافت کرو کون کون بے ٹکٹ مقیم ہے:

تھانوں میں نقشے مرتب ہونے لگے۔ یہاں کا جمعدار میرے پاس بھی آیا۔ میں نے کہا بھائی تو مجھے نقشے میں نہ رکھ۔ میری کیفیت کی عبارت الگ رکھ۔ عبارت یہ کہ: "اسد اللہ بنشن دار ۱۸۵۰ء سے حکیم پٹیالہ والے کے بھائی کی حویلی میں رہتا ہے نہ کالوں کے وقت میں کہیں گیا، نہ گوروں کے وقت میں نکلا اور نکالا گیا۔ کرنیل براؤن صاحب کے زبانی حکم پر اس کی اقامت کا مدار ہے اب تک کسی حاکم نے وہ حکم نہیں بدلا۔ اب حاکم وقت کو اختیار ہے" پرسوں یہ عبارت جمعدار نے محلے کے نقشے کے ساتھ کوتوالی بھیج دی ہے۔

حکیم غلام نجف خاں ان دنوں دوجانہ میں تھے۔ انہوں نے غالب کو دوجانہ کی دعوت دی۔ جواب میں فرماتے ہیں، کہ ٹکٹ کے بغیر باہر نکلنا ممکن نہیں، پھر میں کیوں کر آؤں[1]۔ یوسف میرزا کے نام کے ایک خط میں فرماتے ہیں کہ ٹکٹ موقوف ہو گیا[2]۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خط ۱۸۶۰ء سے پہلے کا نہیں، لیکن اس کی صحیح تاریخ کا تعین مشکل ہے۔

---

[1] اردوئے معلیٰ صفحہ ۱۸۳۔ [2] اردوئے معلیٰ صفحہ ۲۷۱۔

سکوں کا الزام

باغیوں کی حمایت کے متعلق غالب کے خلاف کوئی شہادت موجود نہ تھی۔ لیکن کسی نے کہہ دیا کہ غالب نے بہادر شاہ کے سکّے کہے تھے۔ حالانکہ یہ سکّے ذوق نے شاہ مرحوم کی تخت نشینی کے موقع پر ۱۸۳۷ء میں کہے تھے اور اسی زمانے میں مولانا محمد حسین آزاد کے والد مولوی محمد باقر نے اپنے اخبار میں چھاپ دیئے تھے۔ غالب کو غدر کے بعد اس اخبار کے فائل کی ضرورت پیش آئی۔ تاکہ اپنی بے گناہی کی قطعی شہادت پیش کر سکیں۔ زمانہ اتنا نازک تھا۔ کہ حکام جس کے خلاف شرکت غدر کا الزام سُن لیتے، اسے جلد سے جلد سزا دینے کی کوشش کرتے۔ غالب چودھری عبد الغفور خاں سرور مارہروی کو لکھتے ہیں:-

مولوی باقر دہلوی کے مطبع سے ایک اخبار مہینے میں چار بار نکلتا ہے اُسے "دہلی اُردو اخبار" بعض اشخاص سنین ماضیہ کے اخبار جمع کر رکھتے ہیں۔ اگر احیاناً آپ کے یا آپ کے کسی دوست کے پاس جمع ہوتے چلے آئے ہیں۔ تو اکتوبر ۱۸۳۷ء سے دو چار مہینے کے آگے پیچھے کے اوراق جن میں بہادر شاہ کی تخت نشینی کا ذکر ہو۔ اور میاں ذوق کے دو سکّے ان کے نام کے کہہ کر نذر کرنے کا ذکر مندرج ہو۔ بے تکلف وہ اخبار چھاپہ کا بجنسہ میرے پاس بھیج دیجئے۔ معلوم رہے کہ اکتوبر کی ساتویں آٹھویں تاریخ ۱۸۳۷ء میں یہ تخت پر بیٹھے ہیں۔ اور ذوق نے اسی مہینے میں یا دو ایک مہینے بعد یہ سکّے کہہ کر گزارنے ہیں۔ احتیاطاً چار پانچ مہینے کے اخبار دیکھ لئے جائیں۔ یہاں تک میری طرف سے ابرام ہے۔ کہ اگر بہ شمل کسی اور شہر میں کوئی صاحب آپ کا دوست جامع ہو اور آپ کو اس کا علم ہو۔ تو وہاں سے منگوا بھیجئے۔

چودھری صاحب نے بہت کوشش کی لیکن ناکام رہے۔ غالب نے "جامِ جہاں نما" والوں کو بھی کلکتہ لکھا۔ لیکن "اُردو اخبار" کا مطلوبہ فائل وہاں سے بھی ہاتھ نہ آیا۔ اور اضطراب بدستور باقی رہا۔ چودھری صاحب ہی کو لکھتے ہیں:-

سکّہ کا وار تو مجھ پر ایسا چلا۔ جیسے کوئی چھرا یا گراب۔ کس سے کہوں، کس کو گواہ لاؤں۔ یہ دونوں سکّے ایک وقت میں لکھے گئے ہیں۔ ذوق نے یہ دو سکّے کہہ کر گزارنے۔ بادشاہ نے پسند کئے۔ مولوی محمد باقر جو ذوق کے معتقدین میں سے تھے۔ انہوں نے "دلی اردو اخبار" میں یہ دونوں سکّے چھاپے۔ اس سے علاوہ وہ لوگ موجود ہیں جنہوں نے اس زمانے میں مرشد آباد اور کلکتہ میں یہ سکّے سنے ہیں اور ان کو یاد ہیں۔ اب یہ دونوں سرکار کے نزدیک میرے کہے ہوئے اور گزارے ہوئے ثابت ہوئے۔ میں نے ہر چند قلمرو ہند میں "دلی اردو اخبار" کا پرچہ ڈھونڈا، کہیں ہاتھ نہ آیا۔ یہ دھبہ مجھ پر رہا۔ پنشن بھی گیا۔ اور وہ ریاست کا نام و نشان خلعت دربار بھی مٹا۔ خیر جو کچھ ہوا چونکہ موافق رضائے الٰہی ہے، اس کا گلہ کیا ہے۔

چون جنبش سپہر بہ فرمان داور است

بیداد نبود آنچہ بما ز آسماں رسد

یوسف میرزا کو بھی "اردو اخبار" کی تلاش کے لئے لکھتے ہیں[1]

اپنے دل کو تسلی دینے کا طریق

بہ ہر حال یہ معلوم ہے کہ غالب نے سکّے نہیں کہے تھے۔ لیکن ثبوت نہ مل سکنے کی صورت میں انہوں نے اپنے دل کی تسلی کے لئے بعض عذرات تلاش کر لئے تھے۔ یوسف میرزا کو لکھتے ہیں:۔

میں نے سکہ نہیں کہا۔ اگر کہا تو اپنی جان اور حرمت بچانے کو کہا۔ یہ گناہ نہیں ہے اور اگر گناہ بھی ہے۔ تو کیا ایسا سنگین ہے کہ ملکہ معظمہ کا اشتہار (عفو عام) بھی اسے مٹا نہ سکے؟ سبحان اللہ گولہ انداز کا بارود بنانا اور توپیں لگانا اور بنک گھر اور میگزین کا لوٹنا معاف ہو جائے اور شاعر کے دو مصرعے معاف نہ ہوں۔ ہاں صاحب گولہ انداز کا بھنوٹی مددگار رہے اور شاعر کا سالا بھی جانب دار نہیں۔

[1] اردوئے معلیٰ صفحہ ۲۷۰۔

آخری فقرے میں کیسا بلیغ نکتہ ارشاد فرمایا ہے۔ بہنوئی کو اپنی بیوی کے بھائی کی موت یا مصیبت پر کتنا ہی رنج کیوں نہ ہو لیکن وہ اس رنج کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ جو سالے کو بہن کے خاوند پر آفت نازل ہونے کی حالت میں ہو سکتا ہے۔ غالبؔ اپنے خطوں میں اس قسم کے بلیغ جملے عموماً بے تکلف لکھ جاتے ہیں۔

چونگی کا انتظام | فتح دہلی کے بعد پہلی مرتبہ شہر میں چونگی خانے مقرر ہوئے۔ غالبؔ فرماتے ہیں:

شہر کا حال جانوں کیا ہے۔ پون ٹوٹی کوئی چیز ہے[1]، وہ جاری ہو گئی ہے۔ سوائے اناج اور اُپلے کے کوئی چیز ایسی نہیں۔ جس پر محصول نہ لگا ہو۔

ایک اور مکتوب میں لکھتے ہیں:۔

پون ٹوٹی کے باب میں کونسل ہوئی۔ پرسوں ۷ نومبر سے جاری ہو گئی۔ سالگرام خزانچی، چھنامل، مہیش داس، ان تینوں شخصوں کو یہ کام بہ طریق امانی سپرد ہوا ہے غلّے اور اُپلے کے سوا کوئی جنس نہیں جس پر محصول نہ ہو۔

غلہ کی گرانی | اس زمانے میں غلّہ بہت گراں ہو گیا تھا۔ اس کی کیفیت غالبؔ کی زبان سے سُنئے:۔

غلہ گراں ہے، موت ارزاں ہے۔ میوہ کے مول اناج بکتا ہے۔ ماش کی دال آٹھ سیر۔ باجرہ بارہ سیر، گیہوں تیرہ سیر، چنے سولہ سیر، گھی ڈیڑھ سیر، ترکاری مہنگی۔

ذرا اپنے زمانے کی حالت سامنے رکھ کر اس گرانی کا اندازہ فرمایئے۔ غالبؔ کو کیا معلوم تھا کہ آیندہ چل کر گرانی کے یہ نرخ ارزانی و فراخی کا ایک آرزو انگیز نشان رہ جائیں گے۔ اور واقعی میوہ کے مول اناج بکنے لگے گا۔

---

[1] ٹون ڈیوٹی؟

چراغاں یکم نومبر ۱۸۵۸ء کو دہلی میں چراغاں کا حکم ہوا۔ غالب فرماتے ہیں :-

فقیر بھی اس تہیدستی میں کہ اٹھارہ مہینے سے پنشن مقرری نہیں پایا۔ اپنے مکان پر روشنی کرے گا۔

مختلف عمارتوں کا انہدام انگریزی قبضے کے بعد شہر دہلی کے مختلف حصّوں کا انہدام شروع ہو گیا تھا۔ نئی سڑکیں نکالنے کی تجویز تھی۔ ریل کی سڑک بننے کی افواہ تھی۔ غالب بربادی کا جو منظر پہلے دیکھ چکے تھے، اس کے بعد انہدام شہر ان کے قلب حزیں کے لئے ایک نئی قلق انگیز ضرب بن گیا چنانچہ ان کے مکاتیب اس واقعہ پر ماتم و فغاں سے لبریز ہیں۔ لیکن یہ زارنالی زیادہ تر انہی خطوں میں ملے گی جو یا تو دہلی کے رہنے والوں کو لکھے گئے یا ان لوگوں کو بھیجے گئے جو شہر کے حالات سے پوری طرح آگاہ تھے۔

جامع مسجد کے گرد میدان میر مہدی مجروحؔ کو لکھتے ہیں :

جامع مسجد کے گرد پچیس پچیس فٹ گول میدان نکلے گا۔ دکانیں حویلیاں ڈھائی جائیں گی۔ دارالبقا[1] فنا ہو جائے گی رہے نام اللہ کا۔ خان چند کا کوچہ شاہ بولا کے بڑ تک ڈھے گا دونوں طرف پھاوڑا چل رہا ہے۔

کشمیری کٹڑہ گر گیا پھر فرماتے ہیں :-

کشمیری کٹڑہ گر گیا ہے وہ اونچے اونچے در اور وہ بڑی کوٹھڑیاں دو رویہ نظر نہیں آتیں کہ کیا ہوئیں آہنی سڑک کا آنا اور اس کی رہ گزر کا صاف ہونا ہنوز ملتوی ہے۔

دوکانوں کا انہدام اور کوئیں کی بندش ایک خط میں لکھتے ہیں :

لو سنو اب تمہاری دلی کی باتیں ہیں، چوک میں بیگم کے باغ کے دروازے کے سامنے حوض کے پاس جو کنواں تھا، اس میں سنگ و خشت و خاک ڈال کر بند کر دیا۔ بلی ماراں کے دروازے کے پاس کئی دکانیں ڈھا کر راستہ چوڑا کر دیا۔

---

[1] جامع مسجد کے پاس مفتی صدر الدین آزردہ مرحوم کی قائم کی ہوئی درسگاہ تھی۔ جس کا نام "دارالبقا" تھا۔

دہلی کے ہنگامے

ایک جگہ فرماتے ہیں:

بھائی کیا پوچھتے ہو۔ کیا لکھوں دلی کی ہستی منحصر کئی ہنگاموں پر ہے۔ قلعہ۔ چاندنی چوک، ہر روز مجمع بازار جامع مسجد کا۔ ہر ہفتے سیر جمنا کے پل کی، ہر سال میلہ پھول والوں کا۔ یہ پانچوں باتیں اب نہیں، پھر کہو دلی کہاں؟ ہاں کوئی شہر قلمرو ہند میں اس نام کا تھا۔

میر مہدی نے اپنے آنے کا ذکر کیا تھا۔ انہیں لکھتے ہیں:۔

تم آتے ہو تو چلے آؤ۔ جاں نثار خاں کے چھتے کی اور خان چند کے کوچے کی سڑک دیکھتے جاؤ۔ بلاقی بیگم کے کوچے کا ڈھنا اور جامع مسجد کے گرد ستر گز کا میدان نکلنا سن جاؤ۔

غبارِ چشم کی علت

مجروح کی آنکھیں دکھنی آگئی تھیں۔ غالب اس آزار کو بھی دہلی کے انہدام کا نتیجہ قرار دیتے ہیں:

تمہاری آنکھوں کے غبار کی وجہ یہ ہے کہ جو مکان دلی میں ڈھائے گئے اور جہاں جہاں سڑکیں نکلیں۔ جتنی گرد اڑی اس کو آپ نے از راہ محبت اپنی آنکھوں میں جگہ دی۔[1]

دہلی کی زبان

مجروح نے ایک غزل اصلاح کے لئے بھیجی تھی جس کے مقطع کا مصرعہ یہ تھا ع

میاں یہ اہل دہلی کی زباں ہے

اس مضراب نے غالب کے ساز درد کا ہر تار چھیڑ دیا۔ فرماتے ہیں:

اے میر مہدی تجھے شرم نہیں آتی "میاں یہ اہل دہلی کی زباں ہے"! ارے اب اہل دہلی ہندو ہیں یا اہل حرفہ ہیں یا خاکی ہیں یا پنجابی ہیں یا گورے ہیں۔ ان میں سے تو کس کی تعریف کرتا ہے؟ لکھنؤ کی آبادی میں کچھ فرق نہیں آیا۔ ریاست تو جاتی رہی باقی ہر فن کے کامل لوگ موجود ہیں۔

[1] غالب کا روزنامچہ غدر خواجہ حسن نظامی صاحب نے مرتب فرمایا ہے اس میں اس اقتباس کو غالب کی حب وطن کا ثبوت قرار دیا گیا ہے۔ اور "آپ نے" کے الفاظ تخاطب حذف کر دیئے گئے ہیں۔ بلاشبہ غالب کو دہلی سے انتہائی محبت تھی۔ لیکن اس کا ثبوت وہ نہیں جو خواجہ صاحب نے پیش فرمایا ہے۔ آنکھیں میر مہدی کی دکھی تھیں نہ کہ غالب کی۔ آشوب چشم کی یہ شاعرانہ توجیہ پیدا کرنیوالے یقیناً غالب تھے۔ لیکن اس کے مورد مجروح تھے۔

اسی خط میں آگے چل کر لکھتے ہیں،

قاری کا کنواں بند ہوگیا۔ لال ڈگی کے کوئیں یکقلم کھاری ہوگئے۔ خیر کھاری ہی پانی پیتے۔ گرم پانی نکلتا ہے۔ پرسوں میں سوار ہو کر کوؤں کا حال دریافت کرنے گیا تھا۔ مسجد جامع سے راج گھاٹ دروازے تک بے مبالغہ ایک صحرائے لق ودق ہے۔ اینٹوں کے ڈھیر جو پڑے ہیں اگر اٹھ جائیں تو ہو کا مکان ہو جائے۔ یاد کرو مرزا گوہر کے باغیچہ کے اس طرف کو کئی بانس نشیب تھا۔ اب وہ باغیچہ کے صحن کے برابر ہوگیا یہاں تک کہ راج گھاٹ کا دروازہ بند ہوگیا۔ فصیل کے کنگورے کھلے رہے ہیں باقی سب اٹ گیا۔ کشمیری دروازے کا حال تم دیکھ گئے ہو۔ اب آہنی سڑک کے واسطے کلکتہ دروازہ سے کابلی دروازے تک میدان ہوگیا۔ پنجابی کٹرہ دھوبی کٹرہ رامجی گنج سعادت خاں کا کٹرہ جرنیل کی بی بی کی حویلی رامجی داس گودام والے کے مکانات صاحب رام کا باغ اور حویلی ان میں سے کسی کا پتہ نہیں چلتا۔ قصہ مختصر شہر کا صحرا ہوگیا۔ اب جو کنویں جاتے رہے اور پانی گوہر نایاب ہوگیا تو یہ صحرا صحرائے کربلا ہو جائے گا۔

شہر نہیں کیمپ ہے	یہ تمام حالات بیان کرنے کے بعد پھر اصل مسئلہ کی طرف آتے ہیں اور فرماتے ہیں

کہ دہلی والے اب بھی اس شہر کی زبان کو اچھا کہے جاتے ہیں :

اے بندۂ خدا اردو بازار نہ رہا۔ اردو کہاں؟ دلی کہاں؟ واللہ اب شہر نہیں ہے کیمپ ہے۔ چھاؤنی ہے۔ نہ قلعہ نہ شہر نہ بازار نہ نہر

دہلی کی صورت میں اس خوفناک تغیر کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس سے بہتر کیا کہا جا سکتا تھا کہ اب یہ شہر نہیں ہے، کیمپ ہے، چھاؤنی ہے۔ عزیز الدین کو لکھتے ہیں :

صاحب! کیسی صاحبزادوں کی سی باتیں کرتے ہو۔ دلی کو ویسا ہی آباد جانتے ہو جیسی تھی۔ قاسم جان کی گلی خیراتی کے پھاٹک سے فتح اللہ بیگ خاں کے پھاٹک تک بے چراغ ہے۔ ہاں آباد ہے تو یہ ہے کہ غلام حسن خان کی حویلی ہسپتال ہے اور ضیاء الدین خاں کے کمرے میں ڈاکٹر صاحب رہتے ہیں اور کالے صاحب کے مکانوں میں ایک اور صاحب عالیشان انگلستان تشریف رکھتے ہیں .... لال کنوئیں کے محلے میں خاک اڑتی ہے۔

اہل فوج اور اہل قلم کا اختلاف	بعض حصوں کے انہدام میں فوجیوں اور سول والوں کا اختلاف بھی تھا مثلاً غالب فرماتے ہیں

فیل خانۂ فلک پیرا لال ڈگی کے محاذی کے مکانات سب گرائے گئے۔ بلاقی بیگم کا کوچہ اسکو ڈھانے میں اہل فوج (ملٹری والے) ڈھایا چاہتے ہیں، اہل قلم (سول والے) بچاتے ہیں۔ پایاں کار دیکھئے کیا ہو۔

آغا باقر کا امام باڑہ | آغا باقر کا امام باڑہ ایک مشہور پرانی عمارت تھی اسکے ڈھانے کا حکم ہو گیا۔[1] غالب لکھتے ہیں:

آغا باقر کا امام باڑہ اس کے علاوہ کہ خداوند کا عزاخانہ ہے، ایک بنائے قدیم رفیع و مشہور، اسکے انہدام کا غم کس کو نہ ہوگا، یہاں دو سڑکیں پڑتی ہیں ایک ٹھنڈی سڑک اور ایک آہنی سڑک محل انکا الگ الگ اس سے بڑھکر یہ بات ہے کہ گوروں کا بارک بھی شہر میں بنے گا اور قلعہ کے آگے جہاں لال ڈگی ہے ایک میدان نکالا جائیگا۔

پھر متفرق عمارتوں کے انہدام کی تفصیل بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

کیوں میں دلّی کے ویرانہ سے ناخوش نہ ہوں جب اہل شہر ہی نہ رہے شہر کو لیکے کیا چولہے میں ڈالوں

سڑکوں کی افواہیں | انہدام عمارات کے وقت مختلف افواہیں سنی جا رہی تھیں۔ کہا جاتا تھا کہ سڑکیں نکلیں گی۔ غالب فرماتے ہیں:

شور و غل تھا کہ سڑکیں نکلیں گی۔ اور گوروں کی چھاؤنی بنے گی۔ کچھ بھی نہ ہوا۔ مر پیٹ کر ایک جان نثار خاں کے چھتے کی سڑک نکلی ہے۔

نواب علاء الدین خاں کو لکھتے ہیں:

میری جان یہ وہ دلی نہیں جس میں تم پیدا ہوئے۔ . . . . . . ایک کیمپ ہے مسلمان اہل حرفہ یا حکام کے شاگرد پیشہ باقی سراسر ہنود۔

دہلی کا نقشہ | "دستنبو" آگرہ میں چھپی تھی۔ اس کی چند جلدیں حکام کی نذر کے لئے عمدہ بنوانی منظور تھیں۔ تفتہ کو لکھا کہ آگرہ میں جلدیں بھی بنوا دو۔ ان کی طرف سے جواب آیا کہ یہ کام اپنے سامنے دہلی میں کرا لیجئے۔ اس پر فرماتے ہیں:

میرزا تفتہ تم بڑے بے درد ہو۔ دلّی کی تباہی پر تم کو رحم نہیں آتا، بلکہ تم اس کو آباد جانتے ہو۔ یہاں نیچہ بند تو میسر نہیں۔ صحاف اور نقاش کہاں؟

تیشہ اور کلند کی طغیانی | ایک اور خط میں لکھتے ہیں:

---

[1] اس عمارت کے انہدام کا فیصلہ ہوا تھا لیکن یہ فیصلہ عمل میں نہیں آیا تھا۔

یہاں شہر ڈھ رہا ہے۔ بڑے بڑے نامی بازار (خاص بازار، اردو بازار[1] اور خانم کا بازار) کہ ہر ایک بجائے خود ایک قصبہ تھا اب پتہ بھی نہیں کہ کہاں تھے۔ صاحبان امکنہ و دکاکین نہیں بتا سکتے کہ ہمارا مکان کہاں تھا اور دکان کہاں تھی۔ برسات بھر مینہ نہیں برسا۔ اب تیشہ اور کلند کی طغیانی سے مکان گر گئے۔

دہلی اور لکھنؤ کا موازنہ

ایک مکتوب میں لکھنؤ اور دلّی کا موازنہ یوں کرتے ہیں:

بھائی لکھنؤ میں وہ امن و امان ہے کہ نہ ہندوستانی عملداری (یعنی ملکی حکومت) میں ایسا امن و امان ہوگا، نہ اس فتنہ و فساد (غدر) سے پہلے انگریزی عملداری میں چین ہوگا۔ امراؤ شرفا سے حکام کی ملاقاتیں، قدر و تعظیم و توقیر، پنشن کی تقسیم علی العموم، آبادی کا حکم عام، لوگوں کو کمال نرمی اور تلطف سے آباد کرتے جاتے ہیں۔

---

[1] مولانا ابوالکلام فرماتے ہیں، لال قلعہ اور جامع مسجد کے درمیان اب جو میدان ہے یہاں دہلی کے سب سے زیادہ گنجان محلے آباد تھے قلعہ کے لاہوری دروازہ سے نکلکر جامع مسجد کی طرف جاتے تھے تو ایک بڑے پررونق بازار میں سے گزرنا پڑتا تھا۔ یہ اردو بازار کہلاتا تھا یعنی فوج کا بازار۔ خانم کا بازار بھی اسی طرف تھا قلعہ کی خندق سے لیکر سڑک تک اب کھلا میدان ہے، اس میدان میں بھی محلے آباد ہو گئے تھے۔ زیادہ تر امرا کی بڑی بڑی حویلیاں تھیں۔ قلعہ میں انہیں نوبت بہ نوبت حاضر باش رہنا پڑتا تھا اسلیئے یہیں مکانات تعمیر کر لئے تھے قلعہ محلوں اور عمارتوں کے احاطہ سے چھپ گیا تھا۔ جبتک خندق پر نہیں پہنچتے تھے قلعہ کی دیواریں دکھائی نہیں دیتی تھیں۔
مسٹر اینڈریو نے منشی ذکاء اللہ پر جو کتاب لکھی ہے، اس میں انکی زبانی نقل کرتے ہیں کہ میرا خاندانی مکان قلعہ اور مسجد کے درمیانی حصے میں تھا۔ فتح دہلی کے بعد ایکدن فوج کے افسر اور سپاہی پہنچے اور نیچے کھیجے لوگوں کو حکم دیا کہ "فوراً گھر خالی کر دو، یہ تمام محلہ منہدم کر دیا جائیگا" ایک گھنٹہ کے اندر صدیوں کے بسے ہوئے گھر چھوڑ کر باہر نکلنے پر لوگ مجبور ہو گئے اور تمام محلے بارود سے اڑا دیئے گئے میدان کا یہ حصہ سڑک سے کئی فٹ بلند واقع ہوا ہے یہ بلندی اسی لئے ہوئی ہے کہ مکانوں کا ملبہ پھیلا کر بچھا دیا گیا۔
قلعہ کی اس سڑک پر کشمیری دروازہ کی طرف اور آگے بڑھیں تو ریل کا پل آتا ہے اور بائیں طرف ریلوے سٹیشن کی جانب جانے کی سڑک ملتی ہے۔ یہاں پنجابی کٹرہ آباد تھا جسکے وسط میں اورنگ آبادی کی بڑی خوبصورت مسجد تھی۔ مولوی عبدالقادر کا خاندان یہیں رہتا تھا۔ مولانا نذیر حسین مرحوم نے اسی مسجد میں درس حدیث دینا شروع کیا تھا۔ غدر کے بعد یہ تمام محلہ بھی اڑا دیا گیا۔ اب قدیم صورت حالات کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔
اس محلہ کے انہدام کے بعد مولانا نذیر حسین حبش خاں کے پھاٹک میں چلے آئے اور آخر تک وہیں مقیم رہے۔
قلعہ سے کچھ آگے بڑھیں تو دہنی جانب نشیب میں ایک پرانی عمارت نئی عمارتوں کے اضافوں کے ساتھ کھڑی ملے گی۔ یہ دارا شکوہ کا کتب خانہ تھا۔ اسی کے قریب اسکی ایک حویلی بھی تھی جسکا ذکر فرخ سیر اور احمد شاہ کے زمانے کے واقعات میں ضمناً ملتا ہے۔

با یک جہاں کدورت، باز ایں خرابہ جا ئیست

گویا دلی میں نہ حکام امرأو شرفا سے ملنا پسند کرتے تھے، نہ ان کی مناسب توقیر و تعظیم پر متوجہ تھے، نہ پنشن داروں کو پنشنیں ملتی تھیں، نہ آبادی کا حکم عام تھا اور نہ لوگوں کے ساتھ نرمی اور تلطف کا برتاؤ کیا جاتا تھا۔

سیف الحق سیاح ۱۸۶۰ء کے وسط میں لکھنؤ گئے تھے۔ انھوں نے غالباً لکھا تھا کہ لکھنؤ میں بھی عمارتیں ڈھائی جا رہی ہیں۔ جواب میں غالب لکھتے ہیں،

لکھنؤ کی ویرانی پر دل جلتا ہے مگر تم یاد رکھو کہ وہاں بعد اس فساد کے ایک گون ہوگا یعنی راہیں وسیع ہو جائیں گی، بازار اچھے نکل آئیں گے۔ جو دیکھے گا داد دے گا۔ دلی کے فساد کے بعد گون نہیں ہے۔ یہاں فساد در فساد چلا جائے گا۔ شہر کی صورت سوائے اس بازار کے جو قلعہ کے لاہوری دروازے سے شہر کے لاہوری دروازے تک ہے، سراسر بگڑ گئی ہے اور بگڑتی جاتی ہے۔

اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ غدر کے بعد مسلمانوں پر بہت سختیاں ہونے لگی تھیں۔ غالب نے لکھنؤ کے موازنہ میں بھی اس کیفیت کو درد انگیز پیرایہ میں بیان کیا ہے۔ فرماتے ہیں؛

وہاں (لکھنؤ) کے صاحب کمشنر بہادر نے جو دیکھا کہ عملہ میں ہنود بھرے ہوئے ہیں۔ اہل اسلام نہیں ہیں، ہنود کو اور علاقوں پر بھیج دیا اور ان کی جگہ سب مسلمانوں کو بھرتی کیا یہ آفت تو دلی ہی پر ٹوٹ پڑی ہے۔

مولانا فضل حق خیرآبادی غدر کے الم نامہ کا ایک خونچکاں باب اکابر علم و جاہ کی مصیبتیں ہیں۔ غالب کے مکاتیب میں اس موضوع پر بھی کافی مواد موجود ہے۔ مولانا فضل حق خیرآبادی دورِ آخر میں معقول کے امام تھے ۱۲۱۲ھ میں پیدا ہوئے۔ اپنے والد مولوی فضل امام خیرآبادی کے شاگرد تھے۔ مولانا شاہ عبدالقادر سے حدیث پڑھی چار مہینے میں قرآن مجید حفظ کر لیا تھا۔ دہلی میں عدالت کے سررشتہ دار تھے۔ قدر و منزلت کا یہ عالم تھا کہ جب سررشتہ داری سے مستعفی ہوئے تو نواب فیض محمد خاں والی جھجر نے

پانسو روپے ماہانہ مقرر کر دیئے۔ دہلی سے روانگی کا وقت آیا۔ تو بہادر شاہ نے جو اس زمانے میں ولیعہد تھے مولانا کو طلب کر کے دوشالہ ملبوس خاص ان کے کندھوں پر رکھ دیا۔ آنکھوں میں آنسو بھر لائے اور فرمانے لگے :

شما مے گوئید کہ من رخصت مے شوم، مرا جز اینکہ پذیرم گزیر نیست۔ اما ایزد دانا داند کہ لفظ وداع از دل بہ زبان نمے رسد الا بہ ہزار جر ثقیل [۱]۔

غدر کے بعد مولانا بھی باغیوں کی اعانت سے متہم ہوئے اور انہیں حبس دوام کی سزا دے کر انڈیمان بھجوا دیا گیا۔ غالب یوسف مرزا کو لکھتے ہیں،

مولانا کا حال کچھ تم سے مجھ کو معلوم ہوا کچھ مجھ سے تم معلوم کرو۔ مرافعہ میں حکم دوام حبس بحال رہا بلکہ تاکید کی گئی کہ جلد دریائے شور کی طرف روانہ کرو۔ چنانچہ تم کو معلوم ہو جائے گا۔ ان کا بیٹا ولایت میں اپیل کیا چاہتا ہے۔ کیا ہوتا ہے۔ جو ہونا تھا سو ہو لیا۔

انا للہ وانا الیہ راجعون۔

میاں داد خاں سیاح سیر کرتے ہوئے کلکتہ پہنچے تو غالب انہیں ۴ اکتوبر ۱۸۶۱ء کو لکھتے ہیں:

ہاں خان صاحب! آپ جو کلکتہ پہنچے ہو اور سب صاحبوں سے ملے ہو تو مولوی فضل حق کا حال اچھی طرح دریافت کر کے مجھ کو لکھو کہ اس نے رہائی کیوں نہ پائی؟ وہاں جزیرہ (انڈیمان) میں اس کا کیا حال ہے؟ گزارا کس طرح ہوتا ہے؟

مولانا فضل حق نے انڈیمان ہی میں ۱۲ صفر ۱۲۷۸ھ مطابق ۱۹ اگست ۱۸۶۱ء کو وفات پائی۔ "نامہ غالب" میں ایک موقع پر مولانا کے ایک رسالہ سے

---

[۱] کلیات نثر فارسی صفحہ ۱۴۷

[۲] کلیات نثر فارسی صفحہ ۱۴۷

اقتباس دیتے ہوئے لکھا ہے۔ "فخر الفضلا" "ختم العلما امیر الدولہ مولوی محمد فضل حق رحمۃ اللہ علیہ"

مفتی صدرالدین آزردہ

مفتی صدرالدین آزردہ دورِ آخر کے اکابر و افاضل میں غیر معمولی فضیلت و جامعیت کے بزرگ تھے۔ آپ کے والد غالباً تجارت کے سلسلے میں کشمیر سے دہلی آئے، مفتی صاحب کی ولادت دہلی میں ہوئی، علوم نقلیہ کی تکمیل مولانا شاہ عبدالعزیز، مولانا شاہ عبدالقادر اور مولانا شاہ محمد اسحاق کی خدمت میں کی، معقولات کا درس

لہ مولانا ابوالکلام فرماتے ہیں:- والد مرحوم نے معقولات کی تکمیل مولانا فضل حق کی خدمت میں کی تھی اثنائے درس میں اکثر انکا ذکر آجاتا تھا فرماتے تھے میں نے ایسا خوش تقریر انسان عمر بھر میں اور کوئی نہیں دیکھا مجلس کی تقریر اور درس و علم کی تقریر دونوں میں بے مثل تھے انکی ایک تقریر وحدت الوجود پر اس درجہ مشہور ہوئی کہ دور دور سے اہل علم اسکی سماعت کیلئے شد رحال کر کے آتے تھے۔

لیکن جہاں تک مذہبی عقائد و اعمال کا تعلق ہے ان کا مشرب رسم پرستی و بدعت نوازی کا تھا اور اس باب میں نہایت غلو رکھتے تھے۔ مولانا اسماعیل شہید نے جب تحریک اصلاح شروع کی، تو اسکے مخالفوں میں یہ سب سے زیادہ نامور ہوئے۔ مولانا شہید نے تقویۃ الایمان میں لکھ دیا ہے کہ اگر خدا چاہے تو ایک پل میں کروڑوں آنحضرت صلعم کے امثال پیدا کردے۔ یہ بات ان پر (مولانا فضل حق پر) بہت شاق گزری۔ اور معقولات کی رنگ آمیزیوں سے ایک تقریر اس کے رد میں لکھی۔ دعویٰ یہ کیا کہ نظیر خاتم النبیین کا پیدا ہونا ممتنع بالذات ہے۔ اور پھر قدرت، اور مشیت کا فرق فراموش کر کے سارا معاملہ مشیت کے فحل میں لے گئے۔ ساری تقریر محض جدل و مناظرہ کا ایک لفظی گورکھ دھندا تھی۔ مولانا اسماعیل نماز کیلئے جامع مسجد جارہے تھے کہ راہ میں انہیں یہ تقریر ملی نماز کے بعد مسجد ہی میں بیٹھ گئے اور کاغذ و قلم منگوا کر ایک پورا رسالہ اس کے جواب میں قلمبند کر دیا، چونکہ ایک ہی دن میں لکھا گیا تھا۔ اس لئے "یک روزی" کے نام سے مشہور ہو گیا، پھر مولانا صدرالدین نے بھی اس پر ایک تحریر لکھی۔ یہ دونوں رسالے "ایضاح الحق الصریح" کے حاشیہ پر چھپ گئے ہیں:

انہوں نے مرزا غالب سے بھی ایک مثنوی مولانا اسماعیل کے رد میں لکھوائی تھی، جو دیوان میں موجود ہے۔ استمداد و توسل قبور، استغاثہ بہ حرف ندا، ایصال ثواب بہ طریق رسمی اور یہی مسئلہ امتناع نظیر خاتم النبیین وغیرہ مسائل اسمیں بیان کئے گئے ہیں آخری مسئلہ اس درجہ بے معنے تھا کہ مرزا غالب کا ذہن اسے قبول نہ کر سکا اور ایک لطیف پیرایہ میں وہی بات کہہ گئے جو مولانا اسماعیل کہتے تھے لیکن پھر چونکہ مولانا فضل حق نے بہ شدت انکار کیا۔ اسلئے چند نئے اشعار کہہ کر بحث کا رخ بدل دیا۔

گر دو صد عالم بود خاتم یکے است

مولانا فضل حق نے جزائر انڈمان میں ایک مختصر عربی رسالہ غدر کے حالات اور اپنی اسیری کی سرگزشت میں لکھا تھا جو اس وقت تک شائع نہیں ہوا میرے کتب خانہ میں موجود ہے۔

مولانا فضل امام خیر آبادی سے لیا۔ سرکار انگلشیہ نے آپ کو دہلی کا صدر الصدور بنا دیا تھا۔ مشہور ہے کہ ایک موقع پر آپ کے سامنے غالب کے خلاف قرض کا مقدمہ پیش ہوا تو مدعا علیہ نے حاضر ہو کر جواب دعوے کے بجائے یہ شعر پڑھ دیا۔

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

مفتی صاحب مسکرائے، غالب کے خلاف قرض کی ڈگری دے دی، لیکن سارا روپیہ اپنے پاس سے ادا کر دیا۔

آپ نے جامع مسجد کے پاس "دارالبقا" کے نام سے ایک درسگاہ قائم کی تھی جس میں دور دور سے طالب علم بغرض تحصیل علوم آتے تھے۔ اکثر طالب علموں کے لباس و طعام کا انتظام مفتی صاحب فرماتے تھے۔ اس طرح "دارالبقا" فیضان علوم دین کا ایک وسیع سرچشمہ بن گئی۔ غدر میں آپ سے بھی فتوائے جہاد پر دستخط لئے گئے تھے۔ جب انگریز دہلی پر دوبارہ قابض ہو گئے۔ تو آپ پر بھی مقدمہ بنا۔ کچھ مدت حوالات میں رہے۔ ساری منقولہ اور غیر منقولہ جائداد ضبط ہو گئی۔ تحقیقات کے بعد بری ہوئے تو جو جائداد بک چکی تھی اس کا کوئی معاوضہ نہ ملا۔ باقی ماندہ جائداد واگزار ہو گئی۔

مفتی صاحب نے اس ابتلا کے بعد بھی درس کا سلسلہ جاری رکھا۔ آخری ایام میں فالج گرا۔ اکاسی برس کی عمر میں ۲۴ ربیع الاول ۱۲۸۵ھ (مطابق ۱۵ جولائی ۱۸۶۸ء) کو جمعرات کے دن علم و فضل کا یہ جامع پیکر اپنے مالک حقیقی سے جا ملا۔ مولوی ظہور علی نے تاریخ وفات کہی۔

چو مولانائے صدر الدین کہ در عصر	امام اعظم آخر زماں بود
بہ روز پنجشنبہ کرد رحلت	کہ ایں عالم نہ جائے جاوداں بود
ربیع الاول و بست و چہارم	وداع او سوئے دار الجناں بود

ظہور افسوس آں اُستاد ذی قدر پدر دارم ہمیشہ مہرباں بود

چراغش ہست تاریخ ولادت

کنوں گفتم "چراغ دو جہاں بود"[1]

غالب مفتی صاحب کے خاص دوستوں اور نیاز مندوں میں سے تھے۔ ان کی داستان مصائب یوں بیان کرتے ہیں:۔

مقدمہ پیش ہوا۔ روبکاریاں ہوئیں۔ آخر صاحبان کورٹ نے جان بخشی کا حکم دیا۔ نوکری موقوف جایداد ضبط، ناچار خستہ و تباہ حال لاہور گئے۔ فنانشل کمشنر اور لفٹنٹ گورنر نے از راہ ترحم نصف جایداد واگزاشت کی۔ اب نصف جائداد پہ قابض ہیں۔ اپنی حویلی میں رہتے ہیں۔ کرایہ پر معاش کا مدار ہے۔

حضرت مفتی صاحب کی واگزار شدہ جایداد کا کرایہ صرف چالیس روپیہ ماہانہ تھا۔ لیکن ان کی نیک دلی اور اقربا پروری کا یہ عالم تھا کہ اپنے بعض متعلقین کی اولاد کی پرورش بھی اپنے ذمہ لے رکھی تھی۔ اور ذمہ واری کے اس بوجھ کو عسرت و تنگدستی کے عالم میں بھی بہ دستور اٹھائے رکھا۔ غالب لکھتے ہیں:۔

اگرچہ یہ امداد (کرایہ) ان کے گزارے کو کافی ہے کس واسطے کہ ایک آپ اور ایک بی بی تیس چالیس مہینے کی آمد۔ لیکن چونکہ امام بخش کی اولاد ان کی عترت ہے اور وہ دس بارہ آدمی ہیں، لہذا فراغ بالی سے نہیں گزرتی۔ ضعف پیری نے بہت گھیر لیا ہے۔ عشرہ ثامنہ کے اواخر میں ہیں (یعنی ۸۰ برس کے قریب عمر ہے) خدا سلامت رکھے بہت غنیمت ہیں:۔

---

[1] یعنی تاریخ ولادت لفظ چراغ سے نکلتی ہے (۱۲۰۴ھ) اور تاریخ وفات "چراغ دو جہاں بود" اس حساب سے مفتی صاحب مرحوم نے اکاسی برس کی عمر پائی:۔

۱۳ اردسمبر ۱۸۶۲ء کے ایک مکتوب سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۱ دسمبر کو حضرت مفتی صاحب پر فالج گرا مفلوج[1] پانچ چھ برس اسی حالت میں گزرے۔ اعلےٰ درجے کی فراخی اور امارت کا دور بھی انتہائی سلامت روی گزرا اور زندگی کے آخری بارہ سال بھی جو شدید مصیبتوں کے سال تھے صبر و استقلال کے ساتھ پورے کئے رحمۃ اللہ تعالیٰ۔

مولانا ابو الکلام فرماتے ہیں:

کمال علم و ذوق شعر والد مرحوم کے نانا مولانا منور الدین رکن المدرسین اور مولانا رشید الدین مفتی صاحب کے پڑوس میں رہتے تھے، یہ زمانہ دہلی کے محاصرہ اور انگریزوں اور مرہٹوں کی لڑائی کا تھا۔ لارڈ لیک نے ۱۸۰۳ء میں سندھیا اور ہولکر کی فوجوں کو دہلی کے سامنے آخری شکست دی۔ اس لئے سمجھنا چاہیئے۔ کہ ۱۸۰۰ء اور ۱۸۰۱ء کا زمانہ ہوگا۔ تحصیل علم کے شوق اور شاہ صاحب (شاہ عبد العزیز) کی شاگردی کے ولولہ نے مولانا منور الدین کو گھر سے نکالا۔ بزرگوں اور عزیزوں پر جدائی شاق تھی اس لئے سفر کے روادار نہ تھے۔ مجبوراً بغیر کسی کو خبر دیئے پوشیدہ نکل کھڑے ہوئے اور قصور سے دہلی تک کا سفر پاپیادہ کیا۔ دہلی کے حوالی میں کئی جگہ گرفتار ہوتے ہوتے بچے۔ ایک مقام پر ایک گوجر کی خدمت کر کے اسے اپنا حامی بنایا۔ دہلی پہنچے تو شاہ صاحب کے حلقۂ درس میں مفتی صدر الدین اور مولوی رشید الدین شامل ہو چکے تھے۔ یہ بھی شامل ہو گئے شاہ صاحب نے اپنے ایک عربی مکتوب میں اس عہد کے معرکوں کا حال بیان کیا ہے۔ انگریزوں کی فوج کو مشرقی فوج کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ کیونکہ پورب (بنگال، بہار) انکا مرکز تھا مشرقی فوج کے سردار کی نسبت لکھتے ہیں کہ اس کا نام ہندی میں قمل (جوں) کا مفہوم رکھتا ہے یعنی لیک۔ بہرحال مفتی صاحب چونکہ مولانا منور الدین کے ہم درس رہے تھے اس لئے دونوں میں برادرانہ تعلقات قائم ہو گئے تھے۔ دہلی پہنچنے کے بعد انہوں نے دہلی ہی میں شادی کر لی اور مقیم ہو گئے۔ اس معاملہ میں بھی مفتی صاحب کے ایماء و مشورہ کو دخل تھا۔

---

[1] اُردوئے مُعلّےٰ صفحہ ۲۴۳۔

والد مرحوم نے مفتی صاحب سے بھی تحصیل کی تھی۔ ان کے فضل و کمال اور جامعیت کے بیحد معترف تھے۔ فرماتے تھے ان کا سلوک مجھ سے ایسا تھا جیسا اپنے خاص عزیزوں سے ہوتا ہے عید کے دن ہمارے یہاں آتے، تو جسطرح اپنے عزیزوں کو بطور عیدی کے کچھ دیا کرتے ہیں۔ ایک اشرفی میرے لئے بھی ضرور لاتے۔ نانا مرحوم فرماتے، یہ اشرفیاں بطور تبرک جمع رکھو۔

فضل و کمال علمی کے ساتھ ادب و شعر کا ذوق بھی تینوں زبانوں میں تھا۔ عربی، فارسی اُردو تینوں زبانوں کے شاعر تھے۔ ان کا اردو کلام بہت تھوڑا ہے۔ مگر جتنا ہے انتخاب ہے اور ان کے پایہ بلند کے شایاں ہے۔ والد مرحوم ایک مشاعرہ کا حال سُناتے تھے جس میں ان کی غزل نے تمام اکابر شعراء کا رنگ پھیکا کر دیا۔ وہ زمین "منظور نہیں" طرح تھی:-

دامن اس کا تو بہت دُور ہے دست جنوں   کیوں ہے بیکار گریباں تو مرا دُور نہیں

یہ شعر بھی جو ہمیشہ میری زبان پر رہتا ہے، انہی کا ہے:-

کامل اس فرقۂ زہاد سے اُٹھا نہ کوئی   کچھ ہوئے تو یہی رندانِ قدح خوار ہوئے

والد مرحوم اپنے چچا کا جنھوں نے مدینہ منورہ میں انتقال کیا، جب کبھی ذکر کرتے تھے۔ مفتی صاحب کا یہ شعر پڑھا کرتے تھے:-

آزردہ مر کے کوچۂ جاناں میں رہ گیا   دی تھی دُعا کسی نے کہ جنت میں گھر ملے

والد مرحوم فرماتے تھے کہ ادب عربی کا ذوق ان سے بڑھ کر میں نے وقت کے کسی فاضل میں نہیں پایا۔ حماسہ کے سینکڑوں اشعار نوک زبان تھے۔ متبنی کا درس سب سے پہلے انہوں نے ہی دہلی میں دینا شروع کیا ورنہ اس کا کلام درس کی چیزوں میں داخل نہ تھا۔ انہوں نے متبنی کی ایک شرح بھی لکھی تھی۔

افسوس ہے ان کی مصنفات غدر میں ضائع ہو گئیں۔ صرف ایک عربی رسالہ "لا تشدوا الرحال" کے متعلق میری نظر سے گزرا اور ایک تحریر مسئلہ امتناع نظیر پر ہے۔

مسلمانوں میں ہر دلعزیزی کیلئے | دہلی میں جب انگریزی حکومت قائم ہوئی تو علماء و ثقات کا عام مسلک انگریزوں کی کوششیں | یہ رہا کہ انگریزی ملازمت سے اجتناب کیا جائے . . . لیکن

پھر آہستہ آہستہ نرم پڑتے گئے۔ چنانچہ دہلی کے کئی خاندانی آدمیوں نے ملازمت اختیار کر لی تھی۔ اور شاہ عبدالعزیز کا مولوی عبدالحی اپنے خویش کو ملازمت میرٹھ کی اجازت دے دینا اس دروازہ کی آخری بندش کا ٹوٹنا تھا۔ البتہ خانقاہ والوں کا مسلک غدر تک یہی رہا۔ وہ انگریزی حکومت کے نوکروں سے کسی طرح کا نذرانہ یا تحفہ قبول نہیں کرتے تھے اور کہتے تھے کہ ان کا وسیلہ معیشت مشتبہ ہے۔ سرسید احمد خاں مرحوم بھی خانقاہ کے مریدوں میں سے تھے۔ اور شاہ غلام علی[۱] سے بڑی عقیدت رکھتے تھے انہوں نے جب انگریزی نوکری کر لی اور اسکے بعد ملنے گئے نیز حسب معمول نذر لے گئے تو خانقاہ کے تمام مشائخ نے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ سرسید نے یہ واقعہ خود لکھا ہے۔

انگریزوں کو اس بات کی بڑی خواہش و جستجو تھی کہ مسلمانوں کے خاندانی اور ذی وجاہت اشخاص افتاد صدارت کے مناصب قبول کر لیں تاکہ شمالی ہند میں انگریزی حکومت عوام میں مقبول ہو سکے۔ ہندوستانیوں کے لئے بڑے سے بڑا عہدہ صدر الصدور عدالت کا تھا۔ اس لئے اکابر و افاضل کو بھی پیش کیا جا سکتا تھا۔ دہلی چونکہ قدیم دار الحکومت اور اسلامی تہذیب کا مرکز تھی اس لئے یہاں کی صدارت کے لئے خصوصیت کے ساتھ اہتمام کیا جاتا تھا۔ کلکتہ سے صاحب

---

[۱] شاہ غلام علی جو خانقاہ والے مشہور ہیں اصلاً بٹالہ کے سادات میں سے تھے بٹالہ ۱۱۵۶ھ (۱۷۴۳ء) میں پیدا ہوئے۔ ۱۱۷۸ھ (۱۷۶۴ء) میں اس غرض سے عازم دہلی ہوئے کہ میر ناصر الدین قادری کی بیعت کریں جن کا مزار عیدگاہ کے پیچھے ہے۔ لیکن آپکے دہلی پہنچنے سے پیشتر پیر صاحب کا وصال ہو چکا تھا۔ ۱۱۸۰ھ میں مرزا جانجاناں مظہر کے مرید ہوئے اور دہلی میں اقامت اختیار فرمالی۔ آپ کی قیام گاہ میں جو خانقاہ کے نام سے مشہور ہو گئی تھی پانسو فقیر رہتے تھے۔ ۲۲ صفر ۱۲۴۰ھ (۱۵ اکتوبر ۱۸۲۴ء) کو رہگرائے عالم بقا ہوئے۔ قناعت کا یہ عالم تھا کہ ایک مرتبہ نواب امیر خاں نے بلایا تو جواب میں کہلا بھیجا۔

ما آبروئے فقر و قناعت نمے بریم ۔۔۔ با میر خاں بگوئے کہ روزی مقرر است

شاہ صاحب کے بعد شاہ ابو سعید سجادہ نشین ہوئے۔ آپ حضرت مجددؒ کے اخلاف میں سے تھے۔ شاہ ابو سعید بن صفی اللہ بن عزیز القدر بن محمد عیسیٰ بن سیف الدین بن خواجہ محمد معصوم بن حضرت مجددؒ۔ پھر شاہ احمد سعید بن شاہ ابو سعید اور شاہ عبدالغنی بن شاہ ابو سعید یکے بعد دیگرے خلیفہ بنے۔ رحمہم اللہ تعالیٰ۔

کلاں (ریذیڈنٹ) کو لکھا گیا کہ امرائے شہر اور بادشاہ سے مشورہ کر کے کسی ایسے شخص کو صدر الصدور مقرر کریں۔ جس کی وجاہت اور علم و فضل مسلمانوں میں مسلم ہو۔ ریذیڈنٹ نے بادشاہ اور امرائے شہر سے مشورہ کیا۔ سب کی رائے ہوئی کہ اگر مولوی صدرالدین منظور کر لیں تو ان سے بہتر کوئی شخص نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ بادشاہ اور امرا و ثقات کے متفقہ اصرار سے انہوں نے یہ منصب قبول کر لیا۔

دہلی کے دیوان خانوں کی مجلسیں اٹھارھویں صدی میں پیرس اور لندن کے علم دوست امرا کے سیلون اور ڈرائنگ رومز کے جو حالات ہم پڑھتے ہیں بعینہٖ یہی حال دہلی کے دیوانخانوں کی مجلسوں کا بھی تھا۔ ہر حلقے میں کسی نہ کسی امیر کا دیوان خانہ شب کے اجتماع و سمر کا مرکز بن جاتا تھا۔ اور اس حلقے کے لئے ٹھیک ٹھیک ایک علمی، ادبی اور تفریحی کلب کا کام دیتا تھا۔ والد مرحوم ان دیوان خانوں کی مجالس کے جو افسانے سنایا کرتے تھے، کاش وہ قلمبند کئے جا سکتے۔ بجھنے والے چراغ کا یہ آخری اجالا تھا۔ دہلی مرحوم کی ہفت صد سالہ زندگی کی انجمن طرازیوں کی یہ آخری بزم تھی۔ گو شان و شکوہ کے سارے پچھلے نقوش مٹ چکے تھے۔ لیکن مٹتے ہوئے رنگ و روغن میں بھی عہد ماضی کے مرقعوں کی بہار دیکھی جا سکتی تھی۔

والد مرحوم شب کی نشستوں میں جب کبھی اس عہد کی صحبتوں کا ذکر کرتے تو بار بار یہ شعر پڑھتے اور آبدیدہ ہو جاتے:-

تمتع من شمیم عرار نجد
فما بعد العشیۃ من عرار

فرماتے تھے مفتی صاحب کا دیوان خانہ دہلی کے تمام منتخب افراد کا مجمع و مرکز تھا۔ جاڑا، گرمی، برسات، کوئی موسم ہو لیکن شب کی یہ مجلس کوئی قضا نہیں کرتا تھا۔ ہر فن کے اکابر کو وہاں ان کے بہترین وقتوں میں دیکھا جا سکتا تھا۔ اگر کوئی نووارد دہلی آتا اور چاہتا کہ دہلی کے سارے فضل و کمال کو بیک وقت و بیک مجلس دیکھ لے تو وہ سیدھا مفتی صاحب

کے دیوان خانہ کا رُخ کرتا!

مفتی صاحب کا فتوے جب غدر ہوا تو مفتی صاحب خانہ نشین ہو گئے۔ مگر حالات کب انہیں بے تعلق رہنے دیتے تھے۔ قلعہ میں جانا اور دربار میں شریک ہونا پڑا۔ ان سے کہا گیا کہ بدستور عدالت کا کام جاری رکھیں مگر انہوں نے عذر کر دیا۔ پھر جب بریلی سے بخت خاں آیا تو اس نے علماؤ مشائخ سے جہاد کا فتویٰ لکھوایا۔ خانقاہ والوں کو بھی مجبور کیا۔ کہ جامع مسجد میں آ کر اس کا اعلان کریں۔ مفتی صاحب کو دستخط کرنا پڑا لیکن انہوں نے دستخط کے نیچے "کتبت بالخیر" لکھ دیا تھا۔ عربی میں اس طرح کے جملے خاتمہ عبارت میں لکھے جاتے ہیں مگر "الخیر" پر انہوں نے نقطے نہیں دیئے تھے۔ غدر کے بعد جب ان کی روبکاری ہوئی۔ اور فتویٰ پیش کیا گیا تو انہوں نے کہا ٹھیک ہے۔ مجھے دستخط کرنا پڑا کہ مجبور تھا۔ توپ گولہ نہ تھا کہ مقابلہ کرتا۔ میں نے صاف لکھ دیا کہ کتبت بالجبر"۔ جبر و تشدد سے دستخط کرایا گیا ہے! یہ محض لطیفہ نہ تھا۔ مفتی صاحب نے بالقصد یہ جملہ لکھا تھا اور بالقصد نقطے نہیں دیئے تھے"

نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ غالب کے ایک نہایت عزیز دوست اور مخلص قدر دان نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ تھے، جو ایک بلند پایہ امیر ہونے کے علاوہ زہد و اتقا، علم و فضل اور ذوق شعر و ادب کے اعتبار سے بھی دور آخر کا ایک نہایت گرانمایہ وجود تھے۔ وہ عظیم الدولہ سرفراز الملک نواب مرتضےٰ خاں بہادر مظفر جنگ کے صاحبزادے تھے۔ ۱۸۰۳ء میں لارڈ لیک نے دہلی فتح کی۔ تو نواب مرتضےٰ خاں بہادر کو حسن خدمات کے صلے میں ہوڈل پلول کا علاقہ بطور جاگیر ملا۔ ۱۸۱۴ء میں جہانگیر آباد کا علاقہ جو راجہ کھودس رائے کی ملکیت تھا خرید لیا۔ نواب مرتضےٰ خاں کا انتقال ہوا۔ تو ہوڈل پلول کی جاگیر واپس لے لی گئی۔ اور اس کے عوض ارکان خاندان کی پنشنیں مقرر کر دی گئیں جو ۱۸۵۷ء تک جاری رہیں جہانگیر آباد کا علاقہ نواب مرتضےٰ خاں نے اپنی زندگی ہی میں نواب مصطفےٰ خاں کے نام منتقل کر دیا تھا۔ ۱۲۵۵ھ (مطابق ۱۸۳۹ء) میں مصطفےٰ خاں نے حج کا سفر اختیار کیا۔ جس کے

---

۱ ملخصاً از مقدمہ کلیات حسرتی و شیفتہ مرتبہ جناب نظامی بدایونی۔

تفصیلی حالات ان کے سفرنامہ موسوم بہ "رہ آورد" میں مرقوم ہیں۔ غدر کے آغاز میں وہ جہانگیر آباد میں تھے۔ جب فتنہ و فساد کی ہمہ گیری کے باعث یہ مقام خطرے میں پڑ گیا۔ تو سب کچھ چھوڑ کر اپنے دوست عبداللطیف خاں کے پاس خان پور چلے گئے۔ ٹھاکروں نے قلعہ جہانگیر آباد پر قبضہ جما لیا۔ عالیشان محلوں میں آگ لگا دی اور سارا قیمتی سامان جلا کر خاک کر ڈالا۔ حتیٰ کہ گراں بہا کتب خانہ بھی شعلوں کی نذر ہو گیا۔ انہی دنوں میں رام پور کی فوج اس راستے سے گزری۔ اس نے ٹھاکروں کو شکست دے کر جہانگیر آباد پر نواب صاحب کو دوبارہ قبضہ دلایا لیکن نیرنگی روزگار ملاحظہ ہو کہ یہ تمام نقصان اُٹھاتے اور مصیبتیں جھیلنے کے بعد نواب صاحب پر باغیوں کی اعانت کا الزام لگا۔ وہ گرفتار ہو گئے اور نہ محض ان کی جایداد ہی ضبط ہوئی۔ بلکہ سات سال کی قید کا حکم بھی ہو گیا۔ غالب لکھتے ہیں:۔

مصطفےٰ خاں کا حال سُنا ہو گا۔ خدا کرے مرافعہ میں چھوٹ جائے ورنہ حبس ہفت سالہ کی تاب اس ناز پروردہ میں کہاں۔

جنوری ۱۸۵۹ء میں ان کی تقصیر معاف ہوئی۔ غالب فرماتے ہیں:۔

نواب مصطفےٰ خاں بہ میعاد سات برس کے قید ہو گئے تھے۔ سو ان کی تقصیر معاف ہوئی۔ اور ان کو رہائی ملی۔ صرف رہائی کا حکم آیا ہے۔ جہانگیر آباد کی زمینداری اور دلّی کی املاک اور پنشن کے باب میں ہنوز کچھ حکم نہیں ہوا۔ لاچار وہ رہا ہو کر میرٹھ میں ایک دوست کے مکان میں ٹھہرے ہیں۔ بہ مجرد استماع اس خبر کے ڈاک میں بیٹھ کر میرٹھ گیا، ان کو دیکھا چار دن وہاں رہا۔ پھر ڈاک میں اپنے گھر آیا۔

مولانا ابوالکلام فرماتے ہیں:

شیفتہ کے مرافعہ کی کامیابی میں مرزا غالب کی سعی و کاوش کو بھی دخل ہے۔ نواب صدیق حسن خاں جب دہلی میں مفتی صدرالدین سے پڑھتے تھے۔ تو مرزا غالب سے بھی

رسم و راہ ہو گئی تھی اور شاید ان سے فارسی کی بعض چیزیں پڑھی بھی تھیں۔ غدر کے بعد وہ سکندر جہاں بیگم کے پیشکار ہو گئے۔ ان کی آئندہ ترقیوں کا یہ پہلا زینہ تھا۔ ان کے ایک دوست مومن علی خاں صدر الصدور میرٹھ تھے۔ شیفتہ نے غالب کو لکھا کہ اگر مومن علی خاں کے نام بھوپال سے سفارشی خط آ جائے تو ان کی مشکل آسان ہو سکتی ہے غالب نے صدیق حسن خاں کو لکھا اور انہوں نے مومن علی خاں سے سفارش کی۔

اس کے بعد جب جاگیر کی واگزاری کے لئے مرافعہ کیا گیا تو نواب صدیق حسن خاں کو مکرر سفارش کے لئے لکھا گیا۔ چنانچہ انہوں نے دوبارہ خط لکھا اور اس طرح علاقہ بھی چھوڑ دیا گیا۔

مختلف رؤسا دہلی کے رؤسا کی کیفیت "دستنبو" کے رو سے بیان ہو چکی ہے۔ اردو مکاتیب میں لکھتے ہیں:-

آگے کے درباروں میں سات جاگیردار تھے، کہ ان کا الگ الگ دربار ہوتا تھا۔ جھجر، بہادر گڑھ، بلب گڑھ، فرخ نگر، دوجانہ، پاٹودی، لوہارو چار معدوم محض ہیں (اوّل الذکر چار) جو باقی رہے، ان میں سے دوجانہ و لوہارو تحت حکومت ہانسی حصار۔ پاٹودی حاضر۔ اگر ہانسی حصار کے کمشنر بہادر ان دونوں کو یہاں لے آئے۔ تو تین رئیس ورنہ ایک رئیس۔ دربار عام والے مہاجن لوگ سب موجود۔ اہل اسلام میں صرف تین آدمی باقی ہیں:- میرٹھ میں مصطفےٰ خاں، سلطان جی میں مولوی صدر الدین۔ بلی ماروں میں سگ دنیا موسوم بہ اسد۔ تینوں مردود، مطرود، محروم، مغموم:

توڑ بیٹھے جبکہ ہم جام و سبو پھر ہم کو کیا
آسماں سے بادۂ گلفام گو برسا کرے

میکش غالب کا ایک عزیز شاگرد احمد حسین میکش تھا۔ اس بیچارے نے کوئی جرم سرزد نہیں ہوا تھا۔ غالب ۱۷ر فروری ۱۸۵۸ء کے ایک خط میں میکش کے متعلق لکھتے ہیں:-

میکش چین میں ہے۔ باتیں بناتا پھرتا ہے۔ سلطان جی میں تھا۔ اب شہر میں آگیا ہے۔ دو تین بار میرے پاس بھی آیا۔ پانچ سات دن سے نہیں آیا۔ کہتا تھا کہ بی بی کو اور لڑکے کو بہرام پور میر وزیر علی کے پاس بھیجدیا ہے۔ خود یہاں لوٹ کی کتابیں خریدتا پھرتا ہے۔

اسی حالت میں وہ غریب گرفتار ہوا اور پھانسی کی سزا پا گیا۔ غالب ایک خط میں فرماتے ہیں :-

احمد حسین میکش کا حال کچھ تم کو معلوم ہے یا نہیں ؛ مخنوق ہوا (پھانسی پا گیا) گویا اس نام کا آدمی شہر میں تھا ہی نہیں۔

ایک خط میں دوستوں کو یاد کرتے ہوئے میکش کا تذکرہ خاص طور پر فرماتے ہیں :-

اس چرخ کج رفتار کا برا ہو ہم نے اس کا کیا بگاڑا تھا۔ ملک و مال وجاہ و جلال کچھ نہیں رکھتے تھے۔ ایک گوشہ و توشہ تھا، چند مفلس و بے نوا ایک جگہ فراہم ہو کر کچھ ہنس بول لیتے تھے :-

سوجھی نہ تو کوئی دم دیکھ اے فلک
اور تو یاں کچھ نہ تھا، ایک مگر دیکھنا

یاد رہے یہ شعر خواجہ میر درد کا ہے۔

کل سے میکش مجھ کو بہت یاد آتا ہے۔ سو صاحب اب تم (میر مہدی مجروح) ہی بتاؤ کہ میں تم کو کیا لکھوں۔ وہ صحبتیں اور تقریریں جو یاد کرتے ہو اور تو کچھ بن نہیں آتی مجھ سے خط پر خط لکھواتے ہو آنسوؤں سے پیاس نہیں بجھتی۔ یہ تحریر تلافی اس تقریر کی نہیں کر سکتی۔

غلام فخرالدین

علی بخش خاں رنجور کے صاحبزادے غلام فخرالدین خاں بھی گرفتار ہو گئے تھے اس لئے کہ وہ بہادر شاہ کی جاگیر کوٹ قاسم کے ناظم تھے اور بادشاہ کے حکم کے مطابق وقتاً فوقتاً روپیہ بھیجتے رہے تھے۔ غالب لکھتے ہیں :

غلام فخرالدین خاں کی دو روبکاریاں ہوئی ہیں۔ صورت اچھی ہے خدا چاہے تو رہائی ہو جائے۔

چنانچہ وہ رہا گئے۔ حکیم غلام نجف خاں نے لکھا۔ کہ دوبارہ زندگی پائی۔ غالب لکھتے ہیں :-

ہاں غلام فخر الدین خان کی رہائی زندگی دوبارہ ہے۔ خدا تم کو مبارک کرے۔

بہادر شاہ

بہادر شاہ غفران مکان کے متعلق غالب کے اردو مکاتیب میں صرف دو جگہ ذکر آیا ہے۔ اول میر مہدی مجروح نے پوچھا تھا کہ "دستنبو" میں بادشاہ کے دہلی سے رخصت ہونے کے حالات کیوں نہیں لکھے؛ فرماتے ہیں:-

بھائی میں نے ۱۱ر مئی ۱۸۵۷ء سے ۳۱ر جولائی ۱۸۵۸ء تک کا حال لکھا ہے اور خاتمہ میں اس کی اطلاع دے دی ہے۔ امین الدین خان کی جاگیر کے ملنے کا حال اور بادشاہ کی روانگی کا حال کیوں کر لکھتا ان کو جاگیر اگست میں ملی، بادشاہ اکتوبر (۱۸۵۸ء) میں گئے۔ کیا کرتا اگر تحریر موقوف نہ کرتا۔

دوسری جگہ بہادر شاہ کی وفات کا ذکر ہے:

۷ر نومبر (۱۸۶۲ء) مطابق ۱۴ر جمادی الاول سال حال جمعہ کے دن ابو ظفر سراج الدین بہادر شاہ قید فرنگ و قید جسم سے آزاد ہوئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

دیکھنے کو یہ چند الفاظ ہیں۔ لیکن ایک ایک لفظ کی تہ میں درد و حزن کا دریا موجزن ہے

شاہی خاندان

خاندان شاہی کے افراد کے متعلق بعض تحریریں اوپر گزر چکی ہیں۔ مثلاً بہت سے شہزادوں کا مارا جانا، بعض کا قید ہونا، جو تلوار سے بچے تھے ان کا پانچ پانچ روپے پنشن پانا، خواتین کا گوناگوں مصائب میں مبتلا ہونا۔ غالب ان حالات سے بے حد متاثر تھے اور معمولی سا بہانہ مل جانے پر بھی اظہار درد کے لئے مضطرب رہتے تھے۔ تفتہ نے اپنی کتاب "سنبلستان" چھپوا کر بھیجی۔ چھپائی اچھی نہ تھی۔ غالب نے اسی کو بیگمات قلعہ کی مصیبتوں اور بدحالیوں کے ماتم کا بہانہ بنا لیا۔ فرماتے ہیں:

اجی میرزا تفتہ تم نے اپنا روپیہ بھی کھویا اور اپنی فکر کو اور میری اصلاح کو بھی ڈبو دیا۔ ہائے کیا بری کاپی ہے . . . . اس کاپی کی مثال جب تم پر کھلتی کہ تم یہاں ہوتے اور بیگمات

قلعہ کو پھرتے چلتے دیکھئے۔ صورت ماہ دو ہفتہ کی سی اور کپڑے میلے، پائنچے لیر لیر، جوتی ٹوٹی

یہ مبالغہ نہیں بلکہ بے تکلف "سنبلستان" ایک معشوقہ خوبرو ہے مگر بد لباس ہے۔

تاج محل بیگم	ایک اور خط میں لکھتے ہیں :

تاج محل (بیگم بہادر شاہ مرحوم) مرزا قیصر اور مرزا جواں بخت کے سالے ولایت علی بیگ جے پوری کی زوجہ، ان سب کی الہ آباد سے رہائی ہو گئی۔ دیکھئے کیمپ میں رہیں یا لندن جائیں۔

میرزا الٰہی بخش	دوسرے اکابر واحباب کے اور اپنے حالات یوں فرماتے ہیں :

میرزا الٰہی بخش جو شہزادوں میں ہیں ان کو حکم کراچی بندر جانے کا ہے اور وہ انکار کر رہے ہیں دیکھئے کیا ہو۔ حکیم جی کو (حکیم احسن اللہ خاں) ان کی حویلیاں مل گئی ہیں۔ اب وہ مع قبائل ان مکانوں میں جا رہے ہیں۔ اتنا حکم ان کو ہے کہ شہر سے باہر نہ جائیں۔ رہا میں ع

توبے کسی و غریبی نہ راکہ مے پرسد

نہ جزا، نہ سزا، نہ نفرین، نہ آفرین، نہ عدل، نہ ظلم، نہ لطف، نہ قہر۔ پندرہ دن پہلے تک دن کو روٹی اور رات کو شراب ملتی تھی۔ اب صرف روٹی ملے جاتی ہے۔ کپڑا ایام تنعم کا بنا ہوا ابھی ہے، اس کی کچھ فکر نہیں

ایک اور خط میں میرزا الٰہی بخش کے متعلق تحریر فرماتے ہیں :

میرزا الٰہی بخش کو حکم کراچی بندر جانے کا ہے انھوں نے زمین پکڑی ہے سلطان جی میں رہتے ہیں۔ عذر کر رہے ہیں۔ دیکھئے یہ جبر اٹھ جائے یا یہ خود اٹھ جائیں۔

مولانا ابوالکلام فرماتے ہیں :

یہ وہی الٰہی بخش ہیں جنھوں نے بہادر شاہ کو گرفتار کرایا تھا۔ اور جنھیں باسورتھ سمتھ مصنف سوانح لارڈ لارنس "دہلی کا ٹریٹر" لکھتا ہے۔ سانڈرس نے ان کی طرف ان لفظوں میں اشارہ کیا ہے "فانحوں کی ادنےٰ خوشنودی کے لئے اگر ضرورت ہو تو وہ اپنے باپ

کو پکڑوا دے۔ چونکہ غدر کے بعد گورنمنٹ چاہتی تھی کہ قلعہ کے خاندان کا کوئی نام ونشان دہلی میں نہ رہے اس لئے الٰہی بخش جیسے خاندان فروش کو بھی دہلی میں دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ بہر حال کچھ دنوں کی زار نالی کے بعد انہیں قیام کی اجازت مل گئی اور وہ خاندان شاہی کے ہیڈ قرار پائے۔ عید کے دن انہوں نے چاہا تھا کہ چار گھوڑوں کی گاڑی میں بیٹھ کر عید گاہ جائیں۔ ڈپٹی کمشنر کو معلوم ہوا تو چوبدار بھیج کر ممانعت کر دی کہ یہ امتیاز قلعہ کے شہزادوں کو حاصل تھا اب وہ زمانہ گیا۔

حکیم احسن اللہ خاں | حکیم احسن اللہ خاں کے متعلق حکیم غلام نجف خاں کو لکھتے ہیں:-

میاں تم کو مبارک ہو کہ حکیم جی پر سے وہ سپاہی جوان کے اوپر متعین تھا اٹھ گیا اور ان کو حکم ہو گیا کہ اپنی وضع پر رہو، مگر شہر میں رہو۔ باہر جانے کا اگر قصد کرو تو پوچھ کر جاؤ اور ہر ہفتہ میں ایک بار کچہری میں حاضر ہوا کرو۔ چنانچہ وہ کچھے باغ کے پچھواڑے مرزا جانی کے مکان میں آ رہے جی ان کے دیکھنے کو جی چاہتا ہے مگر ازروئے احتیاط نہیں جا سکتا۔

بعض دوسرے اشخاص کے متعلق فرماتے ہیں:-

میرزا بہادر بیگ نے بھی رہائی پائی۔ اس وقت سُنا ہے کہ وہ خاں صاحب کے پاس آئے ہیں یقین ہے کہ بعد ملاقات باہر چلے جائیں گے۔ یہاں نہ رہیں گے۔ قدم شریف میں وہ رہتے ہیں آج پانچواں دن ہے کہ حکیم محمود خاں مع قبائل وعشائر پٹیالہ گئے ہیں۔ بہ مقتضائے وقت

لے حکیم احسن اللہ خاں شیخ صدیقی اصلاً ہرات کے رہنے والے تھے۔ انکے والد والی ہرات کی ناراضی کے باعث کشمیر میں آ رہے خود احسن اللہ خاں پہلے نواب احمد بخش خاں کے پاس ملازم ہوئے پھر جھجر میں نواب فیض محمد خاں کے پاس چلے گئے انکے انتقال پر ترک روزگار کر کے خانہ نشین ہو گئے۔ پھر اکبر شاہ کے دربار میں ملازم ہوئے اور عمدۃ الملک حاذق الزماں خطاب پایا۔ بہادر شاہ نے احترام الدولہ ثابت جنگ کا خطاب دیا۔ غدر کے بعد حکیم صاحب جے پور میں ملازم ہو گئے تھے اور گاہ گاہ دہلی آتے تھے مگر لوگوں کی نظروں سے اس درجہ گر چکے تھے کہ انہیں عوام کے سامنے آنے کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔ بالکل خانہ نشین رہتے تھے۔
۱۲۹۰ھ (مطابق ۱۸۷۳ء) میں بڑودہ میں بہ عالم غربت وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے۔ نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر نے "حکیم غریب" کے الفاظ سے تاریخ وفات نکالی ع

بود سال فوتش "حکیم غریب"

اپنی سکونت کے مکان کو چھوڑ کر یہاں آرہا ہوں۔ اس طرح کہ محل سرا میں زنانہ

اور دیوان خانہ میں مردانہ

مختلف اکابر | پھر فرماتے ہیں،

ہے ہے۔ کیوں کر لکھوں حکیم رضی الدین احمد خاں کو قتل عام میں ایک خاکی نے گولی ماردی اور

احمد حسین خاں ان کے چھوٹے بھائی اسی دن مارے گئے۔ طالع یار خاں کے دونوں بیٹے

ٹونک سے رخصت لے کر آئے تھے، غدر کے سبب جانہ سکے یہیں رہے اور بعد فتح دہلی

دونوں بے گناہوں کو پھانسی ملی۔ طالع یار خاں ٹونک میں ہیں۔ زندہ ہیں پر یقین ہے کہ

مردہ سے بدتر ہوں گے۔ میر چھوٹم نے بھی پھانسی پائی۔ حال صاحبزادہ میاں نظام الدین ابن

شیخ نصیر الدین عرف کالے میاں کا یہ ہے کہ جہاں سب اکابر شہر سے بھاگے تھے وہاں

وہ بھی بھاگ گئے تھے بڑودہ میں رہے، اورنگ آباد میں رہے، حیدر آباد میں رہے

سال گزشتہ جاڑوں میں یہاں آئے۔ سرکار سے ان کی صفائی ہوگئی لیکن صرف جان بخشی

روشن الدولہ کا مدرسہ جو عقب کوتوالی چبوترہ ہے وہ اور خواجہ قاسم کی حویلی جس میں مغل علی خاں مرحوم

رہتے تھے وہ اور خواجہ صاحب کی حویلی، یہ املاک خاص حضرت کالے صاحب کی اور بعد کالے صاحب

کے میاں نظام الدین صاحب کی قرار پاکر ضبط ہوئیں۔ اور نیلام کا روپیہ سرکار میں داخل

ہوا۔ ہاں قاسم جان کی حویلی جس کے کاغذ میاں نظام الدین کی والدہ کے نام کے ہیں

وہ ان کو یعنی میاں نظام الدین کی والدہ کو مل گئی۔ فی الحال میاں نظام الدین پاک پٹن

گئے ہیں۔ شاید بہاولپور بھی جائیں گے۔

خاندان فخر عالم | شیخ کلیم اللہ جہاں آبادی اپنے عہد کے مشہور اہل اللہ تھے۔ ان کا مقبرہ

لال قلعہ اور جامع مسجد کے درمیان میدان میں ہے۔ پادشاہی زمانے میں مقبرے

کے آس پاس ایک اچھا گاؤں آباد تھا جس میں شیخ مرحوم کی اولاد رہتی تھی۔ اسی

خاندان میں مولانا فخر الدین رحمۃ اللہ علیہ مرید تھے جنکے پوتے شیخ نصیر الدین عرف کالے میاں

بہادر شاہ کے پیر تھے۔ میر ابراہیم علی خاں سورتی نے شیخ کلیم اللہ کی کتابیں اور قطب الدین ابن مولانا فخرالدین کے حالات مانگے۔ غالب لکھتے ہیں :-

خداوند نعمت ! کیا تم دہلی کو آباد اور قلعہ کو معمور اور سلطنت کو بہ دستور سمجھتے ہو جو حضرت کا کلام اور صاحبزادہ قطب الدین ابن مولانا فخرالدین علیہ الرحمۃ کا حال پوچھتے ہو ؟ "ایں دفتر را گاؤ خورد، گاؤ را قصاب برد و قصاب در راہ مرد" بادشاہ کے دم تک یہ باتیں تھیں۔ خود میاں کالے صاحب مغفور کا گھر اس طرح تباہ ہوا کہ جیسے جھاڑو پھیر دی۔ کاغذ کا پرزہ، سوئے کا تار، پشمینہ کا بال باقی نہ رہا۔ شیخ کلیم اللہ جہان آبادی کا مقبرہ اُجڑ گیا۔ ایک اچھے گاؤں کی آبادی تھی۔ ان کی اولاد کے لوگ تمام اس موضع میں سکونت پذیر تھے۔ اب ایک جنگل ہے اور میدان میں قبر۔ اس کے سوا کچھ نہیں۔ وہاں کے رہنے والے اگر گولی سے بچے ہوں گے تو خدا ہی جانتا ہوگا کہ کہاں ہیں۔ ان کے پاس شیخ کا کلام بھی تھا، کچھ تبرکات بھی تھے۔ اب جبکہ وہ لوگ ہی نہیں تو کس سے پوچھوں ؟ کیا کروں ؟ کہیں سے یہ مدعا حاصل نہ ہو گا۔

حسام الدین حیدر کے فرزند

مبازر الدولہ ممتاز الملک نواب حسام الدین حیدر خاں بہادر حسام جنگ دہلی کے ایک بڑے امیر تھے۔ بلیماروں میں، جہاں غالب رہتے تھے، ان کی عظیم الشان حویلی تھی۔ نواب الٰہی بخش خاں معروف کے گہرے دوست تھے، اسی وجہ سے غالب کو بھی اپنے عزیزوں میں شمار کرتے تھے۔ ۱۸۴۶ء میں وفات پائی۔ ان کے بیٹے معین الدولہ عمدۃ الامرا صفدر الملک سید ذوالفقار الدین حیدر نظارت خاں بہادر ذوالفقار جنگ جو حسین مرزا کے نام سے مشہور ہیں، غالب کے

سلہ دہلی کا آخری سانس صفحہ ۱۱۹

گہرے دوست تھے۔ حسین میرزا، آغا حیدر میرزا ناظر بہادر شاہ کے داماد تھے۔ ان کی وفات کے بعد نظارت کا کام حسین میرزا کے سپرد ہوا تھا[1]۔ غدر میں ان پر جو آفت نازل ہوئی اس کی کیفیت "دستنبو" کے حوالے سے اوپر بیان ہو چکی ہے یعنی وہ اور ان کے بھائی مظفر الدولہ سیف الدین حیدر خاں اہل و عیال کو لے کر شہر سے نکل گئے۔ ان کے بھرے مکان کو پہلے لوٹا گیا، پھر آگ لگا دی گئی مظفر الدولہ الور سے پکڑے آئے اور گوڑ گانوہ میں انہیں گولی مار دی گئی۔ حسین میرزا بیچارے دہلی سے نکل کر پہلے لکھنؤ پھر کلکتہ چلے گئے۔ شاید اس غرض سے کہ واجد علی شاہ سے ملکر وظیفے کا بندوبست کرائیں۔ اسی اثنا میں غالب کو اطلاع ملی کہ وہ بیمار ہو گئے ہیں۔ لکھتے ہیں :

> حسین میرزا صاحب کیوں بیمار ہوئے۔ خدایا ان آوارگان دشت غربت کو جمعیت تو جب چاہے عنایت کر، مگر تصدیق مرتضےٰ علی کا تندرست رکھ! اللہ اللہ حسین میرزا کی ڈاڑھی سفید ہو گئی! بہ شارت غم و رنج کی خوبیاں ہیں ؎

حسین میرزا کی امداد

ایک وقت تھا کہ غالب حسین میرزا کے والد کی وساطت سے قرض لیتے تھے۔ لیکن جب حسین میرزا پر آفات و مصائب کا طوفان نازل ہوا تو غالب حصول قرض کے لئے حسین میرزا کے وکیل بنے۔ ایک خط میں حسین میرزا کو لکھتے ہیں :-

> ابھی چنی لال تمہارا قرضخواہ آیا تھا۔ تمہارا حال پوچھتا تھا۔ کچھ سچ جھوٹ کہہ کر اس کو راہ پر لایا ہوں کہ سو دو سو روپیہ تم کو بھیج دے۔ بنیوں کی طرح تقریر اس کو سمجھائی ہے کہ لالہ جس درخت کا پھل کھانا منظور ہوتا ہے۔ اس کو پانی دیتے ہیں۔ حسین میرزا تمہارے کھیت ہیں۔ پانی دو اناج پیدا ہو۔ بھائی کچھ تو نرم ہوا ہے۔ تمہارے مکان کا پتہ

---

[1] دہلی کا آخری سانس صفحہ ۸۶

لکھوا کر لے گیا ہے اور کہہ گیا ہے کہ میں اپنے بیٹے رامجی داس سے صلاح کر کے جواب بھیجے گی آپ سے آکر کہوں گا۔ اگر وہ روپیہ بھیج دے تو کیا کہنا ہے اور اگر وہ خط لکھے اور تم اس کا جواب لکھو تو یہ ضرور لکھنا کہ اسداللہ نے جو تم سے کہا ہے وہ سچ ہے اور وہ امر ظہور میں آنے والا ہے۔

نواب حسام الدین حیدر خاں کے نواسے یوسف میرزا نے غالباً مصائب کے انبوہ میں اپنے نانا نانی کے عہد کی خوشحالی کا ذکر کیا تھا۔ غالب انہیں لکھتے ہیں:

نانا نانی کے مرنے کا ذکر کیوں کرتے ہو، وہ اپنی اجل سے مرے ہیں۔ بزرگوں کا مرنا بنی آدم کی میراث ہے کیا تم یہ چاہتے تھے کہ وہ اس عہد میں ہوتے اور اپنی آبرو کھوتے ۔ ہاں منظفر الدولہ (یوسف میرزا کے ماموں) کا غم منجملہ واقعات کربلائے معلّیٰ ہے یہ داغ ماتم جیتے جی نہ مٹے گا۔

ہجوم رنج وغم | **پھر یوسف مرزا ہی کو لکھتے ہیں:**

میرا حال سوائے میرے خدا اور خداوند کے کوئی نہیں جانتا۔ آدمی کثرت غم سے سودائی ہو جاتے ہیں۔ عقل جاتی رہتی ہے۔ اگر اس ہجوم غم میں میری قوت متفکرہ میں فرق آگیا ہے تو کیا عجب ہے۔ بلکہ اس کا باور نہ کرنا غضب ہے پوچھو کہ کیا غم ہے؟ غم مرگ، غم فراق، غم رزق، غم عزت، میں قلعہ نامبارک سے قطع نظر کر کے اہل شہر کو گنتا ہوں۔ منظفر الدولہ میر ناصر الدین، میرزا عاشور بیگ میرا بھانجا، اس کا بیٹا احمد مرزا انیس برس کا بچہ، مصطفٰے خاں ابن اعظم الدولہ اس کے دو بیٹے ارتضٰے خاں اور مرتضٰی خاں قاضی فیض اللہ کیا میں ان کو اپنے عزیزوں کے برابر نہیں جانتا تھا، اے لو بھول گیا حکیم رضی الدین خاں میر احمد حسین میکش۔ اللہ اللہ ان کو کہاں سے لاؤں! غم فراق حسین میرزا، یوسف میرزا، میر مہدی، میر سرفراز حسین، میرن صاحب، خدا ان کو جیتا رکھے۔ کاش یہ ہوتا کہ جہاں ہوتے خوش ہوتے۔ گھر ان کے بے چراغ وہ خود آوارہ

سجاد اور اکبر کے حال کا جب تصور کرتا ہوں کلیجہ ٹکڑے ٹکڑے ہوتا ہے۔ کہنے کو ہر کوئی ایسا کہہ سکتا ہے، مگر میں علی کو گواہ کر کے کہتا ہوں کہ ان اموات کے غم میں اور زندوں کے فراق میں عالم میری نظر میں تیرہ و تار ہے۔ یہاں اغنیا و امرا کے اولاد و ازدواج بھیک مانگتے پھریں اور میں دیکھوں!

سچی ہمدردی

حسین مرزا نے ایک موقع پر پریشان ہو کر لکھا تھا کہ میں کیا کروں اور کہاں جاؤں۔ اس پر غالب یوسف مرزا کو لکھتے ہیں:۔

تمہارے ماموں (حسین مرزا) کی دستخطی تحریر نے جو میرا حال کیا ہے۔ وہ کس زبان سے ادا کروں۔ ہے ہے حسین مرزا اور یہ کہے کہ میں کہاں جاؤں اور کیا کروں اور مجھ کم بخت سے اس کا سرانجام نہ ہو سکے؛ بہت بڑا آسرا تھا اور سرکار کی خدمت نہ سہی، عہدہ نہ سہی، علاقہ نہ سہی، سو ڈیڑھ سو روپیہ درماہہ مقرر ہو جانا کیا مشکل تھا۔ دلی کے آدمی خصوصاً امرا شاہی ہر شہر میں بدنام اتنے ہیں کہ لوگ ان کے سائے سے بھاگتے ہیں۔ مرشدآباد بھی ایک سرکار تھی۔ حیدرآباد بہت بڑا گھر ہے۔ مگر بے ذریعہ و واسطہ کیونکر جائے اور جائے تو کس سے ملے؛ ناچار وہیں رہو۔ کسی طرح شاہ اودھ کا سامنا ہو جائے۔

آخری فقرے سے معلوم ہوتا ہے کہ حسین مرزا کلکتہ گئے ہوئے تھے اور واجد علی شاہ کے ہاں کوشش کر رہے تھے۔

فرخ آباد کی ریاست ضبط

غدر کے بعد فرخ آباد کی ریاست بھی ضبط ہو گئی تھی اور تفضل حسین خاں والی فرخ آباد کی جان بخشی اس شرط پر ہوئی تھی کہ وہ ہندوستان سے باہر چلے جائیں چنانچہ وہ ہندوستان سے ہجرت کر کے عرب چلے گئے۔ غالب ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

مجھ کو رشک آتا ہے۔ جزیرہ نشینوں کے حال پر (یعنی انڈیمان کے قیدیوں پر) عموماً اور رئیس فرخ آباد پر خصوصاً کہ جہاز سے اتار کر سرزمین عرب پر چھوڑ دیا۔ اہاہا!۔

پڑئیے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیمار دار

اور اگر مر جائیے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

مولانا ابوالکلام فرماتے ہیں :۔

"نواب تجمل حسین خاں اور ان کے بھائی نواب تفضل حسین خاں والد مرحوم کے نانا رکن المدرسین کے مرید تھے۔ غدر میں تفضل حسین خاں نے انقلابیوں کا ساتھ دیا اور لکھنؤ کے سقوط کے بعد جب برجیس قدری فوج نیپال کی طرف ہٹنے لگی۔ تو نانا (ڈھونڈو پنتھ) کی فوج کے ساتھ یہ بھی اسی طرف آگئے۔ پھر دو معرکوں کے بعد انہوں نے اپنے تئیں انگریزوں کے حوالے کر دیا۔ اس شرط پر کہ انہیں مکہ معظمہ بھجوا دیا جائے۔ چنانچہ فوجی حراست میں جدہ پہنچا دیئے گئے۔

والد مرحوم کہتے تھے کہ تفضل حسین خاں بہت شوقین اور خوش پوشاک رئیس تھے کشمیر کے تاجر پہلے ان کے پاس جاتے، پھر لکھنؤ کا رخ کرتے۔ لیکن جب مکہ معظمہ پہنچے تو یہ حال تھا کہ چھینٹ کا ایک میلا کچیلا انگرکھا جسم پر تھا۔ یہ حال دیکھ کر میری آنکھوں میں آنسو نکل آئے۔ میں نے ہر چند کوشش کی۔ کہ ان کی ضروریات کا انتظام کر دوں، مگر انہوں نے قبول نہیں کیا۔ وہ کہتے تھے کہ میں آپ کے خاندان سے ارادت رکھتا ہوں میری جگہ نذر پیش کرنے کی ہے نہ کہ لینے کی۔

بہر حال چند دنوں تک مہمان رہے۔ پھر والد مرحوم نے شریف سے انہیں ملا دیا۔ اس بے نوائی کی حالت میں بھی انہوں نے گوارا نہیں کیا کہ بغیر کسی تحفہ کے ملیں۔ ایک قیمتی تسبیح ان کے پاس رہ گئی تھی وہی بطور تحفہ پیش کر دی۔ کئی سال کے بعد جب شاہجہاں بیگم والیہ بھوپال حج کے لئے گئیں تو والد مرحوم نے ان کے حال پہ توجہ دلائی انہوں نے رباط مکہ کی سالانہ رقم کے ساتھ ایک رقم ان کے لئے بھی مقرر کر دی تھی۔ انکا آخر تک یہ معمول رہا کہ ظہر کے اول وقت حرم شریف میں آتے تھے۔ پھر عشاء پڑھ کر گھر

واپس جانے"۔

عام تباہی | ایک اور مکتوب میں عام تباہ حالی کا نقشہ ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں:۔

امرار اسلام میں سے اموات گنو، حسن علی خاں بڑے باپ کا بیٹا، سو روپے روز کا پنشن دار سو روپے مہینے کا روزینہ دار بن کر نامرادانہ مر گیا۔ میر ناصر الدین باپ کی طرف سے پیرزادہ اور نانا کی طرف سے امیر زادہ مظلوم مارا گیا۔ آغا سلطان، بخشی محمد علی خاں کا بیٹا جو خود بھی بخشی ہو چکا ہے، بیمار پڑا، نہ دوا کا غذا، انجام کار مر گیا۔ تمہارے چچا نواب ضیاء الدین احمد خاں کی سرکار سے تجہیز و تکفین ہوئی۔ احبا کو پوچھو ناظر حسین مرزا جس کا بڑا بھائی مقتولوں میں آگیا ہے۔ اس کے پاس ایک پیسہ نہیں۔ ٹکے کی آمد نہیں۔ مکان اگرچہ رہنے کو مل گیا ہے، مگر دیکھئے چھٹا رہے یا ضبط ہو جائے۔ بڈھے صاحب ساری املاک بیچ کر نوش جان کر کے بیک بینی و دوگوش بھرت پور چلے گئے۔ ضیاء الدولہ کے پانسو روپے کے املاک واگزاشت ہو کر پھر قرق ہو گئے۔ تباہ و برباد لاہور گیا وہاں پڑا ہوا ہے دیکھئے کیا ہو۔ قصہ کوتاہ قلعہ اور جھجھر اور بہادر گڑھ اور بلب گڑھ اور فرخ نگر کم و بیش تیس لاکھ روپے کی ریاستیں مٹ گئیں۔ شہر کی امارتیں خاک میں مل گئیں۔

لوہارو والوں کے لُٹ جانے کا حال اوپر عرض کیا جا چکا ہے۔ غارت زدہ اشیار کی بیش بہائی کا کون اندازہ کر سکتا ہے، صرف کتب خانہ بیس ہزار روپے کا تھا جن میں غالب کی نظم و نثر کے قلمی مجموعے بھی شامل تھے۔

۱ے بخشیوں کا خاندان دہلی کا بلند پایہ خاندان تھا۔

۲ے مظفر الدولہ سیف الدین حیدر خاں۔

۳ے نواب غلام محی الدین خاں عرف بڈھے صاحب دہلی کے بہت بڑے رئیس تھے ایک ہزار روپیہ ماہانہ پنشن تھی۔ تین سو روپیہ ماہانہ بھرت پور سے ملتے تھے، پانچسو روپے ماہانہ کرایہ تھا۔

۴ے حکیم رکن الدولہ کے بیٹے تھے۔ دہلی کے بہت بڑے رئیس تھے۔ غدر کے بعد پانی پت چلے گئے تھے وہاں سے پکڑے آئے لیکن بے قصور ثابت ہوئے۔ ۵ے اردوئے معلیٰ صفحہ ۱۶۲۔

حامد علی خاں نواب حامد علی خاں جن کا ذکر اوپر آچکا ہے، بہادر شاہ کے وزیر رہ چکے تھے۔ غدر میں ان پر بھی آفتیں نازل ہوئیں۔ ساری جائداد ضبط ہو گئی۔ غالب ایک جگہ حسین مرزا کو لکھتے ہیں:۔

مکانات کو حامد علی خاں کا کہہ کر کیوں لکھتے ہو۔ وہ تو مدت سے ضبط ہو کر سرکار کا مال ہو گیا بائع کی صورت، بدل گئی۔ محل سرا اور کوٹھی میں گورے رہتے ہیں۔ اب پھاٹک اور سرتاسر دکانیں گرا دی گئیں۔ سنگ و خشت کا نیلام کر کے روپیہ داخل خزانہ ہوا مگر یہ نہ سمجھو کہ حامد علی خاں کے مکان کا ملبہ بکا ہے۔ سرکار نے اپنا مملوکہ و مقبوضہ ایک مکان ڈھا دیا ہے۔

ایک اور خط میں فرماتے ہیں کہ حامد علی خاں کرایہ کے مکان میں رہتے ہیں۔

عام سختیاں دہلی میں غدر کے بعد حکام کی سخت گیریوں کا یہ عالم تھا کہ کسی کو تلافی کی بھی امید نہیں رہی تھی۔ غالب حسین مرزا کو لکھتے ہیں:

تم اب تک سمجھے نہیں کہ حکام کیا سمجھتے ہیں اور نہ کبھی سمجھو گے۔ جو احکام کہ دلی میں ہیں وہ احکام قضا و قدر ہیں، ان کا کوئی مرافعہ نہیں۔

ایک لطیفہ غالب نے انگریز حکام کی بے خبری اور اہل ہند کے احوال سے ناواقفیت کے متعلق ایک عجیب لطیفہ لکھا ہے جس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ غدر کے بعد جن لوگوں کو سزائیں دی گئیں یا جن کی جایدادیں ضبط کی گئیں ان کے مفروضہ یا حقیقی جرائم کا امتحان کرنے والے اور ان پر حکم لگانے والے لوگ کس دل و دماغ کے تھے۔ دہلی کے آدمیوں میں ایک حافظ محمد بخش تھے۔ جو حافظ مموں کے نام سے مشہور تھے۔ غدر میں پکڑے گئے۔ لیکن بے گناہ ثابت ہوئے۔ اور رہائی پا گئے۔ بعد ازاں انہوں نے املاک کی واگزاشت کے لئے درخواست کی۔ ان کا قبض و تصرف ثابت تھا۔ صرف حکم کی دیر تھی لیکن جب مقدمہ پیش ہوا۔ مسل سامنے آئی تو:

حاکم نے پوچھا حافظ محمد بخش کون؟ عرض کیا کہ ہیں، پھر پوچھا کہ حافظ ممون کون؟ عرض کیا کہ ہیں؛ اصل نام میرا "محمد بخش" ہے۔ "ممون" "ممون" مشہور ہوں۔ (صاحب نے) فرمایا یہ کچھ بات نہیں حافظ محمد بخش بھی تم، اور حافظ ممون بھی تم سارا جہان بھی تم، جو دنیا میں ہے وہ بھی تم۔ ہم مکان کس کو دیں؟ مسل داخل دفتر ہوئی۔ میاں ممون اپنے گھر چلے آئے۔

جامع مسجد

غدر کے بعد جامع مسجد بھی سرکاری قبضے میں چلی گئی تھی، شاید اس وجہ سے کہ شہر پر انگریزوں کے حملے کے وقت مسلمانوں کی ایک بہت بڑی جماعت نے جامع مسجد سے نکل کر حملہ کیا تھا۔ اور انگریزی فوج کو مار کر پیچھے ہٹا دیا تھا یا اس وجہ سے انگریزوں کے دل میں خیال بیٹھ گیا تھا۔ کہ مسجد مسلمانوں کے لئے تبلیغ جہاد کا خاص مقام ہے۔ بہرحال بعض انگریزوں نے تجویز پیش کی تھی کو مسجد کو گرجا بنا لیا جائے۔

سر رچرڈ ٹمپل غدر کے بعد دہلی پہنچ گئے تھے۔ انہوں نے اپنی کتاب میں چاندنی چوک اور جامع مسجد کا ذکر بھی کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ چاندنی چوک ایشیا بھر میں بہترین بازار تھا۔ اور مغلوں کے عہد عروج کی ساری شان و شوکت اس میں سمٹ آئی تھی لیکن غدر کے بعد اس پر ایک گونہ افسردگی و پژمردگی طاری تھی۔

جامع مسجد بجا طور مسلمانوں کی تعمیر کردہ عبادت گاہوں میں سے بہترین سمجھی جاتی تھی لیکن اس میں سکھوں کی ایک بٹالین بٹھادی گئی تھی۔[1]

مسلمان کوشش کر رہے تھے کہ مسجد واگزار ہو جائے۔ غالب ۲ر جولائی ۱۸۶۲ء کے ایک مکتوب میں سیاح کو لکھتے ہیں :-

مسجد جامع کے باب میں کچھ پرسشیں لاہور سے آئی ہیں۔ یقین ہے کہ واگزاری کا حکم آئے اور وہ مسلمانوں کو مل جائے۔ ہنوز بدستور پہرہ لگا ہوا ہے۔ اور کوئی جانے نہیں پاتا۔

---

[1] ہندوستان میں میرے زمانے کے افراد و واقعات مصنفہ سر رچرڈ ٹمپل صفحہ ۱۳۰

دسمبر ۱۸۶۲ء میں مجروح کو لکھتے ہیں :۔

مسجد جامع واگزاشت ہوگئی۔ چتلی قبر کی طرف سیڑھیوں پر کباہیوں کی دکانیں بنائیں۔ انڈا، مرغی، کبوتر بکنے لگا۔ دس آدمی ہتمم ٹھہرے۔ میرزا الٰہی بخش، مولوی صدرالدین، تفضل حسین خاں ہیں یہ سات اور۔

گویا ستمبر ۱۸۵۷ء سے لے کر دسمبر ۱۸۶۲ء تک مسجد انگریزوں کے قبضے میں رہی۔

شہر کی بربادی قاضی عبدالجمیل بریلوی نے اسی زمانے میں غالب سے نثر و نظم کے مجموعے مانگے تھے۔ جواب میں لکھتے ہیں :۔

یہ شہر بہت غارت زدہ ہے، نہ اشخاص باقی نہ امکنہ۔ کتاب فروشوں سے کہہ دوں گا اگر میری نظم و نثر کے رسالوں میں سے کوئی رسالہ مل جائے گا۔ تو وہ مول لے کر خدمت میں بھیج دیا جائے گا۔

اکابر شہر اور خود غالب کی مصیبتوں کے اور بھی کئی مرقع ہیں۔ لیکن وہ پنشن کی بندش کے بیان میں پیش ہوں گے۔

مزید مصیبتیں سوء اتفاق یہ کہ غدر کے بعد دہلی پر پے در پے مصیبتیں نازل ہوتی رہیں مثلاً ایک دفعہ ہیضہ پھیلا، ایک مرتبہ خشک سالی کے باعث کال پڑا۔ ایک سال برسات اس شدت سے ہوئی۔ کہ بہت سے مکان گر گئے اور فصلیں خراب ہوگئیں۔ غالب ان تمام مصیبتوں کا تذکرہ مجملاً اور برسات کا تذکرہ مفصلاً ان الفاظ میں کرتے ہیں :۔

برسات کا نام آگیا سو پہلے تو مجملاً سنو۔ ایک غدر کالوں کا، ایک ہنگامہ گوروں کا، ایک فتنہ انہدام مکانات کا، ایک آفت وبا کی، ایک مصیبت کال کی، اب یہ برسات جمیع حالات کی جامع ہے۔ آج اکیسواں دن ہے۔ آفتاب اس طرح نظر آجاتا ہے جس طرح بجلی چمک جاتی ہے[1]۔ رات کو اگر کبھی کبھی تارے دکھائی دیتے ہیں، تو لوگ ان کو جگنو سمجھنے لگتے ہیں۔ اندھیری راتوں میں چوروں کی بن آئی ہے کوئی دن نہیں کہ دو چار گھر کی چوری کا حال نہ سنا جائے۔ مبالغہ نہ سمجھنا، ہزار ہا مکانات گر گئے۔ سینکڑوں آدمی جا بجا دب کر مر گئے۔ گلی گلی ندی بہ رہی ہے۔ قصہ مختصر وہ ان کال تھا کہ پانی نہ برسا، اناج نہ پیدا ہوا۔ یہ

[1] یہ مضمون خواجہ نظیری نیشاپوری نے بھی باندھا ہے :۔ آفتاب امروز چوں برق از دیار ما گزشت

"بن کال" ہے۔ پانی ایسا برسا کہ بوئے ہوئے دانے بہ گئے، جنہوں نے ابھی نہیں بویا تھا وہ بونے سے رہ گئے۔

پانچ لشکر | ایک اور خط میں فرماتے ہیں:

پانچ لشکر کا حملہ پے در پے اس شہر پر ہوا۔ پہلا باغیوں کا لشکر، اس میں اہل شہر کا اعتبار لُٹا۔ دوسرا خاکیوں[1] کا، اس میں جان و مال و ناموس و مکان و مکین و آسمان و زمین و آثار ہستی سراسر لُٹ گئے۔ تیسرا لشکر کال کا، اس میں ہزار ہا آدمی بھوکے مرے۔ چوتھا لشکر ہیضے کا، اس میں بہت سے پیٹ بھرے مرے۔ پانچواں لشکر تپ کا، اس میں تاب و طاقت نہ پائی۔ اب تک اس لشکر نے شہر سے کوچ نہیں کیا۔ میرے گھر میں دو آدمی تپ سے مبتلا ہیں۔ ایک بڑا لڑکا دوسرا باقر علی خاں، ایک داروغہ۔ (کلو) خدا ان دونوں کو جلد صحت دے۔

وبا | میر مہدی نے غالباً پوچھا تھا کہ اب ہیضے کی کیفیت کیا ہے۔ اس کے جواب میں فرماتے ہیں:۔

وبا کو کیا پوچھتے ہو۔ قدر انداز قضا کے ترکش میں یہ بھی ایک تیر باقی تھا۔ قتل ایسا عام، لوٹ ایسی سخت، کال ایسا بڑا، وبا کیوں نہ ہو۔ لسان الغیب (غالبؔ) نے دس برس پہلے فرمایا ہے۔

ہو چکیں غالبؔ بلائیں سب تمام ایک مرگ ناگہانی اور ہے،

وفات کی پیشگوئی | غالبؔ نے پیشگوئی کر رکھی تھی کہ میں ۱۲۷۷ھ میں مرجاؤں گا، بلکہ ایک قطعۂ تاریخ بھی خود مرتب کر لیا تھا:

من کہ باشم کہ جاوداں باشم چوں نظیری نماند و طالب مرد
در بہ پرسند در کدامیں سال مرد غالبؔ؛ بگو کہ "غالبؔ مرد"

لیکن یہ پیشگوئی پوری نہ ہوئی۔ اسی سال ہیضے کی وبا پھوٹی۔ غالبؔ کو نہ مرنے کا

---

[1] خاکیوں سے مراد انگریزی فوج ہے اور یہ تسمیہ غالباً انگریزی فوج کی وردی کے رنگ پر مبنی ہے۔

ایک دلچسپ عذر ہاتھ آگیا۔ مہدی مجروح کو لکھتے ہیں:

میاں ۱۲۷۷ھ کی بات غلط نہ تھی۔ مگر وبائے عام میں مرنا اپنے لائق نہ سمجھا۔ واقعی اس میں میری کسرِ شان تھی۔ بعد رفع فساد ہوا (ہیضہ) دیکھا جائے گا۔

ایک جگہ فرماتے ہیں کہ ۱۲۷۷ھ میں نہ مرنا صرف میری تکذیب کے واسطے تھا۔[1]

اسی زمانے میں صاحب عالم مارہروی نے غالب کی مدح میں چند اشعار کہہ کر بھیجے تھے۔ انہیں جواب میں لکھتے ہیں کہ وبائے عام میں صرف اس لئے جیتا بچا، کہ آپ کی مدح کی سعادت عظمےٰ سے بہرہ اندوز ہو سکوں[2]

غالب کا قطعہ

دہلی پر انگریزوں کے دوبارہ قابض ہونے کے بعد شہر کی جو حالت ہوئی تھی اس کا نقشہ غالب نے چند اُردو اشعار میں بھی کھینچا تھا، لیکن یہ اشعار ان کے مطبوعہ اُردو دیوان میں شامل نہ ہو سکے۔ البتہ نسخہ حمیدیہ میں اُردوئے مُعلّٰے سے لے کر شامل کر دیئے گئے ہیں۔ چونکہ یہ اشعار غالب کے دوسرے کلام کے خلاف عام اشاعت نہ پا سکے اس لئے میں انہیں یہاں درج کرتا ہوں:

بسکہ فعّال ما یرید ہے آج	ہر سلحشور انگلستاں کا
گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے	زہرہ ہوتا ہے آب انساں کا
چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے	گھر نمونہ بنا ہے زنداں کا
شہر دہلی کا ذرّہ ذرّہ خاک	تشنۂ خوں ہے ہر مسلماں کا
کوئی واں سے نہ آسکے یاں تک	آدمی واں نہ جا سکے یاں کا
میں نے مانا کہ مل گئے پھر کیا	وہی رونا تن و دل و جاں کا
گاہ جل کر کیا کئے شکوہ	سوزشِ داغہائے پنہاں کا

[1] اُردوئے مُعلّٰے صفحہ ۱۶۸ [2] اُردوئے مُعلّٰے صفحہ ۱۶۱۔

گاہ رو کر کہا کیے باہم ماجرا دیدہ ہائے گریاں کا

اس طرح کے وصال سے غالبؔ

کیا مٹے دل سے داغِ ہجراں کا

غدر کے سلسلے میں غالبؔ کے ماتم و عزاداری کی یہ داستانِ غم میری رائے میں کسی تبصرہ کی محتاج نہیں۔ اس کا ایک حصہ ابھی باقی ہے، جو پنشن کی بندش سے تعلق رکھتا ہے۔ اسے آیندہ باب میں ملاحظہ فرمائیں۔ مگر عرض کردینا ضروری ہے کہ غالبؔ نے جو کچھ لکھا ہے وہ ان کے تاثرات کی تصویر ہے۔ انھوں نے انگریزوں کی بے جا خوشامد نہیں کی اور نہ ان کی کسی سختی یا شدت پر پردہ ڈالا۔ جہاں "کالوں" کی دراز دستیوں کی مذمت کی، وہاں "گوروں" کی زیادتیوں کو بھی صاف صاف بیان کردیا۔ غدر کی وجہ سے دہلی پر جو آفتیں آئیں وہ اوپر کے خونچکاں مرقع میں تفصیل کے ساتھ پیش ہو چکی ہیں۔ جہاں بے گناہ انگریزوں بالخصوص بچوں اور عورتوں کا قتل غالبؔ کے لئے رنج افزا تھا، وہاں اکابر و رؤسا و عوام دہلی کی بربادیوں اور پادشاہی خاندان کی مصیبتوں نے بھی انہیں بے طرح تڑپایا اور ان کے سازِ تاثر سے ایسے خون آلود نوحے پیدا کیے، جنہیں سُن کر آج بھی ہر حساس انسان بے اختیار اشکبار ہو جائے گا۔ آخر میں اتنا اور کہہ دینا چاہیئے۔ کہ غالبؔ شاعر تھے۔ کسی خاص گروہ، خاص جماعت اور خاص قوم کے شاعر نہ تھے بلکہ مشرب و طریق کی وسعت اور تاثرات و احساسات کی ہمہ گیری کے باعث کائناتِ انسانیت کے شاعر تھے۔ ان سے یہ توقع نہیں رکھی جاسکتی تھی کہ ایک مخصوص گروہ و جماعت کے مخصوص تاثرات کے پابند ہو جائیں۔ ان کی نظروں میں تجاوز بہر حال بُرا تھا خواہ اس کے مرتکب ہندوستانی ہوئے یا انگریز اور الم نامہ غدر کے ہر صفحہ پر غالبؔ کی یہ خصوصیت آشکارا نظر آرہی ہے۔

گیارھواں باب

پنشن کے لئے سعی و سفارش

بہ تہی دستم دلے برگ خدایا تا چند
بہ سخن شاد شوم کایں گہر از کان من است

غالب کی مالی حالت کا نقشہ آپ کے سامنے آچکا ہے ان کی آمدنی محدود تھی، لیکن خرچ امیرانہ تھا۔ غدر کے آغاز پر ان کے گزارے کے مستقل ذریعے صرف دو تھے۔ قلعہ کے پچاس روپے اور خاندانی پنشن کے ساڑھے باسٹھ روپے۔ یہ دونوں دروازے غدر کے ساتھ ہی بند ہو گئے قلعہ کی تنخواہ اس لئے مسدود ہوئی کہ غدر بپا ہوتے ہی غالب خانہ نشین ہو گئے اور انہیں قلعہ سے کوئی سروکار نہ رہا۔ ویسے بھی اس ہنگامہ عام میں ایک شاعر یا تاریخ نگار کی تنخواہ کا کسے خیال آسکتا تھا اور انگریزی حکومت دہلی سے غدر کے ساتھ ہی اٹھ گئی تھی۔ جب انگریزی اقتدار دوبارہ قائم ہوا تو غالب پر باغیوں کی طرفداری کا الزام عائد ہو گیا۔ اس بنا پر وہ نہ محض خاندانی پنشن ہی سے محروم ہوئے بلکہ خلعت و دربار کا اعزاز بھی کھو بیٹھے پنشن کا پورا روپیہ تین برس کے بعد مئی ۱۸۶۰ء میں یک مشت ملا۔ اعزاز کی بحالی کے لئے

نہیں مزید چند سال انتظار کرنا پڑا۔

جن دوستوں سے اس افتاد میں دستگیری کی امید ہو سکتی تھی وہ خود مصیبتوں میں مبتلا ہو گئے تھے۔ گھر میں غالب کے پاس کوئی قیمتی اثاثہ نہ تھا صرف زیورات تھے جنہیں بیگم نے غدر کے آغاز ہی میں بغرض حفاظت شیخ نصیر الدین عرف کالے میاں کے مکان کے تہ خانہ میں رکھوا دیا تھا جہاں اور بھی کئی گھروں کی قیمتی چیزیں جمع ہو گئی تھیں۔ اس تہ خانے کے تمام محفوظات انگریزی فوج کے ہاتھوں لٹ گئے۔ غالب کے پاس صرف کپڑے یا بعض معمولی اشیا باقی رہ گئی تھیں جنہیں بیچ بیچ کر یا قرض لے لے کر وہ قوت لایموت کا انتظام کرتے رہے۔ جولائی ۱۸۵۹ء میں نواب یوسف علی خاں مرحوم والی رام پور نے سو روپے ماہوار کا وظیفہ مقرر کر دیا۔ اور کسی قدر سہولت کی صورت پیدا ہوئی لیکن اس سے پیشتر قرض کی بھاری رقم ان کے ذمے ہو گئی تھی اور رام پور کا وظیفہ ان کے گزارے کے لئے بھی کافی نہ تھا۔ چہ جائیکہ اس کا کوئی حصہ ادائے قرض میں صرف ہوتا۔

یوں تو عہد طفلی کو چھوڑ کر غالب کی زندگی کا ہر دور کشائش و دلجمعی کے سامان سے بالعموم تہی دامن رہا۔ لیکن غدر کے بعد تین برس بالخصوص بڑی پریشانی اور عسرت میں گزرے۔ پنشن سے کہیں زیادہ انہیں خلعت و دربار کی بندش کا قلق تھا۔ جسے وہ ذاتی اعزاز اور خاندانی وجاہت کا زوال سمجھتے تھے۔ چنانچہ اس دور میں ان کے مکاتیب، بہ طور خاص درد سے لبریز رہے۔

حکام سے بے تعلقی غدر میں پہلے باغیوں نے پھر انگریزی فوج نے شہر پر جو مصیبتیں نازل کیں ان سے غالب کے دل پر سخت چوٹ لگی۔ وہ اس درجہ افسردہ خاطر تھے۔ کہ ابتدا میں انگریزی حکام کے ساتھ رابطہ پیدا کرنے کا کوئی خیال نہ تھا۔ ہرگوپال تفتہ کو ۳۰ جنوری ۱۸۵۸ء کے ایک خط میں رقم فرماتے ہیں:

مجھ کو دیکھو نہ آزاد ہوں، نہ قید۔ نہ رنجور ہوں، نہ تندرست۔ نہ خوش ہوں، نہ ناخوش۔ نہ مردہ ہوں، نہ زندہ، جیئے جاتا ہوں، باتیں کئے جاتا ہوں۔ روٹی روز کھاتا ہوں، شراب گاہ گاہ پیئے جاتا ہوں۔ جب موت آئے گی مر رہوں گا۔ نہ شکر ہے، نہ شکایت ہے۔ جو تقریر ہے بر سبیل حکایت ہے۔

پنشن کے لئے سلسلہ جنبانی

وقت گزر جانے پر رنج و الم کی شدت کم ہوئی اور احتیاجات نے تنگ کیا تو پنشن کے لیے جد و جہد شروع ہوئی۔ لیکن ہر طرف مایوسی کی تیرگی نظر آتی تھی۔ میر مہدی مجروح کو لکھتے ہیں :۔

دیکھا اس پنشن قدیم کا حال۔ میں تو اس سے ہاتھ دھوئے بیٹھا ہوں۔

اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ غالب کو پنشن سے بھی بڑھ خلعت و دربار کا قلق تھا۔ مجروح نے غالباً لکھا تھا کہ پنشن کے لئے گورنر جنرل کے پاس مرافعہ کرنا چاہیئے۔ جواب میں لکھتے ہیں :

لے مے نکند در کف من خامہ روائی
سرد است ہوا آتش بے دود کجائی

میر مہدی صبح کا وقت ہے، جاڑا خوب پڑ رہا ہے۔ انگیٹھی سامنے رکھی ہوئی ہے، دو حرف لکھتا ہوں، ہاتھ تاپتا جاتا ہوں۔ آگ میں گرمی نہیں۔ ہائے آتش سیال (شراب) کہاں کہ جب دو جرعے پی لئے فوراً رگ و پے میں دوڑ گئی۔ دل توانا ہو گیا، دماغ روشن ہو گیا۔ نفس ناطقہ کو تواجد بہم پہنچا۔ ساقی کوثر کا بندہ اور تشنہ لب، ہائے غضب ! ہائے غضب !!

میاں تم پنشن پنشن کہہ رہے ہو۔ گورنر جنرل کہاں اور پنشن کہاں، وہ صاحب ڈپٹی کمشنر صاحب کمشنر بہادر، نواب لفٹنٹ گورنر بہادر۔ جب ان تینوں نے جواب دیا ہو تو اس کا مرافعہ گورنمنٹ میں کروں۔ مجھے تو دربار و خلعت کے لالے پڑے ہوئے

ہیں، تم کو پنشن کا فکر ہے۔

ایک خط میں لکھتے ہیں،

میرا دربار اور خلعت دریا برد ہوگیا۔ نہ پنشن کی توقع، نہ دربار و خلعت کی صورت نہ سزا، نہ انعام، نہ رسم معمولی قدیم۔

دوسرے پنشن داروں کے حالات | **بعض دوسرے پنشن داروں کے اور اپنے حالات بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں،**

اے لو کئی دن ہوئے حیدر خاں گرفتار آیا ہے۔ پاؤں میں بیڑیاں، ہاتھوں میں ہتھکڑیاں۔ حوالات میں ہے، دیکھئے حکم اخیر کیا ہو۔ . . . . جو کچھ ہونا ہے ہو رہا ہے گا۔ ہر شخص کی سرگزشت کے موافق حکم ہو رہے ہیں نہ کوئی قانون ہے، نہ قاعدہ، نہ نظیر کام آئے نہ تقریر پیش جائے۔ ارتضیٰ خاں بن مرتضیٰ خاں کی پوری دو سو روپے کی پنشن کی منظوری کی رپورٹ گئی اور ان کی بہنوں سو سو روپے مہینہ پانے والیوں کو حکم ہوا کہ چونکہ تمہارے بھائی مجرم تھے تمہاری پنشن ضبط۔ بہ طریق ترحم دس دس روپے مہینہ تم کو ملے گا۔ ترحم یہ ہے تو تغافل کیا قہر ہوگا؟ میں خود موجود ہوں اور حکام صدر کارو شناس . . . ۵۲ برس کی پنشن، تقرر اس کا بہ تجویز لارڈ لیک و بہ منظوری گورنمنٹ، اور پھر نہ ملا ہے، نہ ملے گا، خیر احتمال ہے ملنے کا۔ علی کا بندہ ہوں، اس کی قسم کبھی جھوٹ نہیں کھاتا۔ اسوقت کلو (داروغہ) کے پاس ایک روپیہ سات آنے باقی ہیں۔ بعد اس کے نہ کہیں سے قرض کی امید ہے، نہ کوئی جنس رہن و بیع کے قابل۔

پنشن کے لئے سعی کی روداد | **اب پنشن کے لئے سعی کی روداد ملاحظہ فرمائیے:**

عرضی میری سرجان لارنس چیف کمشنر بہادر کو گزری۔ اس پر دستخط ہوئے کہ یہ عرضی مع کاغذ ضمیمہ سائل کو بھیجدی جائے اور یہ لکھا جائے کہ معرفت صاحب کمشنر دلی کے پیش کرو۔ اب سررشتہ دار کو لازم تھا کہ میرے نام موافق دستور کے خط لکھتا۔ یہ

نہ ہُوا۔ وہ عرضی حکم چڑھی ہوئی میرے پاس آگئی۔ میں نے خط صاحب کمشنر چارلس ساؤنڈرس کو لکھا اور وہ عرضی حکم چڑھی ہوئی اس میں ملفوف کرکے بھیج دی صاحب کمشنر نے صاحب کلکٹر کے پاس یہ حکم چڑھا کر بھیجی کہ سائل کی پنشن کی کیفیت لکھو۔ اب وہ مقدمہ صاحب کلکٹر کے ہاں آیا ہے۔ ابھی صاحب کلکٹر نے تعمیل اس حکم کی نہیں کی پرسوں تو ان کے ہاں یہ روبکاری آئی ہے۔ دیکھئے کچھ مجھ سے پوچھتے ہیں یا اپنے دفتر سے لکھ بھیجتے ہیں دفتر کہاں رہا ہے، جو اس کو دیکھیں گے۔

"دستنبو" کی طباعت میں عجلت کی غرض

"دستنبو" کے چھپوانے میں بھی اسی غرض سے عجلت کی گئی تھی۔ کہ کتاب کے ذریعہ سے حکام کے ساتھ تجدیدِ روابط کی مناسب صورت پیدا ہو جائے۔ چودھری عبدالغفور خاں سرور کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

راہ و رسمِ مراسلت حکامِ عالی مقام سے بہ دستور جاری ہو گئی۔ نواب لفٹنٹ گورنر بہادر غرب و شمال (آگرہ و اودھ) کو نسخہ "دستنبو" بہ سبیل ڈاک بھیجا تھا۔ ان کا خط فارسی مشعر تحسین عبارت و قبول صدق و ارادت و مودت بہ سبیل ڈاک آگیا۔ پھر قصیدہ بہاریہ تہنیت و مدح بھیجا گیا، اس کی رسید آگئی۔ وہی خاں صاحب بسیار مہربان دوستان" القاب اور کاغذ افشانی۔ ازاں بعد ایک قصیدہ رابرٹ منٹگمری صاحب لفٹنٹ گورنر بہادر قلمرو پنجاب کی مدح میں بہ توسط چیف کمشنر بہادر دہلی گیا۔ اس کے جواب میں بھی خوشنودی نامہ بہ توسط کمشنر بہادر کل مجھ کو آگیا۔ پنشن ابھی تک مجھ کو نہیں ملی۔ جب ملے گی حضرت کو اطلاع کر دی جائے گی۔

ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ شہر کے کوتوال سے کیفیت طلب کی گئی تھی فرماتے ہیں:-

پنشن کی صورت یہ ہے کہ کوتوال سے کیفیت طلب ہوئی۔ اس نے اچھی لکھی۔

خوش اعتقادی

غالب بڑے خوش اعتقاد تھے۔ صاحب نے بلایا، اچھے انداز میں گفتگو

کی اور انہیں کو یقین ہو گیا کہ اب پنشن ملنے والی ہے۔ لکھتے ہیں:

ہفتے کے دن ساتویں اگست ۱۸۵۸ء کو مجھ کو اجرٹن صاحب نے بلایا کچھ سہل سوال مجھ سے کیے۔ اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تنخواہ ملے اور جلد ملے۔ تردد اگر ہے تو اس میں ہے کہ پندرہ مہینے پہلے بھی ملتے ہیں یا صرف آئندہ کو مقرر ہوتی ہے۔

حالانکہ اس کے بعد بھی پنشن کے حصول میں کم و بیش پونے دو برس صرف ہوئے۔ "دستنبو" کے نسخے مختلف حکام کے پاس پہنچے اور رسیدیں آنے لگیں تو پھر غالب کی کشت امید میں آبیاری کا سامان ہوا۔ اوائل مارچ ۱۸۵۹ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں:

صاحب کمشنر بہادر دہلی یعنی جناب سانڈرس صاحب بہادر نے مجھ کو بلایا پنجشنبہ ۲۴ فروری کو میں گیا۔ صاحب شکار کو سوار ہو گئے تھے۔ میں الٹا پھر آیا۔ جمعہ ۲۵ فروری کو گیا۔ ملاقات ہوئی۔ کرسی دی۔ بعد پرسش مزاج کے ایک خط انگریزی چار ورق کا اٹھا کر پڑھتے رہے۔ جب پڑھ چکے تو مجھ سے کہا کہ یہ خط ہے حاکم اکبر صدر بورڈ پنجاب کا۔ تمہارے باب میں لکھتے ہیں، ان کا حال دریافت کر کے لکھو۔ سو ہم تم سے پوچھتے ہیں کہ تم ملکہ معظمہ سے خلعت کیا مانگتے ہو؟ حقیقت کہی گئی۔ ایک کاغذ آمدہ ولایت لے گیا تھا، وہ پڑھوا دیا۔ پھر پوچھا تم نے کتاب کیسی لکھی ہے؟ اس کی حقیقت بیان کی۔ کہا ایک کتاب میکلوڈ صاحب نے دیکھنے کو مانگی ہے اور ایک، ہم کو دو۔ میں نے عرض کیا کل حاضر کروں گا۔ پھر پنشن کا حال پوچھا وہ گزارش کیا۔ اپنے گھر آیا۔ اور خوش آیا۔

جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے خوش اعتقادی کی بنا پر غالب نے انہی استفسارات کو نئی خوشگوار امیدوں کا مبنیٰ بنا لیا۔ فرماتے ہیں:-

دیکھو میر مہدی حاکم پنجاب کو مقدمہ ولایت کی کیا خبر؟ کتابوں سے کیا اطلاع؟ پنشن کی پرسش سے کیا مدعا؟ یہ استفسار بہ حکم گورنر جنرل بہادر ہوا ہے، اور یہ صورت مقدمہ فتح و فیروزی ہے۔

دوسرے روز وہ کتابیں لے کر گئے۔ لیکن سانڈرس صاحب باہر چلے گئے۔ اور جاتے ہوئے کہہ گئے کہ کتابیں منشی کے حوالے کر دی جائیں[1]۔ ایک دن کا وقفہ ڈال کر غالب پھر ملاقات کے لئے گئے۔ سانڈرس صاحب نے بہت التفات سے باتیں کیں۔ غالب نے گورنروں کے سرٹیفکیٹ دکھائے میکلوڈ صاحب کے نام ایک خط لکھوا کر لے گئے تھے، وہ سانڈرس صاحب کو دیا کہ دستنبو کے ساتھ صاحب کی خدمت میں بھیج دیا جائے۔ پھر پنشن کے متعلق گفتگو ہوئی تو سانڈرس صاحب نے کہا کہ اجرٹن صاحب سے ملو[2]۔ اس تحریر کا آخری حصہ غالب کی خوش اعتقادی کا ایک اور دلچسپ مرقع ہے۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ بس تمام مصیبتیں ختم ہو چکی ہیں۔ اور صبر و ثبات کی آزمایش پوری ہو گئی ہے۔ یہ بھی نہیں کہتے کہ پنشن ملنے والی ہے۔ بلکہ اس انداز میں ذکر فرماتے ہیں کہ گویا سارا روپیہ ان کی جیب میں پہنچ چکا ہے:

> دیکھو سید (میر مہدی) اسد اللہ الغالب علیہ السلام کی مدد کو کہ اپنے غلام کو کس طرح بچایا۔ بائیس مہینے تک (ابتدا مئی ۱۸۵۷ء سے لے کر اواخر فروری ۱۸۵۹ء تک) بھوکا پیاسا بھی نہ رہنے دیا۔ پھر کس محکمہ سے کہ وہ آج سلطنت دہندہ ہے۔ میرے تفقد کا حکم بھجوایا۔ حکام سے مجھ کو عزت دلوائی۔ میرے صبر و ثبات کی داد ملی۔ صبر و ثبات بھی اسی کا بخشا ہوا تھا، میں کیا اپنے باپ کے گھر سے لایا تھا۔

لیکن اس کے بعد بھی عسرت و فاقہ مستی کے چودہ مہینے گزرنے والے تھے۔

افسروں کے حالات کی جستجو اس زمانے میں وہ مختلف افسروں کے حالات معلوم کرنے کے لئے بہت مضطرب رہتے تھے کہ شاید کوئی ایسا افسر آ جائے جو ان کا شناسا

---

[1] اردوئے معلےٰ صفحہ ۱۳۶

[2] اردوئے معلےٰ صفحہ ۱۳۷

ہو اور حکومت میں اچھی رپورٹ پیش کرنے پر آمادہ ہو جائے۔ چنانچہ مکاتیب میں جا بجا مختلف دوستوں سے مختلف افسروں کے متعلق استفسارات ملتے ہیں۔ مثلاً منشی شیو نرائن کو لکھتے ہیں:

دہ نمبر اخبار کا جو تم نے مجھ کو بھیجا تھا اس میں ایڈمنسٹن صاحب کے لفٹنٹ ہونے کی اور بہت جلد آگرہ آنے کی خبر لکھی تھی۔ یہاں مجھ کو کئی باتیں پوچھنی ہیں ایک تو یہ کہ یہ چیف سکرٹری گورنر جنرل کے تھے۔ جب یہ لفٹنٹ گورنر ہوئے تو اب چیف سکرٹری کون ہو گا؟ یقین ہے کہ ولیم میور صاحب اس عہدے پر مامور ہوں۔ پس اگر یونہی ہے تو ان کے محکمہ میں چیف سکرٹری کون ہو گا؟ دوسری یہ کہ میر منشی ان کے تو وہی منشی غلام غوث خاں رہیں گے؟ تیسری یہ کہ گورنر جنرل کے فارسی دفتر کے میر منشی ایک بزرگ تھے، بلگرام کے رہنے والے منشی سید جان خاں۔ آیا اب بھی وہی ہیں یا ان کی جگہ کوئی اور صاحب ہیں؟ ان سب باتوں میں سے جو آپ کو معلوم ہوں وہ اور جو نہ معلوم ہوں ان کو معلوم کر کے مجھ کو لکھئے اور جلد لکھئے اور ضرور لکھئے۔

ایک خط میں خواجہ غلام غوث خاں بیخبر سے اس قسم کے متعدد استفسارات کئے ہیں مثلاً گورنر جنرل کا چیف سکرٹری ایڈمنسٹن کی جگہ کون ہوا؟ لفٹنٹ گورنر کے سکرٹری کا کام کس کے حوالے کیا گیا؟ گورنر جنرل کا دورہ کب شروع ہو گا۔[۲]

دُستنبو کی رسیدوں پر خوشی

دُستنبو کے نسخے جا بجا بھیجتے جاتے تھے اور جب کہیں سے رسید آتی تھی، پھولے نہیں سماتے تھے۔ اگر کسی کی طرف سے اطلاع نہیں ملتی تھی تو پژمردہ ہو جاتے تھے۔ بیخبر نے لفٹنٹ گورنر کے نام پارسل پہنچنے کی اطلاع بھیجی تو اس پر

[۱] سر جارج فریڈرک ایڈمنسٹن ۱۹ جنوری ۱۸۵۹ء سے لیکر ۲ فروری ۱۸۶۳ء تک صوبجات متحدہ کے لفٹنٹ گورنر رہے

[۲] اردوئے معلےٰ صفحہ ۲۲۱

خوش ہو کے لکھتے ہیں:

اس نامہ مختصر نے وہ کیا جو پارۂ ابر کشت خشک سے کرے۔ یعنی خط اور پارسل کا پہنچ جانا ایسا نہیں کہ اس سے خبر پا کر بخت کی رسائی کا سپاس گزار نہ ہوں۔ یہ تو حضرت کو لکھ چکا ہوں کہ دوسرا پارسل اور خط معاً اس خط کے ساتھ بھیجا گیا اور ہر گونہ توقع کا خیال اسی پارسل پر ہے۔ کس واسطے کہ اس خط میں حاکم اعظم کے نام عرضی ملفوف ہے۔ جانتا ہوں کہ محکمہ ایک، ڈاک ایک، دونوں پارسل دونوں لفافے ایک دن پہنچے ہوں گے۔ مگر دل نہیں مانتا اور کہتا ہے۔ کہ نہ مانوں گا۔ جب تک حضرت اس سرنوشت سے معلوم کر کے نہ لکھیں۔

ایڈمنسٹن صاحب گورنر بن کر آگرہ آ گئے۔ تو غالب نے انہیں بھی "دستنبو" بھیجی۔ نیز گورنری کی تہنیت میں ایک فارسی قصیدہ عرض کیا۔ جواب میں ایک فارسی خط آیا جو کتاب کی رسید اور نظم کی تحسین پر مشتمل تھا۔ بعد ازاں غالب نے پنجاب کے لفٹنٹ گورنر سر رابرٹ منٹگمری کو بھی ایک قصیدہ بھیجا۔ لیکن فرماتے ہیں:

پنشن کے باب میں ابھی کچھ حکم نہیں۔ اسباب توقع فراہم ہوتے جاتے ہیں، دیر آید درست آید۔ اناج کھاتا ہی نہیں ہوں، آدھ سیر گوشت دن کو اور پاؤ بھر شراب رات کو مل جاتی ہے۔

حکام دہلی کی مخالفانہ رپورٹ

معلوم ہوتا ہے کہ دہلی کے ادارۂ نظم و نسق نے غالب کے خلاف رپورٹ بھیجی تھی اور صاف لکھا تھا کہ وہ پنشن کے مستحق نہیں ہیں لیکن حکام صدر نے پنشن کی منظوری دے دی۔ غالب خود فرماتے ہیں:

گورنمنٹ نے برخلاف یہاں کے حاکم کی رائے کے میری پنشن کے اجرا کا حکم دے دیا۔

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

میرا دار و گیر سے بچنا کرامت اسد اللٰہی ہے۔ ان پیسوں کا ہاتھ آنا عطیہ ید اللٰہی۔ حاکم شہر لکھ دے کہ یہ شخص ہرگز پنشن پانے کا مستحق نہیں۔ حاکم صدر مجھ کو پنشن دلوائے اور

پورا دلوائیے۔

گورنر جنرل کا حکم | ۷ر مارچ ۱۸۶۰ء کے ایک مکتوب میں فرماتے ہیں :

نواب گورنر جنرل بہادر نے حاکم پنجاب کو لکھا کہ حاکم دہلی سے فلاں شخص کی پنشن کے چڑھے ہوئے روپے کے یک مشت پانے کی اور آیندہ ماہ بہ ماہ ملنے کی رپورٹ منگوا کر اپنی منظوری لکھ کر ہمارے پاس بھیج دو۔ تاکہ حکم منظوری دے کر تمہارے پاس بھیج دیں۔ سو یہاں اس کی تعمیل بہ طرز مناسب ہوگی۔ کم و بیش دو مہینے میں سب روپیہ مل جائے گا۔

مدد خرچ | جن جن لوگوں کے لئے پنشنوں کی منظوری ہو چکی تھی یا جن کے حق میں اچھی رپورٹیں ہوئی تھیں اور توقع تھی کہ انہیں ضرور پنشنیں مل جائیں گی انہیں ساری چڑھی ہوئی رقمیں ملنے سے قبل ۱۸۵۹ء میں قریباً ایک ایک سال کی رقمیں علی الحساب دی گئی تھیں۔ غالب فروری ۱۸۵۹ء کے خط میں لکھتے ہیں :

علی بخش خاں پچاس روپے مہینہ پاتے ہیں۔ بائیس مہینے کی (از مئی ۱۸۵۷ء تا جنوری ۱۸۵۹ء) گیارہ سو ہوتے ہیں۔ ان کو چھ سو روپے مل گئے۔ باقی روپیہ چڑھا رہا۔ آیندہ ملنے میں کچھ کلام نہیں۔ غلام حسن خاں سو روپے مہینے کا پنشن دار بائیس مہینے کے بائیس سو ہوتے ہیں۔ اس کو بارہ سو ملے۔ دیوان کشن لال کا ڈیڑھ سو روپیہ مہینہ، بائیس مہینے کے تین ہزار تین سو ہوتے ہیں اس کو اٹھارہ سو روپے ملے۔ منا جمعدار دس روپے مہینے کا سکہ لمبر سال بھر کے ایک سو بیس روپے آیا۔ اس طرح پندرہ سولہ آدمیوں کو ملا ہے۔

"مدد خرچ" کی شرط | اس کا نام "مدد خرچ" تھا۔ اور صرف ان لوگوں کے لئے منظور ہوا تھا جو بے گناہی کے علاوہ مالی بے مقدوری کے متعلق چار گواہ پیش کر دیں۔ فروری ۱۸۵۹ء میں دوسرے پنشن داروں کو "مدد خرچ" ملا تو غالب نے بھی اس کے لئے کوشش کی۔ حکام کو خطوں پر خط لکھے۔ بڑی دیر کے بعد کوتوال کے نام حکم آیا :

اسد اللہ خاں پنشن دار کی کیفیت لکھو کر وہ بے مقدور اور محتاج ہے یا نہیں۔ کوتوال نے موافق ضابطے کے مجھ سے چار گواہ مانگے ہیں، سو کل چار گواہ کوتوالی چبوترہ جائیں گے اور میری بے مقدوری ظاہر کر آئیں گے۔ تم کہیں یہ نہ سمجھنا کہ بعد ثبوت مفلسی چڑھا ہوا روپیہ مل جائے گا نہ صاحب یہ تو ممکن ہی نہیں۔ بعد ثبوت افلاس مستحق ٹھہروں گا چھ مہینے یا برس دن کا روپیہ علی الحساب پانے کا۔

غالب کو اس وقت کچھ نہ ملا اور پورا ایک سال گزرنے کے بعد پنشن کی منظوری ہوئی۔ صرف دفتری کارروائی کی تکمیل باقی تھی۔ کمشنر نے حکم دیا کہ اگر علی الحساب سو روپیہ لینا چاہو تو لے لو۔ غالب نے اس وقت بھی سال بھر کے روپے کا مطالبہ کیا۔ لیکن جواب ملا۔ کہ جب سارا روپیہ جلد ملنے والا ہے۔ تو اتنی بڑی رقم علی الحساب لینے کی کیا ضرورت ہے۔

تین سال کا روپیہ مل گیا

غرض ۴ مئی سنہ ۱۸۶۰ء کو تین سال کا روپیہ یک مشت ملا۔ اور آیندہ ماہ بہ ماہ روپیہ ملنے کا حکم ہوا۔ ۶ مئی سنہ ۱۸۶۰ء کے خط میں تفتہ کو لکھتے ہیں:

زر سہ سالہ مجموعہ ہزاروں کہاں سے آیا۔ سات سو پچاس پاتا ہوں تین برس کے دو ہزار دو سو پچاس ہوئے۔ سو روپے مجھے مدد خرچ ملے تھے وہ کٹ گئے۔ ڈیڑھ سو متفرقات میں گئے، رہے دو ہزار روپے، میرا مختار کار ایک بنیا ہے ساہو، میں اس کا قرضدار قدیم ہوں۔ اب جو دو ہزار روپے لایا اس نے اپنے پاس رکھ لئے اور مجھ سے کہا میرا حساب کیجئے۔ سات کم پندرہ سو اس کے سود مول کے ہوئے۔ قرض متفرق کا اسی سے حساب کرایا۔ گیارہ سو کئی روپے وہ نکلے۔ پندرہ اور گیارہ چھبیس سو ہوئے۔ اصل میں یعنی دو ہزار میں چھ سو کا گھاٹا وہ کہتا ہے کہ پندرہ سو میرے دے دو، پانسو سات باقی تم لے لو میں کہتا ہوں متفرقات گیارہ سو چکا دیئے تو باقی نو سو رہے آدھے تو لے آدھے مجھے دے پرسوں چوتھی (۴ مئی سنہ ۱۸۶۰ء) کو وہ روپے لایا۔ کل تک قصہ نہیں چکا۔ میں جلدی

نہیں کرنا۔ دو ایک مہاجن بیچ میں ہیں۔ ہفتے بھر میں جھگڑا فیصل ہو جائے گا۔

بالکل یہی تفصیل میر مہدی مجروح کو لکھی[1]۔ مختار کے ساتھ فیصلے کے بعد ایک خط میں لکھتے ہیں:

پنشن بے کم و کاست جاری ہوا۔ زر مجمعہ سہ سالہ یک مشت مل گیا۔ بعد ادائے حقوق چار سو دینے باقی ہیں اور ستاسی روپے گیارہ آنے مجھے بچے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یا تو مختار نے اپنے قرض کے سود میں کمی کر دی تھی یا اس کا تھوڑا بہت روپیہ باقی رہ گیا تھا۔ اور غالب نے اسے عام "حقوق" میں شامل نہیں کیا تھا۔

خوشی کی دو وجہیں پنشن کا روپیہ مل جانے پر خوشی کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ قرضخواہوں سے کم از کم تھوڑی مدت کے لئے نجات مل گئی۔ دوسری وجہ تھی کہ عزت بچ گئی اور حاسدوں کے لئے اعتراض کی گنجائش باقی نہ رہی۔ وہ خود فرماتے ہیں:

بات رہ گئی پت رہ گئی۔ حاسدوں کو موت آ گئی، دوست سب شاد ہو گئے۔ جیسا ننگا بھوکا ہوں، جب تک جیوں گا۔ ایسا ہی رہوں گا۔

خلعت و دربار پنشن کا قضیہ طے ہو گیا تھا۔ لیکن غالب کے خاندانی اعزاز کی ایک بڑی چیز جو انہیں پنشن سے بھی زیادہ عزیز تھی۔ دربار و خلعت کی عزت تھی۔ اس کی بحالی کے لئے مزید جد و جہد کرنی پڑی۔

گورنر جنرل نے ۱۸۶۰ء کے آغاز میں میرٹھ میں دربار کیا تھا۔ غالب متوقع تھے کہ حسب معمول انہیں بھی دربار میں بلایا جائے گا۔ لیکن یہ توقع پوری نہ ہوئی۔ مناسب انتظار کے بعد درخواست کی کہ سابقہ قاعدے کے موافق دربار میں بلایا جائے۔ جواب ملا کہ یہ نہیں ہو سکتا۔ دربار کے بعد گورنر جنرل دہلی آئے۔ تو غالب

---

[1] اردوئے معلیٰ صفحہ ۱۲۴۔

معمول کے مطابق خیمہ گاہ میں پہنچے۔ مولوی اظہار حسین صاحب میر منشی سے ملے۔ چیف سکرٹری کو اطلاع کرائی۔ جواب ملا کہ فرصت نہیں دوسرے روز پھر گیا اور اطلاع کرائی۔ لیکن میر منشی نے جواب دیا۔ کہ ”ایام غدر میں تم باغیوں سے اخلاص رکھتے تھے۔ اب گورنمنٹ سے کیوں ملنا چاہتے ہو؟“

غالب فرماتے ہیں:

اس دن چلا آیا۔ دوسرے دن میں نے انگریزی خط ان کے نام لکھ کر ان کو بھیجا مضمون یہ کہ باغیوں سے میرا اخلاص منظنۂ محض ہے۔ اُمید وار ہوں کہ اس کی تحقیقات ہو۔ تاکہ میری صفائی اور بے گناہی ثابت ہو۔ یہاں کے مقامات پر جواب نہ ہوا۔ اب ماہ گزشتہ یعنی فروری ۱۸۶۰ء میں پنجاب کے ملک سے جواب آیا۔ کہ لارڈ بہادر فرماتے ہیں کہ ہم تحقیقات نہ کریں گے۔

ایک اور خط میں لکھتے ہیں:

میر منشی صاحب سے ملا۔ ان کے ہاتھ میں اپنے نام کا ٹکٹ (کارڈ) صاحب سکرٹری بہادر کے پاس بھیجا۔ جواب آیا کہ تم غدر کے دنوں میں بادشاہی باغیوں کی خوشامد کیا کرتے تھے۔ اب گورنمنٹ کو تم سے ملنا منظور نہیں۔ میں گدائے مبرم اس حکم سے ممنوع نہ ہوا جب لارڈ صاحب بہادر کلکتہ پہنچے۔ میں نے قصیدہ حسب معمول بھیج دیا۔[1] مع اس حکم کے واپس آیا کہ اب یہ چیزیں ہمارے پاس نہ بھیجا کرو۔

جیون لال کا روزنامچہ

میرا خیال ہے کہ محض غالب ہی نہیں بلکہ بعض دوسرے اکابر پر بھی غدر میں شرکت یا باغیوں سے اخلاص کا جو الزام لگا تھا اس کی بنیاد منشی جیون لال

---

[1] یہی قصیدہ ہے جس کے متعلق یوسف میرزا کو لکھتے ہیں کہ ”دو مہینے دن رات خون جگر کھایا اور ایک قصیدہ چونسٹھ بیت کا لکھا۔ مجھ انفس مقہور کو دے دیا۔ وہ پہلی دسمبر کو مجھ کو دے گیا۔ اس میں التزام اپنی تمام سرگزشت لکھنے کا کیا ہے۔“

کے روزنامچہ پر تھی۔ منشی صاحب کے متعلق مشہور ہے کہ غدر کے دوران میں دہلی میں انگریزوں کے خاص جاسوس تھے اور شہر کے حالات کے متعلق روزانہ رپورٹیں بھیجا کرتے تھے جن میں بعض رپورٹیں بداہتہً غلط ہیں۔ مثلاً ایک موقع پر غالب کے متعلق مرقوم ہے۔ کہ انگریزوں پر فتح حاصل ہونے کی خوشی میں بہادر شاہ کے روبرو قصیدہ پڑھا۔[۱] حالانکہ غالب غدر میں گھر سے باہر نہیں نکلے تھے۔

اعزاز کی بحالی

بہ ہر حال پنشن کھل گئی۔ لیکن دربار و خلعت کی بحالی کے سلسلے میں تحقیقات ہوتی رہی۔ جب غالب بے گناہ ثابت ہوئے۔ تو مارچ ۱۸۶۳ء میں خلعت و دربار بھی بحال ہو گئے۔ غالب لکھتے ہیں:

> دوشنبہ ۳ مارچ (۱۸۶۳ء) کو سوادِ شہر مخیم خیام گورنری ہوا آخر روز میں اپنے شفیق قدیم جناب مولوی اظہار حسین خاں بہادر کے پاس گیا۔ اثنائے گفتگو میں فرمایا کہ تمہارا دربار اور خلعت بہ دستور بہ حال و برقرار ہے۔ متحیرانہ میں نے پوچھا کہ حضرت کیوں کر؟ حضرت نے کہا کہ حاکم حال نے ولایت سے آکر تمہارے علاقہ کے سب کاغذ انگریزی و فارسی دیکھے اور بہ اجلاس کونسل حکم لکھوایا کہ اسد اللہ خاں کا دربار اور نمبر اور خلعت بہ دستور بہ حال و برقرار ہے۔

دوسرے دن سر رابرٹ منٹگمری لفٹنٹ گورنر پنجاب نے بلا کر خلعت دے دیا۔ اور کہا۔ کہ اگر گورنر جنرل کے دربار انبالہ میں شرکت کرو گے۔ تو وہاں بھی خلعت ملے گا۔ غالب اگرچہ لفٹنٹ گورنر صاحب سے کہہ آئے تھے کہ انبالہ کہاں جاؤں گا۔[۲] لیکن مصارف سفر کا انتظام نہ ہونے کے باوجود جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ اس سے چند ماہ قبل ان کے ہاتھ پر پھنسی نکل آئی تھی۔ جس نے سخت تکلیف دہ صورت اختیار کر لی۔ اس بنا پر انبالہ کا ارادہ ترک کرنا پڑا۔[۳]

---

[۱] غدر کی صبح و شام صفحہ ۱۶۹ [۲] اردوئے معلیٰ صفحہ ۲۲۶ و ۱۱۷ [۳] اردوئے معلیٰ صفحہ ۱۱۸

سرسید مرحوم کی کوشش مولانا ابوالکلام آزاد فرماتے ہیں کہ غالب کی پنشن اور دربار و خلعت کی بحالی کے لئے سرسید احمد خاں مرحوم نے خاص کوشش فرمائی تھی۔[۱]

سرسید اور غالب کے درمیان آئین۔ اکبری کی تقریظ کے وقت سے ایک گونہ کشیدگی پیدا ہو چکی تھی۔ اور میل جول کے مراسم ختم ہو گئے تھے۔ وہ پہلی مرتبہ رام پور گئے۔ تو سرسید اس زمانے میں مراد آباد کے صدر الصدور تھے۔ اگرچہ ذہاب و ایاب میں مراد آباد سے گزرے لیکن سرسید کو اطلاع نہ دی واپس ہوتے ہوئے سرائے میں ٹھہرے تو سرسید کو کہیں سے خبر مل گئی۔ وہ فوراً سرائے میں پہنچے۔ بہ اصرار غالب کو مکان پر لے گئے اور ایک دو روز ٹھہرایا اس کے بعد کشیدگی رفع ہو گئی۔

پالکی سے اترتے وقت شراب کی بوتل غالب کے ہاتھ میں تھی۔ جسے انہوں نے سرسید کے مکان میں ایسی جگہ پر رکھ دیا جہاں ہر آتے جاتے کی نگاہ پڑتی تھی۔ سرسید نے اسے بہ نظر احتیاط اسباب کی کوٹھڑی میں پہنچا دیا۔ غالب کو بوتل نظر نہ آئی تو بہت پریشان ہوئے لیکن سرسید نے اطمینان دلایا اور اسباب کی کوٹھڑی میں لے جاکر بوتل دکھا دی۔[۲]

اس موقعہ پر سرسید کو غالب کی پریشان حالیوں کی پوری کیفیت معلوم ہو گئی ہو گی۔ اور انہوں نے پنشن اور دربار و خلعت کے لئے سعی میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا ہو گا۔ چونکہ پنشن حکام دہلی کی رائے کے خلاف حکام صدر کے احکام سے بحال ہوئی تھی۔ اس لئے اغلب ہے یہ سرسید کی مخلصانہ سعی کا نتیجہ ہو۔

غالب اور غدر مناسبت مضمون کا تقاضا یہ ہے۔ کہ لارڈ کیننگ، سر رابرٹ منٹگمری اور بعض دوسرے انگریزوں کے قصیدوں میں اپنے اور غدر کے باب میں جو کچھ غالب نے لکھا ہے اسے بھی یہاں درج کر دیا جائے۔

---

[۱] الہلال جلد ۴ نمبر ۴ صفحہ ۸ [۲] حیات جاوید صفحہ ۶۶

لارڈ کیننگ کے قصیدے میں فرماتے ہیں :

به کودکی شده ام ریزه چین خوانِ نوال | نهالم از ثمر پیش رس به بار آمد
ولے ازاں همه مال و منال توقیعی | کم است آنچه به تحویل خاکسار آمد
زیاک دو جرعه فزوں مے فرو نرفت به حلق | قدح به دست من از دست رعشه دار آمد
به پیریم ز تقاضاے طبع اوج گراے | خیال مدح شهنشاه روزگار آمد

پھر فرماتے ہیں کہ ملکہ وکٹوریہ کی مدح میں قصیدہ بھیجا۔ وہاں سے خوشنودی کے خط آئے۔ لیکن آسماں کہہ رہا تھا کہ دیکھیں تو کس طرح گوہر مقصود حاصل کرتا ہے۔ اسی اثنا میں غدر برپا ہو گیا :

به ناگرفت چناں صرصرے وزید به دہر | کزاں بر آئینهٔ آسماں غبار آمد
شراره بار غبارے ز مغز خاک انگیخت | سیاه روسپہے کاندریں دیار آمد
تو گوئی آنچه من آں را غبارے گویم | ز بهر کشت من ابر تگرگ بار آمد
دریں جگر گسل آشوب کز صعوبت آں | سپاه دار سپہری به زینهار آمد
گواه دعوی غالبؔ به عرض بے گنہی | ہمیں بس است که ہر گونه رستگار آمد

خطاب و خلعت و پنشن ز شاه مے خواہم | هم از نخست بدیں وایه ام قرار آمد
پس از سه سال که در رنج و پیچ و تاب گزشت | سر گزارشِ اندوه انتظار آمد

منٹگمری کے قصیدے میں لکھتے ہیں :

ذکر ایں فتنه که برخاست ز انبوهِ سپاه | به زبانے که قلم راست سراسر دارد
چوں دریں شہر ستم بهر که نامش دہلی است | دیدم آشوب که ہنگامهٔ محشر دارد
بنده مے خواست که بیروں رود اما بوجود | نتوانست که از گوشه قدم بر دارد
ماند و آئین وفا داشت دراں عهد و هنوز | نیز آں قاعده با خویش مقرر دارد

جز ثنائے و دعائے کہ ہمے گفت نگفت — وانچہ مے گفت دریں وقت ہم از بر دارد

دگر ایں نیز قصور است کہ تدبیر نہ کرد — چہ کند آں کہ نہ گنجینہ نہ لشکر دارد

بود با بندہ دراں روز و ہم امروز بجاست — خشت و خاکے کہ ازاں بالش و بستر دارد

خود بریں قول کہ ماتم زدہ و مردہ دل است — دو گواہ از لب خشک و مژۂ تر دارد

بہ گواہان دگر نیز گر افتد حاجت — دم سرد و رخ زرد و تن لاغر دارد

از تو جز داد نخواہم کہ در آئین وداد — ایں چنیں کار نہ پاداش نہ کیفر دارد

ہوس کار دگر نیست بہ جز شعر و شراب — اینت حرفے کہ ہم بالب ساغر دارد

اس قصیدہ کے آخر میں بھی یہی لکھتے ہیں۔ کہ ملکہ وکٹوریہ کا قصیدہ لکھ کر بھیجا۔ وہاں سے دو خوشنودی نامے آئے۔ نیز گورنروں کے خط پہنچے۔

ایڈمنسٹن کے قصیدے میں فرماتے ہیں:

از حضرت شہنشہ[1] خاطر نشان من بود — در مزد مدح سنجی صد گونہ کامرانی

ناگہ ز تند بادے[2] کاں خاست در قلمرو — برہم زد آں بنا را نیرنگ آسمانی

در وقت فتنہ بودم غمگین و بود با من — زاری و بے نوائی، پیری و ناتوانی

حاشا کہ بودہ باشم باغی بہ آشکارا — حاشا کہ کردہ باشم ترک وفا نہانی

از تہمتے کہ بر من بستند بد سگالاں — حکام راست با من یک گونہ سرگرانی

در پیریم ازیں غم جز مرگ چارہ نبود — خود پیر گشتے من بودے اگر جوانی

دارم شگرف حالے از مرگ و زیست بیروں

جاں گرچہ ہست شیریں تلخ است زندگانی

---

١ وکٹوریہ ٢ غدر۔

بارھواں باب

عوارض اور وفات

ہزار خستہ و رنجور در جہاں داری
یکے ز غالبؔ رنجور خستہ تن یاد آر

خواجہ حالیؔ مرحوم فرماتے ہیں کہ جن لوگوں نے غالبؔ کو جوانی میں دیکھا تھا۔ ان سے سُنا گیا ہے۔ کہ عنفوان شباب میں وہ شہر کے نہایت حسین و خوشرو لوگوں میں شمار ہوتے تھے۔ اور بڑھاپے میں بھی حسانت اور خوبصورتی کے آثار ان کے چہرے، قد و قامت اور ڈیل ڈول سے نمایاں طور پر نظر آتے تھے۔ لیکن آخری عمر میں خوراک کی قلت اور امراض کے ہجوم کی وجہ سے بہت نحیف و کمزور ہو گئے تھے۔ تاہم چونکہ ہاڑ بہت چکلا، قد کشیدہ اور ہاتھ پاؤں زبردست تھے۔ اس لئے اس حالت میں بھی نو وارد تورانی معلوم ہوتے تھے۔

حُلیہ | غالبؔ نے ایک خط میں اپنی تصویر الفاظ میں کھینچی ہے۔ جس سے ان کی جوانی اور بڑھاپے دونوں زمانوں کا نقشہ سامنے آجاتا ہے۔ میرزا حاتم علی بیگ کو لکھتے ہیں :-

تمہارے کشیدہ قامت ہونے پر مجھ کو رشک نہ آیا۔ کس واسطے کہ میرا قد درازی میں انگشت نما ہے۔ تمہارے گندمی رنگ پر رشک نہ آیا کس واسطے کہ جب میں جیتا تھا یعنی عالم جوانی میں) تو میرا رنگ چنپئی تھا اور دیدہ ور لوگ اس کی ستائش کیا کرتے تھے۔ اب جو کبھی وہ اپنا رنگ یاد آتا ہے۔ تو چھاتی پر سانپ لوٹ جاتا ہے۔ ہاں مجھ کو رشک آیا۔ اور میں نے خونِ جگر کھایا تو اس کلمہ پر کہ ڈاڑھی خوب گھٹی ہوئی ہے۔ وہ مزے یاد آ گئے۔ کیا کہوں جی پر کیا گذری، بقول شیخ علی حزیں:۔

تا دسترسم بود زدم چاک گریباں
شرمندگی از خرقۂ پشمینہ نہ دارم

جب داڑھی مونچھ میں بال سفید آ گئے تیسرے دن چیونٹی کے انڈے گالوں پر نظر آنے لگے اس سے بڑھکر یہ ہوا کہ آگے کے دو دانت ٹوٹ گئے۔ ناچار مسی بھی چھوڑ دی۔ اور داڑھی بھی۔ مگر یاد رکھئے اس بھونڈے شہر میں ایک وردی ہے عام۔ ملا، حافظ، بساطی، نیچا بند، دھوبی، سقا، بھٹیارہ، جولاہا، کنجڑا، منہ پر داڑھی، سر پر بال، فقیر نے جس دن داڑھی رکھی اُسی دن سر منڈایا۔

یہ مکتوب ۱۸۵۹ء کے اوائل کا ہے، کیوں کہ اس کے آخر میں جارج فریڈرک ایڈمنسٹن لفٹنٹ گورنر صوبجات متحدہ کو "دستنبو" نذر بھیجنے کا ذکر ہے۔ جس کی طباعت نومبر ۱۸۵۸ء میں مکمل ہوئی تھی اور ایڈمنسٹن صاحب جنوری ۱۸۵۹ء میں لفٹنٹ گورنر بنے۔

اس سے ظاہر ہے کہ:

(۱) غالب کشیدہ قامت تھے۔

(۲) ان کا رنگ چنپئی تھا۔

(۳) جوانی میں داڑھی منڈاتے تھے۔

(۴) جب سر اور داڑھی میں سفید بال آ گئے تو سر منڈانا شروع کر دیا اور داڑھی چھوڑ دی۔

(۵) جوانی میں مسّی استعمال کرتے تھے۔

(۶) باسٹھ تریسٹھ برس کی عمر تک ان کے آگے کے دو دانت ٹوٹ چکے تھے۔ اس کے ساتھ ہی مسّی چھوڑ دی تھی۔

میر صفیر بلگرامی ۱۸۶۵ء میں غالب سے ملے تھے۔ لباس اور حلیہ کے متعلق ان کا بیان یہ ہے:۔

"پاجامہ سیاہ بوٹے دار دریں کا کلی دار، نیفہ سُرخ ٹول کا، بدن میں مرزائی، سر کُھلا ہوا، رنگ سُرخ و سفید، مُنہ پر داڑھی دو اُنگل کی، آنکھیں بڑی، کان بڑے۔ قد لمبا، ولائیتی صورت، پاؤں کی اُنگلیاں بہ سبب کثرت شرب کے موٹی ہو کر اینٹھ گئی تھیں۔ اور کان کی سماعت میں کچھ ثقل آچلا تھا۔"[1]

ابتدا میں صحت بہت اچھی تھی

غالب کی صحت شروع میں بہت اچھی ہو گی، اس لئے کہ ابتدائی تحریریں خرابی صحت کے شکووں سے عام طور پر پاک ہیں۔ کہیں کہیں ان عوارض کا ذکر آتا ہے جو موسمی اثرات کے ماتحت قریباً ہر شخص کو وقتاً فوقتاً لاحق ہو جاتے ہیں۔ مثلاً مولوی محمد علی خاں صدر امین باندہ کے نام کے ایک خط سے جو سفر کلکتہ کے دوران میں لکھا گیا تھا، معلوم ہوتا ہے کہ انہیں باندہ کے قیام میں بخار آگیا تھا۔ فرماتے ہیں:۔

للہ الحمد کہ زحمت صداع (دردِ سر) و حمی (بخار) ہم از باندہ اثرے در طبع نہ گذاشتہ۔ ضعف اگر باقی است تر ودے نیست، چہ ایں رفیقے است کہ از وطن کر بہ ہمرہی بستہ است۔

تپ و لرزہ

اردو خطوط میں سب سے پہلے بیماری کا ذکر منشی ہر گوپال تفتہ کے نام کے ایک خط میں آیا ہے۔ جو مارچ ۱۸۵۴ء کا مرقومہ ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب ۲۶ فروری ۱۸۵۴ء کو بعارضہ تپ و لرزہ بیمار ہوئے تھے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:۔

میں چار دن سے لرزہ میں مبتلا ہوں اور مزہ یہ ہے کہ جس دن سے لرزہ چڑھا ہے، کھانا

[1] مصنف "جلوۂ خضر"۔

مطلق نہیں کھایا۔ آج پنجشنبہ پانچواں دن ہے۔ کہ نہ دن کو کھانا میسر ہے نہ رات کو شراب حرارت مزاج میں بہت ہے۔ ناچار احتراز کرتا ہوں۔ بھائی اس طرف کو دیکھو کہ پانچواں دن ہے کھانا کھائے، ہر گز بھوک نہیں لگی اور طبیعت غذا کی طرف متوجہ نہیں۔

بعض خطوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ حفظ صحت کی غرض سے مسہل لے لیا کرتے تھے۔ تفتہ کو ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

میں مسہل میں ہوں یہ نہ سمجھنا کہ بیمار ہوں۔ حفظ صحت کے واسطے مسہل لیا ہے۔

قولنج

مئی ۱۸۵۸ء میں قولنج کا سخت حملہ ہوا۔ تفتہ کو لکھتے ہیں:

بھائی وہ خط پہلا تم کو بھیج چکا تھا کہ بیمار ہو گیا۔ بیمار کیا ہوا توقع زیست کی نہ رہی۔ قولنج اور پھر کیسا شدید کہ پانچ پہر مرغ نیم بسمل کی طرح تڑپا کیا۔ آخر عصارہ، ریوند اور ارنڈی کا تیل پیا۔ اس وقت تو بچ گیا۔ مگر قصہ قطع نہ ہوا مختصر کہتا ہوں، میری غذا تم جانتے ہو کہ تندرستی میں کیا ہے۔ دس دن میں دو بار آدھی آدھی غذا کھائی گویا دس دن میں ایک بار غذا تناول فرمائی۔ گلاب اور املی کا پنا اور آلو بخارا کا افشردہ، اس پر مدار رہا۔ کل سے خوف مرگ گیا ہے اور صورت زیست کی نظر آتی ہے۔ آج صبح کو (۲۸ مئی ۱۸۵۸ء) بعد دوا پینے کے تم کو خط لکھا ہے۔ یقین تو ہے کہ آج پیٹ بھر کر روٹی کھا سکوں۔

چاقو سے ہاتھ زخمی ہو گیا

دسمبر ۱۸۵۸ء میں قلم بناتے وقت چاقو سے ہاتھ زخمی ہو گیا تھا۔ فرماتے ہیں:۔

قلم بنانے میں میرا ہاتھ انگوٹھا کے پاس سے زخمی ہو گیا۔ اور ورم کر آیا۔ چار دن روٹی بھی مشکل سے کھائی ہے۔ بہر حال اب اچھا ہوں۔

واقعہ یہ ہے کہ غالب کی صحت شراب نے تباہ کی۔ ان کا جسم قوی تھا۔ جوانی کے عالم میں شراب کے بُرے اثرات ظاہر نہ ہوئے۔ لیکن جب زندگی کا آفتاب زوال کی طرف مائل ہوا اور بڑھاپا آنے لگا۔ تو جسمانی طاقت گھٹتی گئی اور بیماریاں بڑھتی گئیں۔ مختلف آلام مستقل ہوتے گئے۔ زندگی کے آخری دس سال کا کوئی حصہ ایسا نہیں۔

جس میں ان کو اپنی صحت کے متعلق ایک لمحہ کے لئے بھی اطمینان نصیب ہوا ہو جسمانی اور مالی پریشانیوں کے اسی ہجوم کے باعث وہ آخری عمر میں موت کی بہت آرزو کیا کرتے تھے۔

۱۸۶۰ء ۱۸۶۰ء سے ان کے خطوط میں ضعف، نقاہت، قلت غذا اور ہجوم امراض کا ذکر ایک عام چیز بن گیا تھا۔ میاں سیف الحق سیاح کو ۲۱ر دسمبر ۱۸۶۰ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں :-

ناتوانی زور پر ہے۔ بڑھاپے نے نکما کر دیا ہے۔ ضعف، سستی، کاہلی، گرانجانی۔ رکاب میں پاؤں ہے۔ باگ پر ہاتھ ہے، بڑا سفر دور دراز در پیش ہے۔ زاد راہ موجود نہیں۔ خالی ہاتھ جاتا ہوں، اگر ناپرسیدہ بخش دیا تو خیر، اگر باز پرس ہوئی تو سقر مقر ہے اور ہاویہ زاویہ ہے۔ دوزخ جاوید ہے اور ہم ہیں۔ ہائے کسی کا کیا اچھا شعر ہے۔

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے[۱]

۱۸۶۱ء ستمبر ۱۸۶۱ء کے ایک مکتوب میں نواب علاؤ الدین احمد خاں کو تحریر فرماتے ہیں:

روٹی کھانے کو باہر کے مکان میں سے محل سرا میں، کہ وہ بہت قریب ہے۔ جاتا ہوں۔ تو ہندوستانی گھڑی بھر میں دم ٹھہرتا ہے۔ اور یہی حال دیوان خانہ میں آ کر ہوتا ہے۔ والی رام پور نے بیٹے[۲] مرشد زادہ کی شادی میں بلایا تھا۔ یہی لکھا گیا کہ میں اب معدوم محض ہوں۔

نومبر ۱۸۶۱ء کے خط موسومہ سیاح میں مرقوم ہے:

۱۔ یہ شعر ذوق کا ہے۔

۲۔ نواب یوسف علی خاں مرحوم کے منجھلے صاحبزادہ سید حیدر علی خان بہادر کی شادی کا ذکر ہے۔ جو ۲۷ جولائی ۱۸۶۱ء کو ہوئی۔ غالب کو بھی اس مبارک تقریب پر بلایا گیا تھا۔ لیکن وہ بہ سبب ضعف جا نہ سکے۔ اور تہنیت کے طور پر دو قطعے بھیج دیئے۔ جو ان کے کلیات نظم فارسی میں موجود ہیں (ملاحظہ ہو کلیات صفحہ ۴۳۱-۴۳۲)

ان دنوں صحت دماغ اور دوران سر میں اتنا مبتلا ہوں کہ والی رام پور کا بہت سا کلام بھی یُوں ہی دھرا ہوا ہے۔ دیکھنے کی نوبت نہیں آتی۔

۱۸۶۲ء — ۱۸۶۲ء میں ہاتھ پر پھوڑا نکل آیا۔ جس نے نہایت تکلیف دہ صورت اختیار کر لی۔ اس کے علاج میں ہندوستانی جراحوں سے مایوس ہو کر غالب نے انگریزی ڈاکٹر کی طرف توجہ کی۔ میر سرفراز حسین کو لکھتے ہیں :-

رجب کے مہینے میں سیدھے ہاتھ پر پھنسی ہوئی تھی۔ پھوٹتا ہی پھوڑا پھوٹ کر زخم بنا جو بگڑ کر غار ہو گیا، اب بہ قدر ایک کف دست وہ گوشت مردار ہو گیا۔

۱۸۶۳ء — ۲۳ رمئی ۱۸۶۳ء کے ایک خط میں منشی شیو نرائن آرام کو لکھتے ہیں :

چھٹا مہینہ ہے کہ سیدھے ہاتھ میں ایک پھنسی نے پھوڑے کی صورت پیدا کی، پھوڑا پک کر پھٹا اور پھوٹ کر ایک زخم، زخم کا ایک غار بن گیا۔ ہندوستانی جراحوں کا علاج رہا۔ بگڑتا گیا دو مہینے سے کالے ڈاکٹر کا علاج ہے۔ سلائیاں دوڑ رہی ہیں۔ اُسترہ سے گوشت کٹ رہا ہے۔ بیس دن سے افاقت کی صورت نظر آنے لگی ہے۔

اس کے بعد پنشن کے کھلنے، جمع شدہ روپے کے ملنے اور دربار و خلعت کے بحال ہونے کی کیفیت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ آخر فروری ۱۸۶۳ء میں لفٹنٹ گورنر پنجاب دہلی آئے۔ چپراسی بھیجکر بلایا :

میرا یہ حال ہے۔ کہ علاوہ اس داہنے ہاتھ کے زخم کے سیدھی ران میں اور بائیں ہاتھ میں ایک ایک پھوڑا جدا ہے۔ حاجتی میں پیشاب کرتا ہوں۔ اُٹھنا بیٹھنا دشوار ہے۔

معلوم ہوتا ہے۔ کہ ان پھوڑوں کا زہر پھیلتا گیا۔ یہاں تک کہ غالب کا سارا جسم پھوڑوں سے بھر گیا۔ بالخصوص ٹانگوں کے پھوڑے کافی دیر تک ان کے لئے وبال جان بنے رہے۔

۱۶ راگست ۱۸۶۳ء کے ایک خط میں منشی ہرگوپال تفتہ کو لکھتے ہیں :

ایک برس سے عوارض فساد خون میں مبتلا ہوں۔ بدن پھوڑوں کی کثرت سے سرو چراغاں ہو گیا۔ طاقت نے جواب دے دیا۔ دن رات لیٹا رہتا ہوں۔ کھانا کھاتے وقت پلنگ پر سے اُٹھ بیٹھتا ہوں۔ کھانا کھا کر ہاتھ دھو کر پھر پڑ رہتا ہوں۔ حاجتی پلنگ کے پاس رہتی ہے۔ اتر کر پیشاب کیا جاتا ہے۔ بیت الخلا جانا ایک مصیبت ہے۔ طشت چوکی بھی مگر گنتی قدم جانا، پھر آنا کیا آسان ہے۔ ایک کم ستر برس کی عمر ہوئی۔ اب نجات چاہتا ہوں۔ بہت جیا۔ کہاں تک جیوں گا۔

چودھری عبدالغفور سرور مارہروی کو لکھتے ہیں:

ثمو رو او رام مرض خاص اور رنج عام، یہ ایک اجمال۔ دوسرا اجمال سنو کہ مہینہ بھر سے صاحب فراش ہوں۔ صبح سے شام تک پلنگ پر پڑا رہتا ہوں۔ محل سرا اگرچہ دیوان خانہ کے بہت قریب ہے، پر کیا امکان ہے جو جا سکوں۔ صبح کو نو بجے کھانا یہیں آ جاتا ہے۔ پلنگ سے کھسک پڑا، ہاتھ منہ دھو کر کھانا کھایا۔ پھر ہاتھ دھوئے، کلی کی۔ پلنگ پر جا پڑا۔ پلنگ کے پاس حاجتی لگی رہتی ہے اُٹھا اور حاجتی میں پیشاب کیا۔ اور پڑ رہا۔ مدتوں سے یہ مرض ہے کہ پیشاب جلد جلد آتا ہے۔ اس صاحب فراش ہونے کو دیکھو اور دم بدم تقاضائے بول کو دیکھو۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ غالبؔ کو تسلسل بول کا عارضہ تھا جو ذیابیطس پر دال ہے۔ پھوڑوں کا مدت تک اچھا نہ ہونا بھی اسی خیال کا مؤید ہے۔ اسی خط میں آگے چل کر لکھتے ہیں:-

پاخانے اگرچہ دن رات میں ایک دفعہ جاتا ہوں مگر صعوبت کو تصور کرو۔ ایک پھوڑا داہنے پہنچے میں جس کو ساعد کہتے ہیں۔ دو پھوڑے بائیں پہنچے میں۔ یہ سہل ہیں۔ بائیں پاؤں میں کف پا پشت پا سے لے کر آدھی پنڈلی تک ورم اور ورم بھی سخت۔ رداد عات و محللات (مادہ کو ہٹانے اور تحلیل کرنے والی دوائیں) سے کچھ نہ ہوا۔ اب تجویز ہے۔ کہ نیم کا بھرتا

باندھئے۔ جب پکے، پھوٹے، تب مرہم لگایئے۔ کہو کف پا میں جراحت کا عمل ہوا تو قیام کا کہاں ٹھکانا۔

پھر لکھتے ہیں،

برس دن سے فسادِ خون کے عوارض میں مبتلا ہوں۔ بثور و اورام سے لد رہا ہوں۔ برس دن میں اوجاع سہتے سہتے روح تحلیل ہوگئی۔ نشست و برخاست کی طاقت نہ رہی اور پھوڑے تو خیر مگر دونوں پنڈلیوں میں ہڈیوں کے قریب دو پھوڑے ہیں، گھرا ہوا اور پنڈلیوں کی ہڈیاں چرانے لگیں اور رگیں پھٹنے لگیں۔ بائیں پانو پر کف پا سے جہاں وہ پھوڑا ہے۔ پنڈلی پر ورم ہے۔ رات دن پڑا رہتا ہوں۔ پلنگ کے پاس حاجتی لگی رہتی ہے کھسل پڑا بعد رفع حاجت پھر لیٹ رہا۔ اسی صورت سے روٹی کھاتا ہوں۔ اشعار کی اصلاح یک قلم موقوف۔ خطوط ضروری لیٹے لیٹے لکھتا ہوں۔ دو خط چودھری صاحب کے آئے اور ایک خط شاہ عالم کا اور دو خط حضرت صاحب کے آئے (یعنی صاحب عالم مارہروی) جواب نہ لکھ سکا۔ آج اپنے کو طعنے دے کر مرد بنایا، جب یہ عبارت لکھی۔

ایک خط میں فارسی شاعری کی مختلف طرزوں پر بحث کرتے ہوئے اُردو کے چند اچھے شعر نمونۃً لکھے ہیں جن میں ایک شعر میر تقی کا ہے، دوسرا سودا کا، تیسرا حاتم کا اور چوتھا مومن کا پھر لکھتے ہیں :۔

ناسخ کے ہاں کمتر اور آتش کے ہاں بیشتر یہ تیز نشتر موجود ہیں، مگر ان کا کوئی شعر اس وقت یاد نہیں آتا۔ یاد کیا آئے۔ لیٹا ہوا ہوں، دم بہ دم پانو کے ورم کی ٹیس ہوش اڑائے دیتی ہے۔

قاضی عبدالجمیل صاحب بریلوی کے نام کے ایک خط میں بھی ان آلام کا ذکر ہے[1]

---

[1] اُردوئے معلّٰی صفحہ ۱۶۸

غالب نے اپنی موت کے متعلق پیشگوئی کی تھی اور تاریخ وفات بھی نکال لی تھی، سوئے اتفاق سے اسی سال دلی میں ہیضہ کی وبا پھیلی۔ انہوں نے اپنی پیشگوئی کی تغلیط پر ایک دوست کو ازراہ تفنن لکھا کہ وبائے عام میں مرنا میرے لئے باعث ہتک تھا۔ قاضی عبدالجمیل کو لکھتے ہیں :-

۱۲۷۷ھ میں میرا نہ مرنا صرف میری تکذیب کے واسطے تھا۔ مگر اس تین برس میں (اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خط ۱۲۸۰ھ یا ۱۲۸۱ھ میں لکھا گیا تھا) ہر روز مرگِ نو کا مزا چکھتا رہا ہوں۔ حیران ہوں کہ کوئی صورت زیست کی نہیں پھر میں کیوں جیتا ہوں۔ روح اب میرے جسم میں اس طرح گھبراتی ہے جس طرح طائر قفس میں کوئی شغل، کوئی اختلاط، کوئی مجمع پسند نہیں۔ کتاب سے نفرت، جسم سے نفرت، روح سے نفرت۔ جو کچھ لکھا ہے بے مبالغہ اور بیان واقع ہے۔

خرم آں روز کزیں منزل ویراں گزرم

فتق کا آغاز

نواب علاءالدین احمد خاں کو لکھتے ہیں کہ بائیں پاؤں میں ورم کف پا سے پشت پا کو گھیرتا ہوا پنڈلی تک چلا گیا ہے۔ کھڑا ہوتا ہوں تو پنڈلی کی رگیں پھٹنے لگتی ہیں۔ کھانا دیوان خانہ میں منگا لیتا ہوں۔ لیکن :

پیشاب کو کیوں کر نہ اٹھوں۔ حاجتی رکھ لی۔ بغیر اٹھے اور کروٹ بیٹھے بات نہیں بنتی۔ پاخانہ کو اگرچہ دوسرے تیسرے دن جاؤں مگر جاؤں تو سہی۔ یہ سب موقع خیال میں لا کر سوچو کہ کیا گزرتی ہوگی۔ آغاز فتق مزید علیہ یا مستزاد ع

پیری و صد عیب چنیں گفتہ اند

اپنا یہ مصرعہ بار بار چپکے چپکے پڑھتا ہوں ع

اے مرگِ ناگہاں تجھے کیا انتظار ہے

پھوڑوں اور پھنسیوں سے شفایاب ہوئے تو ضعف اور بھی بڑھ گیا۔ قاضی عبدالجمیل

کو لکھتے ہیں :-

اب میں تندرست ہوں۔ پھوڑا پھنسی کہیں نہیں مگر ضعف کی وہ شدت ہے کہ خدا کی پناہ اور ضعف کیوں کر نہ ہو۔ برس دن سے صاحب فراش ہوں ستر برس کی عمر ہے۔ جتنا خون بدن میں تھا بے مبالغہ آدھا اس میں سے پیپ ہو کر نکل گیا۔ سن کہاں جواب پھر تو لید دم صالح ہو بہرحال زندہ ہوں اور ناتوان اور آپ کی پرسشہائے دوستانہ کا ممنون احسان

۱۸۶۵ء

مختلف خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب ۱۸۶۵ء تک فساد خون و احتراق میں مبتلا تھے۔ مثلاً حکیم غلام نجف خاں صاحب کے نام کے ایک خط میں پھوڑوں اور ناطاقتی کا ذکر ہے۔ نیز لکھتے ہیں کہ ضعف انتہا کو پہنچ گیا ہے[1]

نواب انوار الدولہ بہادر کو لکھتے ہیں :-

نہ تپ، نہ کھانسی، نہ اسہال، نہ فالج، نہ لقوہ، ان سب سے بدتر ایک صورت پر کدورت یعنی احتراق کا مرض۔ مختصر یہ کہ سر سے پانو تک بارہ پھوڑے، ہر پھوڑے پر ایک زخم ہر زخم پر ایک غار، ہر روز بے مبالغہ بارہ تیرہ پھائے اور باؤ بھر مرہم درکار۔ نو دس مہینے بے خور و خواب رہا ہوں اور شب و روز بے تاب۔ راتیں یوں گزری ہیں کہ اگر کبھی آنکھ لگ گئی دو گھڑی غافل رہا ہوں گا کہ ایک آدھ پھوڑے میں ٹیس اٹھی جاگ اٹھا، تڑپا کیا، پھر سو گیا۔ پھر ہوشیار ہو گیا۔ سال بھر میں تین حصے دن یوں گزرے۔ پھر تخفیف ہونے لگی دو تین مہینے لوٹ پوٹ کر اچھا ہو گیا۔ نئے سرے سے روح قالب میں آئی۔ اجل نے میری سخت جانی کی قسم کھائی۔

اسی خط میں آگے چل کر اپنی حالت یوں بیان کرتے ہیں :-

حواس کھو بیٹھا۔ حافظہ کو رو بیٹھا۔ اگر اٹھتا ہوں تو اتنی دیر میں اٹھتا ہوں کہ جتنی دیر میں۔

---

[1] اردوئے معلیٰ صفحہ ۱۷۹

قدآدم دیوار اُٹھے۔

نواب انورالدولہ نے کسی سے سُنا تھا کہ غالب کا انتقال ہوگیا ہے اس واقعہ کا ذکر انھوں نے خط میں بھی کر دیا۔ غالب فرماتے ہیں،

آپ کی پرسش کے کیوں نہ قربان جاؤں کہ جب تک میرا مرنا نہ سُنا میری خبر نہ لی میری مرگ کے مخبر کی تقریر اور مثلہ میری یہ تحریر آدھی سچ اور آدھی جھوٹ۔ درصورت مرگ نیم مردہ اور درحالت حیات نیم زندہ ہے!

درکشاکش ضعفم نگسلد رواں از تن،

ایں کہ من نمے میرم ہم زناتوانہاست

۱۸۶۵ء میں ان کی معذوری بہت بڑھ گئی تھی۔ ۲۴ر جولائی کے ایک خط میں لکھتے ہیں:

تین برس عوارض احتراق خون میں ایسا مبتلا رہا ہوں کہ اپنے جسم و جان کی بھی خبر نہیں رہی میں اپنی زبان سے کیوں کر کہوں کہ اچھا ہوں، مگر بیمار اور عوارض میں گرفتار نہیں ہوں بوڑھا، بہرا، اپاہج، بدحواس، ناتواں، فلک زدہ آدمی ہوں۔

اکتوبر ۱۸۶۵ء میں نواب کلب علی خاں مرحوم کے جشن جلوس میں شریک ہونے کی غرض سے رامپور گئے اور آخر دسمبر میں واپس ہوئے۔ تو راستے میں ایک حادثہ پیش آگیا جس کی تفصیل چھٹے باب میں مذکور ہے۔ اسی حادثہ کے باعث بیمار ہو گئے اور پانچ روز تک مولوی محمد حسین خاں صدر الصدور کے مکان پر ٹھہرے رہے جب افاقہ ہوا تو دہلی روانہ ہوئے۔

آخری دور کی خوراک | خواجہ حالی نے لکھا ہے کہ مرنے سے کئی برس پہلے چلنا پھرنا بالکل

لہ ۱۲۸۲ھ (مطابق ۱۸۶۵ء) میں غالب کی وفات کی خبر مشہور ہوئی تھی۔ ذکا حیدر آبادی نے تاریخ وفات بھی کہہ ڈالی تھی (ملاحظہ ہو خاش خماش صفحہ ۲۰۹)

موقوف ہو گیا تھا۔ اکثر اوقات پلنگ پر پڑے رہتے تھے۔ غذا کچھ نہ رہی تھی۔ خواجہ مرحوم نے آخری دور کی خوراک کی کیفیت یوں بیان فرمائی ہے صبح کو وہ شیرہ بادام پیتے تھے۔ دن کو گھر سے جو کھانا آتا تھا۔ اس میں پاؤ سیر گوشت کا قورمہ ہوتا تھا۔ ایک پیالہ میں بوٹیاں، دوسرے میں لعاب یا شوربا ایک پیالی میں ایک پھلکے کا چھلکا شوربے میں ڈوبا ہوا، ایک پیالی میں کبھی کبھی ایک انڈے کی زردی اور ایک پیالی میں دو تین پیسہ بھر دہی۔ اسی کھانے کے متعلق غالب نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ اگر برتنوں کی کثرت پر خیال کیجے تو میرا دسترخواں یزید کا دسترخوان معلوم ہوتا ہے اور کھانے کی مقدار کو دیکھئے تو بایزید کا۔ شام کو وہ کسی قدر شامی کباب یا سیخ کے کباب کھاتے تھے۔ میر صفیر بلگرامی ذاتی مشاہدات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں،

گیارہ بجے دن کے آپ کا کھانا ایک سینی میں آیا۔ ایک دسترخوان بچھایا گیا۔ اس پر ایک چینی کے پیالے میں شوربا اور ایک میں بھرا ہوا گھی گرم کیا ہوا اور ایک تانبے کی رکابی میں پاؤ بھر گوشت کی بوٹیاں اور ایک تانبے کی رکابی میں تین پھلکے روے کے اور ایک رکابی تانبے کی خالی۔ آدمی نے پھلکوں کے کنارے توڑ توڑ کر انہیں ٹکڑے ٹکڑے کیا اور خالی رکابی میں رکھ دیئے۔ پھر ایک چمچے سے تھوڑا گھی اور شوربا لے کر ان ٹکڑوں کو ملایا اور خوب ملا کر حلوے کی طرح بنا کر لقمے کے انداز سے ایک طرف رکابی میں رکھ دیا۔ اتنے میں حضرت پلنگڑی سے اُترے اور دسترخوان پر آ بیٹھے۔ پہلے وہ دو لقمے نوش جان فرمائے۔ اس کے بعد آدھا پیالہ شوربا اور آدھا پیالہ گھی کا پی گئے۔ بعد اس کے پھلکوں کے دو چھلکے لے کر شوربا ملا ملا کر کھائے اس پر پھر بقیہ گھی اور شوربا پی لیا۔ کھا چکے اور فرمایا بس میرا کھانا یہی ہے۔ شب کو پاؤ بھر بادام مقشر نمک میں تلوا کر کھاتا ہوں[1]

خواجہ عزیز لکھنوی کا بیان	خواجہ عزیز لکھنوی مرحوم نے بھی آخری دور میں غالب کی زیارت کی تھی

[1] "جلوۂ خضر" جلد اوّل

فرماتے ہیں کہ پختہ مکان تھا۔ ایک بڑا پھاٹک تھا جس کی بغل میں ایک کمرہ تھا۔ اسمیں چارپائی پر لیٹے ہوئے غالباً دیوان قاآنی دیکھ رہے تھے۔ نحیف الجثہ گندمی رنگ بہرے اس قدر تھے کہ ان کے کان تک آواز نہ گئی۔ چارپائی کی پٹی کے سہارے سے کروٹ بدلی تو ہماری (خواجہ عزیز اور ان کے ساتھی) طرف دیکھا۔ بہ مشکل چارپائی سے اتر کر فرش پر بیٹھے قلمدان اور کاغذ سامنے رکھ کر فرمانے لگے کہ آنکھوں سے تو کسی قدر سوجھتا بھی ہے لیکن کانوں سے کچھ سُنائی نہیں دیتا۔ جو کچھ پوچھوں اس کا جواب لکھ کر دو۔

خواجہ مرحوم سے شعر سنے تو اپنے شعر سنائے اتنے میں کھانا آیا دو پھلکے اور ایک طشتری میں بُھنا ہوا گوشت جس میں کچھ میوہ بھی پڑا ہوا تھا پھلکے کا باریک پرت لیکر دو چار نوالے بہ مشکل کھائے اور کھانا بڑھا دیا۔ تعجب ہوا کہ اس مقدار خوراک پر کیونکر بسر کرتے تھے۔

۱۸۶۶ء عمر کی زیادتی کے ساتھ تکلیفیں تدریجاً بڑھتی گئیں۔ نواب میر غلام بابا خاں نے شرکت جشن کے لئے سورت آنے کی دعوت دی تھی۔ اس کے جواب میں ۱۴ نومبر ۱۸۶۶ء کو لکھتے ہیں: ۔

بہ سواری ریل روانہ ہونے کی لہر دل میں آئی۔ پاؤں سے اپاہج، کانوں سے بہرا، ضعف بصارت، ضعف دماغ، ضعف دل، ضعف معدہ، ان سب ضعفوں پر ضعف طالع کیونکر قصد سفر کروں؟ تین چار شبانہ روز قفس میں کس طرح بسر کروں؟ (یعنی ریل کے سفر میں) گھنٹہ بھر میں دو بار پیشاب کی حاجت ہوتی ہے۔ ایک ہفتہ دو ہفتہ کے بعد ناگاہ قولنج کے دورے کی شدت ہوتی ہے۔ طاقت جسم میں، حالت جان میں نہیں، آنا میرا سورت تک کسی صورت حیز امکان میں نہیں۔

اس دعوت کے متعلق سیاح کو لکھتے ہیں،

بھئی میں بہرا ہوں، گانا کیا سنوں، بوڑھا ہوں، ناچ کیا دیکھوں؟ غذا چھ ماشے آٹا کھانا کیا کھاؤں، بمبئی سورت میں انگریزی شرابیں ہوتی ہیں، اگر وہاں آتا اور شریک محفل

ہوتا، تو پی لیتا۔

منشی حبیب اللہ خاں ذکا حیدرآبادی کو ۱۲ رمئی کے ایک خط میں لکھتے ہیں۔

آگے ناتواں تھا، اب نیم جان ہوں۔ آگے بہرا تھا اب اندھا ہوا چاہتا ہوں۔ رام پور کے سفر کا رہ آورد ہے رعشہ و ضعف بصر۔ جہاں چار سطریں لکھیں انگلیاں ٹیڑھی ہوگئیں حرف سوجھنے سے رہ گئے۔ اکہتر برس جیا، بہت جیا، اب زندگی برسوں کی نہیں مہینوں اور دنوں کی ہے۔

ایک اور خط میں فرماتے ہیں:

تم میری بابت پوچھتے ہو، مگر میں کیا لکھوں؟ ہاتھ میں رعشہ، انگلیاں کہنے میں نہیں، ایک آنکھ کی بینائی زائل۔ جب کوئی دوست آ جاتا ہے۔ تو اس سے خطوط کا جواب لکھوا دیتا ہوں۔ مشہور ہے یہ بات کہ جو کوئی کسی اپنے عزیز کی فاتحہ دلاتا ہے، مونے کی روح کو اس کی بو پہنچتی ہے۔ ایسے ہی میں سونگھ لیتا ہوں غذا کو۔ پہلے مقدار غذا کی تولوں پر منحصر تھی، اب ماشوں پر ہے۔ زندگی کی توقع آگے مہینوں پر تھی اب دنوں پر ہے۔

اکتوبر ۱۸۶۶ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں:

بہتر برس کا آدمی، پھر رنجور دائمی۔ غذا یکقلم مفقود۔ آٹھ پہر میں ایک بار اللہ گوشت پی لیتا ہوں، نہ روٹی، نہ بوٹی، نہ پلاؤ، نہ خشکہ۔ آنکھوں کی بینائی میں فرق، ہاتھ کی گیرائی میں فرق، رعشہ مستولی، حافظہ معدوم۔

۴ دسمبر ۱۸۶۶ء کے ایک مکتوب میں رقم فرماتے ہیں:

اس مہینے یعنی رجب کی اٹھویں تاریخ سے بہترواں برس شروع ہوا۔ غذا صبح کو سات بادام کا شیرہ۔ قند کے شربت کے ساتھ، دوپہر کو سیر بھر گوشت کا گاڑھا پانی، قریب شام کبھی کبھی تین تلے ہوئے کباب، چھ گھڑی رات گئے پانچ روپے بھر (ایک چھٹانک) شراب خانہ ساز اور اسی قدر عرق شیر۔ اعصاب کے ضعف کا یہ حال کہ اٹھ نہیں سکتا، اگر دونو ہاتھ ٹیک کر

چارپایہ بن کر اٹھتا ہوں تو پنڈلیاں لرزتی ہیں۔ معہذا دن بھر میں دس بارہ بار اور اسی قدر رات بھر میں پیشاب کی حاجت ہوتی ہے۔ حاجتی پلنگ کے پاس لگی رہتی ہے۔ اٹھا اور پیشاب کیا اور پڑ رہا۔ اسباب حیات میں سے یہ بات ہے کہ شب کو بدخواب نہیں ہوتا بعد اراقت بول بلے توقف نیند آجاتی ہے۔

ان خطوں سے ظاہر ہے کہ احتراق خون کے مرض میں جو کم و بیش تین برس مسلط رہا۔ غالب بہت کمزور ہو گئے تھے۔ ذیابطیس کا عارضہ اس قدر شدت اختیار کر چکا تھا کہ رات دن میں بیس پچیس بار پیشاب کی حاجت ہوتی تھی۔ کانوں سے بہرے ہو چکے تھے۔ بصارت بہت کم ہو گئی تھی۔ بلکہ ایک آنکھ کی بینائی کلیتہً زائل ہو چکی تھی۔ غذا کی مقدار بیحد گھٹ گئی تھی۔ قبض کی شکایت شدید تھی اور وقتاً فوقتاً قولنج کے سخت دورے ہوتے تھے۔ ہاتھوں پر رعشہ طاری تھا۔

سنہ ۱۸۶۷ء | اب سنہ ۱۸۶۷ء کی کیفیت سنیئے۔ ۲۲ر اپریل کے ایک خط میں میاں داد خاں سیاح کو لکھتے ہیں:۔

میں اب محض نکما ہو گیا۔ خدا جھوٹ نہ بلائے پچاس جگہ سے اشعار واسطے اصلاح کے آئے ہوئے بکس میں دھرے ہیں جس دن ذرا افاقہ پاؤں گا ان سب کاغذ کو دیکھوں گا۔

جون سنہ ۱۸۶۷ء کے ایک خط میں فرماتے ہیں:۔

بھائی میرا حال اسی سے جانو کہ اب خط نہیں لکھ سکتا۔ آگے لیٹے لیٹے لکھتا تھا، اب رعشہ و ضعف بصارت کے سبب سے وہ بھی نہیں ہو سکتا۔ جب حال یہ ہے تو کہو صاحب میں اشعار کو اصلاح کیوں کر دوں اور پھر اس موسم میں کہ گرمی سے سر کا بھیجا پگھلا جاتا ہے، دھوپ کے دیکھنے کی تاب نہیں۔ رات کو صحن میں سوتا ہوں۔ صبح کو دو آدمی ہاتھوں پر لے کر دالان میں لے آتے ہیں۔ ایک کوٹھڑی ہے اندھیری اس میں ڈال دیتے ہیں۔ تمام دن اس گوشہ تاریک میں پڑا رہتا ہوں۔ شام کو پھر دو آدمی بدستور

لے جا کر پلنگ پر صحن میں ڈال دیتے ہیں۔

منشی حبیب اللہ خاں ذکا کو لکھتے ہیں :۔

میں اب قریب مرگ ہوں۔ غذا بالکل مفقود۔ اور امراض مستولی، تہتر برس کی عمر،

انا للہ وانا الیہ راجعون۔

پھر لکھتے ہیں :۔

ستر ا بہترا اردو ترجمہ پیر خرفت ہے۔ میری تہتر برس کی عمر ہے۔ پس میں اخرف ہوا۔ حافظہ گویا کبھی تھا ہی نہیں۔ سامعہ باطل بہت دن سے تھا۔ رفتہ رفتہ وہ بھی حافظہ کی مانند معدوم ہو گیا۔ اب مہینہ بھر سے یہ حال ہے۔ کہ جو دوست آتے ہیں رسمی پرسش مزاج سے بڑھ کر جو بات ہوتی ہے۔ وہ کاغذ پر لکھ دیتے ہیں۔ غذا مفقود ہے۔ صبح کو قند اور شیرۂ بادام مقشر، دوپہر کو گوشت کا پانی، سرِ شام تلے ہوئے چار کباب۔ اب سوتے وقت پانچ روپے بھر شراب اور اسی قدر گلاب۔ خرف ہوں، پوچ ہوں، عاصی ہوں فاسق ہوں، روسیاہ ہوں، یہ شعر میر تقی کا میرے حسب حال ہے :

مشہور ہیں عالم میں مگر ہوں بھی کہیں ہم

القصہ نہ درپے ہو ہمارے کہ نہیں ہم

۱۸۶۸ء | ۱۶ را پریل ۱۸۶۸ء کے ایک خط میں میر غلام بابا خاں کو لکھتے ہیں :

امراض جسمانی کا بیان اور اخلاص ہمدگر کی شرح کے بعد ہجوم غمہائے نہانی کا ذکر کیا کروں۔ جیسے ابر سیاہ چھا جاتا ہے۔ یا ٹڈی دل آتا ہے۔ بس اللہ ہی اللہ ہے۔

مرض الموت | اسی حالت میں ۱۸۶۸ء ختم ہوا اور ۱۸۶۹ء شروع ہو گیا۔ غالب اگرچہ ہمہ تن مجموعہ امراض بن چکے تھے۔ لیکن یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ موت کا فوری سبب کون سا مرض بنا۔ خواجہ حالی فرماتے ہیں مرنے سے چند روز پیشتر یہ کیفیت پیدا ہو گئی تھی کہ بیہوش ہو جاتے، پہر پہر دو دو پہر کے بعد چند منٹ کے لئے افاقہ ہوتا، پھر بیہوش

ہو جاتے۔

وفات سے ایک روز پیشتر خواجہ حالی عیادت کو گئے تو کئی پہر کے بعد افاقہ ہوا تھا۔ اور نواب علاء الدین احمد خاں کو خط لکھوا رہے تھے۔ نواب صاحب نے حالت پوچھی تھی، اس جواب میں لکھوایا:۔

میرا حال مجھ سے کیا پوچھتے ہو۔ ایک آدھ روز میں ہمسایوں سے پوچھنا۔

اسی خط میں ایک شعر بھی لکھوایا تھا جس کا صرف ایک مصرعہ خواجہ حالی کو یاد رہا۔ ع

نہ کرد ہیچ مدارا بہ من سر تو سلامت

آخری عمر میں اپنا یہ شعر اکثر پڑھتے رہتے تھے۔

دمِ واپسیں بر سرِ راہ ہے
عزیزو اب اللہ ہی اللہ ہے

وفات | غرض ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء (مطابق ۳ ذی قعدہ ۱۲۸۵ھ[1]) کو دوشنبہ کے دن ادب و شعر کا یہ درخشندہ آفتاب ہمیشہ کے لئے غروب ہو گیا، جس کی عالمتابی دہور ماضیہ کیلئے سرمایہ ناز اور قرون آیندہ کے لئے منار ہدایت تھی۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

تمام اکابر شہر جنازے میں شریک ہوئے۔ شیعہ حضرات اپنے طریق پر مراسم دفن ادا کرنا چاہتے تھے۔ لیکن ضیاء الدین احمد خاں نے تمام مراسم اہل سنت کے طریق پر ادا

---

[1] تمام سوانح نگاروں نے تاریخ وفات ۲ ذی قعدہ لکھی ہے لیکن تقویم سے معلوم ہوتا ہے کہ ذی قعدہ ۱۲۸۵ھ ۱۳ فروری سے شروع ہوا، اس لئے اگر ۲ ذی قعدہ کو مسلم مانا جائے۔ تو عیسوی تاریخ ۱۴ فروری ماننی چاہیئے اور اگر ۱۵ فروری کو مسلم مانا جائے تو قمری تاریخ ۳ ذی قعدہ سمجھنی چاہیئے۔ اس لحاظ سے غالب کی عمر بحساب سنین قمری تہتر برس تین مہینے ۲۳ دن اور بحساب عیسوی اکہتر برس ایک مہینہ اور انیس دن ہوتی ہے۔

گئے۔ دہلی دروازہ کے باہر نماز جنازہ پڑھی گئی اور حضرت شیخ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ کی درگاہ کے قریب نواب الٰہی بخش خاں معروف کے پہلو میں دفن کئے گئے۔ حالی، مجروح اور دوسرے شاگردوں نے پُر درد مرثیہ لکھے۔

مزار

غالب جس احاطہ میں مدفون ہیں، اس میں چھوٹی بڑی تئیس قبریں ہیں۔ احاطہ کے اردگرد قریباً پانچ فٹ اونچی دیوار ہے۔ تمام قبروں کے متعلق ٹھیک ٹھیک نہیں کہا جا سکتا۔ کہ کس کس کی ہیں لیکن اتنا یقینی طور پر معلوم ہے کہ غالب کے علاوہ اس احاطہ میں نواب الٰہی بخش خاں معروف، میرزا علی بخش خاں رنجور، زین العابدین خاں عارف میرزا باقر علی خاں کامل اور بیگم غالب بھی دفن ہیں۔ بقیہ قبریں بھی اسی خاندان کے افراد کی ہونگی۔ غالب کی قبر پر چونے کا پلستر ہے سرہانے سنگ مرمر کی ایک لوح نصب ہے جس پر :

رشکِ عرفی و فخر طالب مرد

اسد اللہ خان غالب مرد

کے علاوہ میر مہدی مجروح کا یہ قطعہ تاریخ کندہ ہے :۔

کل میں غم واندہ میں با خاطر محزوں تھا تربت استاد پہ بیٹھا ہوا غمناک

دیکھا جو مجھے فکر میں تاریخ کے مجروح ہاتف نے کہا "گنج معانی ہے تہ خاک"

درستی مزار کی کوششیں

رئیس الاحرار مولانا محمد علی مرحوم جب اپنے مشہور اخبار "کامریڈ" کو کلکتہ سے دہلی لائے تھے۔ تو مرزا غالب کے لئے چندے کی تحریک فرمائی تھی۔ لیکن مولانا مرحوم اپنی وسیع مصروفیتوں اور ابتلاؤں کے باعث سنگ مرمر کی ایک لوح نصب کرانے کے سوا کچھ نہ کر سکے۔ پھر خواجہ حسن نظامی اور بعض دوسرے ارباب علم و ادب نے "غالب سوسائٹی" کی بنیاد رکھی۔ جو مزار و احاطہ کی درستی کے علاوہ غالب کے نام پر ہال بھی بنوانا چاہتی ہے۔ احاطہ مزار کے پاس ایک قطعہ زمین تھا۔ جسے حکیم حاجی عبدالحمید صاحب مالک ہمدرد دواخانہ دہلی (خازن غالب سوسائٹی) نے اپنی گرہ سے

معتدبہ رقم دے کر خریدا۔ اور غالب سوسائٹی کے حوالے کر دیا۔

ایک اور قطعہ زمین بیگم حکیم محمد واصل خاں مرحوم (برادر کلاں مسیح الملک حکیم اجمل خاں مرحوم) نے حکیم محمد احمد خاں مرحوم کی سفارش پر عطا فرمایا ہے۔ نواب ذوالقدر جنگ حیدر آبادی بھی مزار کی مرمت کے آرزومند ہیں۔ نواب صاحب ممدوح غالب کے بھانجوں کی اولاد میں سے ہیں۔

تیرھواں باب

اخلاق و عادات

نہ بخشندہ شاہے کہ بارم دھد | بہ ہر بار زر پیل بارم دھد
کہ تا پیل زانجا بر انگیزمے | زرش بر گدایان فرو ریزمے

غالب کے اخلاق کا باب بہت وسیع ہے۔ لیکن ان کی نظم و نثر کے سمندر سے ان انمول موتیوں کو اکٹھا کرنا بے حد مشکل ہے۔ اگر راستے کی دشواری سے بے پروا ہو کر اس منزل کو طے کرنے کا قصد بھی کیا جائے۔ تو ظاہر ہے کہ ایک بڑا دفتر تیار ہو جائے گا۔ جس میں غالب کی نظم و نثر کے اکثر حصے مختلف ترتیبات سے شامل کرنے پڑیں گے بلکہ بعض حصے مختلف عنوانوں کے ماتحت کئی کئی مرتبہ نقل ہوں گے۔ لہذا میرے لئے اس کے سوا چارہ نہیں۔ کہ اس لذیذ حکایت کے چند عنوانات اختصار کے ساتھ پیش کردوں۔ تاکہ شخص غالب کا ایک عام خاکہ آنکھوں کے سامنے آجائے۔

سادہ دل و راست گفتار فارسی کے ایک خط میں سراج الدین احمد خاں کو ایک مرتبہ لکھا تھا:

للہ الحمد کہ سادہ دل و راست گفتارم آفریدہ اند۔ ہرچہ در دل داشتم بہ زبان باز گفتم[1]۔

ان چند لفظوں میں ان کے اخلاق کی پوری تصویر آگئی ہے۔

ایثار و کرم اُردو مکاتیب میں ایک جگہ فرماتے ہیں:۔

قلندری و آزادگی و ایثار و کرم کے جو دواعی میرے خالق نے مجھ میں بھر دیئے، بقدر ہزار ایک ظہور میں نہ آئے۔ نہ وہ طاقت جسمانی کی لاٹھی ہاتھ میں لوں اور اس میں شطرنجی اور ٹین کا ایک لوٹا مع سوت کی

[1] کلیات نثر غالب صفحہ ۱۳۴۔

رسی کے ٹکڑوں اور پیادہ پا چل دوں۔ کبھی شیراز جا نکلا کبھی مصر میں جا ٹھہرا کبھی نجف جا پہنچا۔ نہ وہ دستگاہ کہ ایک عالم کا میزبان بن جائں۔ اگر تمام عالم میں نہ ہو سکے۔ نہ سہی جس شہر میں رہوں، اس شہر میں تو بھوکا ننگا نظر نہ آئے۔

یہ سخن طرازی اور مبالغہ آرائی نہیں بلکہ حقیقت ہے اور غالب کی داستان حیات کا ہر ورق اس پر گواہ ہے۔

مثنوی "ابر گہربار" میں بہ سلسلۂ مناجات خدا سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ میرے کردار و افعال کا حساب نہ لے۔ اگر محاسبہ ناگزیر ہو تو پھر مجھے بھی اجازت دے تاکہ جو حسرتیں دل میں باقی رہیں انہیں تفصیل سے بیان کر دوں۔ تیرے محکمۂ عدل و انصاف کی طرف سے جو جرم میرے ذمے ثابت ہو۔ اس کے مقابلے میں حسرتوں کی ایک صف کھڑی کر دوں گا۔ اس طرح آشکارا ہو جائے گا کہ جرموں کے مقابلے میں میری حسرتیں زیادہ ہیں:۔

همانا تو دانی که کافر نیم	پرستار خورشید و آزر نیم
نه کشتم کسے را به اہرمنی	نه بردم زکس مایه در رہزنی
مگر مے که آتش بگورم ازوست	به ہنگامه پرواز مورم ازوست
من اندوهگین و مے اندہ ربائے	چه مے کردم اے بندہ پرور خدائے
حسابے در امش و رنگ و بو	زجمشید و بهرام و پرویز جو
که از باده تا چهره افروختند	دل دشمن و چشم بد سوختند
نه از من که از تاب مے گاه گاه	به دریوزه رخ کرده باشم سیاه
نه بستاں سرائے، نه میخانهٔ	نه دستاں سرائے، نه جانانهٔ
نه رقص پری پیکراں بر بساط	نه غوغائے رامشگراں در رباط

یعنی میں کافر نہیں ہوں، کسی کا خون نہیں بہایا، کسی پر ڈاکہ نہیں ڈالا، البتہ شراب ضرور پی۔ میں غموں کا مارا ہوا شراب کے سوا غموں سے نجات حاصل کرنے کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ لیکن اگر

شراب نوشی کا حساب لینا ہے تو جمشید، بہرام اور پرویز جیسے تاجداروں سے لے۔ مجھ سے کیا لینا ہے۔ جس نے کبھی کبھی بھیک مانگ کر منہ کالا کیا۔

بے نواؤں سے ہمدردی | پھر فرماتے ہیں کہ زندگی میں جو کچھ مجھ پر گزری اسے کیا بیان کروں۔ بیان کرنے کا وقت ہی نہ رہا۔ بہاریں آئیں لیکن میں بے سر و سامانی کا ماتمی بنا رہا۔ افق پر نشاط افزا بادل چھائے، لیکن میرا جام سفالیں شراب سے خالی رہا۔ اگر عیش کا کوئی لمحہ نصیب بھی ہوا تو اسکی حیثیت رقص بسمل کی سی تھی۔ تار درست ہوا تو گوہر ٹوٹ گیا۔ شراب مہیا ہوئی تو پیالہ ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔

بہ گیتی درم بے نوا داشتی — دلم را اسیر ہوا داشتی

نہ بخشندہ شاہے کہ بارم دہد — بہ ہر بار زر پیل بارم دہد

کہ چوں پیل را نجابر انگیزمے — زرش بر گدایاں فرو ریزمے

گویا اگر دولت اور صلہ کی خواہش بھی تھی تو اپنی ذات کے لئے نہیں، اپنی آسائش کے لئے نہیں بلکہ اس لئے تھی۔ کہ بادشاہ بلائے اور ہر مرتبہ ہاتھی پر لاد کر زر و جواہر عطا کرے۔ یہ ہاتھی لے کے نکلیں اور زر و جواہر فقیروں پر برسائے جائیں۔

پیکر حسن اخلاق | خواجہ حالی اپنے مشاہدات کی بنا پر فرماتے ہیں:۔

مرزا (غالب) کے اخلاق نہایت وسیع تھے۔ وہ ہر ایک شخص سے جو ان سے ملنے جاتا تھا بہت کشادہ پیشانی سے ملتے تھے۔ جو شخص ایک دفعہ ان سے مل آتا تھا اس کو ہمیشہ ان سے ملنے کا اشتیاق رہتا تھا۔ دوستوں کو دیکھ کر باغ باغ ہو جاتے تھے اور انکی خوشی سے خوش اور ان کے غم سے غمگین ہوتے تھے۔ ان کے دوست ہر ملت اور مذہب کے نہ صرف دہلی میں بلکہ تمام ہندوستان میں بیشمار تھے جو خطوط انہوں نے اپنے دوستوں کو لکھے ہیں ان کے ایک ایک حرف سے مہر و محبت و غمخواری و یگانگت ٹپکی پڑتی ہے ہر ایک خط کا جواب لکھنا وہ اپنے ذمے فرض عین سمجھتے تھے ان کا بہت سا وقت دوستوں کے خطوں کے جواب لکھنے میں صرف ہوتا۔ بیماری اور تکلیف کی حالت میں بھی خطوں کے جواب لکھنے سے باز نہ آتے تھے۔ وہ دوستوں کی فرمائشوں سے کبھی تنگدل نہ ہوتے تھے غزلوں کی اصلاح کے سوا اور طرح طرح کی فرمائشیں ان کے بعض خالص و مخلص دوست کرتے تھے اور وہ ان کی تعمیل کرتے تھے مروت اور لحاظ مرزا کی طبیعت میں بدرجۂ غایت تھا

اگرچہ مرزا کی آمدنی قلیل تھی مگر حوصلہ فراخ تھا۔ سائل ان کے دروازے سے خالی ہاتھ بہت کم جاتا تھا۔ ان کے مکان کے آگے لنگڑے لولے اور اپاہج مرد و عورت ہر وقت پڑے رہتے تھے۔ غدر کے بعد ان کی آمدنی کچھ اوپر ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار ہو گئی تھی اور کھانے پینے کا خرچ بھی کچھ لمبا چوڑا نہ تھا۔ مگر وہ غریبوں اور محتاجوں کی مدد اپنی بساط سے زیادہ کرتے تھے۔ اس لئے اکثر تنگ رہتے تھے۔[۱]

---

[۱] غالب نامہ کے فاضل مؤلف نے ان واقعات سے اختلاف کیا ہے وہ فرماتے ہیں کہ (۱) غالب کی تنگدستی اور قرضداری محض خیرات کا نتیجہ نہیں ہو سکتی (۲) غالب نے غدر میں اپنے بھائی مرزا یوسف کی کوئی امداد نہ کی بلکہ ان کے جنازے میں بھی شریک نہ ہوئے۔ (۳) مرزا یوسف کی وفات کے بعد غالب نے اپنی بھتیجی یا بھاوجہ کو کم از کم تین برس تک کچھ نہ دیا۔

میرے نزدیک یہ رائے نظر ثانی کی محتاج ہے۔ بلاشبہ غالب کا خرچ بہت بڑھا ہوا تھا لیکن محض اس وجہ سے کہ ان کے متوسلین کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ غدر میں اور اس کے بعد کچھ مدت تک ان کی آمدنی کے تمام دروازے بند رہے، گھر کی قیمتی چیزیں لٹ چکی تھیں تاہم ان کے ذمے بیس آدمیوں کا خرچ تھا۔ جس میں زیادہ تعداد ملازموں کی تھی۔ بعض نوکری چھوڑ کر جا چکے تھے لیکن جب غدر میں انہیں کھانے کو کچھ نہ ملا تو عیال سمیت واپس چلے آئے۔ غالب اپنا معمولی سامان بیچ بیچ کر اور قرض لے لیکر سب کو کھلاتے رہے۔

مرزا یوسف غالب کے برابر پنشن پاتے تھے اور ابتدا ہی سے الگ رہتے تھے۔ ایک بیٹی کے سوا ان کے کوئی اولاد نہ تھی۔ اسکی شادی نواب الٰہی بخش خاں معروف کے پوتے مرزا غلام فخر الدین خاں سے ہوئی تھی جو غدر کے اختتام تک بادشاہ کی جاگیر کوٹ قاسم کے ناظم تھے ان کی مالی حالت یقیناً اچھی ہو گی قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ مرزا یوسف اور ان کی بیوی بیٹی کے ساتھ رہتے تھے اور غالب کی امداد کے محتاج نہ تھے غدر کے دنوں میں مرزا یوسف کی بیوی بیٹی اور اس کے بچوں سمیت جے پور چلی گئی اور صرف ایک بوڑھے نوکر اور بوڑھی ملازمہ کو مرزا کی نگرانی کے لئے چھوڑا۔ غالب کو ان واقعات کا بعد میں علم ہوا۔ لیکن شہر کی حالت اس درجہ مخدوش تھی کہ وہ بھائی کو اپنے پاس نہ لا سکے۔ یہ واقعہ "دستنبو" میں مرقوم ہے۔

بھائی کے انتقال کی خبر ملی تو دفن کا سارا انتظام غالب نے کیا۔ البتہ خود نہ جا سکے اس لئے کہ شہر نیا نیا فتح ہوا تھا اور غالب کیلئے جو دربار شاہی کے ممتاز افراد میں تھے، باہر نکلنا سخت خطرے کا موجب تھا۔ اگر اس واقعہ سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ غالب ذاتی آسائش کو برادرانہ محبت پر ترجیح دیتے تھے تو مرزا یوسف کی بیوی اور بیٹی کے متعلق کیا سمجھنا چاہیئے جو مرزا کو نوکروں کے حوالے کر کے شہر چھوڑ گئی تھیں۔ یقیناً محولہ بالا رائے پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔

خاص طور پر توجہ طلب امر یہ ہے کہ مرزا یوسف کے جنازے میں شریک نہ ہو سکنے یا بھتیجی کی پرورش نہ کر سکنے کے واقعات خود غالب کے بیان کردہ ہیں اور اس بات کے شاہد عادل ہیں کہ بیان کرنے والے نے کسی بات پر پردہ نہیں ڈالا۔ وہ بھائی اور بھتیجی کے ساتھ محبت کا بہترین اندازہ دان تھا۔ بھتیجی یقیناً امداد کی محتاج نہ تھی۔ غالب نے محض اپنے واجبات کے سلسلے میں یہ ذکر بھی کر دیا۔

فراخ حوصلگی خواجہ حالی نے ان کی فراخ حوصلگی کے دو واقعے لکھے ہیں۔ ایک مرتبہ غدر کے بعد انہیں لفٹننٹ گورنر کی طرف سے سات پارچے کا خلعت مع تین رقوم جواہر کے ملا۔ لفٹننٹی کے چپراسی اور جمعدار قاعدے کے مطابق انعام کیلئے آئے۔ غالب کو پہلے ہی سے معلوم تھا کہ انعام دینا ہوگا۔ چنانچہ چپراسیوں کو ایک الگ مکان میں بٹھادیا گیا اور خلعت مع رقوم جواہر بغرض فروخت بازار بھیج دیا گیا۔ بازار سے قیمت آئی تو چپراسیوں کو انعام دیکر رخصت کیا

دوسرا واقعہ یہ ہے کہ غالب کے ایک امیر دوست جن کی حالت غدر میں بہت سقیم ہوگئی تھی چھینٹ کا فرغل پہنے ملنے کیلئے آئے۔ غالب نے انہیں کبھی مالیدہ یا جامہ وار کے چغوں کے سوا نہیں دیکھا تھا۔ چھینٹ کا فرغل دیکھکر دل بھر آیا۔ امداد کا خیال پیدا ہوا لیکن دوست کی خودداری کا احترام پیش نظر رکھتے ہوئے سلوک ایسے طریق پر کرنا چاہتے تھے کہ اسے بیچارگی کا احساس نہ ہو اور پیش کردہ ہدیہ کے قبول میں عار نہ آئے۔ غرض غالب نے چھینٹ کے فرغل کی بیحد تعریف کی پوچھا کہ یہ کہاں سے لی ہے اور درخواست کی کہ مجھے بھی اسی کا فرغل بنوا دیجئے۔ دوست نے بے تکلف کہا کہ اگر آپ کو پسند ہے تو یہی فرغل لے لیجئے۔ غالب نے کہا جی تو یہی چاہتا ہے کہ ابھی چھین لوں، لیکن جاڑا شدت سے پڑ رہا ہے۔ آپ یہاں سے مکان تک کیا پہنکر جائینگے" اس کے ساتھ ہی اپنا مالیدہ کا نیا چغہ انہیں پہنا دیا۔ ایک نازک دل اور نازک احساسات والے شاعر کی شان دوستداری کا تقاضا یہی تھا۔

غوث علی شاہ قلندر پانی پتی کا بیان حضرت غوث علی شاہ صاحب قلندر پانی پتی کے ایک مرید فرماتے ہیں کہ حضرت نے جب غالب کے انتقال کی خبر سُنی تو انا للہ پڑھکر بڑے تاسف کا اظہار فرماتے رہے، پھر بعض اشعار پڑھے۔ آخر میں فرمایا کہ میرزا غالب

نہایت خوب آدمی تھے۔ عجز وانکسار بہت تھا۔ فقیر دوست بہ درجہ غایت اور خلیق از حد

---

[۱] حضرت مولانا ابوالکلام فرماتے ہیں کہ مفتی صدرالدین آزردہ کا واقعہ ہے خواجہ حالی کہتے تھے کہ میں نے نام لکھنا پسند نہ کیا کہ شاید ان کے عزیزوں پر گراں گزرے۔

تھے ..... رند مشرب، بے شر اور رحم دل تھے اور فن شاعری میں تو اپنا جواب نہ رکھتے تھے[1]

احسان لینا گوارا نہ تھا

اگرچہ زندگی کا بڑا حصہ تنگ دستی اور قرضداری میں گزرا اور ارباب جاہ و ثروت کے عطایا لینے یا دوستوں اور نیازمندوں کے ہدایا قبول کرنے میں تامل نہ تھا۔ لیکن عام حالات میں کسی کا احسان لینا گوارا نہ تھا۔ "دستنبو" اگرچہ ان کے ایک عزیز شاگرد منشی شیو نرائن آرام نے چھاپی تھی، لیکن جن پچاس جلدوں کی قیمت رائے امید سنگھ اندور والے نے ادا کرکے ان کا بڑا حصہ غالب کو دلوا دیا تھا۔ ان کے علاوہ جتنی جلدوں کی ضرورت پیش آئی قیمت بھیج کر منگاتے رہے[2]

وہ خوددار سطوجاہ مولوی رجب علی کو جنہوں نے ایک چادر تحفہ کے طور پر بھیجی تھی۔ لکھتے ہیں :-

"منت پذیرفتن از ترک و تاجیک ننگ است[3]"

دوستوں کی خدمت

دوستوں کی ہر خدمت کے لئے وہ ہمیشہ تیار رہتے تھے۔ ہرگوپال تفتہ نے نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ مرحوم اور نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر کی تعریف میں قصیدے لکھے تھے غالب نے تفتہ کو ان کا صلہ دلوایا۔ چنانچہ لکھتے ہیں :-

تم کو معلوم رہے کہ ایک ممدوح تمہارے یہاں آئے ہیں۔ ان کو میں نے تمہارے فکر اور تلاش کا مداح پایا۔ جنوری ۱۸۶۳ء میں کچھ تمہاری خدمت میں بھیجیں گے۔ تم کو قبول کرنا ہوگا۔ سمجھے یہ کون؟ یعنی نواب مصطفےٰ خاں صاحب دوسرے ممدوح یعنی نواب ضیاء الدین احمد خاں، وہ آخر دسمبر ۱۸۶۲ء یا اوائل جنوری میں حاضر ہوں گے۔

---

[1] تذکرہ غوثیہ صفحہ (۳۵۵-۳۵۶)　　[2] اردوئے معلّٰی صفحہ (۶۸-۶۹)

[3] کلیات نثر فارسی صفحہ (۲۶۲)

هندوستانی شعرا کا انگریزی تذکرہ

دوستوں کی امداد میں، انہوں نے کبھی تامل نہ کیا۔ بلکہ آرزو ہمیشہ یہ رہی کہ جو لوگ ان سے وابستہ تھے زیادہ سے زیادہ فروغ پائیں۔ دہلی کے مستقل ڈپٹی کلکٹر ایک مرتبہ رخصت لے کر پہاڑ پر گئے اور ان کی جگہ ریٹی گن صاحب عارضی طور پر ڈپٹی کلکٹر مقرر ہوئے۔ انہیں ہندوستانی شعرا کا ایک انگریزی تذکرہ لکھنے کا خیال تھا۔ غالب نے نواب ضیاء الدین احمد خاں سے شعرا کے تذکروں کی سات کتابیں مستعار لیکر ریٹی گن صاحب کو بھجوائیں اور بعض زندہ شعرا کے حالات خود لکھ کر دے دیئے۔ ان میں ہرگوپال تفتہ بھی تھے۔ ریٹی گن صاحب نے غالباً خود بھی تفتہ کو خط لکھا تھا۔ ان کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ اگر غالب خود ریٹی گن صاحب کے پاس جاکر سفارش کرینگے تو ان کے متعلق زیادہ اچھے الفاظ لکھے جائیں گے چنانچہ ایک خط میں غالب پر یہ خیال ظاہر بھی کر دیا لیکن اس اثنا میں ریٹی گن صاحب عارضی ڈپٹی کلکٹری کی مدت پوری کر چکنے کے بعد عدالت خفیفہ کے جج ہو گئے اور شہر سے باہر فاصلے پر رہنے لگے۔ غالب تفتہ کو لکھتے ہیں کہ ریٹی گن صاحب کے منشی، مظہر الحق صاحب آئیں گے ان سے:

حال معلوم کر کے اگر میرا جانا یا لکھنا تمہاری فلاح کا موجب ہوگا تو ضرور ریٹی گن صاحب کے پاس جاؤنگا۔

سفارشوں کیلئے مستعد

سفارشوں کے باب میں بڑے مستعد تھے۔ نواب میر علی نقی خاں بڑے عالی خاندان آدمی تھے۔ نوکری کی جستجو میں نکلے تو غالب نے سید بدر الدین احمد کو سفارشی خط لکھا۔ فرماتے ہیں:-

آپ ان کی (علی نقی خاں کی) تعظیم و توقیر میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کریں۔ اور راج کا حال سب ان پر ظاہر کریں۔ اور انہیں اہالی سرکار سے ملادیں اور بابو صاحب سے جو ان کو ملوایئے تو میرا یہ خط جو آپ کے نام ہے جناب بابو صاحب کو پڑھوا دیجئے کیا خوب ہو کہ یہ سرکار میں نوکر ہو جائیں اور اگر نوکری کی صورت نہ بنے تو راج سے ان کی رخصت بہ آئین شائستہ عمل میں آوے۔

یہ جملۃ الملک نواب اسد خاں کے اخلاف میں سے تھے جو ۱۶۷۶ء سے عالمگیر اعظم کی وفات تک وزیر اعظم ہند رہے۔ مورخین انہیں "خاتم الامرا" کہتے ہیں۔ عالمگیر کی وفات کے بعد خانہ جنگیاں عام ہو گئی تھیں۔ ان سے مختلف امرا ملوث ہو کر برباد ہوئے۔ ان میں جملۃ الملک کے بیٹے آصف الدولہ ذوالفقار خاں بھی تھے۔ جو مغلوں کے آخری دور کے ایک مشہور سپہ سالار تھے۔ چنانچہ فرخ سیر کے حکم سے انہیں موت کی سزا دی گئی جملۃ الملک نے غالباً ۱۷۱۶ء میں وفات پائی۔

غالب ان مصائب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ علی نقی خاں کی بہبود کی جتنی کوشش کرو گے، مجھ پر احسان ہوگا۔

تواضع اور انجاح مقاصد خلق صاحب عالم مارہروی نے غالباً لالہ گوبند پرشاد صاحب کو سفارشی خط دیگر بھیجا تھا اور غالب کو براہ راست بھی لکھا تھا اسکے جواب میں فرماتے ہیں:

لالہ گوبند پرشاد صاحب ہنوز میرے پاس نہیں آئے ہیں، دنیا دار نہیں، فقیر خاکسار ہوں، تواضع میری خو ہے انجاح مقاصد خلق میں حتی الوسع سعی کرتا ہوں تو ایمان نصیب نہ ہو۔ انشاء اللہ العزیز وہ فقیر سے راضی و خوشنود رہیں گے۔

خط کشیدہ الفاظ سے غالب کے کمال حسن اخلاق اور جذبہ خدمت خلق روز روشن کی طرح آشکارا ہے

قیدیوں کی سفارش نواب انور الدولہ نے غالباً غدر کے دو قیدیوں کیلئے سفارشی خط طلب کیا تھا۔ انہیں لکھتے ہیں کہ حکم بہ طیب خاطر بجا لاتا ہوں۔ مگر یہ فرما دیجئے کہ کیا لکھوں اور خط کس کو بھیجوں، نیز سفارش کا مقصود کیا یہ ہے کہ قیدی ہندوستان میں رہیں اور انڈیمان نہ جائیں، یا یہ ہے کہ کاملاً رہا ہو جائیں، ہو آخر میں فرماتے ہیں:

بہرحال اس خط کے ساتھ ایک درلفافہ آپکے نام روانہ کرتا ہوں اسمیں صرف ایک خط موسومہ بلنشی صاحب جنکے پاس سفارش مطلوب تھی ہے کھلا ہوا اس کو پڑھکر میاں امیر الدین کے پاس بھیج دیجئے گا مگر گوند لگا کر (یعنی بند کر کے) اگر یہ منظور نہ ہو تو میری طرف سے منشی صاحب کے نام کا خط لکھ کر میرے پاس

بھیجئے اور لکھ بھیجئے کہ اس مسودہ کو صاف کر کے کہاں بھیجوں۔

دوست داری

نواب حسین مرزا کی ہر چیز غدر میں تباہ ہو چکی تھی۔ ان کے بھائی مظفر الدولہ مارے جا چکے تھے۔ ایک خط میں انہیں لکھتے ہیں:

اگر کہوں کہ میری جان بھی تمہارے کام آئے تو میں حاضر ہوں، یہ کہنا تکلف محض ہے کون کسی کی جان مانگتا ہے، کون جان دیتا ہے۔ مگر جو فکر مجھ کو تمہاری ہے۔ اور جو میری دسترس ہے، اس کو میرا خدا اور میرا خداوند (حضرت علی کرم اللہ وجہہ) جانتا ہے۔ دسترس کو تم بھی جانتے ہو ...... ابھی چنی لال تمہارا قرضخواہ آیا تھا۔ تمہارا حال پوچھتا تھا۔ کچھ سچ جھوٹ کہہ کر اس کو اس راہ پر لایا ہوں کہ سو سو روپیہ تم کو بھیج دے۔ بنیوں کی طرح تقریر اس کو سمجھائی ہے کہ لالہ، جس درخت کا پھل کھانا منظور ہوتا ہے۔ اس کو پانی دیتے ہیں۔ حسین مرزا تمہارے کھیت ہیں کھیت میں پانی دو تو اناج پیدا ہو۔ بھائی کچھ تو نرم ہوا ہے

منشی شیو نرائن کو لکھتے ہیں:

میاں عبدالحکیم بہت نیک بخت اور اشراف اور ہنرمند آدمی ہیں۔ دلی گزٹ میں حرفوں کے چھاپے کا کام کرتے تھے، چونکہ وہ چھاپہ خانہ اب آگرہ میں ہے یہ بھی وہیں جاتے ہیں تمہارے پاس حاضر ہوں گے۔ ان پر مہربانی رکھنا۔ وہ شہر بیگانہ ہے۔ ان کو تمہاری خدمت میں شناسائی رہے گی، تو اچھی بات ہے۔ صحافی کا کام بھی بقدر ضرورت کر سکتے ہیں۔ شاید اگر دہلی گزٹ میں ان کا طور درست نہ ہو تو اس صورت میں بہ شرط گنجائش اپنے مطبع میں رکھ لینا۔

امیر مینائی مرحوم

منشی شیو نرائن نے ایک رسالہ "معیار الشعراء" کے نام سے نکالا تھا جس میں مختلف شعرا کی غزلیں چھپتی تھیں۔ امیر مینائی مرحوم نے بھی اپنا کلام بغرض اشاعت بھیجا۔ اس زمانے میں وہ چنداں مشہور نہ تھے۔ منشی شیو نرائن نے "معیار الشعراء" میں ایک اعلان چھاپ دیا۔ کہ جب تک ان کا پورا نام و نشان معلوم نہ ہوگا، کلام نہیں چھاپا جائیگا۔ غالب نے "معیار الشعراء" میں یہ اعلان دیکھا تو فوراً منشی صاحب کو لکھا۔

یہ میرے دوست ہیں۔ امیر احمد ان کا نام ہے اور امیر تخلص کرتے ہیں۔ لکھنؤ کے ذی عزت باشندوں میں ہیں۔ اور وہاں کے پادشاہوں کے روشناس اور مصاحب رہے ہیں اور اب وہ رام پور میں نواب صاحب کے پاس ہیں۔ میں ان کی غزلیں تمہارے پاس بھیجتا ہوں۔ میرا نام لکھ کر ان غزلوں کو چھاپ دو۔ یعنی غزلیں غالب نے تمہارے پاس بھیجیں اور اس کے لکھنے سے ان کا (امیر مرحوم) نام اور ان کا حال معلوم ہوا......

اس کو "معیار الشعرا" میں چھاپ کر ایک دو ورقہ یا چار ورقہ رامپور ان کے پاس بھیج دو اور سرنامہ پر لکھو کہ "در رام پور بردر دولت حضور رسیدہ بخدمت مولوی امیر احمد برسد" اور مجھ کو اس کی اطلاع دو۔

یہ صرف چند مثالیں ہیں۔ غالب کے رقعات میں دوستوں اور منوسلوں کی امداد کے متعدد واقعات ملتے ہیں۔ یوسف علی خاں عزیز ایک شاگرد تھے، متعدد خطوط میں ان کے محاسن مختلف دوستوں کے پاس بیان کئے ہیں۔ خود بھی قلت مداخل کے باوجود عزیز کی امداد فرماتے رہتے تھے۔ دوستوں کی فرمائشیں پوری کرنے میں بڑے سرگرم تھے ان کے پاس مہریں بنوانے اور نگیں کندہ کرانے کی فرمائشیں اکثر آتی تھیں، متعدد خطوط میں ان کی تکمیل کا ذکر ملتا ہے۔ دہلی سے جوتے اور ٹوپیاں بھی دوستوں کو بھیجتے رہتے تھے۔

انکسار: اپنی ستایش سے بہت گھبراتے تھے۔ دوست اور شاگرد مدحیہ قصیدے بھیجتے، تو جواب میں حد درجہ کا انکسار فرماتے۔ صاحب عالم مارہروی کی ایک مدحیہ نظم کے جواب میں لکھتے ہیں:۔

خدا کی بندہ نوازیاں ہیں کہ مجھ ننگ آفرینش کو اپنے خاصان بارگاہ سے بھلا کہلوایا ہے ظاہر امیرے مقدر میں یہ سعادت نہ تھی (یعنی صاحب عالم کا مدحیہ قصیدہ) کہ اس دبلے حام میں جیتا بچا۔ اللہ اللہ اس کشتنی و سوختنی کو یوں بچایا اور پھر اس رتبے کو پہنچایا! کبھی عرش کو اپنا نشیمن قرار دیتا ہوں اور کبھی بہشت کو اپنا پائیں باغ تصور کرتا ہوں واسطے خدا

کے اور اشعار نہ فرمایئے گا۔ ورنہ بندہ خدائی کا دعوئے کرنے میں محابانہ کرے گا۔

قاضی عبدالجمیل بریلوی نے ان کی مدح میں قصیدہ بھیجا، ان کو لکھتے ہیں۔

اگر مجھے قوت ناطقہ پر تصرف باقی رہا ہوتا تو قصیدہ کی تعریف میں ایک قطعہ اور حضرت کی مدح میں ایک قصیدہ لکھتا۔

ایک اور خط میں قاضی صاحب ہی کو رقم فرماتے ہیں۔

وہ رباعی جو آپ نے اس ننگ آفرینش کی مدح میں لکھی، اس کا جواب بندگی ہے اور کورنش اور آداب

تیسرے خط میں مرقوم ہے۔

مجھے کیوں شرمندہ کیا، میں اس ثنا و دعا کے قابل نہیں۔ مگر اچھوں کا شیوہ ہے بروں کو اچھا کہنا۔ اس مدح گستری کے عوض میں آداب بجالاتا ہوں۔

تفتہ نے یگانہ روزگار استاد کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا تھا۔ اس کے جواب میں فرماتے ہیں۔

حضرت اس قصیدہ کی جتنی تعریف کروں کم ہے۔ کیا کیا شعر نکالے ہیں، لیکن افسوس کہ بے محل اور بے جا ہیں۔ اس مدح اور اس ممدوح کا بعینہ وہ حال ہے کہ ایک مزبلہ پر سیب کا یا بہی کا درخت اُگ جائے۔ خدا تمہیں سلامت رکھے، دکان بے رونق کے خریدار ہو۔

ایک اور خط میں لکھتے ہیں۔

میرزا تفتہ کیا کہنا ہے، نہ ظہیر کا پتہ ہے، نہ غالب کا۔ مداح (تفتہ) شایستہ صد ہزار آفرین اور ممدوح (غالب) سزاوار صد نفرین۔

مروت — مروت اور لحاظ کا یہ عالم تھا کہ آخری عمر میں اگرچہ بہت کمزور ہو گئے تھے، اور آلام جسمانی نے بہت پریشان کر دیا تھا۔ لیکن ناشناسا لوگ بھی کلام بھیج دیتے

تو اصلاح کے بغیر واپس نہ کرتے۔ اگر کسی عارضہ کی وجہ سے معذور ہو جاتے تو چھوٹوں بڑوں، شناساؤں اور ناشناساؤں سب کے ساتھ یکساں سلوک ہوتا، مثلاً ضعف دماغ اور دوران سر کے امراض میں مبتلا ہوئے تو جہاں عام شاگردوں کے کلام میں اصلاح ملتوی کرنی پڑی ہو ہاں نواب رام پور کے کلام کے ساتھ بھی یہی سلوک ہوا، حالانکہ وہ سرکار رام پور سے مستقل وظیفہ پاتے تھے۔ ۱۸۶۷ء میں انہوں نے اپنی بے چارگی کی کیفیت "اکمل الاخبار" اور "اشرف الاخبار" میں چھپوادی تھی اور خطوں کے جواب یا اصلاح اشعار سے معذرت چاہی تھی۔ لیکن لوگ بہ دستور انہیں خط بھیجتے، نیز اصلاح کے لئے اشعار آجاتے اور وہ شرمندہ ہوتے[۱]

اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ منشی شیو نرائن سے "دستنبو" کے جتنے نسخے امید سنگھ اندور والے کے پچاس نسخوں سے زائد منگائے قیمت دے کر منگائے۔ جب میاں داد خاں سیاح نے کتابوں کے لئے روپے بھیجے تو بہت ناراض ہوئے۔ فرماتے ہیں،

صاحب تم نے یہ پانچ روپے کے ٹکٹ کیوں بھیجے ہیں؟ میں "کتاب فروش" نہ "دلال"
یہ حرکت مجھے پسند نہ آئی، تم نے بہت بُرا کیا۔

شہزادہ بشیر الدین میسوری[۲] نے تصانیف مانگی تھیں ساتھ ہی ان کی قیمت پوچھی تھی۔ غالب کے پاس اس وقت فارسی دیوان اور "دستنبو" کے سوا کوئی چیز نہ تھی، چنانچہ دونوں

---

[۱] اردوے معلےٰ صفحہ ۱۷

[۲] یہ ٹیپو سلطان کے پوتے تھے۔ کلکتہ میں رہتے تھے اور ساڑھے تین سو روپے ماہانہ وظیفہ پاتے تھے سلطان تخلص تھا فارسی دیوان کلکتہ میں چھپ چکا ہے۔ مولوی عبدالرحیم گورکھپوری ان کے استاد تھے جنہیں انگریزی کی تحصیل اور نئے علوم کے اشتغال کی بنا پر لوگوں نے دہری مشہور کر دیا تھا۔ حملات حیدری انہی مولوی عبدالرحیم کی تصنیف ہے۔ جان مارشمین کلارک کی "ہسٹری آف انڈیا" کا انہوں نے فارسی میں ترجمہ کیا تھا، صرف پہلا حصہ شائع ہوا۔

کتابیں بھیج دیں اور شہزادہ کو لکھا:۔

حرفِ پرسشِ مقدارِ قیمت چرا بزبانِ قلم رفت۔ ہنجارِ نوازشِ نیازمندانِ بے نوا نہ این است بے سرمایہ ام نہ فرومایہ، سخنورم نہ سوداگر، موئینہ پوشم نہ کتاب فروش، پذیرندۂ ملائمم نہ گیرندۂ بہا۔ ہرچہ آزادگان بہ شہزادگان فرستند ارمغان است و ہرچہ شہزادگان بہ آزادگان بخشند تبرک۔ ہیچ دگر نیست، از چون و چرا نیست، ہرچہ فرستادہ ام ارمغان است و ہرچہ خواہم فرستاد ارمغان خواہد بود۔

کتابیں مستعار لیتے تھے

مطالعہ کے لئے کبھی کتاب نہ خریدی۔ ہمیشہ مستعار لے کر پڑھ لیتے۔ اور واپس کر دیتے۔ وہ خود لکھتے ہیں:۔

وہ میر کو رضی الدین نیشا پوری کا کلام ایک شخص بیچتا ہوا لایا۔ میں تو کتاب کو دیکھ لیتا ہوں۔ مول نہیں لیتا۔

میر مہدی مجروح کے نام ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ ان سے مصطلحات الشعرا مستعار منگائی تھی۔ نواب علاء الدین احمد خاں رئیس لوہارو سے فرہنگ لغات دساتیر طلب فرمائی تھی۔

حافظہ و سرعت فہم

حافظہ بلا کا تھا۔ جو کتاب ایک مرتبہ دیکھ لیتے اس کے تمام اہم اور ضروری حصے ذہن میں محفوظ ہو جاتے۔ اساتذہ کا کلام بڑی بے تکلفی سے سند میں پیش کرتے۔ "قاطع برہان" انہوں نے محض حافظہ کی بنا پر مرتب کر دی تھی۔ اس زمانے میں "برہان قاطع" اور دساتیر کے سوا ان کے پاس کوئی کتاب نہ تھی۔

سرعت فہم اور مطالب رسی کے متعلق "یادگار غالب" کے حوالے سے ایک واقعہ پہلے نقل کر چکے ہیں۔ یعنی نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ کو شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے ایک رسالہ میں سے بعض حصے سمجھ میں نہ آئے۔ غالب نے ان پر ایک نظر ڈال کر کسی قدر غور کے بعد مطلب اس خوبی سے واضح کر دیا۔ کہ شیفتہ کے قول کے

مطابق خود شاہ ولی اللہ بھی شاید اس سے بہتر بیان نہ فرما سکتے۔

شعر فہمی کے متعلق نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ نے "گلشن بے خار" میں جو کچھ لکھا ہے وہ سب سے بڑی دستاویز ہے۔ فرماتے ہیں:

مضامین شعری را کما حقہ مے فہمد و بہ جمیع نکات و لطائف پے مے برد و ایں فضیلتے است۔ کہ مخصوص خواص اہل سخن است۔ اگر طبع سخن شناس داری باین نکتہ مے رسی۔ چہ خوش فکر اگر چہ کمیاب است۔ اما خوش فہم کمیاب تر۔ خوشا حال کسیکہ از ہر دو بہرہ یافتہ و حظے ربودہ بالجملہ ایں چنیں نکتہ سنج نغز گفتار کمتر مرئی شدہ

شعر فہمی اور داد کا طریق

غالبؔ کا عام طریقہ یہ تھا۔ کہ جب تک واقعی اچھا شعر نہ ہوتا، تعریف نہ کرتے اور خاموش بیٹھے رہتے۔ خواجہ حالی فرماتے ہیں کہ اس بنا پر بعض معاصرین ان سے آزردہ رہتے تھے اور ضد میں آکر ان کی شاعری پر طرح طرح کی نکتہ چینیاں کرتے تھے۔ ویسے غالب طبعاً صلح جو تھے۔ اور ہر شخص کی دلداری کا انتہائی خیال رکھتے تھے۔

"تذکرہ غوثیہ" میں ایک واقعہ حضرت غوث علی شاہ پانی پتی کی زبانی مرقوم ہے کہ ایک روز مرزا رجب علی بیگ سرور مصنف فسانہ عجائب غالبؔ سے ملے۔ اثنا گفتگو میں پوچھا۔ کہ اُردو زبان کس کتاب کی عمدہ ہے۔ جواب ملا کہ "چہار درویش" کی۔ سرور نے "فسانہ عجائب" کا نام لیا۔ غالبؔ کو معلوم نہ تھا۔ کہ خود مصنف "فسانہ عجائب" استفسار کر رہا ہے۔ بے تکلف جواب دیا "اجی لاحول ولاقوۃ۔ اس میں لطف زبان کہاں۔ ایک تک بندی ور بھٹیار خانہ جمع ہے"۔

جب سرور چلے گئے اور غالبؔ کو معلوم ہوا کہ یہ فسانہ عجائب" کے مصنف تھے تو بہت افسوس کیا اور کہا "ظالمو پہلے سے کیوں نہ کہا" دوسرے دن غوث علی شاہ صاحب ملے انہیں سارا قصہ سنایا اور کہا کہ حضرت! یہ امر مجھ سے بے خبری میں سرزد ہو گیا۔ آپئے آج سرور کے مکان پر چلیں اور کل کی مکافات کر آئیں۔ چنانچہ وہاں گئے۔ مزاج پرسی کے بعد

غالب نے عبارت آرائی کا ذکر چھیڑا اور بولے جناب مولوی صاحب رات میں نے "فسانہ عجائب" کو بہ غور دیکھا تو اس کی خوبی عبارت اور رنگینی کا کیا بیان کروں، نہایت ہی فصیح و بلیغ ہے۔ غرض اس قسم کی باتوں سے سرور کو مسرور کیا۔ دوسرے دن ان کی دعوت کی۔ اور غوث علی شاہ صاحب کو بھی بلایا۔

شاہ صاحب یہ واقعہ بیان فرمانے کے بعد کہتے ہیں:

"مرزا صاحب کا مذہب یہ تھا کہ دل آزاری بڑا گناہ ہے۔"

لیکن اشعار کی داد میں راہ حق سے بال برابر بھی انحراف گوارا نہ تھا۔

سلامت طبع

نہایت سلیم الطبع تھے۔ خواجہ حالی نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ سلامت طبع ہی کا اقتضا تھا۔ کہ ابتدائے مشق سخن میں جو ناہموار اور ٹیڑھا ہی نہیں بلکہ غلط راستہ اختیار کیا تھا۔ اسے کسی رہبر یا استاد کی دستگیری کے بغیر خود بخود ترک کر کے صحیح راستے پر آ گئے۔ سلامت طبع کا اندازہ مسئلہ امتناع و امکان نظیر خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی ہو سکتا ہے۔ جس کی تفصیل مولانا ابوالکلام کی زبان سے مولانا فضل حق خیرآبادی کے حالات میں پیش کی جا چکی ہے۔

شاہ اسماعیل شہید نے "تقویت الایمان" میں ایک جگہ لکھ دیا تھا کہ خدا چاہے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کروڑوں مثیل ایک پل میں پیدا کر دے یہ سنکر مولانا فضل حق بگڑ گئے۔ اور قدرت و مشیت کے فرق کو نظر انداز کر کے دعوٰی کر دیا کہ آنحضرت صلعم کا نظیر ممتنع بالذات ہے۔ اس پر بحث شروع ہو گئی اور مولانا فضل حق نے غالب سے بھی ایک مثنوی لکھوائی جو ان کے کلیات فارسی میں موجود ہے۔ اس میں مسئلہ نظیر خاتم النبیین کے علاوہ استمداد و توسل قبور وغیرہ کو بھی درست ثابت کیا گیا ہے۔

مولانا شاہ اسماعیل جون ۱۸۲۱ء میں حج کے لئے تشریف لے گئے۔ اور

اپریل ۱۸۲۲ء میں واپس آئے۔ پھر ۱۸۲۶ء میں حضرت سید احمد بریلویؒ کے ہمراہ جہاد کے لئے روانہ ہو گئے۔ میرا خیال ہے کہ محولہ بالا بحث ۱۸۲۱ء سے پہلے ہوئی یا اسے ۱۸۲۴ء اور ۱۸۲۵ء کا واقعہ سمجھنا چاہیئے۔ پہلی صورت میں غالب کی عمر زیادہ سے زیادہ چوبیس برس کی اور آخری صورت میں ستائیس اٹھائیس برس کی ہوگی لیکن اس زمانے میں بھی ان کے ذہن نے امتناع نظیر کا مسئلہ قبول نہ کیا۔ اور ایک لطیف پیرایہ میں وہی بات کہہ گئے، جو شاہ اسماعیل شہید کہتے تھے۔ قادر مطلق کی قدرت پر پابندی ان کے تصور میں نہیں آسکتی تھی۔ لہذا تعبیر کا یہ پہلو اختیار کر لیا کہ اس جہان میں تو خاتم النبیینؐ کا نظیر پیدا نہیں ہو سکتا۔ ہاں خدا دوسرے جہان پیدا کرکے ان میں نئے خاتم بنا سکتا ہے:

یک جہاں تا ہست یک خاتم بس است ۔۔۔ قدرت حق را نہ یک عالم بس است

خواہد از ہر ذرہ آرد عالمے ۔۔۔ ہم بود ہر عالمے را خاتمے

ہر کجا ہنگامۂ عالم بود ۔۔۔ رحمۃ للعالمینے ہم بود

کثرت ابداع عالم خوب تر

یا بیک عالم دو خاتم خوب تر

مولانا فضل حق جانتے تھے کہ یہ استدلال ان کے خلاف ہے۔ لہذا اصرار کیا کہ اس حصے کو مثنوی سے نکال دو، اور لکھو کہ کتنے ہی جہان پیدا ہو جائیں "خاتم"، ایک ہی رہے گا۔ غالب نے یہ حصہ تو نہ نکالا۔ لیکن چند اشعار کا اضافہ کرکے بحث کا رخ بدل دیا:-

غالب ایں اندیشہ نپذیرم ہمے ۔۔۔ خردہ ہم برخویشتن مے گیرم ہمے

منشأ ایجاد ہر عالم یکے است ۔۔۔ گر دو صد عالم بود "خاتم" یکے است

یہ غالب کی سلامت طبع کا کرشمہ تھا، کہ اصل مضمون میں استدلال کی جو خامیاں

تھیں انہیں وہ قبول نہ کر سکے۔ مثنوی اگرچہ ایک عزیز دوست کی فرمائش پر اور ایک خاص مقصد کو سامنے رکھ کر لکھی گئی تھی۔ لیکن انہوں نے سچی بات صاف صاف کہہ دی۔

غلطی کا اعتراف

غالب سے اگر کوئی غلطی سرزد ہو جاتی تو اس کے اعتراف میں تامل نہیں کرتے تھے۔ مثلاً "قاطع برہان" میں انہوں نے "افسوس" کو عربی الاصل ماخوذ از "اسف" قرار دیا تھا۔ جب ان پر یہ غلطی واضح ہو گئی، تو فوراً رجوع کر لیا۔ نواب علاء الدین احمد خاں کو لکھتے ہیں:۔

"افسوس" کو میں نے عربی جانا۔ عربی نہیں ہے۔ اب مانا کہ یہ ایک سہو طبیعت تھا۔

"نامۂ غالب" میں میرزا رحیم بیگ کو لکھتے ہیں:۔

"اوراقِ "افسوس" کے بیان میں مجھ سے وہ سہو ہوا ہے کہ مجھے اس کا اقرار اور میرے دوست میاں داد خاں سیاح شرمسار ہے۔

غالب کی مثنوی "درد و داغ" میں ایک شعر تھا:

خوک شد و پنجہ زدن ساز کرد
با سر و رو عربدہ آغاز کرد

گل محمد خاں ناطق مکرانی کے پاس کلیات کا نسخہ پہنچا، اور یہ مثنوی دیکھی تو خط لکھا، کہ خوک کے "سم" ہوتا ہے "پنجہ" نہیں ہوتا۔ پھر کیا سم و پنجہ کا اطلاق ایک محل پر شعرا کے نزدیک جائز ہے؟ جواب میں لکھتے ہیں:

راست مے گویم و یزداں نہ پسندد جز راست، حرف ناراست سرودن روشِ اہرمن است۔ بہ تیزی دم ذوالفقار و بہ فروغ گوہر حیدر کرار سوگند کہ ہیئت پائے خوک در نظر نبود۔ اگرچہ ایں نوع آفرینش را در ویرانہ و خرابہ ہا بسیار دیدہ ام، اما ژرف نگہی بہ کار

نبردہ ام۔ گمان من ایں بود کہ خوک ہم چو سگ دگر بہ پائے دارد، اکنوں از روے نوشتۂ شما در نظر جلوہ کرد کہ خوک "سم" دارد و پنجہ نہ دارد۔ کاشش نامۂ شما پیش ازاں کہ کلیات نقش انطباع پذیرد، بہ من رسیدے۔[1]

کون اس بے تکلّفی کے ساتھ اپنی غلطی یا کسی خاص معاملے کے متعلق اپنی بیخبری کا اعتراف کرتا ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ فارسی مکاتیب غالبؔ نے خود جمع کر کے چھپوائے۔ وہ چاہتے تو آسانی سے اس خط کو حذف کر سکتے تھے۔ لیکن اسے بجنسہٖ چھاپ دیا۔ اور کلیات کے دوسرے ایڈیشن میں محولہ بالا شعر کو بدل کر یوں بنا دیا:-

خوک شد و بد نفسی ساز کرد

با سر و رُو عربدہ آغاز کرد

اصلاح قبول کر لی | خواجہ حالیؔ نے لکھا ہے کہ ایک قصیدہ کا پہلا مصرع یہ تھا:

عید اضحےٰ بہ سر آغاز زمستان آمد

نواب مصطفٰے خاں شیفتہؔ کے کہنے پر "عید اضحےٰ" کی جگہ "عید قرباں" بنا دیا۔
ایک اور قصیدہ کا ایک شعر تھا:-

ہم چناں در تتق غیب "نمودے" دارند

بہ وجودے کہ ندارند ز خارج اعیاں

مولانا فضل حق خیر آبادی کے کہنے پر "نمودے" کی جگہ "ثبوتے" بنا دیا۔

مخالفت سے عفو و درگزر | جن اشخاص کی فارسی دانی میں غالبؔ کو کلام تھا۔ ان کے خلاف رقعات میں جا بجا سخت الفاظ ملتے ہیں۔ مثلاً مرزا محمد حسن قتیلؔ۔ عبدالوسع ہانسوی، ملا

---

[1] کلیات نثر غالب صفحہ ۲۴۵

غیاث الدین رام پوری صاحب غیاث اللغات، اطلاق العین واقف بٹالوی یہ چیز ان کے عام اسلوب کے خلاف پیش کی جا سکتی ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ بحث اصلاً مسائل و اصول کے باب میں شروع ہوئی۔ مخالف گروہ چونکہ بار بار انہی اشخاص کے نام بہ طور سند پیش کرتا تھا اس لئے غالب کو ان کی حقیقی حیثیت کی توضیح کرنی پڑی۔ اور شدہ شدہ تحریر میں تلخی کا رنگ آگیا۔ اور نہ وہ اپنے مخالفین کے بارے میں بالعموم عفو و درگزر پر کاربند رہتے تھے۔ سیف الحق سیاح کے نام ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ قاضی بڑودہ نے غالب کے خلاف بُرے الفاظ استعمال کئے تھے۔ سیاح نے اطلاع دی تو جواب میں فرماتے ہیں:

قاضی صاحب بڑودہ کو معاف رکھو۔ اگر کوئی درجہ اپنے پر ان کے عتاب کی پاتا تو ان سے عذر کرتا اور اپنا گناہ معاف کرواتا۔ جب سببِ ملال کا ظاہر نہیں تو میں کیا کروں۔ تم بُرا نہ مانو۔ کس واسطے کہ اگر میں بُرا ہوں تو اُس نے سچ کہا اور اگر میں اچھا ہوں اور اُس نے بُرا کہا تو اس کو خدا کے حوالے کرو۔

غالب بُرا نہ مان جو دشمن بُرا کہے
ایسا بھی ہے کوئی کہ سب اچھا کہیں جسے

جو لوگ ان سے ملنے کے لئے آتے تھے ان کی بازدید کا بڑا خیال رکھتے تھے اور یہ گوارا نہ تھا کہ کسی کا "آنا" ان کے ذمے رہ جائے۔

تاریخی مادوں سے نفرت

غالب نظم و نثر کے بادشاہ تھے۔ اصنافِ تحریر و نگارش میں سے کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس میں ان کے فکر و تخیل کی بہتر سے بہتر گلکاریاں موجود نہ ہوں۔ غزل، مثنوی، قصیدہ، رباعی، قطعہ، نوحہ، نثر میں مکاتیب، علمی مباحث، قدرتی مناظر، تاریخ، تقریظ و تنقید سب کچھ موجود ہے۔ لیکن تاریخی

مادوں کی تلاش سے وہ سخت گھبراتے تھے۔ ان کے نہایت عزیز دوست منشی نبی بخش حقیر کا انتقال ہو گیا۔ تفتہ نے تاریخ وفات کے لئے اصرار کیا۔ جواب میں لکھتے ہیں:۔

میں تاریخ کو دون مرتبہ شاعری جانتا ہوں۔ اور تمہاری طرح میرا یہ بھی عقیدہ نہیں ہے کہ تاریخ وفات لکھنے سے ادائے حق محبت ہوتا ہے۔ بہرحال میں نے منشی نبی بخش مرحوم کی تاریخ رحلت میں یہ قطعہ لکھ کر بھیجا۔ منشی قمرالدین صاحب نے پسند کیا۔ قطعہ یہ ہے:۔

منشی نبی بخش کہ از حسن خلق	داشت مذاق سخن و فہم تیز
سال وفاتش زپئے یادگار	با دل زار و مژہ وجلہ ریز
خواستم از غالب آشفتہ سر	گفت بہ طول و بگو رستخیز

سیاح کو لکھتے ہیں:۔

بھائی تمہاری جان کی قسم اور اپنے ایمان کی قسم میں فن تاریخ گوئی اور معما سے بیگانہ محض ہوں اردو زبان میں کوئی تاریخ میری سُنی ہو گی۔ فارسی دیوان میں دو چار تاریخیں ہیں، ان کا حال یہ ہے۔ کہ مادہ اور کا ہے۔ اشعار میرے ہیں۔ تم سمجھے کہ میں کیا کہتا ہوں؟ حساب سے میرا جی گھبراتا ہے اور مجھ کو جوڑ لگانا نہیں آتا۔ جب کوئی مادہ بتاؤں گا۔ حساب درست نہ پاؤں گا۔ ایک دوست اپنے تھے کہ اگر حاجت ہوتی تو مادہ تاریخ وہ ڈھونڈ دیتے تھے، موزوں میں کرتا۔

اس کے بعد اپنی چند تاریخیں پیش کی ہیں کہ دیکھو تعمیہ یا تخرجہ کس درجہ مضحکہ خیز ہے:۔

نواب علاءالدین احمد خاں کے صاحبزادہ کا انتقال ہو گیا۔ انہوں نے تاریخ وفات کے لئے لکھا۔ غالب نے یہی عذر پیش کیا۔ کہ میرے مادہ ہائے تاریخ بیشتر بے مزہ ہوا کرتے ہیں۔ اس کے باوجود ان کے کلیات میں تاریخ کے متعدد قطعات . . . .

موجود ہیں اور بعض ایسے قطعات بھی ہیں جو کلیات میں شامل نہیں ہوئے۔

فرمایشی اشعار

دوستوں کی فرمایش پر بھی وہ شعر کہہ دیتے تھے۔ تفتہ کو لکھتے ہیں:

ایک میرا دوست اور تمہارا ہمدرد ہے۔ اس نے اپنے حقیقی بھتیجے کو بیٹا کر لیا تھا۔ اٹھارہ انیس برس کی عمر، قوم کا کھتری، خوبصورت وضعدار نوجوان ۱۲۷۲ھ میں بیمار پڑ کر مر گیا۔ اب اس کا باپ مجھ سے آرزو کرتا ہے کہ ایک تاریخ اس کے مرنے کی لکھوں، ایسی کہ وہ فقط تاریخ نہ ہو بلکہ مرثیہ ہو تاکہ وہ اس کو پڑھ پڑھ کر رویا کرے۔ سو بھائی اس سائل کی خاطر مجھ کو عزیز اور فکر شعر متروک۔ معہذا یہ واقعہ تمہارے حسب حال ہے جو خونچکاں شعر تم نکالوگے مجھ سے کہاں نکلیں گے۔ بہ طریق مثنوی بیس تیس شعر لکھ دو۔ مصرعہ آخر میں مادہ تاریخ ڈال دو۔ نام اس کا برج موہن تھا اور اس کو بابو بابو کہتے تھے چنانچہ میں ہزج مسدس مخبون میں ایک شعر تم کو لکھتا ہوں ــــ

برم چوں نام بابو برج موہن

چکید خونِ دل ریش از لب من

سعادت مند شاگرد نے استاد کے حکم کی تعمیل میں کچھ اوپر اسّی شعر کا مرثیہ لکھ بھیجا لیکن اس سے پیشتر غالب نے خود ہی بائیس شعر کہکر فرمایش پوری کر دی تھی لہذا تفتہ کے اشعار واپس کر دئے اور لکھا کہ یہ کسی دوسرے ضرورتمند کو دے دینا۔ تفتہ کو شبہ ہوا کہ شاید شعر سقیم تھے اور یہ شبہ ظاہر بھی کر دیا۔ جواب میں فرماتے ہیں،

وہ شعر سب دست و گریبان تھے۔ ایک کو ایک سے ربط، ایک یا دو شعر اس میں سے ۔

سلہ انھی دنوں میں تفتہ کے بیٹے پتمبر سنگھ کا انتقال ہو گیا تھا جس پر ڈھائی تین سو شعر کا ایک مرثیہ تفتہ نے لکھا جو ان کے مطبوعہ فارسی دیوان میں موجود ہے۔

کیوں کرنے جاتے۔ اشعار سب میرے پسند بے سقم بے عیب۔

منشی شیونرائن آرام کی فرمائش پر اکیس شعر کا ایک قصیدہ "ایلن براؤن" کی مدح میں ان کے ہاں لڑکا پیدا ہونے پر لکھا تھا۔ خود منشی صاحب کو لکھتے ہیں:

کل آپ کا خط آیا۔ رات بھر میں نے فکر شعر میں خون جگر کھایا۔ اکیس شعر کا قصیدہ لکھ کر تمہارا حکم بجا لایا۔ میرے دوست خصوصاً میرزا تفتہ جانتے ہیں کہ میں فن تاریخ کو نہیں جانتا۔ اس قصیدہ میں ایک روش خاص سے اظہار ۱۸۵۸ء کا کر دیا ہے خدا کرے تمہارے پسند آئے۔

اس کے بعد قصیدہ درج کیا ہے جس کے آخری دو شعر یہ ہیں:

اُمیدوارِ عنایات شیونارائن — کہ آپ کا ہے نمک خوار اور دولت خواہ

یہ چاہتا ہے کہ دنیا میں عز و جاہ کے ساتھ — تمہیں اور اس کو سلامت رکھے سدا اللہ

"اس کو" نو مولود کی طرف اشارہ ہے۔

شجروں سے نفرت ارباب تصوف و سلوک کے ہاں "شجرہ" ایک خاص چیز ہے۔ یعنی روحانی فیوض کے واسطوں کو مرشد سے لے کر حضور خواجہ دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم تک ترتیب وار یاد کرنا۔ مدت سے یہ چیز صوفیا کے یومیہ اوراد و وظائف کا جزو بنی ہوئی ہے سہولت کی غرض سے شجرے منظوم کرنے کا رواج عام ہے۔ خواجہ حالی فرماتے ہیں کہ نواب الٰہی بخش خاں معروف بھی جس شخص کو مرید کرتے اپنے سلسلے کا منظوم شجرہ اسے عطا فرماتے۔ اس غرض کے لئے وہ شجرہ کی نقلیں کراتے رہتے تھے۔ ایک مرتبہ غالب سے بھی یہ کام لیا گیا۔ انہیں شجروں سے نفرت تھی، لہذا نقل کرتے وقت ہر تیسرا شعر حذف کرتے گئے۔ جب یہ مقطوع نقل نواب الٰہی بخش خاں کے ملاحظہ سے گزری تو بہت خفا ہوئے۔ لیکن غالب نے بے تکلف کہا:

آپ اس کا کچھ خیال نہ فرمایئے۔ شجرہ دراصل خدا تک پہنچنے کا زینہ ہے، سو زینہ کی ایک

ایک سیڑھی اگر درمیان سے نکال دی جائے تو چنداں ہرج واقع نہیں ہوتا۔ آدمی ذرا اُچک اُچک کے اوپر چڑھ سکتا ہے۔

میر ابراہیم علی خاں سورتی نے شجرۂ منظوم اصلاح کیلئے بھیجنا چاہا۔ جواب میں فرماتے ہیں :-

میرے قبلہ و کعبہ واسطے خدا کے شجرۂ منظومہ ارسال نہ فرمایئے گا۔ اس کی اصلاح میری حدِ وسع سے باہر ہے۔ یہ میرا شیوہ نہیں۔

ہجو خواجہ حالی نے لکھا ہے کہ غالب نے کسی کی ہجو میں کوئی قطعہ یا قصیدہ نہیں لکھا۔ صرف ایک قطعہ ان کے قلمی مسودات میں دستیاب ہوا ہے۔ جو مطبوعہ کلیات میں شامل نہیں[1]۔ اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک امیر کی مدح میں فارسی قصیدہ مع عرضداشت ارسال کیا۔ جواب مدت دراز تک نہ ملا تو تقاضے کے طور پر یہ قطعہ بھیجا جس کو مشکل سے ہجو ملیح کہا جاسکتا ہے[2]۔

اوپر عرض کیا جاچکا ہے کہ یہ قطعہ نواب وزیر الدولہ والی ٹونک کی خدمت میں بھیجا گیا تھا۔ خواجہ مرحوم کا یہ دعوےٰ صحیح نہیں کہ غالب نے کبھی کسی کی ہجو میں کوئی قطعہ نہیں لکھا۔ ان کے فارسی کلیات نظم میں کم و بیش چار قطعات ایسے ضرور موجود ہیں جنہیں بہر حال ہجو ہی کی مد میں لانا پڑے گا[3]۔ البتہ یہ درست ہے کہ ان کی ہجو سودا یا انشا یا فارسی کے بعض دوسرے ہجوگو شعرا کی طرح بازاری رنگ کی نہیں ہوتی تھی۔

تقریظ نگاری خواجہ حالی فرماتے ہیں کہ غالب پر تقریظوں کی بے انتہا فرمائشیں ہوتی تھیں اور وہ احباب کی دلداری کے خیال سے عموماً فرمائشیں پوری کر دیتے تھے لیکن تقریظ نگاری

---

[1] یہ قطعہ "سبد چین" میں موجود ہے اور "سبد چین" غالب کی زندگی میں چھپ گئی تھی۔ معلوم نہیں خواجہ مرحوم نے اسے قلمی کس بنا پر فرمایا [2] یادگار غالب صفحہ ۸۴ [3] کلیات نظم قطعات ۱۲ و ۱۳ و ۱۴ و ۱۷

میں انہوں نے ایسا طریقہ اختیار کیا تھا کہ کوئی بات راستی کے خلاف نہ ہو اور صاحب کتاب خوش ہو جائے۔ مثلاً تقریظ کا زیادہ حصہ تمہید میں یا مُصنّف کی ذات اُس کے اخلاق یا اس کی محبت اور دوستی کے بیان میں صرف کر دیتے تھے۔ کتاب کی نسبت صرف چند جملے لکھتے تھے جو اصلیت سے خالی نہ ہوں[1]۔

وہ خود اپنی روش کی نسبت تفتہ کو لکھتے ہیں،

وہ روش ہندوستانی فارسی لکھنے والوں کی مجھ کو نہیں آتی کہ بالکل بھاٹوں کی طرح بکنا شروع کر دیں۔ میرے قصیدے دیکھو۔ تشبیب کے شعر بہت پاؤ گے، مدح کے شعر کمتر، نثر میں بھی یہی حال ہے۔ نواب مصطفےٰ خاں کے تذکرہ (گلشن بے خار) کی تقریظ ملاحظہ کرو۔ ان کی مدح کتنی ہے۔ میرزا رحیم الدین بہادر حیا تخلص کے دیوان کا دیباچہ دیکھو وہ جو تقریظ دیوان حافظ کی موجب فرمائش جان جاکوب بہادر کے لکھی ہے۔ اس کو دیکھو کہ فقط ایک بیت میں ان کا نام اور ان کی مدح آئی ہے اور باقی ساری نثر میں کچھ اور ہی اور مطالب ہیں۔

تفتہ نے اپنے دیوان کی تقریظ کے مدحیہ الفاظ کی کمی کا شکوہ کیا تھا۔ محولہ بالا بحث کے بعد غالب فرماتے ہیں،

واللہ باللہ کسی شہزادے یا امیرزادے کے دیوان کا دیباچہ لکھتا، تو اتنی مدح نہ کرتا کہ جتنی تمہاری مدح کی ہے۔ ہم کو اور ہماری روش کو اگر پہچانتے تو اتنی مدح کو بہت جانتے۔ قصہ مختصر تمہاری خاطر ایک فقرہ تمہارے نام کا بدل کر اس کے عوض ایک اور فقرہ لکھ دیا ہے، اس سے زیادہ بھٹئی میری روش نہیں۔

آئین اکبری کی تقریظ | سرسید احمد خاں نے "آئین اکبری" کی تصحیح کی تھی تو دہلی کے دوسرے

[1] یادگار غالب صفحہ ۷۵

مشاہیر کے علاوہ غالب نے بھی مثنوی میں اس کے لئے تقریظ لکھی تھی لیکن انہیں ایک تو شیخ ابوالفضل کا انداز تحریر پسند نہ تھا، دوسرے شیخ کے پیش کردہ آئین کو انگریزی آئین کے مقابلے میں فروتر جانتے تھے۔ سرسید کے ساتھ اگرچہ ان کے تعلقات بہت گہرے اور عزیزانہ تھے اور ان کی دلداری بھی بدرجہ غائت منظور تھی۔ لیکن تقریظ میں اپنے حقیقی خیالات چھپا نہ سکے اور صاف لکھا کہ سید کی ہمت بلند کے لئے آئین اکبری کی تصیح قطعاً باعث فخر نہ تھی اور ایسے کام کی ستایش وہی کر سکتا ہے جس کا شیوہ ریاکاری ہو۔

من کہ آئین ریا را دشمنم　　در وفا اندازہ دان خود منم
گر بدیں کارش نہ گویم آفریں　　جائے آں دارد کہ جویم آفریں

پھر فرماتے ہیں کہ اگر آئین کی بنا پر کتاب ستایش کی مستحق ہے تو آنکھیں کھول کر موجودہ زمانے کی حالت دیکھو اور انگریزوں ہی کی کاریگری پر نظر ڈالو کہ انہوں نے دیاسلائی دخانی کشتیاں، ریل، تار، بجلی وغیرہ کیسی چیزیں ایجاد کی ہیں۔

آتشے کز سنگ بیروں آورند　　ایں ہنرمنداں ز خس چوں آورند
تا چہ افسوں خواندہ اند ایناں بر آب　　دود[1] کشتی را ہمے راند در آب
گہ دخاں کشتی بہ جیحوں مے برد　　گہ دخاں گردوں[2] بہ ہاموں مے برد
غلطک گردوں بگرداند دخاں　　نرہ گاو و اسپ را ماند دخاں
از دخاں زورق بہ رفتار آمدہ　　باد و موج ایں ہر دو بیکار آمدہ
نغمہ ہا بے زخمہ از ساز آورند　　حرف چوں طائر بہ پرواز آورند
ہیں نمے بینی کہ ایں دانا گروہ　　در دو دم آرند حرف از صد کروہ
مے زند آتش بہ باد اندر ہمے　　مے درخشد باد چوں اخگر ہمے

[1] بھاپ　　[2] گاڑی گردوں دخاں سے مراد یہاں ریل گاڑی ہے۔

رو بہ لندن کاندراں رخشندہ باغ　　شہر روشن گشتہ در شب بے چراغ

کار و بار مردم ہشیار بیں　　در ہر آئین صد نو آئیں کار بیں

پیش ایں آئیں کہ دارد روزگار　　گشتہ آئین دگر تقویم پار

پھر فرماتے ہیں کہ اگر کتاب کو طرزِ تحریر کے لحاظ سے شایان ستایش قرار دیا جائے تو،

ہر خوشے را خوشتر ے ہم بودہ است　　گر سرے ہست افسرے ہم بودہ است

مبدأ فیاض را مشمر بخیل　　نوزمے ریزہ در طب ہا زاں نخیل

مردہ پروردن مبارک کار نیست　　خود بگو کاں نیز جز گفتار نیست

"آئین اکبری" کے متعلق غالبؔ کی رائے یقیناً قابلِ قبول نہیں اسلئے کہ کتاب کی تاریخی حیثیت معلوم و مسلّم ہے۔ لیکن تقریظ سے ایک حقیقت صاف آشکارا ہے کہ غالبؔ کا اسلوب فکر و نظر عام لوگوں سے الگ تھا۔ وہ شخصیت پرست نہ تھے بلند ناموں سے مرعوب نہیں ہوتے تھے۔ بلکہ ہر شے کی افادی حیثیت کا مستقلاً اندازہ کرتے، بعد میں اس پر اچھائی یا برائی کا حکم لگاتے۔ نیز ان کا دماغ نئے نئے علوم و فنون کی اہمیت کا اعتراف اس زمانے میں کر چکا تھا۔ جب کہ عام ہندوستانی ان سے دور بھاگتے تھے۔

سرسید کے خاندان کے ساتھ ان کے تعلقات بہت گہرے تھے بلکہ رشتہ داری بھی تھی۔ لیکن اس وجہ سے اپنے دل کی بات صاف صاف اور بے تکلف کہہ دینے میں تامل نہ کیا۔ سرسید نے اس تلخ تقریظ کو نہ چھاپا بلکہ مشہور ہے اسی بنا پر سرسید اور غالبؔ کے روابط میں تکدر پیدا ہو گیا جو ۱۸۶۰ء میں اس وقت دور ہوا جب غالبؔ رامپور کے پہلے سفر سے واپس ہوتے ہوئے مراد آباد ٹھہرے تھے، جہاں سرسید اس زمانے میں صدر الصدور تھے۔

سردیوں میں دھوپ اور آگ گرمیوں میں ٹٹی

ان کی روزانہ زندگی کے متعلق تفصیلی حالات معلوم نہیں ہو سکے مکاتیب سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کم از کم ایک وقت کا کھانا گھر میں کھاتے تھے اور یہ پابندی اس وقت تک نہ ٹوٹی جب تک ان میں چلنے پھرنے کی طاقت باقی رہی۔ متعدد خطوں میں مذکور ہے کہ سرما میں دھوپ تاپتے تھے اور گرمیوں میں خس کی ٹٹی لگا لیتے تھے۔ مثلاً ایک خط میں جو جاڑے کے موسم میں لکھا گیا۔ فرماتے ہیں:

دھوپ میں بیٹھا ہوں۔ یوسف علی خاں و لالہ ہیرا سنگھ بیٹھے ہیں۔ کھانا تیار ہے۔ خط لکھ کر بند کر کے آدمی کو دوں گا۔ اور میں گھر جاؤں گا۔ وہاں ایک دالان میں دھوپ آتی ہے اس میں بیٹھوں گا۔ ہاتھ منہ دھوؤں گا۔ ایک روٹی کا چھلکا سالن میں بھگو کر کھاؤں گا۔

دوسرے خط میں جو گرمیوں کے زمانے کا ہے۔ فرماتے ہیں:

کوٹھڑی میں بیٹھا ہوں۔ ٹٹی لگی ہوئی ہے۔ ہوا آ رہی ہے۔ پانی کا جھجر دھرا ہوا ہے حقہ پی رہا ہوں۔ یہ خط لکھ رہا ہوں۔

سردیوں میں آگ بھی تاپتے تھے۔ چنانچہ کئی خطوں میں اس کا بھی ذکر آیا ہے۔ مثلاً ایک خط میں فرماتے ہیں،

ہمارے پاس شراب آج کی اور ہے۔ کل سے رات کو نری انگیٹھی پر گزارا ہے۔ بوتل گلاس موقوف۔

قصص وحکایات کے مطالعہ کا شوق

غالب کو قصص وحکایات کی کتابیں پڑھنے کا شوق تھا۔ صاحب عالم مارہروی نے مارہرہ بلانے کی کوششیں کیں۔ ایک مرتبہ آموں کا لالچ دیا۔ پھر لکھا کہ مارہرہ تشریف لائیں گے تو اسکے "بوستانِ خیال" پڑھیں گے۔ اس کے جواب میں فرماتے ہیں،

حضرت نے میری گرفتاری کا نیا رنگ نکالا "بوستان خیال" کے دیکھنے کا دانہ ڈالا مجھ میں

اتنی طاقت پرواز کہاں کہ بلاسے اگر پھنس جاؤں، دام پر گر کے دانہ زمین سے اٹھالاؤں۔

میر مہدی مجروح کو ایک خط میں لکھتے ہیں :

مولانا غالب علیہ الرحمتہ ان دنوں بہت خوش ہیں، پچاس ساٹھ جز کی کتاب امیر حمزہ کی

داستان کی اور اس قدر حجم کی ایک جلد بوستان خیال کی ہاتھ آگئی ہے سترہ بوتلیں بادہ ناب

کی موجود ہیں۔ دن بھر کتاب دیکھا کرتے ہیں رات بھر شراب پیا کرتے ہیں :

کسے کایں مرادش میسر بود

اگر جم نہ باشد سکندر بود

غذا — خواجہ حالی لکھتے ہیں کہ غالب کی مرغوب غذا گوشت کے سوا کوئی چیز نہ تھی وہ ایک وقت بھی بغیر گوشت کے نہیں رہ سکتے تھے یہاں تک کہ مسہل کے دن بھی انہوں نے کھچڑی یا شولہ کبھی استعمال نہیں کیا۔ آخری عمر میں ان کی خوراک بہت کم رہ گئی تھی۔ جب وہ چلنے پھرنے سے بڑی حد تک معذور ہو چکے تھے تو گھر سے انکے لئے دن کو جو کھانا آتا تھا۔ اسمیں خواجہ حالی کے بیان کے مطابق مندرجہ ذیل چیزیں ہوتی تھیں۔

(۱) پاؤ سیر گوشت کا قورمہ، ایک پیالے میں بوٹیاں دوسرے میں شوربا۔

(۲) ایک پیالے میں پھلکے کا چھلکا شوربے میں ڈوبا ہوا۔

(۳) ایک پیالے میں کبھی کبھی ایک انڈے کی زردی۔

(۴) ایک پیالے میں دو تین پیسہ بھر دہی۔

(۵) شام کو کسی قدر شامی کباب یا سیخ کے کباب

وہ خود دسمبر ۱۸۶۶ء کے ایک خط میں اپنی غذا کے متعلق فرماتے ہیں :

صبح کو سات بادام کا شیرہ قند کے شربت کے ساتھ، دوپہر کو سیر بھر گوشت کا گاڑھا پانی

قریب شام کے کبھی کبھی تین تلے ہوئے کباب چھ گھڑی رات گئے پانچ روپے بھر

شراب خانہ ساز اور اسی قدر عرق شیر۔

دسمبر ۱۸۶۶ء کے ایک خط میں فرماتے ہیں:

غذا بہ اعتبار آرد و برنج مفقود۔ محض صبح کو بان سات بادام کا شیرہ بارہ بجے آب گوشت شام کو چار تلے ہوئے کباب، لیں آگے خدا کا نام۔

ناؤ نوش

عرق نوشی پر پردہ ڈالنا یا اس کے متعلق کوئی عذر تلاش کرنا بے سود ہے یہ علت ابتدائے شباب سے ان کو لگ چکی تھی۔ اور آخر دم تک نہ چھٹی۔ زیادہ تر ولائتی شراب پیتے تھے۔ جس کا نام ان کی اصطلاح میں "فرنچ" تھا۔ غدر کے بعد ولائتی شراب بہت گراں ہو گئی تھی۔ چنانچہ وہ بابو گوبند سہائے سے کاس ٹیلین اور اولڈ ٹام کا نرخ پوچھتے ہیں[1]۔ ایک خط میں فرماتے ہیں:

"لیکور ایک انگریزی شراب ہوتی ہے۔ قوام کی بہت لطیف اور رنگت کی بہت خوب اور طعم کی ایسی میٹھی، جیسا قند کا قوام پتلا۔"

خواجہ حالی لکھتے ہیں کہ شراب سوتے وقت پیتے تھے۔ جو مقدار مقرر کر لی تھی۔ اس سے زیادہ کبھی نہیں پیتے تھے۔ جس بکس میں بوتلیں رہتی تھیں اس کی کنجی داروغہ کے حوالے تھی۔ اور اس کو سخت تاکید تھی۔ کہ اگر عالم سرخوشی میں زیادہ پینے پر اصرار بھی ہو تو کنجی نہ دینا۔

نواب سر امیر الدین احمد خاں مرحوم فرمانروائے لوہارو سے معلوم ہوا کہ بوتلیں ان کے پاس دھری رہتی تھیں۔ نواب مرحوم بچپن میں اکثر غالب کے پاس جایا کرتے تھے۔ فرماتے تھے: والدہ محترمہ نے سخت تاکید کر رکھی تھی۔ کہ غالب کی بوتلوں کو کبھی ہاتھ نہ لگانا۔ یہ بھی فرماتے تھے۔ کہ شراب کی بوتلوں کے علاوہ نمکین بادام بھی ایک دو بوتلوں میں بھرے رہتے تھے۔ جنہیں گزک کے طور پر استعمال کرتے تھے۔

---

[1] اردوئے معلیٰ صفحہ ۲۰۵۔

شراب میں عرق شیر یا گلاب ملا کر پیتے تھے۔ خود ایک غزل کے مقطع میں کہتے ہیں :۔

آسودہ باد خاطر غالبؔ کہ خوے اوست

آمیختن بہ بادۂ صافی گلاب را

عرق نوشی کا التوا

یہ نہیں کہا جاسکتا کہ روزانہ شراب پیتے تھے یا کبھی کبھی بغیر پیئے بھی گزارا کر لیتے تھے۔ ممکن ہے۔ غدر کے بعد پنشن کی بندش کے زمانے میں بھی انہیں کسی وقت شراب نہ ملی ہو۔ خطوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۶۴ء میں انہوں نے ۲۲ جون سے لے کر ۱ جولائی تک شراب کلیتہً ملتوی رکھی[1]۔ اس کی وجہ خود بیان فرماتے ہیں :۔

انکم ٹیکس جدا، چوکیدار جدا، سود جدا، مول جدا، بی بی جدا، بچے جدا، شاگرد پیشہ جدا، آمد وہی ایک سو باسٹھ، تنگ آگیا۔ گزارا مشکل ہوگیا۔ روزمرہ کا کام بند رہنے لگا۔ سوچا کہ کیا کروں۔ کہاں سے گنجایش نکالوں۔ قہر درویش بر جان درویش۔ صبح کی تبرید متروک، چاشت کا گوشت آدھا، رات کی شراب و گلاب موقوف۔ بیس بائیس روپے مہینا بچا روزمرہ کا خرچ چلایا۔ یاروں نے پوچھا۔ تبرید و شراب کب تک نہ پیو گے۔ کہا گیا کہ جب تک وہ نہ پلائیں گے۔ پوچھا نہ پیو گے۔ تو کس طرح جیو گے۔ جواب دیا کہ جس طرح وہ جلائیں گے۔ بارے مہینہ پورا نہیں گزرا تھا۔ کہ رام پور سے علاوہ وجہ مقرری کے روپیہ آگیا۔ قرض متفرق ادا ہو گیا۔ متفرق رہا، خیر رہو۔ صبح کی تبرید، رات کی شراب جاری ہوگئی گوشت پورا آنے لگا۔ چونکہ بھائی (نواب امین الدین احمد خاں رئیس لوہارو) نے وجہ موقوفی و بحالی پوچھی تھی، ان کو یہ عبارت پڑھا دینا اور حمزہ خاں کو بعد سلام کہنا ع

اے بے خبر ز لذت شرب مدام ما

---

[1] اردوئے معلےٰ صفحہ ۳۳۳۔

دیکھا ہم کو یوں پلاتے ہیں۔

آموں کا شوق میووں میں سے انہیں انگور اور آم بے حد مرغوب تھے۔ آموں کی تعریف میں ان کی مثنوی بھی اُردو دیوان میں ہے۔ دوست دُور دُور سے انہیں آم بہ طور تحفہ بھیجتے تھے۔ خود بھی فرمایش بھیج کر منگاتے تھے۔ فارسی مکاتیب میں سب سے پہلا خط نواب اکبر علی خاں طبا طبائی متولی امام باڑہ ہوگلی کے نام ہے اس میں آم طلب کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

لختے شکم بندہ ام وقدرے ناتواں۔ ہم آرایش خواں جویم وہم آسایش جاں خرد دران داند کہ ایں ہر دو صفت بہ انبہ اندر است واہل کلکتہ را آنند کہ قلمروانبہ، ہوگلی بندر است۔

ایک غزل کے مقطع میں فرماتے ہیں:-

ہمہ گر میوۂ فردوس بہ خوانت باشد
غالبؔ آں انبۂ بنگالہ فراموش مباد

سیاحؔ نے بمبئی سے آم بھیجنے کا خیال ظاہر کیا تھا۔ اس کے جواب میں لکھتے ہیں:

آم مجھ کو بہت مرغوب ہیں۔ انگور سے کم عزیز نہیں۔ لیکن بمبئی اور سورت سے یہاں پہنچنے کی کیا صورت؟ مالدہ کا آم یہاں ولایتی اور پیوندی کر کے مشہور ہے اچھا ہوتا ہے کمال یہ ہے کہ وہاں بہت اچھا ہوگا۔ سورت سے دلی آم بھیجنا محض تکلّف ہے۔ روپے کے آم اور چار روپے محصُول ڈاک۔ پھر سو میں سے شاید دس پہنچیں۔ یہاں دیسی آم انواع واقسام کے بہت پاکیزہ اور لذیذ اور خوش بو، افراط سے ہیں، پیوندی آم بھی بہت ہیں رام پور سے نواب صاحب اپنے باغ کے آموں میں سے اکثر بہ سبیل ارمغان بھیجتے رہتے ہیں۔ اے لو آج بریلی سے ایک بہنگی ایک دوست کی بھیجی ہوئی آئی۔ دو ٹوکرے، ہر ٹوکرے میں سو آم۔ کلوداروغہ نے میرے دو نو ٹوکرے کھولے۔ دو سو میں سے تراسی آم اچھے نکلے۔ ایک سو سترہ بالکل سڑے ہوئے۔

انبہ خوری کا طریق | صاحب عالم مارہروی نے کسی سے سُنا تھا۔ کہ غالب مارہرہ آکر آم کھانے کے آرزو مند ہیں۔ انھوں نے محض دعوت نامہ ہی بھیجا بلکہ لکھا کہ مارہرہ آنے کی تاریخ سے مطلع فرمایئے۔ جواب میں لکھتے ہیں کسی وقت بہ طریق تمنا کہا گیا تھا کہ مارہرہ جا کر آم کھاؤں۔ مگر اب وہ دل اور طاقت کہاں سے لاؤں۔

نہار منہ میں آم نہ کھاتا تھا۔ کھانے کے بعد میں آم نہ کھاتا تھا۔ رات کو کچھ کھاتا ہی نہیں جو کہوں بین الطعامین۔ ہاں آخر روز بعد ہضم معدی آم کھانے بیٹھ جاتا تھا۔ بے تکلّف عرض کرتا ہوں اتنے آم کھاتا تھا۔ کہ دم پیٹ میں نہ سماتا تھا۔ اب بھی اسی وقت کھاتا ہوں مگر دس بارہ۔ اگر پیوندی آم بڑے ہوئے۔ تو پانچ سات۔

اسی طرح میر مہدی مجروح اور قاضی عبد الجمیل بریلوی کے نام کے خطوں میں آموں کے ہدیہ کا ذکر ہے[1]

تمباکو کشی | غالب حقہ بھی پیتے تھے چنانچہ دو تین جگہ خطوں میں اس کا ذکر موجود ہے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ رام پور کے سفر میں بھی حقہ ساتھ تھا۔

سوار ہو کر نکلتے تھے | اگرچہ عموماً تنگ دست رہے اور اسباب کو چھوڑ کر ان پر کشایش کا دور کبھی نہ آیا لیکن وضعداری کا یہ عالم تھا۔ کہ ہمیشہ سوار ہو کر نکلتے۔ غدر کے بعد جب ان کی پنشن بند تھی اور بے مقدوری انتہا کو پہنچی ہوئی تھی۔ اس زمانے میں بھی سواری کا سلسلہ بہ دستور قائم تھا۔ مثلاً کمشنر دہلی کی خواہش کے مطابق "دستنبو" کے نسخے ان کے پاس لے کر گئے تو سواری میں گئے۔ چنانچہ میر مجروح کے نام کے خط میں صاحب سے ملاقات کی کیفیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

میں نے کہا کتابیں حاضر ہیں۔ کہا منشی جیون لال کو دے جاؤ۔ وہ (صاحب) ادھر سوار

---

[1] اردوئے معلّٰے صفحہ ۱۵۶۔۱۶۷۔۱۷۱

ہوگئے۔ میں ادھر سوار ہو کر اپنے مکان پر آیا۔

ایک اور خط میں لکھتے ہیں:۔

مصیبت عظیم یہ ہے کہ قاری کا کنواں بند ہو گیا۔ لال ڈگی کے کنویں یک قلم کھاری ہو گئے خیر کھاری ہی پانی پیتے، اگرم پانی نکلتا ہے۔ پرسوں میں سوار ہو کر کنوؤں کا حال دریافت کرنے گیا تھا۔

اگر ان کے پاس سواری نہیں ہوتی تھی۔ تو کسی بے تکلف دوست کے ہاں سے منگا لیتے تھے۔ مثلاً ایک موقع پر نواب حسام الدین حیدر خاں کے ہاں سے پینس منگائی تھی۔[1]

قلعہ میں جانے کا وقت

قلعہ میں بھی سوار ہو کر جاتے تھے۔ صبح جا کر پہر دن چڑھے واپس آجاتے تھے۔ مکان پر دو چار آدمی برابر رہتے۔ ایک صاحب غالباً بریلی سے ملنے آئے تھے۔ غالب اس وقت مکان پر موجود نہ تھے۔ بعد میں انہیں معلوم ہوا۔ تو نہ مل سکنے پر افسوس اور معذرت کا خط قاضی عبدالجمیل بریلوی کو بھیجا۔ اس میں فرماتے ہیں:۔

صبح کو میں ہر روز قلعہ کو جاتا ہوں۔ ظاہرا مولوی صاحب اول روز آئے ہوں گے۔ جب سوار ہو جاتا ہوں۔ جب بھی دو چار آدمی مکان پر ہوتے ہیں۔ مولوی صاحب بیٹھتے۔ حقہ پیتے۔ اگر قلعہ جاتا ہوں۔ تو پہر دن چڑھے آتا ہوں۔

شیوہ عام کی پیروی سے نفرت

شیوۂ عام کی پیروی سے بہت متنفر تھے جس طرح فکر و نظر اور تخیّل میں ان کی راہ سب سے الگ تھی۔ اسی طرح زندگی کے عام اوضاع میں بھی رسم عوام کو پسندیدہ نہیں سمجھتے تھے۔ اس میں تصنع کا شائبہ تک نہ تھا بلکہ انکی طبیعت ہی ایسی تھی۔ حلیہ کے بیان میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ جب تک داڑھی میں سفید بال

---

[1] کلیات نثر فارسی صفحہ ۲۴۱

نہ آئے، منڈاتے رہے۔ جب داڑھی چھوڑ دی۔ تو دہلی کے شیوہ عام کے خلاف سر منڈا دیا۔

اس سلسلے میں لفافوں کا واقعہ بھی قابل ذکر ہے۔ غالب غدر کے دنوں میں تنگدست تھے۔ اور لفافے خرید نے کا مقدور نہ تھا۔ تو خود لفافے بنا لیتے تھے۔ منشی شیو نرائن آرام کو معلوم ہوا تو انہوں نے لفافے بھیج دیئے۔ جن پر سعادت مند شاگرد نے اُستاد کی سہولت کے لئے "از مقام"۔ "در مقام"۔ "تاریخ وماہ" وغیرہ الفاظ چھپوا دیئے تھے۔ غالب نے ان لفافوں کو دوستوں میں بانٹ دیا۔ منشی صاحب نے دوبارہ پیکٹ بھیجا۔ تو واپس کر دیا اور لکھا:۔

بھائی میں اپنے مزاج سے لاچار ہوں۔ یہ لفافے "از مقام" و"در مقام" و"تاریخ وماہ" مجھ کو پسند نہیں آئیں گے۔ جو تم نے بھیجے تھے۔ وہ بھی میں نے دوستوں میں بانٹ دیئے۔ اب یہ لفافوں کا لفافہ اس مراد سے بھیجتا ہوں۔ کہ ان کی عوض وہ لفافے جو "از مقام" اور "در مقام" سے خالی ہیں، جن میں تم اپنے خط بھیجا کرتے ہو، مجھ کو بھیج دو اور یہ لفافے اس کے عوض مجھ سے لے لو۔ اگر اس طرح کے لفافے نہ ہوں تو اس کی ضرورت نہیں۔

بیرنگ خطوط کا قاعدہ

غالب اکثر خطوط بیرنگ بھیجا کرتے تھے، خصوصاً اہم خطوں پر ٹکٹ لگانا منافی احتیاط تصور کرتے تھے اور اپنے دوستوں سے بھی یہی کہتے تھے کہ بیرنگ خط بھیجا کرو۔ مثلاً تفتہ کو لکھتے ہیں کہ بیرنگ خط بھیجو اس لئے کہ ڈاک والے ایسے خط جلد پہنچاتے ہیں۔

سیف الحق سیاح کو لکھتے ہیں:۔

بیدڑ خط گاہ گاہ تلف بھی ہو جاتا ہے۔ نظر اس بات پر تم کو بیرنگ خط بھیجتا ہوں۔ کہ ضائع نہ ہونے کا احتمال قوی رہے۔

چودھری عبدالغفور خاں سرور مارہروی کو لکھتے ہیں:۔

ایک قاعدہ آپ کو بتاتا ہوں۔ اگر اس کو منظور کیجئے گا تو خطوط کے نہ پہنچنے کا احتمال اُٹھ جائے گا

اور رجسٹری کا در دسر جاتا رہے گا۔ آدھا آنہ نہ سہی ایک آنہ سہی۔ آپ بھی خط بیرنگ بھیجا کیجئے۔
اور میں بھی بیرنگ بھیجا کروں۔ بیرنگ خطوط تلف ہو جاتے ہیں۔ اس قاعدے کا جیسا کہ میں
واضع ہوا ہوں بادی (شروع کرنے والا) بھی ہوا اور یہ خط بیرنگ بھیجا۔

شہرت وناموری کا احساس

بڑے عالی حوصلہ تھے لیکن اپنی شہرت وناموری کا انہیں بہت خیال تھا۔ اور ان کی یہ حس بے حد تیز تھی۔ اگر کوئی شخص ان کے مکان کا پتہ پوچھتا یا خط پر پتہ درج کرنے میں زیادہ تفصیلات سے کام لیتا تو فوراً دل میں کھٹک پیدا ہو جاتی، کہ شاید انہیں گمنام اور کم مشہور آدمی سمجھ لیا گیا ہے۔ خطوں میں ایسی مثالیں موجود ہیں۔ مثلاً ایک جگہ فرماتے ہیں :۔

میں گمنام آدمی ہوں۔ مگر فارسی انگریزی جو خط میرے نام کے آتے ہیں۔ تلف نہیں ہوتے بعض فارسی خطوں پر محلے کا پتہ نہیں ہوتا۔ اور انگریزی خطوں پر تو ہوتا ہی نہیں، صرف شہر کا نام ہوتا ہے۔

ایک اور خط میں لکھتے ہیں :۔

میرے نام کا لفافہ جس شہر سے چلے، اسی شہر کے ڈاک گھر میں رہ جائے تو رہ جائے۔ ورنہ دلّی کے ڈاک خانہ میں پہنچ کر کیا امکان ہے کہ تلف ہو۔

نواب علاء الدین احمد خاں نے مکان کا پتہ پوچھا۔ تو فرمایا :۔

قسم شرعی کھا کر کہتا ہوں، کہ ایک شخص ہے کہ اس کی عزت اور نام آوری جمہور کے نزدیک ثابت و متحقق ہے۔ اور تم جانتے بھی ہو مگر جب تک اس سے قطع نظر نہ کرو۔ اور اس مسخرے کو گمنام و ذلیل نہ سمجھ لو تمہیں چین نہ آئے گا۔ پچاس برس سے دلّی میں رہتا ہوں۔ ہزارہا خط اطراف وجوانب سے آتے ہیں۔ بہت لوگ ایسے ہیں کہ محلہ نہیں لکھتے ہیں۔ بہت لوگ ایسے ہیں کہ محلہ سابق کا نام لکھ دیتے ہیں۔ حکام کے خطوط فارسی و انگریزی، یہاں تک کہ ولایت کے آئے ہوئے، صرف شہر کا نام اور میرا نام، یہ

سب مراتب تم جانتے ہو اور ان خطوط کو دیکھ چکے ہو اور پھر مجھ سے پوچھتے ہو۔ اپنا مسکن بتا
اگر میں تمہارے نزدیک امیر نہیں، نہ سہی، اہل حرفہ سے بھی نہیں ہوں کہ جب تک محلہ
اور تھانہ نہ لکھا جائے، ہرکارہ میرا پتہ نہ پائے۔ آپ صرف دلی لکھ کر میرا نام لکھ دیا کیجے۔
خط کے پہنچنے کا میں ضامن۔

مذہب | غالب کی تحریرات میں شیعیت کی جھلک نمایاں ہے۔ اور بلاشبہ ان کا میلان تشیع کی طرف تھا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ شیعیت تفضیل تک محدود تھی۔ ان کا خاندان جس حد تک میں معلوم کر سکا ہوں سُنّی تھا، سسرال کے خاندان میں بھی کوئی شیعہ نہ تھا، میرا خیال ہے، کہ شیعیت ان کی "ایرانیت" سے پیدا ہوئی۔ فارسی زبان کے متعلق بھی ان کی روش وہی تھی جس پر بعد میں اہل ایران شدت و غلو کے ساتھ کاربند ہوئے یعنی عربیت سے بُعد۔ اسی چیز نے غالب میں ایرانیت کے ساتھ خاص شیفتگی پیدا کر دی اور غالباً اسی شیفتگی کا نتیجہ تھا۔ کہ ان کے مذہبی معتقدات بھی ایرانی رنگ میں رنگے گئے۔ ممکن ہے۔ ملا عبد الصمد کی صحبت نے ان کے مذہبی افکار و امیال پر یہ اثر ڈالا ہو یا ممکن ہے نجف خاں کے عہد اقتدار میں ان کے خاندان نے شیعیت اختیار کر لی ہو۔

تصوف | تصوف سے انہیں خاص مناسبت تھی۔ خواجہ حالی کے قول کے مطابق وہ بظاہر اہل حال سے نہ تھے۔ لیکن عرفا اور صوفیا کے کلام سے پوری طرح واقف اور توحید وجودی یا بہ اصطلاح عام وحدت الوجود کے قائل تھے۔ خواجہ مرحوم نے بالکل درست لکھا ہے کہ توحید وجودی ان کی شاعری کا خاص عنصر بن گئی تھی اس مضمون کو انہوں نے جس قدر اصناف سخن میں بیان کیا ہے۔ غالباً نظیری اور بیدل کے بعد کسی نے بیان نہیں کیا۔

وہ خود فرماتے ہیں:۔

یہاں لاموجود الا اللہ کے بادہ ناب کا رطل گراں چڑھائے ہوئے اور کفر و اسلام اور

نور و نار کو مٹائے ہوئے بیٹھے ہیں سے

کجا غیر و کو غیر و کو نقش غیر

سوی اللہ و اللہ مافی الوجود

ایک اور خط میں لکھتے ہیں :-

در ہبر کے بنیوں کے لونڈوں کو پڑھا کر مولوی مشہور ہونا اور مسائل ابو حنیفہ کو دیکھنا .... اور ہے اور عرفا کے کلام سے حقیقت حقہ وحدت وجود کو اپنے دل نشین کرنا اور ہے۔ مشرک وہ ہیں جو وجود کو واجب و ممکن میں مشترک جانتے ہیں۔ مشرک وہ ہیں جو مسیلمہ کو نبوت میں ختم المرسلین کا شریک گردانتے ہیں .... دوزخ ان لوگوں کے واسطے ہے۔ میں موحد خالص اور مومن کامل ہوں زبان سے لا الٰہ الا اللہ کہتا ہوں اور دل میں لا موجود الا اللہ اور لا موثر فی الوجود الا اللہ سمجھے ہوئے ہوں۔ انبیاء سب واجب التعظیم اور اپنے وقت میں سب مفروض الطاعت۔ محمد علیہ السلام پر نبوت ختم ہوئی۔ یہ ختم المرسلین اور رحمۃ للعالمین ہیں۔ مقطع نبوت کا مطلع امامت اور امامت نہ اجماعی، بلکہ من اللہ ہے اور امام من اللہ علی علیہ السلام ہے ثم حسن ثم حسین تا مہدی موعود علیہ السلام ع

بریں زیستم ہم بریں بگذرم

ہاں اتنی بات اور ہے کہ اباحت و زندقہ کو مردود، شراب کو حرام اور اپنے کو عاصی سمجھتا ہوں۔ اگر مجھ کو دوزخ میں ڈالیں گے تو میرا جلانا مقصود نہ ہوگا بلکہ میں دوزخ کا ایندھن ہوں گا اور دوزخ کی آگ کو تیز کر دوں گا۔ تاکہ مشرکین و منکرین نبوت مصطفوی و امامت مرتضوی اس میں جلیں۔

مسلمان سے محبت

اگرچہ عمل کے اعتبار سے متقی اور پرہیزگار نہ تھے بلکہ خاص اسلامی عبادات کے بھی پابند نہ تھے لیکن اسلام و مسلمین سے انہیں بدرجہ غایت محبت تھی

اور مسلمانوں کی ذرا سی ذلت پر بھی تڑپ اُٹھتے تھے۔ خواجہ حالی فرماتے ہیں ایک مرتبہ خود غالب نے کہا،

مجھ میں کوئی بات مسلمانی کی نہیں پھر میں نہیں جانتا کہ مسلمانوں کی ذلت پر مجھ کو کیوں اس قدر رنج و تاسف ہوتا ہے۔

تعصبات سے بالکل پاک تھے حد درجہ صلح کل اور تعصب سے بالکل پاک تھے۔ ہندوؤں مسلمانوں سب کے ساتھ ان کے گہرے تعلقات تھے۔ کوئی شخص نہیں کہہ سکتا کہ تفتہ یا منشی بہاری لال یا منشی شیو نرائن یا ہیرا سنگھ اور جواہر سنگھ یا ان کے والد رائے چھجمل کے ساتھ انہیں مسلمان شاگردوں یا دوستوں سے کم محبت تھی وہ ایک خط میں لکھتے ہیں،

میں تو بنی آدم کو، مسلمان ہو یا ہندو یا نصرانی، عزیز رکھتا ہوں اور اپنا بھائی گنتا ہوں۔ دوسرا مانے یا نہ مانے۔ باقی رہی وہ عزیزداری جس کو اہل دنیا قرابت کہتے ہیں اس کو قوم اور ذات اور مذہب اور طریق شرط ہے اور اس کے مراتب و مدارج ہیں۔

لباس لباس کے متعلق خطوط و تحریرات سے تحقیقی طور پر کچھ معلوم نہیں ہوسکا۔ تصاویر سے ظاہر ہوتا ہے کہ کھلا پاجامہ لمبا چغہ اور پوست کی کلاہ پہنتے تھے۔ ایک مرتبہ ٹوپی خراب ہو گئی تھی تو سر کے لئے پشاوری لنگی بھی منگائی تھی۔ منشی جواہر سنگھ کو لکھتے ہیں:۔

کلہے از پوست برہ داشتم آں را کرم خوردو سرم بے کلاہ ماند۔ اگرچہ کلہ نے جویم لنگ ابریشمی چنانکہ در پشاور و ملتان سازند و اعیان آں قلمرو بر سر پیچند مے خواہم، اما لنگے کہ رنگہائے شوخ نہ داشتہ باشد و حاشیہ سرخ نبود۔ معہذا ابروازہائے نازک و طراز ہائے نغز داشتہ باشد و تارہائے زر و سیم را در آں صرف نہ کردہ باشند۔

پھر ایک اُردو خط میں لکھتے ہیں:۔

کیوں صاحب وہ ہماری لنگی اب تک کیوں نہیں آئی؟ بہت دن ہوئے جب تم نے لکھا تھا کہ اسی ہفتے بھیجوں گا۔

صفیر بلگرامی نے آخری دور کا لباس یہ لکھا ہے: پاجامہ سیاہ بوٹے دار دلیس کا کلی دار نیفہ سُرخ ٹول کا، بدن میں مرزائی۔

جانوروں کا شوق

یہ نہیں کہا جاسکتا کہ غالب کو جانور پالنے کا بہت شوق تھا یا نہیں لیکن ان کے گھر میں مختلف قسم کے جانور ضرور رہتے تھے۔ مثلاً طوطا تھا جس کے متعلق یادگار غالب میں ایک لطیفہ بھی درج ہے کہ "میاں مٹھو تمہارے نہ جورو نہ بچے تم کس فکر میں سر جھکائے بیٹھے ہو" رام پور سے جو خط لکھے گئے ان میں سے ایک میں ذکر ہے کہ باقر علی خاں اور حسین علی خاں رام پور سے "مرغ" لے کر دھلی روانہ ہوئے۔ ایک مرتبہ نواب امین الدین احمد خاں والی لوہارو سے برسات کے لئے مکان مستعار مانگا تھا۔ بعد ازاں اس میں منتقل ہونے کا ارادہ ترک کر دیا۔ اس سلسلے میں نواب صاحب موصوف کو جو خط لکھا اس میں مور، کبوتر، دُنبہ، بکری اور گھوڑوں کا ذکر ہے[1]۔ کلیات نظم فارسی میں ایک قطعہ بلّی کی تعریف میں ہے:

دارم بہ جہاں گربہ پاکیزہ نہادے	کز بال پری زاد بود موج رم او
سرمست ادا چوں بہ زمیں باز خرامد	از خاک دمد غنچہ نقش قدم او
چوں صورت آئینہ ز افراط لطافت	آید بہ نظر بچۂ او از شکم او
ہر شیر ژیانے کہ بہ بینی بہ نیستاں	دارد سر دریوزۂ غرش ز دم او
گر جانورے مردہ رابینہ سرراہے	از پاکی طینت نخورد غیر غم او

---

[1] اردوئے مُعلّےٰ صفحہ ۳۴۰

هر بچه که کنجشک بوے باز سپارد — در پرورشش او نخورد جز قسم او

آرے بود از غیرتِ اندازِ خرامش — بر کبک و تذرو است اگر خود ستم او

رخشنده ادیم تنش از لطف زبانش — گوئی به اثر تاب سهیل است نم او

جوش گل و بالیدگی موجهٔ رنگ است — دُم لابه کناں آمدن و جنبش دم او

در عربده چوں بشکند و دم باز کشاید — لرزد شکن طرهٔ خوباں ز خم او

تا مهره کش صفحهٔ افلاک بود مهر
بادا کف دست من و پشت شکم او

چودھواں باب

تصانیف

نہ رنجم گر بہ صورت از گدایاں بودہ ام غالبؔ،
بہ دارالملک معنی مے کنم فرماں روائیہا

متداول تصانیف غالبؔ کی تصانیف بہ صورت موجودہ حسب ذیل ہیں:

(۱) "کلیات نظم فارسی": اس میں قطعات، ترکیب بند، ترجیع بند، ترجیع بند، نوحہ جات، مثنویاں، قصائد، غزلیات اور رباعیات شامل ہیں۔

(۲) "کلیات نثر فارسی": پنج آہنگ، مہر نیم روز اور دستنبو پر مشتمل ہے۔

(۳) "دیوان اردو": اس کے مختلف ایڈیشن اور نسخے مروج ہیں۔

(۴) "اردوئے معلّٰے": اس کے بھی مختلف ایڈیشن ملتے ہیں۔

(۵) "عودِ ہندی": اس میں نامۂ غالبؔ بھی شامل ہے۔

(۶) "سبد چیں": یہ غالبؔ کے اس فارسی کلام کا مختصر سا مجموعہ ہے جو کلیات فارسی میں شامل نہ ہو سکا، یا اس کے بعد لکھا گیا۔ غالبؔ کی وفات کے بعد اس کا کوئی ایڈیشن نہ نکل سکا اور کتاب بالکل کمیاب ہو گئی تھی، حال میں اس کا نیا ایڈیشن شائع ہو گیا ہے۔

(۷) "مکاتیب غالبؔ" نواب یوسف علی خاں مرحوم اور نواب کلب علی خاں مرحوم فرمانروایان رام پور کے نام غالبؔ نے جتنے خطوط لکھے تھے وہ سب مولانا امتیاز علی صاحب عرشیؔ نے مرتب فرما کر شائع کر دیئے ہیں۔ اس مجموعہ کیلئے فاضل مرتب نے ایک بسوط مقدمہ لکھا اور تمام مکاتیب پر نہایت عمدہ حواشی تحریر فرمائے بلکہ فرمانروایان رام پور کے متعلقہ مکاتیب کی عبارتیں بھی جا بجا درج کر دیں۔

(۸) "نادر خطوط غالبؔ": غالبؔ کے ۲۷ مکاتیب کا مجموعہ ہے جو سید کرامت حسین صاحب کرامت ہمدانی بہاری، حضرت صفیر بلگرامی اور حضرت صوفی منیری بہاری کو لکھے گئے یہ مجموعہ سید کرامت حسین کے پوتے سید اسمٰعیل صاحب ساگیاوی نے شائع کیا ہے۔

کمیاب تصانیف | جو تصانیف آج کل بہت کمیاب ہیں اور غالبؔ کی وفات کے بعد دوبارہ شائع نہیں ہوئیں۔ ان کی تفصیل یہ ہے۔

(۱) قاطع برہان:۔ یہ غالبؔ کی زندگی ہی میں دوسری بار "درفش کاویانی" کے نام سے چھپ گئی تھی۔

(۲) تیغ تیز:۔ اس میں "قاطع برہان" پر بعض اعتراضات کے جوابات دیئے گئے تھے۔

(۳) نکات و رقعات غالبؔ:۔ اس میں فارسی زبان کے چند اصولی قواعد سہل اردو زبان میں بیان کئے گئے تھے اور آخر میں "پنج آہنگ" سے پندرہ فارسی مکاتیب شامل کر دیئے گئے تھے۔

(۴) مثنوی ابر گہر بار:۔ یہ مثنوی بہ حالت موجودہ کلیات نظم فارسی میں شامل ہے۔ لیکن اس کا ایک الگ نسخہ بھی کلیات کی اشاعت کے بعد ۱۲۸۰ھ میں چھپا تھا جس میں غالبؔ کے چند فارسی قصیدے قطعات اور رباعیات بھی شامل تھیں۔

(۵) قادر نامہ:۔ اس کتاب کا ایک نسخہ جو ۱۸۷۳ء کا چھپا ہوا پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں موجود ہے۔ پبلشر کا دعوٰی ہے کہ یہ کتاب غالبؔ کی تصنیف ہے۔

لیکن مجھے اس میں کلام ہے[1] یہ "خالق باری" کے رنگ میں بچوں کے نصاب کی کتاب ہے، جس میں سہولت حفظ کے لئے مترادف الفاظ نظم کر دیئے گئے ہیں۔ پہلا شعر یہ ہے:۔

قادر اللہ اور یزداں ہے خدا
ہے نبی مرسل پیمبر رہنما

اس کا نام "قادر نامہ" اس وجہ سے رکھا گیا کہ پہلے شعر کا پہلا لفظ "قادر" ہے۔

(۶) گل رعنا۔ غالب نے اپنے عزیز دوست مولوی سراج الدین احمد کی فرمایش پر اپنے اُردو اور فارسی کلام کا ایک منتخب مجموعہ اس نام سے مرتب کیا تھا اور اس کے دیباچہ اور خاتمہ کی نثریں فارسی میں لکھی تھیں جو کلیات نثر فارسی میں موجود ہیں۔ لیکن میں جس حد تک معلوم کر سکا ہوں یہ مجموعہ کبھی شائع نہیں ہوا۔ مولانا حسرت موہانی فرماتے ہیں کہ اس کا صرف ایک حصہ ان کے پاس ہے۔

(۷) انتخاب دیوان اُردو، یہ انتخاب نواب کلب علی خاں مرحوم کے ارشاد کے مطابق غالب نے ستمبر ۱۸۶۶ء میں کیا تھا۔

(۸) انتخاب دیوان فارسی، یہ انتخاب بھی ستمبر ۱۸۶۶ء ہی میں نواب کلب علی خاں مرحوم کی خواہش کے مطابق ہوا تھا۔

دونوں انتخاب رامپور کے شاہی کتب خانہ میں موجود تھے اعلحضرت فرمانروائے رامپور اور ان کے وزیر اعظم کی علم دوستی کی برکت سے مولانا سید امتیاز علی صاحب

[1] مولانا عبدالحق صاحب سکریٹری انجمن ترقی اُردو نے میر فضل علی عرف میرن صاحب کے حوالے سے بیان فرمایا ہے کہ قادر نامہ غالب نے باقر علی خاں اور حسین علی خاں کی تعلیم کیلئے لکھا تھا۔ مالک رام صاحب مؤلف ذکر غالب فرماتے ہیں کہ اس میں بعض ایسی شہادتیں ہیں جن سے یہ واقعی غالب کی تصنیف ثابت ہوتا ہے میں ان داخلی شہادتوں سے آگاہ نہیں ہو سکا۔

عرشی کے زیر اہتمام چھپ گئے ہیں۔

غالب کی اُردو اور فارسی تحریرات میں اُردو دیوان کلیات نظم فارسی پنج آہنگ اور مہر نیمروز کے حالات کم ملتے ہیں "قاطع برہان" اور "دستنبو" کے حالات زیادہ ملتے ہیں بہر حال جو کچھ معلوم ہو سکا یہاں درج کیا جاتا ہے۔

کلام کی فراہمی

معلوم ہوتا ہے کہ نظم و نثر خود ان کے پاس کبھی جمع نہیں ہوئی بعض دوستوں اور نیاز مندوں نے ان کی تحریرات کے جمع کرنے کا اہتمام کیا تھا جن میں نواب ضیاالدین احمد خاں نیر رئیس لوہارو اور ذوالفقار الدین حیدر عرف حسین مرزا خاص طور پر قابل ذکر ہیں نیر نے غدر سے قبل غالب کی سب تحریرات اہتمام کے ساتھ جمع کر کے انکی پر تکلف جلدیں بندھوالی تھیں، لیکن یہ مجموعے غدر میں لُٹ گئے۔ غالب منشی شیو نرائن اکبر آبادی کو لکھتے ہیں :۔

ضیاء الدین خاں جاگیر دار لوہارو میرے بھتیجے بھائی اور میرے شاگرد رشید ہیں نظم و نثر میں نے جو کچھ لکھا انہوں نے لے لیا اور جمع کیا چنانچہ کلیات نظم فارسی جو ۵۵ پچپن جزو اور پنج آہنگ اور مہر نیمروز اور دیوان ریختہ سب مل کر سو سو اسو جزو مطلّا اور مذہب اور انگریزی ابری کی جلدیں کوئی ڈیڑھ سو اور سو روپے کے صرف میں بنوائیں میری خاطر جمع کہ میرا کلام سب یکجا فراہم ہے۔ پھر ایک شہزادہ نے اس مجموعہ نظم و نثر کی نقل کی، اب دو جگہ میرا کلام اکٹھا ہوا۔ کہاں سے یہ فتنہ (غدر) برپا ہوا اور شہر لٹے وہ دونوں جگہ کا کتاب خانہ خوان یغما ہو گیا ہر چند میں نے آدمی دوڑائے کہیں سے ان میں سے کوئی کتاب ہاتھ نہ آئی، وہ سب قلمی ہیں غرض اس تحریر سے یہ ہے کہ قلمی فارسی کا کلیات قلمی ہندی کا کلیات قلمی پنج آہنگ قلمی مہر نیمروز اگر ان میں سے کوئی نسخہ بکتا ہوا نظر آئے تو اس کو میرے واسطے خرید کر لینا اور مجھ کو اطلاع کرنا میں قیمت بھیج کر منگالوں گا۔

یہ جنوری ۱۸۵۹ء کا مکتوب ہے اپریل ۱۸۵۹ء کے ایک مکتوب میں فرماتے ہیں :۔

اُردو کے دیوان کے چھاپے ناقص ہیں۔ بہت غزلیں اس میں نہیں ہیں قلمی دیوان جو تم دا کمل تھے وہ لٹ گئے۔ یہاں سب کو کہہ رکھا ہے کہ جہاں بکتا ہوا نظر آئے لے لو۔ تم کو بھی لکھ بھیجا۔

بہ ہر حال ان اقتباسات سے ظاہر ہے کہ :

(۱) غالب کی تحریرات ان کے پاس جمع نہیں تھیں۔

(۲) جو کچھ مختلف دوستوں بالخصوص نواب ضیاء الدین احمد خاں کے پاس جمع تھا۔ وہ تمام تر غدر میں لٹ گیا۔

غدر کے بعد جو کچھ جمع کر کے چھاپا گیا، اس میں بے شبہ انتہائی اہتمام کیا گیا ہو گا کہ کوئی چیز باہر نہ رہ جائے۔ لیکن حصر و احاطہ کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا۔ غالب کی شائع شدہ تحریرات میں اگرچہ کوئی ایسی شہادت نہیں ملتی جس سے ثابت ہو کہ بعض چیزیں چھپنے سے رہ گئیں، لیکن ان کا جو غیر مطبوعہ کلام (نسخہ حمیدیہ کے علاوہ) متفرق طور پر وفات کے بعد شائع ہوا، اس کا خاصا حصہ غدر سے پیشتر کا معلوم ہوتا ہے البتہ یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ کلام فراہم نہ ہو سکا۔ یا غالب نے اسے ناقابل اشاعت سمجھ کر قلم انداز کر دیا۔

اُردو دیوان تصانیف میں ہم سب سے پہلے اُردو دیوان کو لیتے ہیں جو غالب کی شہرت و عظمت کا مدار ہے اگرچہ وہ خود اس کو یا اردو کلام کو اپنے خداداد کمالات کا صحیح مظہر نہیں جانتے تھے بلکہ باعث ننگ گردانتے تھے۔[۱]

اپریل ۱۸۵۹ء کے جس مکتوب کا حوالہ اوپر دیا جا چکا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس سے پیشتر غالب کا اُردو دیوان ایک سے زیادہ مرتبہ چھپ چکا تھا۔ مثلاً،

ایک قطعہ میں فرماتے ہیں جس میں خطاب ذوق سے ہے۔

راست مے گویم و لے از راست سر نتواں کشید ہر چہ در گفتار فخر تست آں ننگ من است

فارسی بیں تا بہ بینی نقشہائے رنگ رنگ بگزر از مجموعہ اُردو کہ بیرنگ من است

پہلی بار ۱۲۵۷ھ (۱۸۴۲-۴۳ء) میں چھپا تھا جس کے آخر میں نواب ضیاء الدین احمد خاں کی تقریظ تھی۔ اس دیوان میں کل ۱۰۷۲ اشعر تھے۔ دوسرا ایڈیشن ۱۲۷۱ھ (۱۸۵۵ء) میں چھپا اس نسخہ میں ۷۹۳ اشعر تھے۔ اس کی ترتیب کلیات فارسی کی موجودہ ترتیب سے مشابہ تھی۔ یعنی ابتدا میں قطعات پھر مثنوی پھر قصائد بعد میں غزلیں اور آخر میں رباعیات۔

۱۸۶۰ء میں دیوان کا نیا ایڈیشن چھاپنے کا خیال پیدا ہوا۔ مئی ۱۸۵۷ء میں اپنے اردو دیوان کا ایک نسخہ خوشخط لکھوا کر نواب یوسف علی خاں والی رام پور کے لئے بھیجا تھا جنوری ۱۸۶۰ء میں رام پور گئے تو اس کی ایک نقل لے کر نواب ضیاء الدین خاں کی فرمایش کے مطابق ان کے پاس ارسال کر دی۔ رام پور ہی میں تھے کہ عظیم الدین میرٹھی نے اردو دیوان کے چھاپنے کی اجازت کے لئے خط لکھا۔ واپسی پر وہ میرٹھ پہنچے۔ تو منشی ممتاز علی خاں صاحب جو غالب کے عزیز دوست تھے عظیم الدین کے سفارشی بن گئے اور نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ نے کاپیاں دیکھنے کا ذمہ اٹھا لیا۔ غالب راضی ہو گئے اور دلی پہنچ کر نواب ضیاء الدین احمد خاں والا قلمی نسخہ نواب مصطفےٰ خاں کے پاس میرٹھ بھیج دیا۔ عظیم الدین نے دیوان کا چھاپا ابھی شروع نہیں کیا تھا کہ منشی شو نرائن صاحب اکبر آبادی نے دیوان کے لئے اصرار و ابرام کیا اور کہا کہ بڑے اہتمام سے اسے اپنے مطبع میں چھاپوں گا۔ غالب نے تقاضا کر کے دیوان عظیم الدین سے واپس لیا۔ اور منشی شیو نرائن کے پاس آگرہ بھیج دیا۔ وہاں بھی اس کی اشاعت میں تاخیر ہوئی تو دلّی میں محمد حسین خاں کے مطبع احمدی واقع شاہدرہ میں دیوان چھپوا لیا۔

میرٹھ میں طباعت کا اہتمام	یہ سب مدارج خود غالب نے مختلف خطوں میں بیان

لے ان میں سے کوئی ایڈیشن میری نظر سے نہیں گزرا ان کے متعلق جو کچھ لکھا گیا وہ دوسروں کے بیان پہ مبنی ہے۔

کئے ہیں مثلاً وہ منشی شیو نرائن کو لکھتے ہیں :۔

میں رام پور میں تھا کہ ایک خط پہنچا۔ سرنامہ پر لکھا تھا "عرضداشت عظیم الدین احمد من مقام میرٹھ" واللہ باللہ اگر میں جانتا ہوں کہ عظیم الدین کون ہے اور کیا پیشہ رکھتا ہے۔ معلوم ہوا کہ ہندی دیوان اپنی سوداگری اور فائدہ اٹھانے کے واسطے چھاپا چاہتے ہیں۔ خیر چپ رہا۔ جب رام پور سے میرٹھ آیا، بھائی مصطفےٰ خاں صاحب کے ہاں اترا۔ وہاں منشی ممتاز علی صاحب میرے دوست قدیم مجھ کو ملے انہوں نے کہا کہ اپنا اردو کا دیوان مجھ کو نہ بھیج دیجئے گا۔ عظیم الدین ایک کتب فروش اس کو چھاپا چاہتا ہے۔ اب تم سنو دیوان ریختہ اتم و اکمل کہاں تھا۔ ہاں میں نے غدر سے پہلے لکھوا کر نواب یوسف علی خاں بہادر کو رام پور بھیج دیا تھا۔ اب جو میں دلی سے رام پور جانے لگا۔ تو بھائی ضیاء الدین نے مجھ کو تاکید کر دی تھی کہ تم نواب صاحب کی سرکار سے دیوان لے کر اس کو کسی کاتب سے لکھوا کر مجھ کو بھیج دینا۔ میں نے رام پور میں کاتب سے لکھوا کر بسبیل ڈاک ضیاء الدین خاں کو دلی بھیج دیا تھا۔ آمدم بر سر مدعائے سابق۔ اب جو منشی ممتاز علی صاحب نے مجھ سے کہا تو مجھے یہی کہتے بن آئی کہ اچھا دیوان تو میں ضیاء الدین احمد خاں سے لے کر بھیج دوں گا۔ مگر کاپی کی تصحیح کا ذمہ کون کرتا ہے، نواب مصطفےٰ خاں نے کہا کہ میں۔ اب کہو میں کیا کرتا۔ دلی آکر ضیاء الدین احمد خاں سے دیوان لے کر ایک آدمی کے ہاتھ نواب مصطفےٰ خاں کے پاس بھیج دیا۔ اگر میں اپنی خواہش سے چھپواتا تو اپنے گھر کا مطبع (یعنی مطبع منشی شیو نرائن) چھوڑ کر پرائے چھاپے خانے میں کتاب کیوں بھجواتا۔ آج اسی وقت میں نے تم کو خط لکھا اور اسی وقت بھائی مصطفےٰ خاں کو ایک خط بھیجا ہے۔ ان کو لکھا ہے کہ اگر چھاپا شروع نہ ہوا ہو تو نہ چھاپا جائے، اور دیوان جلد بھیج جائے۔ اگر دیوان آگیا تو فوراً تمہارے پاس بھیج دوں گا۔ اگر وہاں کاپی شروع ہو گئی ہے تو ناچار ہوں۔

مسودہ کی واپسی پر اصرار

بہر حال دیوان اواخر مارچ یا اوائل اپریل ۱۸۶۰ء میں میرٹھ بھیجا گیا ہو گا، اس لئے کہ غالب مارچ ۱۸۶۰ء ہی میں رام پور سے واپس آئے تھے منشی شیو نرائن کے خط کے بعد دیوان کی واپسی کا تقاضا شروع کیا۔ ۱۱ جون ۱۸۶۰ء کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک دیوان واپس نہیں ملا تھا۔ سیف الحق سیاح کو لکھتے ہیں :

دیوان کا چھاپا کیسا۔ وہ شخص ناآشنا موسوم بہ عظیم الدین جس نے مجھ سے دیوان منگا بھیجا آدمی نہیں ہے، بھوت ہے، پلید ہے، غول ہے، قصہ مختصر سخت نامعقول ہے۔ مجھ کو اس کے طور پر انطباع دیوان نامطبوع ہے۔ اب میں اس سے دیوان مانگتا ہوں۔ وہ نہیں دیتا۔ خدا کرے ہاتھ آجائے۔ تم بھی دعا مانگو۔

مسودہ آگرہ بھیجا گیا

۳۰ جون ۱۸۶۰ء کے ایک خط میں سیاح ہی کو لکھتے ہیں :-

میں بہت خوشی سے تم کو اطلاع دیتا ہوں کہ اُردو کا دیوان غاصب ناانصاف سے ہاتھ آگیا اور میں نے نور چشم منشی شیو نرائن کو بھیج دیا۔ یقین کلی ہے کہ وہ چھاپیں گے۔ جہاں تم ہو گے ایک نسخہ تم کو پہنچ جائے گا

دیوان منشی شیو نرائن کے پاس پہنچا تو انہوں نے غالباً لکھا کہ یہ مکمل نہیں ہے۔ غالب فرماتے ہیں :-

میاں تمہاری باتوں پر ہنسی آتی ہے۔ یہ دیوان جو میں نے تم کو بھیجا ہے اتم و اکمل ہے وہ اور کون سی دو چار غزلیں ہیں جو مرزا یوسف علی خاں عزیز کے پاس ہیں اور اس دیوان میں نہیں ہیں؟ اس طرف سے آپ اپنی خاطر جمع رکھیں کہ کوئی مصرع میرا اس دیوان سے باہر نہیں۔

دہلی میں طباعت

لیکن جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے منشی شیو نرائن کی طرف سے بھی طباعت میں کافی دیر ہو گئی۔ مجبور ہو کر غالب نے دیوان دہلی میں چھپوا لیا۔ وہ

۱۰ر جنوری ۱۸۶۲ء کے ایک خط میں منشی شیونرائن صاحب کو لکھتے ہیں :۔

دلی میں ہندی دیوان کا چھپنا پہلے اس سے شروع ہوا ہے کہ حکیم احسن اللہ خاں تمہارا بھیجا ہوا فرمہ مجھے دیں اور وہ جو میں نے یہاں کے مطبع میں چھاپنے کی اجازت دی تھی یہ سمجھ کر دی تھی کہ اب تمہارا ارادہ اس کے چھاپنے کا نہیں۔ غور کرو میرٹھ کے چھاپے خانے والے محمد عظیم (عظیم الدین) نے کس عجز و الحاح سے دیوان لیا تھا اور میں نے نظر تمہاری خوشی پر بہ جبر اس سے پھیر لیا۔ یہ کیوں کر ہو سکتا تھا کہ اور کو چھاپنے کی اجازت دوں۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ منشی شیونرائن صاحب بھی طباعت شروع کر چکے تھے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ انھوں نے چھاپا مکمل کیا یا نہ کیا۔

اس باب میں ایک عجیب امر یہ ہے کہ اس نسخہ کے سوا جو غالب نے رام پور سے نقل کرا کے نواب ضیاء الدین خاں کے پاس بھیجا تھا۔ اردو دیوان کا کوئی اور نسخہ موجود نہ تھا، یہی نسخہ نواب صاحب سے مستعار لے کر میرٹھ ارسال کیا تھا بعد ازاں اسی کو واپس لے کر آگرہ بھیج دیا تھا، تو دلی والے مطبع میں کونسا نسخہ چھپا؟ یہ معلوم ہے کہ غالب نے جو نسخہ منشی شیونرائن کو بھیجا تھا، وہ انہیں کے پاس رہنے دیا۔ کیا دلی والے مطبع کے لئے رامپور کے نسخہ کی نقل دوبارہ حاصل کی گئی تھی یا منشی شیونرائن کے پاس نسخہ بھیجنے سے قبل اس کی کوئی نقل رکھ لی گئی تھی یا غدر کے گم شدہ نسخوں میں سے کوئی نسخہ مل گیا تھا؟ غالب کی تحریرات میں مجھے ان سوالات کا کوئی جواب نہیں ملا۔

دیوان کا ناقص چھاپا اور قیمت

دلی کے دیوان کا چھاپا بہت برا تھا، نیز اس میں غلطیاں بہت رہ گئی تھیں۔ میر مجروح کو لکھتے ہیں :۔

دیوان چھپ چکا ہے۔ لکھنؤ کے چھاپے خانے نے جس کا دیوان چھاپا اس کو آسمان پر چڑھا

ملے اردوئے معلےٰ صفحہ ۲۰۴

دیا۔ حسن خط سے الفاظ کو چمکا دیا دلی پر اس کے پانی پر اور اس کے چھاپے پر لعنت،

صاحب دیوان کو اس طرح یاد کرنا جیسے کوئی کتے کو آواز دے۔ ہر کاپی دیکھتا رہا ہوں۔

کاپی نگار اور تھا۔ متوسط جو کاپی میرے پاس لایا کرتا تھا وہ اور تھا۔ اب جو دیوان چھپ

چکا، حق تصنیف ایک مجھ کو ملا غور کرتا ہوں تو وہ الفاظ جوں کے توں ہیں۔ یعنی کاپی نگار

نے نہ بنائے۔ ناچار غلط نامہ لکھا، وہ چھپا۔ بہ ہر حال خوش و ناخوش کئی جلدیں مول لوں گا

. . . . . نہ میں خوش ہوا نہ تم خوش ہوگے، اور یہ جو لکھتے ہو یہاں کچھ خریدار ہیں،

قیمت لکھ بھیجو۔ میں دلال نہیں۔ مہتمم مطبع نہیں، مطبع احمدی کے مالک محمد حسین خاں مہتمم

مرزا موجان، مطبع شاہدرہ میں، محمد حسین خاں دلی شہر راتمان کے کوچے میں، مصوروں کی حویلی

کے پاس، قیمت کتاب چھ آنے، محصول ڈاک خریدار کے ذمے۔

زمانے کی نیرنگیاں دیکھئے کہ جس مجموعہ اشعار کے بعض نسخے ہمارے زمانے میں دو دو سو روپے کو فروخت ہو چکے ہیں۔ اس کا حق تصنیف غالب کو صرف ایک نسخہ ملا تھا جس کی قیمت مع منافع ناشر و طابع صرف چھ آنے تھی اور انہیں اپنے دوستوں کیلئے بھی نسخے خریدنے پڑے تھے۔

نواب ضیاء الدین احمد خاں نے مطبع احمدی والے ایڈیشن کی تاریخ "بنائے ریختہ" اور "بیان ریختہ" نکالی تھی۔ یوسف علی خاں عزیز نے لکھا تھا۔

لکھی عزیز خستہ نے تاریخ انطباع
حاسد کے سر کو کاٹ کے "دیوان ریختہ"

کانپور میں دیوان کی طباعت مطبع احمدی والا نسخہ ۲۰ محرم ۱۲۷۸ھ (مطابق ۲۸ جولائی ۱۸۶۱ء) کو چھپا تھا لیکن چونکہ حد درجہ غلط تھا اس لئے غالب نے از سر نو کانپور میں چھپوانے کا ارادہ کیا۔ چنانچہ اپنے قلم سے مطبوعہ نسخہ پر تمام غلطیاں درست کیں، اس کی پشت پر ایک رقعہ محمد حسین خاں مالک مطبع احمدی کے نام لکھ کر تصحیح شدہ نسخہ انکے پاس بھیج دیا۔ محمد حسین خاں نے اسے مطبع نظامی

کانپور میں چھپوایا۔ یہ ایڈیشن ذی الحجہ ۱۲۷۸ھ (جون ۱۸۶۲ء) میں مکمل ہوا۔ غالب کا صحیح کیا ہوا نسخہ جسکی پشت پر محمد حسین خاں کے نام رقعہ لکھا گیا تھا، لکھنؤ کے بازار میں چند پیسے کو بکا[1]۔ رقعہ مذکورہ درج ذیل ہے:۔

جناب محمد حسین خاں کو میرا اسلام پہنچے۔ دو رات دن کی محنت میں میں نے اس نسخہ کو صحیح کیا ہے۔ غلط نامہ بھی اس میں درج کر دیا ہے۔ گویا اب غلط نامہ بیکار ہو گیا ہے[2]۔ خاتمہ کی عبارت، یا میرا بیان، میر قمر الدین کا اظہار اب کچھ ضرور نہیں، کس واسطے کہ اب یہ کتاب اور مطبع میں چھاپی جائے گی۔ یہ مجلد گویا مسودہ ہے۔ اس کو بھیج دیجے۔ غالب[3]

میری معلومات کے مطابق غالب کی زندگی میں اُردو دیوان کا کوئی اور ایڈیشن نہیں چھپا۔

غیر مطبوعہ اردو اشعار

غالب نے ابتدا میں میرزا بیدل کے رنگ میں اُردو شعر کہنے شروع کئے تھے اور دس برس کی مدت میں ایک دیوان جمع کر لیا تھا جب ہوش آیا اور شاعری کی حقیقت سے آگاہی ہوئی تو ان میں سے صرف تھوڑے سے اشعار باقی رکھے۔ باقی قلم انداز کر دیئے۔ انہی اشعار کا ایک مجموعہ اعلحضرت نواب حمید اللہ خاں بہادر فرمانروائے بھوپال کی توجہات عالیہ سے "نسخہ حمیدیہ" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ جو اردو اشعار دیوان کی طباعت کے بعد کہے گئے وہ یا تو ان کے رقعات میں آ گئے ہیں یا بعض قلمی مسودات سے لے کر شائع کئے جا چکے ہیں۔ مثلاً چند چیزیں حضرت مولانا ابوالکلام نے "الہلال" میں چھاپ دی تھیں۔ کچھ اشعار دیوان کے اس ایڈیشن میں چھپ چکے ہیں جو نظامی بدایوانی نے خاص اہتمام سے شائع کیا تھا۔ کچھ اشعار آسی صاحب نے مکمل شرح کلام غالب

---

[1] رسالہ ہندوستانی بابت جنوری ۱۹۳۴ء صفحہ ۹۶

[2] مراد یہ ہے کہ ساری غلطیاں درست کر دی گئی ہیں لہٰذا اب غلط نامہ کی ضرورت نہیں۔

[3] مولانا ابوالکلام فرماتے ہیں، میرے پاس یہی ایڈیشن ہے۔ اس عہد کے مطابع میں نظامی پریس سب سے بہتر پریس تھا۔ تصحیح کا پورا انتظام کیا جاتا تھا۔ یہ نسخہ بہت اچھا چھپا ہے۔

میں چھاپے ہیں۔ لیکن بعض اشعار اس وقت تک منظرِ عام پر نہیں آئے۔

حضرت مولانا ابوالکلام سے معلوم ہوا کہ نواب سعید الدین احمد خاں طالب مرحوم کے پاس اردو دیوان کا ایک قلمی نسخہ تھا جس میں غالب کے غیر مطبوعہ اشعار بھی تھے مولانا نے محترم نے ان اشعار کی نقل لے لی تھی۔ ارادہ یہ تھا کہ انہیں "الہلال" (دورِ اول) میں شائع کر دیں لیکن سوءِ اتفاق سے "الہلال" بند ہو گیا اور بعض دوسرے مسودات کے ساتھ یہ اشعار بھی ضائع ہو گئے۔

میں نے اس دیوان کی تلاش شروع کر دی۔ مولانا مظہر الدین صاحب شیر کوٹی مرحوم مالکِ "الامان" و "وحدت" کی وساطت سے طالب مرحوم کے متعدد عزیزوں سے ملا لیکن قلمی دیوان کا کوئی سراغ نہ مل سکا۔ اس تلاش میں نواب شجاع الدین احمد خاں تاباں مرحوم کی بیگم[۱] سے ایک اور قلمی دیوان مل گیا جس کے حاشیہ پر اور بعض اوراق پر متفرق اشعار درج تھے۔ میرا خیال ہے کہ کاتب نے انہیں غیر مطبوعہ سمجھتے ہوئے الگ درج کیا۔ لیکن ان میں سے بعض مطبوعہ دیوان میں موجود ہیں۔

کچھ اشعار اردوئے معلّٰی میں چھپ چکے ہیں مگر اب تک دیوان میں شامل نہیں ہو سکے مثلاً:

میں ہوں مشتاقِ جفا، مجھ پہ جفا اور سہی
تم ہو بیداد سے خوش اس سے سوا اور سہی[۲]

متفرق اشعار "الہلال" یا دوسرے رسائل کے حوالے سے دیوانِ غالب کے نسخہ نظامی میں چھپ چکے ہیں مثلاً والیِ رامپور کے غسلِ صحت کا قصیدہ[۳] "دو تین قطعات" "سخن تکیہ" "کہن تکیہ" والی غزل سے بعض اشعار رامپور والے مجموعۂ مکاتیبِ غالب میں شائع ہو چکے ہیں

---

[۱] محمد سلطان بیگم عرف جندو بیگم بنت میرزا باقر علی خاں کامل۔

[۲] پوری غزل اردوئے معلّٰی صفحہ ۳۰۷ پر موجود ہے۔

[۳] دیوانِ غالب مع شرح نظامی صفحہ ۱۶۱ - ۲۶۷

مثلاً برسات والا قطعہ جو نواب کلب علی خاں مرحوم کو بھیجا گیا تھا۔ اس کا ایک شعر یہ ہے،

جناب قبلۂ حاجات اس بلاکش نے
بڑے عذاب سے کاٹے ہیں پانچ چار برس

جو اشعار اب تک غیر مطبوعہ سمجھے جا سکتے ہیں، اس لئے کہ کسی مجموعہ میں شامل نہیں ہوئے وہ ذیل میں درج ہیں:

آپ نے مسنی الضر کہا ہے تو سہی
یہ بھی اے حضرت ایوب گلا ہے تو سہی

رنج طاقت سے سوا ہو تو نہ پیٹوں کیونکر
ذہن میں خوبی تسلیم و رضا ہے تو سہی

ہے غنیمت کہ بہ امید گزر جائیگی عمر
نہ ملے داد مگر روز جزا ہے تو سہی

دوست ہی کوئی نہیں ہے جو کرے چارہ گری
نہ سہی نیک، تمنائے دوا ہے تو سہی

غیر سے دیکھئے کیا خوب نباہی اس نے
نہ سہی ہم سے پر اس بت میں وفا ہے تو سہی

نقل کرتا ہوں اسے نامۂ اعمال میں میں
کچھ نہ کچھ روز ازل تم نے لکھا ہے تو سہی

کبھی آجائے گی کیوں کرتے ہو جلدی غالب
شہرۂ تیزی شمشیر قضا ہے تو سہی

ممکن نہیں ہے بھول کے بھی آرمیدہ ہوں
میں دشت غم میں آہوئے صیاد دیدہ ہوں

ہوں دردمند جبر ہو یا اختیار ہو
گہ نالۂ کشیدہ گہ اشک چکیدہ ہوں

جاں لب پہ آئی تو بھی نہ شیریں ہوا دہن
از بسکہ تلخی غم ہجراں چشیدہ ہوں

نے سبحہ سے علاقہ نہ ساغر سے واسطہ
میں معرض مثال میں دست بریدہ ہوں

ہوں خاکسار پر نہ کسی سے ہے مجھ کو لاگ
نے دانۂ فتادہ ہوں نے دام چیدہ ہوں

جو چاہئے نہیں وہ مری قدر و منزلت
میں یوسف بہ قیمت اول خریدہ ہوں

ہرگز کسی کے دل میں نہیں ہے مری جگہ
ہوں میں کلام نغز ولے ناشنیدہ ہوں

اہلِ ورع کے حلقے میں ہر چند ہوں ذلیل — پر عاصیوں کے زُمرہ میں میں برگزیدہ ہوں

پانی سے سگ گزیدہ ڈرے جس طرح اسدؔ
ڈرتا ہوں آئینہ سے کہ مردم گزیدہ ہوں

حاشیے اور متن کے علاوہ محولہ بالا قلمی نسخہ کے اول و آخر کے بعض اوراق پر چند اشعار اردو اور فارسی کے موجود ہیں جو میرے علم کے مطابق آج تک کہیں شائع نہیں ہوئے مثلاً یہ اشعار جو غالباً لوہارو والوں کی طرف سے تقاضائے تشریف آوری کے جواب میں کہے گئے :

خوشی ہے یہ آنے کی برسات کے — پئیں بادہ ناب اور آم کھائیں
سرِ آغازِ موسم میں اندھے ہیں ہم — کہ دلی کو چھوڑیں لوہارو کو جائیں
سوا، ناج ہے جو کہ مطلوب جاں — نہ واں آم پائیں، نہ انگور پائیں
ہُوا حکم باورچیوں کو کہ ہاں — ابھی جا کے پوچھو کہ کل کیا پکائیں
وہ کھٹے کہاں پائیں املی کے پھول — وہ کڑوے کریلے کہاں سے منگائیں

فقط گوشت، سو بھیڑ کا ریشہ دار
کہو اس کو کیا کھا کے ہم حظ اٹھائیں

دو شعر سہرے کے ہیں جو نواب شہاب الدین احمد خاں ثاقبؔ کی شادی کے موقع پر کہے گئے تھے۔

لہ یہ غزل ایک مرتبہ "ہمدرد" میں شائع ہوئی تھی جبکہ جریدہ مذکورہ ٹائپ کے حروف میں دہلی سے نکلا تھا۔ اس زمین میں غالبؔ نے ابتدائی دور میں دو غزلیں کہی تھیں جو نسخہ حمیدیہ میں موجود ہیں اور جن میں سے دو شعر نسخہ نظامی میں بھی بہ سلسلۂ اشعارِ غیر مطبوعہ چھپے ہیں۔ یہ دونوں بیگم تاباںؔ والے قلمی نسخہ کے حاشیہ پر بھی درج ہیں۔ قیاس کہتا ہے کہ غالبؔ نے نسخہ حمیدیہ والی دو غزلوں میں سے صرف یہی دو شعر قابلِ اندراج سمجھے۔

ہم نشیں تارے ہیں اور چاند شہاب الدین خاں　　بزم شادی ہے، فلک کاہکشاں ہے سہرا
ان کو لڑیاں نہ کہو بحر کی موجیں سمجھو　　ہے تو کشتی ہیں ولے بحر رواں ہے سہرا

مہاراجہ الور نے گلستان کا ایک نہایت عمدہ نسخہ میر پنجہ کش سے لکھوایا تھا اور بہت روپیہ اسکی تزئین پر صرف کیا تھا۔ ایک فارسی قطعہ اس نسخہ کی تکمیل کے متعلق ہے۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ نسخہ نظامی کے صفحہ ۱۷۳ پر ایک غیر مطبوعہ غزل درج ہے۔ جس کا مقطع یہ ہے :

اب ہے دلی کی طرف کوچ ہمارا غالب
آج ہم حضرت "نواب" سے بھی مل آئے

جناب نظامی فرماتے ہیں کہ "نواب" سے نواب یوسف علی خاں والی رامپور کی طرف اشارہ ہے۔

یہ وہ غزل ہے جو رامپور سے رخصت ہوتے وقت لکھی تھی چونکہ دیوان اس وقت مرتب ہو کر چھپ چکا تھا۔ اسلئے دیوان میں شامل نہیں ہوئی۔

یہ درست نہیں۔ اسلئے کہ اولاً "نواب" کلب علی خاں مرحوم کا تخلص تھا اور اشارہ یقینی طور پر نواب کلب علی خاں ہی کی طرف ہے۔ دوسرے نواب یوسف علی خاں مرحوم کے زمانے میں غالب جنوری ۱۸۶۰ء میں رامپور گئے اور مارچ ۱۸۶۱ء میں واپس آئے دیوان کی طباعت کے جو حالات اوپر بیان کئے جا چکے ہیں، انہیں پیش نظر رکھتے ہوئے نہیں مانا جا سکتا۔ کہ مارچ ۱۸۶۰ء میں دیوان چھپ چکا تھا۔ اس وجہ سے یہ غزل شامل دیوان نہ ہو سکی۔ صحیح یہی ہے کہ یہ غزل ۱۸۶۵ء میں کہی گئی۔

بہر حال غالب کا کافی اردو کلام ابھی تک بکھرا پڑا ہے۔ اس بات کی بھی ضرورت ہے کہ تمام متفرق چیزوں کو یکجا کر کے بہ صورت کلیات چھاپا جائے اور اس بات کی بھی ضرورت ہے کہ سارا کلام سامنے رکھ کر ایک ایسا انتخاب مرتب کیا جائے جو غالب کے اصلی رنگ کا صحیح مرقع ہو۔

خواجہ حالی مرحوم نے لکھا ہے۔

مرزا ۱۸۵۰ء تک ہمیشہ فارسی میں خط و کتابت کرتے تھے۔ مگر سنہ مذکور میں جبکہ وہ تاریخ نویسی کی خدمت پر مامور کئے گئے اور ہمہ تن "مہر نیمروز" کے لکھنے میں مصروف ہوگئے اس وقت بہ ضرورت اُن کو اُردو میں خط و کتابت کرنی پڑی ہوگی ...... قیاس چاہتا ہے کہ انہوں نے غالباً ۱۸۵۰ء کے بعد سے اُردو زبان میں خط لکھنے شروع کئے ہیں۔

مجھے اس رائے سے اتفاق نہیں اسلئے کہ اول "مہر نیمروز" کوئی بڑی کتاب نہیں جس کی ترتیب میں غالب کے اوقات کا بیشتر حصہ صرف ہوتا ہوگا۔ یہ کتاب انہوں نے کم از کم دو برس میں مرتب کی۔ موجودہ مطبوعہ صورت میں اس کے کل ۱۱۸ صفحے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ بہ اعتبار اوسط وہ سال بھر میں زیادہ سے زیادہ پچپن ساٹھ صفحات لکھتے رہے اور یہ غالب جیسے قادر الکلام اور مشاق نثر نگار کیلئے کوئی بہت بڑا کام نہیں تھا جس کی تکمیل کے سلسلے میں انہیں فارسی خط و کتابت ترک کرنی پڑی ہو۔ پھر خط و کتابت میں ان کا عام انداز الجھا ہوا نہ تھا۔ بلکہ جو کچھ لکھتے تھے عموماً بلا تکلف لکھتے تھے۔ وہ خود فرماتے ہیں:

ہنجار من در نگارش این است کہ چوں کلک و ورق بکف گیرم مکتوب الیہ را بہ لفظے کہ فراخور حالت اوست در سر آغاز صفحہ آواز دہم و زمزمہ سنج مدعا گردم۔ القاب و آداب و خیریت گوئی دعا فیت جوئی حشو و زاید است و پختگاں حشو را دفع نہند[۱]۔

اُردو خطوط کی طرح فارسی خطوط میں بھی تکلفات سے آزادگی ہر مقام پر ظاہر ہے سب سے آخر میں یہ کہ فارسی مکاتیب میں ایک خط منشی جواہر سنگھ جوہر کے نام ہے جس میں سر کے لئے لنگی کی فرمایش کی ہے۔ اس پر مطبوعہ "پنج آہنگ" میں یکم دسمبر ۱۸۴۸ء کی تاریخ ثبت ہے۔ اُردوئے معلّےٰ کے ایک خط میں بھی منشی جواہر سنگھ سے لنگی کا تقاضا موجود ہے۔ فرماتے ہیں:

---

[۱] کلیات نثر صفحہ ۷۵۔

کیوں صاحب وہ ہماری لنگی اب تک کیوں نہیں آئی؟ بہت دن ہوئے جب تم نے لکھا تھا کہ اسی ہفتے بھیجوں گا۔

یہ دونوں خط لازماً ایک دوسرے سے قریب کے زمانے میں لکھے گئے ہوں گے میرا خیال یہی ہے کہ غالب ۱۸۵۰ء سے قبل اُردو خط و کتابت کر چکے تھے لیکن چونکہ اس زمانے میں اُردو نثر کو اہل علم چنداں وقیع نہیں سمجھتے تھے اس لئے وہ خط محفوظ نہ رہ سکے۔ بعد میں جیسے جیسے اُردو کا رواج بڑھتا گیا اور فارسی کا تداول کم ہوتا گیا۔ غالب فارسی کے بجائے زیادہ تر اردو میں خط لکھتے رہے[1]۔

---

[1] میری اس ناچیز رائے سے فاضل محترم مولانا امتیاز علی صاحب عرشی مرتب "مکاتیب" (نسخہ رامپور) نے اختلاف فرمایا ہے اور بہ ضمن "باب انشا" خواجہ حالی مرحوم کے بیان کی توثیق کیلئے کافی سامان فراہم کر دیا ہے (مکاتیب غالب صفحہ ۱۲۴۔۱۲۳) لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ مسئلہ کسی بحث کا محتاج نہیں میرا مقصود محض یہ تھا کہ غالب ۱۸۵۰ء سے پیشتر بھی متفرق اردو خطوط لکھتے رہے ہونگے۔ یہ صحیح نہیں کہ ۱۸۵۰ء تک تو انکی ساری خط و کتابت فارسی میں رہی اور جونہی وہ دربار شاہی کی طرف سے تاریخ نگاری پر مامور ہوئے اردو خط و کتابت پر آگئے اسلئے کہ کاوش فکر و نظر کی ساری استعداد مہر نیم روز کیلئے وقف ہو چکی تھی جیسے خود عرض کر دیا ہے کہ جب تک فارسی زبان کو اختصاص علم و فضل کا نشان سمجھا جاتا تھا اور اردو کی حیثیت چنداں وقیع نہ تھی وہ زیادہ تر فارسی میں خطوط لکھتے رہے لیکن جب فارسی کے بجائے اُردو کا رواج بڑھ گیا۔ تو غالب نے بھی زیادہ تر اردو ہی کو مدار مکاتیب بنالیا۔

اس سلسلے میں بعض حضرات نے عجیب استدلال اختیار فرمایا ہے مثلاً "نادر خطوط غالب" کے ایک مکتوب کی ابتدائی عبارت یہ ہے۔

شاہ صاحب (سید کرامت حسین کرامت ہمدانی شاگرد غالب) کو غالب ناتواں کا سلام پہنچے۔ یہ پہلا خط ہے جو میں تمہیں اردو زبان میں لکھ رہا ہوں۔

اس مجموعہ کو ترتیب دینے والے فاضل کا ارشاد ہے کہ میں پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ غالب نے سب سے پہلا اردو خط میر سید آل اعلیٰ کرامت ہمدانی بہاری مرحوم کے نام لکھا اور وہ پہلی تاریخ جنوری ۱۸۵۰ء کو لکھا (نادر خطوط غالب صفحہ ۱۴) لیکن غالب کی مندرجہ صدر عبارت سے صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت کرامت کے نام یہ پہلا اردو خط تھا۔ یہ کیونکر ثابت ہو گیا کہ اُردو زبان میں غالب کا پہلا خط یہی تھا۔

اُردو مکاتیب کی اشاعت سے گریز

معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۵۸ء تک اُردو مکاتیب کا اچھا ذخیرہ مختلف دوستوں کے پاس جمع ہو گیا تھا اور وہ چھاپ دینے کا قصد کر رہے تھے۔ سب سے پہلے منشی شیو نرائن اکبر آبادی نے غالب کو لکھا کہ اردو مکاتیب شائع کرنے کی اجازت دیجیے۔ اس کے جواب میں ۱۸ نومبر ۱۸۵۸ء کو لکھتے ہیں،

اُردو کے خطوط جو آپ چھاپا چاہتے ہیں۔ یہ بھی زائد بات ہے۔ کوئی رقعہ ایسا ہو گا جو میں نے قلم سنبھال کر اور دل لگا کر لکھا ہو گا، ورنہ صرف تحریر سرسری ہے۔ اس کی شہرت میری سخنوری کے منافی ہے۔ اس سے قطع نظر کیا ضرور ہے کہ ہمارے آپس کے معاملات اوروں پر ظاہر ہوں۔ خلاصہ یہ کہ ان کا چھاپنا میرے خلاف طبع ہے

غالب اپنے فارسی رقعات کو چھاپنے کے خلاف نہ تھے حالانکہ وہ بھی زیادہ تر ان کے اور دوستوں کے "آپس کے معاملات" پر مشتمل تھے۔ میرا خیال ہے کہ اُردو مکاتیب کی اشاعت میں صرف اس لئے تامل تھا کہ اس زمانے میں اُردو نثر کو وقیع نہیں سمجھا جاتا تھا بلکہ غالب کے قول مطابق یہ نثر ان کی شہرت سخنوری کے منافی تھی "آپس کے معاملات" والا عذر، عذرِ زائد تھا۔

مجموعہ مکاتیب کی ترکیب

لیکن معلوم ہوتا ہے کہ دوستوں کے پیہم اصرار نے ان کی رائے بدل دی چنانچہ ۱۲۷۸ھ مطابق ۱۸۶۱ء میں چودھری عبدالغفور خاں سرور مارہروی نے منشی ممتاز علی خاں کی فرمائش سے رقعات کا ایک مجموعہ "مہر غالب" کے نام سے جمع کر لیا اور اس پر ایک دیباچہ بھی لکھا۔ غالب نے دیباچہ کی داد دی۔[۱] خواجہ غلام غوث خاں بیخبر نے مزید رقعات کی ترتیب شروع کر دی۔ غالب ایک خط میں خواجہ صاحب کو لکھتے ہیں،

کوئی صاحب ڈپٹی کلکٹر ہیں کلکتہ میں مولوی عبدالغفور خاں ان کا نام نساخ انکا تخلص ہے میری ان کی ملاقات نہیں۔ انہوں نے ابتداءً بیان چھاپے کا موسوم بہ "دفتر بے مثال" مجھ کو

---

[۱] عود ہندی صفحہ ۴۴۔

بھیجا اس کی رسید میں یہ خط میں نے ان کو لکھا چونکہ یہ خط مجموعہ نثر اردو کے لائق ہے۔
آپ کے پاس ارسال کرتا ہوں ۔

اس خط میں آگے چل کر جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہی منشی ممتاز علی خاں صاحب جنہوں نے چودھری عبد الغفور خاں کے پاس مارہرہ پہنچ کر مکاتیب مرتب کرنے کی فرمائش کی تھی اس مجموعہ کو چھاپ رہے تھے اور خواجہ غلام غوث خاں بیخبر کتاب کی ترتیب و تکمیل میں منشی صاحب کے معاون تھے ۔ غالب خواجہ صاحب کو لکھتے ہیں ؛

ہاں حضرت وہ مجموعہ چھپے گا بالفتح یا چھپے گا بالضم چھپ چکا ہے تو حق التصنیف کی کتنی جلدیں منشی ممتاز علی خاں صاحب کی ہمت اقتضاء کرے ۔ فقیر کو بھیجیں ۔

ایک اور خط میں فرماتے ہیں ؛ ۔

اب یہ عبارت جو تم کو لکھ رہا ہوں ۔ یہ لائق شمول مجموعہ نثر اردو کہاں یقین جانتا ہوں ایسی نثروں کو آپ خود درج نہ کریں گے ۔ . . . . جناب کیمس صاحب بہادر افسر مدارس غرب و شمال کا باوجود عدم تعارف خط مجھ کو آیا ۔ کچھ اردو زبان کے ظہور کا حال پوچھا تھا اس کا جواب لکھ بھیجا ۔ نظم و نثر اردو طلب کی تھی ۔ مجموعہ نظم بھیج دیا ۔ نثر کے باب میں تمہارا نام نہیں لکھا مگر یہ لکھا کہ مطبع الہ آباد میں وہ مجموعہ چھاپا جاتا ہے ۔ بعد انطباع و حصول اطلاع وہاں سے منگا کر بھیج دوں گا ۔

عود ہندی کی کیفیت

بہر حال منشی ممتاز علی خاں نے مختلف رقعات جمع کرائے ۔ سرور نے اپنا مجموعہ مع دیباچہ منشی صاحب کے حوالے کر دیا ۔ خواجہ غلام غوث خاں صاحب،

۱؎ عود ہندی صفحہ ۴۴ ۔

بخبر نے بعض مزید خطوط فراہم کر دیئے۔ اس وقت تک یہی خیال تھا کہ تمام خطوط کی اشاعت ضروری نہیں۔ صرف وہ شائع کئے جائیں جن میں علمی رنگ نمایاں ہو۔ اسی لئے غالب نے خواجہ غلام غوث خاں کو لکھا تھا کہ اب یہ عبارت جو آپ کو لکھ رہا ہوں مجوزہ مجموعہ نثر میں شمول کے لائق نہیں۔

لیکن بالآخر جتنے خطوط مل سکے۔ علمی اور غیر علمی کے امتیاز کو نظر انداز کرتے ہوئے مجموعہ میں داخل کر دیئے گئے۔ اس مجموعہ نے "عود ہندی" نام پایا۔ اب اس میں ایسے خطوط بھی موجود ہیں۔ جن میں نہ عبارت کی کوئی خاص خوبی ہے۔ اور نہ کوئی علمی نکتہ ہے۔

غالب سے دیباچہ کا مطالبہ ایک خط سے ظاہر ہوتا ہے کہ خواجہ غلام غوث خاں "عود ہندی" کا دیباچہ غالب سے لکھوانا چاہتے تھے۔ اس فرمائش کا جواب یہ ملا:

مجموعہ نثر اردو کا انطباع اگر میرے لکھے ہوئے دیباچہ پر موقوف ہے تو اس مجموعہ کا چھپ جانا بالفعل میں نہیں چاہتا۔ بلکہ چھپ جانا بالفعل چاہتا ہوں۔ سعدی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں ؎

رسم است کہ مالکانِ تحریر

آزاد کنند بندۂ پیر

آپ بھی اسی گروہ یعنی مالکان تحریر میں سے ہیں پھر اس شعر پر عمل کیوں نہیں کرتے؟

منشی ممتاز علی خان کا بیان منشی ممتاز علی خاں "عود ہندی" کے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ میرزا غالب کی فارسی تصانیف تو بہت چھپ چکی ہیں، مگر کلام اردو نے سوائے ایک دیوان کے ترتیب نہ پائی حالانکہ غالب کی اردو نثر دوسروں کی فارسی سے بہتر ہے مدت سے میرا خیال تھا کہ اردو نثر بھی مرتب کی جائے۔

میرے عنایت فرما اور میرزا صاحب کے شاگرد یکتا چودھری عبدالغفور صاحب سرور تخلص سے یہ ذکر آیا تو انھوں نے جتنے خطوط میرزا صاحب کے ان کے نام آئے تھے

سب کو ایک جا کر کے اور اس پر ایک دیباچہ لکھ کے وہ مجموعہ عنایت کیا۔ عرصہ تک سرگرم تلاش رہا۔ جا بجا سے اور تحریریں میرزا صاحب کی بہم پہنچائیں۔ بڑی محنت اٹھائی تب تمنا بر آئی ۔۔۔۔۔۔ خواجہ غلام غوث خاں بہادر بیخبر تخلص جو جناب معلّےٰ القاب لفٹنٹ گورنر بہادر ممالک مغربی و شمالی کے میر منشی اور میرے مخدوم خاص اور حضرت غالب صاحب کے مخلص باختصاص ہیں اس تلاش میں میرے معین اور مددگار رہے۔ بہت کچھ ذخیرہ ان کی بدولت بہم پہنچا۔ اس کتاب کی دو فصل اور ایک خاتمہ ہے۔ پہلی فصل میں چودھری صاحب کے مرتب کئے ہوئے خطوط اور ان کا لکھا ہوا دیباچہ، دوسری فصل میں میرے جمع کئے ہوئے رقعات اور خاتمہ میں چند نثریں ہیں، جو جناب غالب نے اوروں کی کتابوں پر تحریر فرمائی ہیں۔

"عود ہندی" کے اختتام کی عبارت بہ طرز تقریظ حکیم غلام مولا صاحب قلق ساکن میرٹھ نے لکھی تھی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ منشی ممتاز علی خاں روسا میرٹھ میں تھے۔ غالباً یہ وہی بزرگ تھے جنہوں نے سفارشی بن کر اردو کا دیوان منشی عظیم الدین کتب فروش کو بغرض طباعت دلایا تھا۔

عود کی طباعت کب ہوئی

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ "عود" کب چھپی؟ میرزا محمد عسکری صاحب مؤلف ادبی خطوط غالب فرماتے ہیں کہ "عود ہندی" سب سے پہلے مطبع مجتبائی میرٹھ میں غالباً ۱۲۷۸ھ میں یعنی غالب کی وفات سے سات برس قبل چھپی تھی[1] لیکن یہ صحیح نہیں۔ اس کے وجوہ ملاحظہ فرمایئے۔

(۱) "عود" میں "نامہ غالب" بھی شامل ہے جو ۱۸۶۵ء میں لکھا گیا تھا[2]۔ اس سے ظاہر

---

[1] ادبی خطوط غالب صفحہ ۴

[2] اردوئے معلّیٰ صفحہ ۲۰ و ۲۱

ہے کہ کتاب ۱۸۶۵ء تک نہیں چھپی تھی۔

(۲) غالب نے خواجہ غلام غوث خاں بیخبر کو مولوی عبدالغفور خاں نسّاخ کے دیوان "دفتر بیمثال" کی تقریظ بھی "عود" میں شامل کرنے کیلئے بھیجی تھی۔ اس میں غالب اپنی عمر ایک کم ستر برس[1] بتاتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ ۱۲۸۱ھ مطابق ۱۸۶۴ء میں لکھی گئی اور اس وقت تک "عود" نہیں چھپی تھی۔

(۳) "عود" میں ایسے مکاتیب بھی موجود ہیں جو یقینی طور پر ۱۲۷۸ھ کے بعد لکھے گئے مثلاً خواجہ غلام غوث خاں صاحب بیخبر کے نام کا وہ مکتوب جو کتاب کے صفحہ ۱۱۹ پر درج ہے اس میں غالب مجموعہ نثر اردو کے طبع نہ ہونے کی شکایت کرتے ہوئے لارڈ کیننگ اور لارڈ ایلجن کی مدح میں قصیدے بھیجنے کا ذکر کرتے ہیں اور آخر میں فرماتے ہیں کہ جب لارڈ لارنس وائسرائے بنے تو ۳ا فروری ۱۸۶۴ء کو ان کی خدمت میں قصیدہ بھیجا۔ "آج تک کہ ۷ مارچ ہے اس کا جواب نہیں آیا" اس سے ظاہر ہے کہ ۷ مارچ ۱۸۶۴ء تک "عود" نہیں چھپی تھی۔

(۴) خواجہ غلام غوث بیخبر کے نام کے ایک خط میں جو ۷ جولائی ۱۸۶۵ء کا مرقومہ ہے۔ نواب کلب علی خاں والی رامپور کی مدح میں ایک قصیدہ درج ہے یہ بھی اس امر کی دلیل ہے کہ جولائی ۱۸۶۵ء تک "عود" شائع نہیں ہوئی تھی۔

عود کا پہلا ایڈیشن

اب "عود" کا پہلا ایڈیشن مل گیا ہے جس سے ثابت ہو گیا ہے کہ کتاب ۲ رجب ۱۲۸۵ھ مطابق ۱۵ اکتوبر ۱۸۶۸ء کو یعنی غالب کی وفات سے ٹھیک چار ماہ قبل شائع ہوئی۔ لیکن اس میں اتنی غلطیاں رہ گئی تھیں کہ غالب

---

[1] عود ہندی صفحہ ۱۲۱۔

اسے مہمل قرار دینے پر مجبور ہو گئے "عود" کے متعلق بعض مزید معلومات ذیل میں درج ہیں:۔

(۱) چودھری عبدالغفور خاں صاحب سرور مارہروی کے مجموعہ کے علاوہ خواجہ غلام غوث خاں بیخبر نے مختلف خطوط کے جمع و ترتیب میں سخت محنت اٹھائی لیکن انہیں زیادہ تر خطوط صرف ان دوستوں سے ملے جو صوبجات متحدہ میں رہتے تھے مثلاً کالپی کے نواب انور الدولہ گورکھپور کے عبدالرزاق خاں شاکر آگرہ کے حاتم علی بیگ مہر بریلی کے قاضی عبدالجمیل۔

(۲) خواجہ صاحب نے پورا مجموعہ مرتب کر کے اس کی نقل ۱۸۶۶ء میں منشی ممتاز علی خاں کے پاس چھاپنے کے لئے بھیج دی تھی اور لکھا کہ طباعت سے قبل مسودہ غالب کو دکھا لیا جائے۔

(۳) کتاب چھپ گئی لیکن قطعہ تاریخ کے انتظار میں طابع نے آخری صفحہ روک لیا اخبار "جلوۂ طور" مراد آباد کے مہتمم نے آخری صفحہ کے بغیر بکس جلدیں مول لیں خواجہ غلام غوث خاں کو یہ کیفیت معلوم ہوئی تو انہوں نے منشی ممتاز علی خاں کو لکھا کہ قطعہ تاریخ فرض نہیں۔ اس کے انتظار میں کتاب کی اشاعت نہ روکئے۔

(۴) یہ نسخہ میرٹھ میں چھپا تھا اگرچہ غالب سمجھ رہے تھے کہ مطبع الہ آباد میں چھپ رہا ہے[۱]

(۵) اس کی تقطیع $\frac{1}{2}$۹ × ۶ انچ تھی کاغذ سفید اور حجم ۱۸۸ صفحہ تھا۔[۲]

عود کا مختلف ایڈیشن

"عود" کے مختلف ایڈیشنوں کی تفصیل ذیل میں درج ہے:۔

(۱) مطبع میرٹھ ۱۵ اکتوبر ۱۸۶۸ء ۲۰ رجب ۱۲۸۵ھ

(۲) مطبع نارائنی دہلی ۲۳ فروری ۱۸۷۸ء ۲۰ صفر ۱۲۹۵ھ

---

[۱] عود ہندی صفحہ ۱۶۷

[۲] مجھے اس ایڈیشن کا ایک نسخہ مل گیا۔ جس کے اول و آخر سے چند صفحات غائب ہیں۔

(۳) مطبع نول کشور کانپور ستمبر ۱۸۷۸ء (رمضان ۱۲۹۵ھ)

(۴) مطبع مفید عام آگرہ مئی ۱۹۱۰ء

(۵) مطبع نول کشور کانپور ۱۹۱۳ء (بار چہارم)

(۶) مطبع مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۱۹۲۷ء

(۷) نیشنل پریس الہ آباد ۱۹۲۹ء

(۸) مطبع انوار احمدی الہ آباد

(۹) مطبع کریمی لاہور

(۱۰) مطبع گلزار ہند سٹیم پریس لاہور

اندازہ کیا گیا ہے کہ اس وقت تک مختلف مطابع میں "عود ہندی" کے بارہ ہزار نسخے شائع ہو چکے ہیں۔

اردوئے معلےٰ کی ترتیب "عود" کی طباعت میں تاخیر ہوگئی تو غالب کے بعض عزیز شاگردوں نے دہلی میں اردو مکاتیب کے چھاپنے کا ارادہ کر لیا۔ غالب نواب علاء الدین احمد خاں کو لکھتے ہیں:

مطبع اکمل المطابع میں چند اصحاب میرے مسودات اُردو جمع کرنے اور ان کو چھپوانے پر آمادہ ہوئے ہیں۔ مجھ سے مسودات مانگتے ہیں اور اطراف و جوانب سے فراہم کیے ہیں۔ میں مسودہ نہیں رکھتا۔ جو لکھا وہ جہاں بھیجنا ہوا بھیج دیا۔ یقین ہے کہ خط میرے تمہارے پاس بہت ہوں گے۔ اگر ان کا ایک پارسل بنا کر بہ سبیل ڈاک بھیج دو گے یا آج کل میں کوئی ادھر آنے والا ہو، اس کو دے دو گے۔ تو موجب میری خوشی کا ہوگا۔

اس خط پر کوئی تاریخ درج نہیں جس سے معلوم ہو سکے کہ دہلی میں ترتیب مکاتیب کا کام کب شروع ہوا۔ نواب علاء الدین احمد خاں نے غالباً خطوط کے بھیجنے میں تامل کیا۔ انہیں پھر لکھتے ہیں:

سنو بھائی۔ اگر ان خطوط کا تم کو اخفا منظور ہو اور شہرت منافی طبع ہو تو ہرگز نہ بھیجو۔ قصہ تمام ہوا۔ اور اگر ان کے تلف ہونے کا اندیشہ ہے۔ تو میرے دستخطی خطوط اپنے پاس رہنے دو۔ اور کسی متصدی سے نقل اُتروا کر، چاہو کسی کے ہاتھ بہ سبیل پارسل ارسال کرو۔

نواب صاحب نے خطوط بھیج دیئے تو انہیں لکھتے ہیں:۔

خطوط کے ارسال کو مکرر نہ لکھنا از راہ ملال نہ تھا۔ طالب کے ذوق کو سست پا کر میں متوقف ہو گیا تھا۔ متوسط ایک جلیل القدر آدمی اور طالب کتب کا سوداگر ہے۔ اپنا نفع نقصان سوچے گا۔ لاگت بچت کو جانچے گا۔ میں متوسط کو مہتمم سمجھا تھا اور یہ خیال کیا تھا کہ یہ چھپوائے گا۔ تین رقعہ ایک جگہ سے لیکر ان کو بھیجے۔ اس کی رسید میں تقریباً انہوں نے طلب قعات بہ تکلف سوداگر لکھی اور اس سوداگر کو مفقود الخبر لکھا تھا۔ ظاہر اکتابیں لیکر کہیں کیا ہو گا...... یہ تین لفافے اور چونتیس خطوط بہ دستور میرے بکس میں موجود و محفوظ رہیں گے۔ اگر متوسط بہ تقاضا طلب کرے گا، ان خطوط کی نقلیں اس کو اصل تم کو بھیج دوں گا۔ ورنہ تمہارے بھیجے ہوئے کاغذ تم کو پہنچ جائیں گے۔

اس خط پر ۳۰ مئی ۱۸۶۳ء کی تاریخ ثبت ہے اس سے ظاہر ہے کہ دہلی میں مجموعہ خطوط کی طباعت کا ارادہ ۱۸۶۳ء میں ہوا تھا۔

اردوئے معلیٰ کی طباعت دہلی والے مجموعہ کا نام "اردوئے معلیٰ" قرار پایا۔ میر مہدی مجروح نے اس کا دیباچہ لکھا جس میں بتایا گیا ہے کہ یہ نسخہ منشی جواہر سنگھ جوہر کی کوششوں سے فراہم ہوا تھا۔ اس کی طباعت اکمل المطابع میں فخر الدین کے زیر اہتمام شروع ہوئی تھی۔ غالب اس وقت زندہ تھے۔ لیکن اردوئے معلیٰ کے خاتمہ کی عبارت (مرقومہ قربان علی بیگ سالک) سے معلوم ہوتا ہے کہ طباعت ابھی اتمام کو نہیں پہنچی تھی کہ غالب وفات پا گئے۔ سالک کی کہی ہوئی تاریخ طبع کا آخری شعر یہ ہے:۔

ہے یہی سال طبع سال وفات

آج ان کا سخن تمام ہوا

حق ملکیت | غالب نے اردوئے معلّٰے کا حق ملکیت حکیم غلام رضا خاں کے حوالے کر دیا تھا ان کی اصل تحریر جو صرف پہلے ایڈیشن کے ساتھ چھپی تھی، یہ ہے:۔

پیکر بے روح و رواں، فقیر اسد اللہ خاں، غالب تخلص ہیچ مداں کہتا ہے اور لکھ دیتا ہے کہ یہ "اردوئے معلّٰے" تصنیف فقیر مطبع اکمل المطابع دہلی میں چھاپا ہوا، سو میں نے از راہ فرط محبت اپنا حق تالیف نور چشم اقبال نشان حکیم غلام رضا خاں کو بخش دیا ہے اور اس حق کو خاص ان کا حق کیا ہے اور کوئی صاحب اگر مالک اکمل المطابع حکیم غلام رضا خاں کے بے اطلاع "اردوئے معلّٰے" کے چھاپنے کا قصد کریں تو مواخذہ سے محفوظ نہ رہیں گے اور فوراً حسب منشا قانون بستم ۱۸۴۷ء سزا پائیں گے۔

"عود" کی طرح "اردوئے معلّٰے" کے بھی متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ بعض ایڈیشنوں میں غالب کے مزید رقعات شامل کیے گئے ہیں۔ لیکن میں سارے ایڈیشن جمع نہیں کر سکا۔ اس لیے ان کی تفصیل نہیں بتا سکتا۔

نکات و رقعات | اردو کی بقیہ تصانیف میں سے "تیغ تیز" کا ذکر "قاطع برہان" کے ضمن میں آئے گا۔ کیونکہ وہ "قاطع" ہی کے سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ البتہ "نکات و رقعات" کا ذکر اردو تصانیف ہی میں ہونا چاہیئے۔ یہ کتاب اگرچہ فارسی زبان کے بعض اصول و قواعد کے متعلق ہے اور اس میں رقعات بھی سب کے سب فارسی ہیں۔ لیکن اصل کتاب اردو میں ہے۔ غالب خود فرماتے ہیں کہ یہ پنج آہنگ کا اردو ترجمہ ہے:

اکہتر برس کا ناتوان آدمی دنیا میں عزت اور عقبیٰ میں نجات کا طالب ترک سلجوقی اسد اللہ خاں غالب کہتا ہے۔ تیس برس پہلے میں نے اپنی نثریں جمع کیں اور اس کا نام پنج آہنگ رکھا۔ چالیس برس کی عمر میں وہ رسالہ لکھا۔ اب اکتیس برس کے بعد یہ ارادہ کیا ہے کہ پنج آہنگ کی

چوتھی آہنگ[1] جس میں فارسی کی صرف کا بیان ہے اس کا اردو ترجمہ کیا جائے تاکہ وہ اوراق حضور پرنور، قبلۂ حیات خلق اور کعبۂ آمال انام، نائب مسیح علیہ السلام، جامع دانش و داد، امرا کے مربی اور علما کے استاد جناب معلے القاب میکلوڈ صاحب بہادر فرمانروائے وسیع ملک پنجاب بظاہر نواب لفٹنٹ گورنر بہادر ان کا خطاب اور فی الحقیقت سلطان فلک رخش ہلال رکاب کی نذر کیے جائیں۔ خدا کرے مجھ ترک جاہل کا بیان حضرت کو پسند آئے۔ اور یہ رسالہ ان کی زبان سے "نکات غالب" کا نام پائے۔

لیکن میری رائے میں اُسے "ترجمہ" قرار دینا صحیح نہیں۔ بہرحال یہ کتاب فروری ۱۸۶۷ء میں پیارے لال صاحب[2] اسسٹنٹ ماسٹر مدرسہ دہلی نے چھپوائی تھی۔ اس کے بیس صفحات نکات کیلئے وقف ہیں سولہ صفحوں میں پندرہ خطوط پھیلے ہوئے ہیں۔ ایک ورق غلط نامہ کا ہے۔ یہ صرف ایک مرتبہ محمد سعادت علی خاں کے مطبع سراجی میں پانسو کی تعداد میں چھپی تھی۔ اب کہیں نہیں ملتی۔

اردو کی کتاب ہنری اسٹوارٹ ریڈ صاحب نے غالباً منشی شیو نرائن کی وساطت سے فرمائش کی تھی کہ غالب اردو نثر میں ایک مستقل کتاب لکھ دیں۔ اس فرمائش کے متعلق منشی شیو نرائن کو لکھتے ہیں:

جناب ہنری اسٹوارٹ ریڈ صاحب کو بھی میں خط نہیں لکھ سکتا۔ ان کی فرمائش ہے اردو کی نثر کی۔ انجام پائے تو اس کے ساتھ ان کو خط لکھوں۔ مگر بھائی تم غور کرو اردو میں میں اپنے قلم کا زور کیا صرف کروں گا اور اس عبارت میں معانی نازک کیوں کر بھروں گا سوچ رہا ہوں

---

[1] بہ ترتیب موجودہ "آہنگ چہارم" تقریظوں وغیرہ پر مشتمل ہے اور مصادر وغیرہ کا بیان "آہنگ دوم" میں ہے۔

[2] لالہ پیارے لال آشوب جنہیں بعد میں رائے بہادر کا خطاب ملا اور وہ پنجاب کے محکمۂ تعلیم میں ممتاز عہدے پر فائز رہے۔ یہ لالہ سری رام مصنف خمخانۂ جاوید کے چچا تھے۔ غالب انہیں بہت عزیز رکھتے تھے۔

کہ کیا لکھوں، کون سی بات، کون سی کہانی، کون سا مضمون تحریر کروں۔ تمہاری رائے میں کچھ آئے تو مجھ کو بتاؤ۔

پھر لکھتے ہیں :۔

جناب ریڈ صاحب صاحبی کرتے ہیں۔ میں اُردو میں اپنا کمال کیا ظاہر کر سکتا ہوں۔ اس میں گنجائش عبارت آرائی کی کہاں ہے۔ بہت ہوگا تو یہ ہوگا کہ میرا اُردو بہ نسبت اوروں کے اُردو کے فصیح ہوگا۔ خیر بہرحال کچھ کروں گا اور اردو میں اپنا زور قلم دکھاؤں گا۔

یہ ۸ اردسمبر ۱۸۵۷ء کی تحریر ہے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ غالب نے اُردو نثر کی کوئی مستقل کتاب نہیں لکھی۔ البتہ یوپی کے انگریز انسپکٹر مدارس نے اُردو زبان کی ابتدا کے متعلق ان سے جو تحریر حاصل کی تھی، وہ خدا جانے کیا ہوئی۔ کاش اس تحریر کا سراغ کہیں سے مل سکے۔

فارسی دیوان فارسی تصانیف میں سے ہم سب سے پہلے نظم کو لیتے ہیں۔ غالب ۱۸۶۳ء کے ایک مکتوب میں سید بدرالدین کو لکھتے ہیں :

فارسی کا دیوان بیس پچیس برس کا عرصہ ہوا چھپا تھا پھر نہیں چھپا۔

۱۸۶۳ء سے پچیس برس نکال دیئے جائیں تو ۱۸۳۸ء باقی رہتے ہیں اگر غالب کے بتائے ہوئے تخمینہ کو صحیح سمجھا جائے تو نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ فارسی کا دیوان پہلی مرتبہ ۱۸۳۸ء کے لگ بھگ چھپا تھا۔

میرزا علی بخش خاں رنجور "پنج آہنگ" کے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ ۱۲۵۱ھ میں نواب شمس الدین احمد خاں والی فیروز پور جھرکا پر قضائے آسمانی سے آفت نازل ہوئی :

بعد ازاں ہنگامہ ہم دراں ہنگام از جے پور بہ دہلی رسیدم و بہ کاشانہ برادر والاشان و آموزگار مہربان مولانا غالب زاد افضالہ فرود آمدم۔ چوں دراں ایام دیوان فیض عنوان کہ مسمّٰے "بہ میخانۂ آرزو" است تازہ فراہم آمدہ و پیرایہ انتمام پوشیدہ آنچہ از نثر دراں ہمایوں صحیفہ صورت ارقام

داشت ہمہ را بہ خدمت والاے آں خسرو اقلیم سخنوری خواندم۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲۵۱ھ (مطابق ۱۸۳۵ء) میں غالب کا فارسی دیوان مرتب ہو چکا تھا اور اس کا نام "میخانہ آرزو" رکھا گیا تھا۔ انہوں نے فارسی دیوان کے خاتمہ کی نثر میں سال تحریر نثر ۱۲۵۳ھ (۱۸۳۷ء) لکھا ہے۔ لیکن فارسی دیوان کا پہلا ایڈیشن ۱۸۴۵ء میں نواب ضیاء الدین احمد خاں کی تصحیح سے مطبع دار السلام دہلی میں چھپا۔ اس کا کوئی نسخہ میری نظر سے نہیں گزرا۔ ۱۸۴۵ء کے بعد غالب جو کچھ لکھتے رہے وہ حسب سابق نواب ضیاء الدین احمد خاں کے پاس جمع ہوتا رہا۔

کلیات نظم کی طباعت اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ کلام غالب کے جو مجموعے نواب ضیاء الدین احمد خاں نے اہتمام کے ساتھ مرتب کئے تھے وہ سب غدر میں لٹ گئے۔ بعد میں نواب مرحوم نے دوبارہ بڑی محنت سے یہ نادر ذخیرہ فراہم کیا اور ۱۸۶۱ء میں منشی نولکشور نے مسودہ منگا کر چھاپنا شروع کیا۔ غالب لکھتے ہیں:

منشی نولکشور نے شہاب الدین خاں (فرزند نواب ضیاء الدین احمد خاں) کو لکھ کر کلیات فارسی جو ضیاء الدین خاں نے غدر کے بعد بڑی محنت سے جمع کیا تھا منگایا، اور چھاپنا شروع کیا۔ وہ پچاس جزو ہیں، یعنی کوئی مصرعہ میرا اس سے خارج نہیں۔

لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس مجموعہ کی طباعت میں بڑی تاخیر ہو گئی۔ غالب میر مہدی مجروح کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

کلیات کے چھاپے کی حقیقت سنو۔ سات صفحے چھاپے گئے تھے کہ مولوی ہادی علی مصحح بیمار ہو گئے کاپی نویس رخصتی اپنے گھر گیا۔ اب دیکھئے کب چھاپا شروع ہو۔

ایک اور خط میں نواب علاؤ الدین احمد خاں کو لکھتے ہیں:

کلیات کے انطباع کا اختتام اپنی زیست میں مجھ کو نظر نہیں آتا۔

ستمبر ۱۸۶۱ء میں منشی نولکشور دہلی آئے اور غالب سے بھی ملے اس سے قبل وہ غالباً

اودھ اخبار میں کلیات کی طباعت کا اعلان کر چکے تھے اور اس کی قیمت سوا تین روپے مقرر کی تھی لیکن بعد کے اعلان میں قیمت بڑھا کر پانچ روپے کر دی۔ غالب نواب علاؤ الدین احمد خاں کو لکھتے ہیں؛

شفیق مکرم و لطف مجسم منشی نولکشور صاحب بسبیل ڈاک یہاں آئے مجھ سے اور تمہارے چچا نواب ضیاء الدین احمد خاں اور تمہارے بھائی شہاب الدین احمد خاں سے ملے۔ خالق نے ان کو زہرہ کی صورت اور مشتری کی سیرت عطا کی ہے ۔ ۔ ۔ ۔

تم سے میں نے کچھ نہ کہا تھا اور کلیات کے دس مجلد کی قیمت پچاس روپے مان لئے تھے۔ اب ان سے (منشی نولکشور سے) ذکر آیا۔ تو انہوں نے پہلی قیمت مشتہرہ اخبار یعنی قبول کی یعنی سوا تین روپے فی جلد اس صورت میں دس مجلد کے ساڑھے بتیس روپے میں دوں اور ساڑھے بتیس روپے تم دو گے پچیس ہزار روپے مطبع اودھ اخبار میں پہنچانے ہیں۔ میں دسمبر ماہ حال کی دسویں گیارھویں وطالبہ ہونگا کہ ساڑھے بتیس روپے علی حسین کو دے دو کہو لکھنؤ بھیج دوں۔

لیکن معلوم ہوتا ہے کہ کلیات ۱۸۶۳ء میں مکمل ہوا۔ غالب سید بدر الدین کو ۱۸۶۳ء کے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں ،

اب سُنا ہے کہ وہ (کلیات) چھپ کر تمام ہو گیا ہے۔ روپے کی فکر میں ہوں۔ ہاتھ آجائے تو پچیس ٹھ بھیج کر بیس جلدیں منگواؤں۔ جب آجائیں گی، ایک آپ کو بھی بھیج دوں گا۔

۶ ستمبر ۱۸۶۳ء کو ایک مکتوب میں نواب علاؤ الدین احمد خاں کو لکھتے ہیں ،

بہ توسط برخوردار علی حسین خان مجلد کلیات فارسی پہنچی۔ حیرت ہے کہ چار روپے چار آنے قیمت کتاب قال الطباع میں اگر پانچ روپے قیمت اور پانچ آنے محصول قرار پائے ،

تیر جہاں سو وہاں سوا۔ میرا حال تمہیں اور تمہارا حال مجھے معلوم ہے ۔

ایں ہم اندر عاشقی بالائے غمہائے دگر

اب کے چھپے میں شاید دے سکوں۔ نومبر سنہ حال (۱۸۶۳ء) میں پچاس روپے تمہارے پاس پہنچ جائیں گے۔ انشاء اللہ العظیم ۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگرچہ شروع میں کلیات کی قیمت تین روپے اور محصول ڈاک چار آنے قرار پایا تھا۔ لیکن بعد ازاں چار روپے کا اعلان ہو گیا۔ اور کتاب چھپی تو اس کی قیمت پانچ روپے اور محصول ڈاک پانچ آنے ٹھہرا۔ غالب کے ساتھ وعدہ یہ تھا کہ انہیں سوا تین ہی روپے میں کتاب ملے گی لیکن انہیں بھی پانچ روپے دینے پڑے۔

ستمبر ۱۸۶۳ء میں غالب کے پاس کلیات کا پہلا مطبوعہ نسخہ آیا تھا۔ اسی مہینے میں انہوں نے ایک نسخہ مولوی مؤید الدین خاں کی وساطت سے نواب مختار الملک سر سالار جنگ اول وزیر اعظم حیدر آباد کے پاس بھیجا۔ منشی حبیب اللہ خاں ذکا کے نام کے ایک مکتوب (مرقومہ ۲۵ دسمبر ۱۸۶۳ء) میں اپنے اور مولوی مؤید الدین خاں کے بزرگوں کے گھرے تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

اب آپ (ذکا) سے یہ چاہتا ہوں کہ آپ مولوی صاحب سے ملیں اور ان کو یہ خط اپنے نام کا دکھائیں اور میری طرف سے بعد سلام میرے کلیات کے پارسل کا ان کے پاس پہنچنا ان کے ذریعہ عنایت سے اس مجلد کا حضرت فلک رفعت نواب مختار الملک بہادر کی نظر سے گزرنا اور جو کچھ اس گزرنے کے بعد واقع ہو دریافت کر کے مجھے مطلع فرمائیں۔

کلیات کے انطباع کی جتنی تاریخیں کہی گئیں ان میں سے میر مہدی مجروح کی تاریخ ۱۲۷۸ھ کی ہے، بقیہ سب تاریخیں ۱۲۷۹ھ کی ہیں۔ ایک تاریخ عیسوی ہے جس سے ۱۸۶۳ء نکلتے ہیں[1]۔

مثنوی "ابر گہر بار" | غالب نے شاہنامہ اور سکندر نامہ کی بحر میں غزوات نبوی کو نظم کرنے کا

[1] ۱۲۷۸: از ۹ جولائی ۱۸۶۱ء تا ۲۸ جون ۱۸۶۲ء ۔ ۱۲۷۹: از ۲۹ جون ۱۸۶۲ء تا ۱۸ جون ۱۸۶۳ء معلوم ہوتا ہے کہ میر مہدی مجروح نے پہلے تاریخ لکھ کر بھیجدی تھی اور اس وقت امکان تھا کہ کلیات ۱۸۶۲ء میں چھپ جائے گا۔ باقی تاریخیں بعد میں لکھی گئیں۔

ارادہ کیا تھا۔ لیکن تمہیدات و مقدمات ہی مکمل ہو سکے۔ اس ناتمام مثنوی کا نام "ابر گہر بار" ہے یہ کلیات نظم فارسی میں شامل تھی۔ لیکن ۱۲۸۰ھ (مطابق ۶۴-۱۸۶۳ء) میں حکیم غلام رضا خاں کے اصرار پر اسے الگ چھاپنے کی اجازت دے دی چنانچہ یہ نسخہ اکمل المطابع میں میر فخر الدین کے زیر اہتمام چھپا اس میں دو قصیدے، تین قطعے اور دس رباعیاں بھی شامل کر دیں۔ یہ کلام کلیات کی طباعت کے بعد کہا گیا تھا۔ جب "سبد چیں" چھپی تو یہ اس میں شامل ہو گیا۔

"سبد چیں" غالب کے ان فارسی اشعار کا مجموعہ ہے جو کلیات کی طباعت کے بعد کہے گئے یا نواب ضیاالدین احمد خاں کے فراہم کئے ہوئے اس مجموعہ میں شامل ہونے سے رہ گئے، جو منشی نولکشور کے مطبع میں بغرض طباعت بھیجا گیا تھا۔ غالب خود اسکے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

"سبد چیں" میوہ را گویند کہ پایان موسم بہ شاخسارے ماند و چوں آں را بر چینند شاخسار بے بار ماند۔ ہر آئینہ آنچہ پس از انطباع کلیات فارسی گفتہ شد و آنچہ یاران از دیرین سواد داشتند و من ازاں خبر نہ داشتم و اینک بہ من برساندند در اوراق جداگانہ ضبط کردہ شد۔ و آں را "سبد چیں" نام نہادہ ام۔

آخر میں لکھتے ہیں:

اکنوں کہ ناسور کہن را تراوش نماند کلک از کف فرو گذاشتہ ام۔ سپس اگر سخنے در اندیشہ خواہد گزشت روشناس صفحہ نخواہد گشت۔

یہ مجموعہ ربیع الثانی ۱۲۸۴ھ (اگست ۱۸۶۷ء) میں چھپا۔ بعد میں بہت کمیاب ہو گیا۔ میرے عزیز دوست مالک رام صاحب ایم۔ اے مولف "ذکر غالب" کی سعی سے دوبارہ چھپ گیا ہے۔ اس میں غالب کا مشہور "حبسیہ" بھی ہے۔

پنج آہنگ "پنج آہنگ" غالب کے کلیات نثر کی پہلی کتاب ہے۔ اس کے پانچ حصے ہیں، اسی وجہ سے "پنج آہنگ" نام رکھا گیا۔ حصہ اول میں آداب و القاب وغیرہ ہیں

حصہ دوم میں فارسی لغات کے مصطلحات و مصادر ہیں۔ حصہ سوم میں دیوان غالب سے منتخب اشعار جمع کر دیئے گئے ہیں تاکہ کاتب خط کو کسی مدعا کے لئے کوئی شعر مطلوب ہو تو اس مجموعہ سے فائدہ اٹھا سکے۔ حصہ چہارم میں غالب کی لکھی ہوئی تقریظیں اور مختلف نثریں ہیں۔ حصہ پنجم غالب کے فارسی مکاتیب پر مشتمل ہے۔

کتاب کے دیباچہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۲۴۱ھ (۱۸۲۵ء) میں جب انگریزی لشکر بھرت پور پر حملہ آور تھا تو نواب احمد بخش خاں مرحوم کے دستے کے ساتھ غالب اور میرزا علی بخش خاں رنجور بھی تھے۔ رنجور نے غالب سے درخواست کی کہ :

آداب و القاب متعارف رسمیہ بر دے ہم ریختہ و الفاظ شکر و شکوہ و شادی و غم باہم آمیختہ برائے نامہ نگاران دستور العمل موجزے ساختہ آید۔

غالب اپنے انداز تحریر کے متعلق فرماتے ہیں :

چوں کلک و ورق بہ کف گیرم مکتوب الیہ را بہ لفظے کہ فراخور حالت اوست در سر آغاز صفحہ آواز دہم و زمزمہ سنج مدعا گردم۔ القاب و آداب و خیریت گوئی و عافیت جوئی حشو و زائد است و پختگاں حشو را وقع نہہند . . . . . لیکن خاطر نازک پژدہندہ (میرزا علی بخش خاں) عزیز بود، فرمایش از راہ گوش بہ دل دریافت۔

گویا اس کتاب کے پہلے دو حصے میرزا علی بخش خاں کی فرمایش پر مرتب ہوئے تیسرے اور چوتھے حصہ کی ترتیب میرزا علی بخش خاں نے کی۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں نے نثریں جمع کر لی تھیں۔ اور سب کو مدون کرنا چاہتا تھا۔ لیکن فرصت نہ مل سکی حکیم رضی الدین حسن خاں بھی ترتیب پر مصر تھے۔ نیز مجھے خیال آیا کہ اگر یہ سب چیزیں یکجا ہو جائیں گی تو میرا بیٹا غلام فخر الدین ان سے فائدہ اٹھا سکے گا۔[1]

---

[1] پنج آہنگ صفحہ ۳ و ۴

غدر سے پیشتر "پنج آہنگ" دو مرتبہ چھپ چکی تھی۔ ایک مرتبہ پادشاہی چھاپہ خانہ میں دوسری مرتبہ منشی نورالدین کے چھاپہ خانہ میں۔ غالب منشی شیونرائن کو لکھتے ہیں:

پنج آہنگ تم نے مول لے لی۔ اچھا کیا۔ دو چھاپے ہیں، ایک پادشاہی چھاپہ خانہ کا، ایک منشی نورالدین کے چھاپہ خانہ کا۔ پہلا ناقص ہے، دوسرا سراسر غلط ہے۔

صاحب عالم مارہروی کو لکھتے ہیں:

چھاپے کی پنج آہنگیں اب بھی بکتی ہیں اور معیوب بہ دو عیب ہیں۔ ایک تو یہ کہ جو بعد از انطباع از قسم نثر تحریر ہوا ہے وہ اس میں نہیں دوسرے کاپی نویس نے وہ اصلاح میری نثر کو دی ہے کہ میراجی جانتا ہے اگر کہوں کوئی سطر غلطی سے خالی نہیں تو اغراق ہے بے مبالغہ یہ ہے کہ کوئی صفحہ اغلاط سے خالی نہیں۔

"پنج آہنگ" کے خاتمہ کی عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ منشی نولکشور دہلی آئے تھے۔ تو غالب کی ساری نثریں بغرض طباعت لے گئے تھے۔ یہ مجموعہ پہلی بار جنوری ۱۸۶۸ء میں مطبع نولکشور میں چھپا۔ اس میں "پنج آہنگ" کے علاوہ "مہر نیمروز" اور "دستنبو" بھی شامل ہیں،

"مہر نیمروز" ابوظفر بہادر شاہ نے تیموری خاندان کی تاریخ مرتب کرانے کا ارادہ کیا تھا۔ حکیم احسن اللہ خاں واقعات جمع کرتے تھے۔ غالب اس خدمت پر مامور ہوئے کہ حکیم صاحب کے فراہم کردہ واقعات کو اپنی بہار آفریں عبارت کا لباس پہنا دیں۔ قلعہ کے ساتھ غالب کے تعلقات ملازمت کا آغاز اسی سے ہوا۔ پوری کتاب کا نام "پرتوستان" رکھا گیا تھا۔ اس کے دو حصے تجویز ہوئے تھے حصہ اوّل کا نام "مہر نیمروز" قرار پایا تھا۔ اس میں ابتدائے آفرینش سے لے کر ہمایوں پادشاہ کے انتقال تک مغلیہ خاندان کے پورے حالات لکھے گئے۔ حصہ دوم میں اکبر کی تخت نشینی سے لیکر بہادر شاہ تک کے حالات لکھنے کا فیصلہ تھا۔ اس کا نام "ماہ نیم ماہ"[1] رکھا گیا تھا لیکن یہ شروع بھی نہیں ہوا تھا کہ خاندان مغلیہ کی بساط لپیٹ گئی۔ نواب ضیاءالدین احمد خاں نے "مہر نیمروز" کی

[1] غالب کو اس نام پر بڑا ناز تھا اور یہ واقعہ ہے کہ چودھویں کے چاند کو "ماہ نیم ماہ" سب سے پہلے غالب نے کہا۔

جو تاریخ کہی ہے اس میں طباعت کا سال ۱۲۷۱ھ (مطابق ۱۸۵۴ء) بتایا گیا ہے
یہ ۲ ربیع الاول ۱۲۷۱ھ (مطابق ۲۴ دسمبر ۱۸۵۴ء) کو شائع ہوئی تھی۔

چونکہ "مہر نیمروز" میں "ماہ نیم ماہ" کا بھی ذکر تھا اس لئے شائقین دوسرا حصہ طلب کرتے رہتے تھے۔ غالب لکھتے ہیں:۔

اکثر صاحب اطراف و جوانب سے "ماہ نیم ماہ" کے بھیجنے کا حکم بھیجتے ہیں اور میں جی میں کہتا ہوں کہ جب "مہر نیمروز" کی عبارت نہیں سمجھے تو "ماہ نیم ماہ" کو لے کر کیا کریں گے۔ صاحب! "مہر نیمروز" کے دیباچہ میں میں نے لکھ دیا ہے کہ اس کتاب کا نام "پرتوستان" ہے اور اس کے دو مجلد ہیں پہلی جلد میں ابتدائے خلقت عالم سے ہمایوں کی سلطنت تک کا ذکر، دوسری میں اکبر سے بہادر شاہ تک کی سلطنت کا بیان پہلے حصہ کا نام "مہر نیمروز" دوسرے حصے کا نام "ماہ نیم ماہ" پہلا حصہ چھاپا گیا، جا بجا بھیجا گیا۔ قصد تھا جلال الدین اکبر کے حالات لکھنے کا کہ امیر تمر تک کا نام و نشان مٹ گیا۔

"دستنبو"

"دستنبو" کے متعلق غالب کے مکاتیب میں سب سے زیادہ ذکر ہے بالخصوص ہرگوپال تفتہ

لے میرے پاس "مہر نیمروز" کا یہ نسخہ موجود ہے۔ اس کے کل ۱۱۶ صفحے ہیں ہر صفحہ میں ۱۲ سطریں اور ہر سطر میں قریباً ۱۲ لفظ ہیں۔ سرورق کے پہلے صفحہ پر کتاب کا نام ہے۔ دوسرے صفحے سے کتاب شروع ہو کر ۱۱۳ صفحے پر ختم ہو جاتی ہے صفحہ ۱۱۴۔ اغلاط نامہ کیلئے وقف ہے بقیہ دو صفحوں میں نواب ضیاء الدین احمد خاں کی منظوم تقریظ اور تاریخ طباعت ہے۔ سرورق کی پیشانی پر ولیعہد بہادر کی مہر کا نقشہ ہے پھر یہ عبارت درج ہے۔ بحول و قوت فیاض مطلق جل جلالہ حسب الحکم حضرت سلیمان رفعت فلک بارگاہ انجم سپاہ چشم و چراغ دودمان گورگانی ثانی صاحبقران ثانی سلطان فخر الدین فتح الملک ولیعہد بہادر دام اقبالہٗ این کتاب مستطاب بنام مہر عالم افروز حاوی حالات عالم از ابتدائے آفرینش تا عہد فرمانروائی حضرت نصیر الدین ہمایوں پادشاہ موسوم بہ "مہر نیمروز" کہ از اندیشہ اعجاز پیشہ نواب معلے القاب عطارد نظیر آفتاب ضمیر نوح سفینۂ سخن کلیم طور معنی نجم الدولہ دبیر الملک اسد اللہ خاں بہادر نظام جنگ غالب تخلص مشرق آن است بہ تصحیح و تحشی نواب سابق الالقاب از فخر المطابع باہتمام بندہ درگاہ حافظ عبداللہ بہ پیرایہ انطباع جلوہ گر شد۔

حاتم علی بیگ مہرؔ، شیو نرائن آرام مالک مطبع مفید خلائق آگرہ اور نبی بخش حقیرؔ کے نام کے خطوں میں۔ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے یہ کتاب غدر کے حالات کے متعلق لکھی گئی تھی۔ اور التزام کیا تھا کہ عربی کا کوئی لفظ نہ آئے یہ غدر کی مستقل تاریخ نہیں۔ بلکہ اس میں صرف وہ واقعات درج ہیں، جو غالبؔ کو اور ان سے علاقہ رکھنے والوں کو پیش آئے یا غالبؔ نے سُنے۔ وہ خود لکھتے ہیں،

۱۱ر مئی ۱۸۵۷ء کو یہاں فساد ہوا میں نے اسی دن سے گھر کا دروازہ بند کیا اور آنا جانا موقوف کر دیا بے شغل زندگی بسر نہیں ہوتی۔ اپنی سرگزشت لکھنی شروع کی۔ جو سنا گیا وہ بھی ضمیمہ سرگزشت کرتا گیا۔

غدر کے بعد دلّی میں کوئی مطبع باقی نہیں رہا تھا۔ اس لئے "دستنبو" کو آگرہ میں چھپوانے کا قصد کیا۔ منشی ہرگوپال کو لکھتے ہیں :

میں نے آغاز یازدہم مئی ۱۸۵۷ء سے ۳۱ر جولائی ۱۸۵۸ء تک روداد شہر اور اپنی سرگزشت یعنی پندرہ مہینے کا حال نثر میں لکھا ہے اور التزام اس کا کیا ہے کہ دساتیر کی عبارت یعنی پارسی قدیم لکھی جائے اور کوئی لفظ عربی نہ آئے، جو نظم اس میں درج ہے وہ بھی بے آمیزش لفظ عربی ہے۔ ہاں اشخاص کے نام نہیں بدلے۔ وہ عربی، انگریزی، ہندی جو ہیں لکھ دیئے ہیں، مثلاً تمہارا نام ہرگوپال ہے "منشی" لفظ عربی ہے، نہیں لکھا گیا۔ اس کی جگہ "شیوا زبان" لکھ دیا ہے۔ یہی میرا خط جیسا اس رقعہ کا ہے، یعنی نہ چھدرا، نہ گنجان، اوراق بے مسطر پر اس طرح کہ کسی صفحہ میں بیس سطر، کسی میں بائیس سطر، کسی میں اُنیس سطر آئے۔ چالیس صفحے یعنی بیس ورق ہیں۔ اگر اکیس سطر سے کوئی گنجان لکھے تو شاید دو جزو میں آ جائے۔ یہاں کوئی مطبع نہیں ہے۔ سنتا ہوں ایک ہے اس میں کاپی نگار خوش نویس نہیں۔ اگر آگرہ میں اس کا چھاپا ہو سکے تو مجھ کو اطلاع دو۔ اس تہید ستی اور بے نوائی میں پچیس کا پیں بھی خرید ار ہو سکتا ہوں لیکن صاحب مطبع لینے پر

کیوں ماننے لگا اور البتہ چاہیئے کہ اگر ہزار نہ ہوں تو پانسو جلد تو چھاپی جائے۔ یقین ہے کہ پانسو سات سو چھاپنے کی صورت میں سوا تین آنے چار آنے قیمت پڑے کاپی تو ایک ہی ہوگی۔ رہا کاغذ وہ بھی بہت نہ لگے گا۔ لکھائی متن کی تو آپ کو معلوم ہو گئی حاشیہ پر البتہ لغات کے معنی لکھے جائیں گے۔ بہ ہر حال اگر ممکن ہو تو اس کا تکدمہ کرو اور حساب معلوم کر کے مجھ کو لکھو۔

نواب انور الدولہ کے نام کے ایک خط کا مضمون بھی قریباً یہی ہے، نیز اس میں فرماتے ہیں کہ پندرہ سطر کے مسطر سے چار جزو کی کتاب بنے گی اور مطبع مفید خلائق آگرہ میں چھپنے کو گئی ہے[1]۔

کتاب کا حجم اگرچہ ابتدائی خط میں تفتہ کو لکھا تھا کہ کوئی گنجان لکھے گا تو کتاب دو جزو میں آ جائے گی۔ لیکن آرزو یہ تھی کہ حجم زیادہ ہو۔ وہ خود کہتے ہیں،

میں نے ہرگز نہیں لکھا کہ یہ عبارت دو جزو میں آ جائے۔ میں نے یہ لکھا تھا کہ عبارت اس قدر ہے کہ دو جزو میں آ جائے، لیکن میں یہ چاہتا ہوں کہ حجم زیادہ ہو۔

طباعت میں اہتمام چاہتے تھے کہ کتاب اچھی چھپے۔ تفتہ کے علاوہ منشی نبی بخش حقیر اور میرزا حاتم علی بیگ مہر کو بھی طباعت کے اہتمام میں شریک کر دیا تھا یا غالب کے لفظوں میں ان سب کی کونسل بنا دی گئی تھی[2]۔ کاپی دیکھنے کے ذمہ دار منشی نبی بخش تھے جکام کے لئے چند عمدہ مجلد نسخے مطلوب تھے، جلدوں کے نگران میرزا مہر تھے اور تفتہ کے ذمہ عام اہتمام تھا۔ حقیر کے صاحبزادے منشی عبد اللطیف بڑے اچھے صحاف تھے۔ ان کو جلدوں کی وضع و ہیئت کے متعلق تفصیلی ہدایات بھیج دی تھیں۔ اہتمام کا یہ عالم تھا کہ اگر تفتہ کو ایک بات لکھتے۔ تو وہی بات مہر اور حقیر اور منشی شیو نرائن مالک مطبع کو بھی تحریر فرماتے۔ ایک خط میں تفتہ کو ارشاد فرماتے ہیں،

---

[1] اردوئے معلیٰ صفحہ ۲۴۸ [2] اردوئے معلیٰ ۲۰۷۔

صاحب کبھی نہ کبھی میرا کام تم سے آپڑا ہے اور پھر کام کیساتھ جس میں میری جان الجھی ہوئی ہے اور میں نے اس کو اپنے بہت سے مطالب کے حصول کا ذریعہ سمجھا ہے۔ خدا کے واسطے پہلو تہی نہ کرو اور بہ دل توجہ فرماؤ۔ کاپی کی تصحیح کا ذمہ بھائی (منشی حقیرؔ) کا ہو گیا ہے۔ چھ مجلد کی آراستگی کا ذمہ برخوردار عبداللطیف کا کردو۔ میری طرف سے دُعا کہو اور کہو کہ میں تمہارا بوڑھا اور مفلس چچا ہوں۔ تصحیح بھائی اور تزئین تم کرو۔ کہتا ہوں مگر نہیں جانتا تزئین کیوں کر کی جائے۔ سنتا ہوں کہ چھاپے کی کتاب کے حرفوں پر سیاہی کی قلم پھیر دیتے ہیں تاکہ حرف روشن ہو جائیں۔ سیاہ قلم سے جدول بھی کھچ جاتی ہے۔ پھر جلد بھی پر تکلف بن سکتی ہے۔ بھتیجے کی دستکاری اور صناعی اور ہشیاری میرے کس دن کام آئے گی۔

صحافی اور نقاشی تفتہؔ نے غالباً لکھا تھا کہ صحافی اور نقاشی اپنے سامنے دہلی میں کرا لیجئے۔ جواب میں لکھتے ہیں،

میرزا تفتہ تم بڑے بے درد ہو۔ دلی کی تباہی پر تم کو رحم نہیں آتا۔ بلکہ تم اس کو آباد جانتے ہو۔ یہاں نیچہ بند تو میسر نہیں۔ صحاف اور نقاش کہاں؟ جو شہر آباد ہوتا تو میں آپ کو تکلیف کیوں دیتا؟ یہیں سب درستی میری آنکھوں کے سامنے ہو جاتی۔

جلدوں کے متعلق پھر فرماتے ہیں،

یہ عبارت منشی عبداللطیف کو پڑھا دو۔ میں تو ان کے باپ کو اپنا حقیقی بھائی جانتا ہوں اگر وہ مجھے اپنا حقیقی چچا جانیں اور میرا کام کریں تو کیا عجب ہے۔ دو روپے فی جلد، اس سے زیادہ کا مقدور نہیں۔ جب مجھ کو لکھو گے ہنڈوی بھیج دوں گا۔ چھ روپے آٹھ روپے دس روپے حد بارہ روپے۔ میاں کو سمجھا دینا کلی کی طرف نہ گریں، چیز اچھی ہو۔

"نہیب" کا نہیب غالبؔ نے جو مسودہ بھیجا تھا۔ اس کی حمد یہ عبارت میں یہ فقرہ تھا؛

اے خداوند چنانکہ نیست را ہستی دہ است ہستی پذیر فتہ را نیست ساز نیز تواند بود

آنکہ ہمہ را دریک دم بہ نوید نشو رکن) پدید آورد اگر دردم دیگر بہ نہیب مباش

(نیست ہوجا) بہم زند۔ زہرہ کراست کہ از چون و چرا دم زند۔

"نہیب" عربی لفظ تھا جو غالباً ابتدا میں لکھا گیا۔ نظر ثانی میں اس کی جگہ "نوا" بنا دیا گیا۔ لیکن جو مسودہ طباعت کیلئے آگرہ بھیجا تھا۔ اس میں نہیب ہی درج ہوگیا۔ اس سہو پر وہ بڑے پریشان ہوئے۔ تفتہ کو لکھتے ہیں:

میں منشی شیونرائن کو آج صبح لکھ چکا ہوں۔ تیسرے صفحے کے آخر یا چوتھے کے اول یہ جملہ ہے اگر "دردم دیگر نہیب مباش زند"۔ نہیب کی جگہ نوائے بنا دیا جائے۔ "نہیب" لفظ عربی ہے اگر رہ جائے گا تو لوگ مجھ پر اعتراض کریں گے۔ تیز چاقو کی نوک سے "نہیب" کا لفظ چھیلا جائے اور اسی جگہ "نوائے" لکھ دیا جائے۔

تفتہ کی تحریر سے غالب نے شاید یہ سمجھا تھا کہ نہیب والے ورق چھپ چکے ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں،

نہیب والے دو ورقے چار سو ہوں پانسو ہوں، سب بدلوا ڈالنا۔ کاغذ کا جو نقصان ہو مجھ سے منگوا لینا۔ اس لفظ کے رہ جانے سے ساری کتاب نکمی ہو جائے گی۔ اور میرے کمال کو دھبہ لگ جائے گا۔ یہ لفظ عربی ہے۔ ہر چند مسودہ میں بنا دیا تھا، لیکن کاتب کی نظر سے رہ گیا۔

پھر فرماتے ہیں،

"نہیب" کے نہیب سے مرا جاتا ہوں اس کی درستی کی خبر بھیجو۔

مزید ہدایات

مزید ہدایات دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

واللہ بے مبالغہ کہتا ہوں کہ بھائی منشی نبی بخش صاحب بہ دل متوجہ ہوں تو اگر احیاناً اصل نسخہ میں سہو کاتب سے غلطی واقع ہوئی ہو تو اس کو بھی صحیح کر دیں گے۔ خدا کرے انجام تک یہی قلم یہی خط اور یہی طرز تصحیح چلی جائے۔ جدول مطبوع ہے پہلے

صفحے کی صورت اور دوسرے صفحے کی لوح بھی خدا چاہے تو دل پسند اور نظر فریب
ہوگی۔ کاغذ کے باب میں یہ عرض ہے کہ فرنچ کاغذ اچھا ہے چھ جلدیں جو نذر حکام ہیں
وہ اس کاغذ پر ہوں اور باقی چاہو شیورام پوری اور چاہو نیلے کاغذ پر چھاپو اور یہ بات
کہ دو جلدیں جو ولایت جانے والی ہیں وہ اس کاغذ پر چھاپی جائیں اور باقی شیورام پوری
یا نیلے کاغذ پر، یہ تکلف محض ہے۔ وہاں کے حاکموں نے کیا گیا ہے۔ کہ ان کی نذر کی
کتابیں اچھے کاغذ پر ہوں۔ مگر جو ایسا ہی صرف اور خرچ زائد پڑتا ہو تو خیر دو جلدیں
اس کاغذ پر اور چار جلدیں شیورام پوری پر ہوں، باقی جلدوں میں تمہیں اختیار
ہے۔ ہاں صاحب اگر ہو سکے تو کاپی کی سیاہی ذرا اور سیاہ اور رخشندہ ہو۔
اور آخر تک رنگ نہ بدلے۔

جلدوں کی آرائش معلوم ہوتا ہے کہ مرزا مہر نے جلدوں کی آرائش کا نقشہ غالب کے
پاس بھیجا تھا۔ اس کے متعلق لکھتے ہیں:

سبحان اللہ جلدوں کی آرائش کے باب میں کیا اچھی فکر کی ہے۔ میرے دل میں بھی ایسی
ہی ایسی باتیں تھیں۔ یقین ہے کہ متاع شاہوار ہو جائے گی۔ اہار مہرہ اگر ہو جائے تو
حرف خوب چمک جائیں گے۔ اس کا خیال ان چار جلدوں میں رہے۔ بارہ روپے کی ہنڈوی
پہنچتے ہی روپیہ وصول کر کے مجھے اطلاع دیجئے گا۔ ورنہ میں مشوش رہوں گا۔

ملکہ وکٹوریہ کا قصیدہ اس دوران میں ملکہ وکٹوریہ کی مدح میں ایک قصیدہ بھی کہہ لیا
تھا۔ پہلے خیال تھا کہ قصیدہ علیحدہ ملکہ کی خدمت میں بھیجا جائے اور کتاب علیحدہ جائے۔
پھر یہ رائے ٹھہری کہ قصیدہ بھی کتاب کے ساتھ چھپے۔ چنانچہ میرزا مہر کو لکھتے ہیں:

میں نے حضرت ملکہ معظمہ انگلستان کی مدح میں ایک قصیدہ ان دنوں میں لکھا ہے (مشتمل بر
تہنیت فتح و عملداری شاہی۔ ساٹھ بیت ہے۔ منظور یہ تھا کہ کتاب کے ساتھ قصیدہ ایک
اور کاغذ مذہب پر لکھ کر بھیجوں۔ پھر یہ خیال آیا کہ دس سطر کے مسطر پر کتاب لکھی گئی ہے۔

یعنی چھاپا ہوئی ہے یہ چھ صفحے یعنی تین ورق اور چھپ کر اس کتاب کے آغاز میں شامل جلد ہو جائیں تو بات اچھی ہے آپ اور منشی نبی بخش اور میرزا تفتہ، منشی شیو نرائن سے کہہ کر اسکا طور درست کریں، پھر مجھ کو اطلاع دیں تو میں مسودہ آپ کے پاس بھیج دوں گا۔

میرزا مہر نے غالباً لکھا تھا کہ کیا اسے نثر کا دیباچہ بنا دیا جائے؟ اس کے جواب میں فرماتے ہیں:

قصیدہ کا نثر سے پہلے لگانا از راہ اکرام و اعزاز ہے ورنہ نثر میں اور صنعت اور نظم میں اور انداز ہے یہ اس کا دیباچہ کیوں ہو؟ بلکہ صورت ان دونوں کے اجماع کی یوں ہو کہ سررشتہ آمیزش توڑ دیا جائے اور قصیدہ اور دستنبو کے بیچ میں ایک ورق سادہ چھوڑ دیا جائے۔

مسئلہ سرورق مالک مطبع نے اسی زمانے میں غالب کو خط لکھا تھا جس پر پتہ یوں مرقوم تھا۔ بہ "میرزا نوشہ صاحب غالب"۔ غالب اس پر بہت پریشان ہوئے کہ کہیں کتاب کے سرورق پر بھی نام نہ چھپ جائے۔ تفتہ کو لکھتے ہیں:

آیا "پنج آہنگ" یا "مہر نیمروز" چھاپے کی کوئی کتاب اس شہر میں (آگرہ میں) نہیں پہنچی جو وہ (منشی شیو نرائن) میرا نام دیکھ لیتے؟ صرف اپنی نفرت عرف سے وجہ اس واویلا کی نہیں ہے، بلکہ سبب یہ ہے کہ دلی کے حکام کو تو عرف معلوم ہے مگر کلکتہ سے ولایت تک وزرا کے محکمے میں اور ملکہ عالیہ کے حضور میں کوئی اس نالائق عرف کو نہیں جانتا۔ اگر صاحب مطبع نے "میرزا نوشہ صاحب غالب" لکھ دیا تو میں غارت ہو گیا، کھویا گیا، میری محنت رائیگاں گئی۔ کتاب اور کی ہو گئی۔

کتاب کا اشتہار اس دوران میں غالب نے یہ تحریک بھی کی کہ کتاب کا اشتہار پہلے سے چھپنے لگے:

ہمارے منشی شیو نرائن صاحب اپنے مطبع کے اخبار میں اس کتاب کا اشتہار کیوں نہیں

چھاپتے تاکہ درخواستیں خریداری کی فراہم ہو جائیں۔

کتاب کے مصارف

اندور کے ایک امیر رائے امید سنگھ تھے، جنہوں نے "دستنبو" کی پچاس جلدیں خریدنے کا وعدہ کیا تھا، ساتھ ہی کہہ دیا تھا کہ ان میں سے پچیس جلدیں انہیں دی جائیں بقیہ جلدیں غالب اپنے دوستوں میں تقسیم کر دیں۔ یہی خریداری حقیقت میں "دستنبو" کی طباعت کا ذریعہ بنی تھی۔ مجروح کو لکھتے ہیں :

میاں کیا باتیں کرتے ہو؛ میں کتابیں کہاں سے چھپواتا، روٹی کھانے کو نہیں، شراب پینے کو نہیں۔ . . . . . . منشی اُمید سنگھ اندور والے دلّی آئے تھے۔ سابقہ معرفت مجھ سے نہ تھی۔ ایک دوست ان کو میرے گھر لے آیا۔ انہوں نے وہ نسخہ دیکھا۔ چھپوانے کا قصد کیا۔ آگرہ میں میرا شاگرد رشید منشی ہرگوپال تفتہ تھا، اس کو میں نے لکھا۔ اس نے اس اہتمام کو اپنے ذمہ لیا۔ مسودہ بھیجا گیا۔ آٹھ آنے قیمت ٹھہری۔ پچاس جلدیں منشی امید سنگھ نے لے لیں۔ پچیس روپے چھاپے خانے میں بہ طریق ہنڈی بھجوا دیئے۔ صاحب مطبع نے بہ شمول سعی منشی ہرگوپال تفتہ چھاپنا شروع کیا۔ آگرہ کے حکام کو دکھایا۔ اجازت چاہیئے ہے حکام نے بہ کمال خوشی اجازت دے دی۔ پانسو جلد چھاپی جاتی ہے۔ اس پچاس جلد میں سے پچیس جلد منشی امید سنگھ کو دیں گے۔ میں عزیزوں میں بانٹ دوں گا۔

ممانعت طبع کا اعلان

غالب کو کتاب کے حقوق محفوظ کرنے کا بھی بڑا خیال تھا۔ چنانچہ لکھتے ہیں کہ کتاب کے آخر میں ممانعت طبع کا اعلان کر دیا جائے۔ پھر تفتہ اور شیو نرائن کی فرمائش پر خود یہ عبارت تجویز کر بھیجی :

نامہ نگار غالب خاکسار کا یہ بیان ہے کہ یہ جو میری سرگزشت کی داستان ہے۔ اس کو میں نے مطبع مفید خلائق میں چھپوایا ہے اور میری رائے میں اس کا قاعدہ یہ قرار پایا ہے کہ اور صاحب مطبع جب تک مجھ سے طلب رخصت نہ کریں اپنے مطبع میں چھاپنے کی جرأت نہ کریں۔

منقش و مجلد نسخے

میرزا مہر نے صحافی اور نقاشی کے لئے جو کتابیں رکھ لی تھیں وہ پہنچیں تو غالب بہت خوش ہوئے۔ فرماتے ہیں :۔

بھائی جان! کل جو جمعہ روز مبارک و سعید تھا، گویا میرے حق میں روز عید تھا۔ وقت شام

ساتھ جلدوں کا پارسل پہنچا

واہ کیا خوب بر محل پہنچا

. . . . . . میری آرزو ایسی بر آئی کہ وہ برتر از وہم و خیال ہے۔ یہ بتاؤ تو میرے تصور میں بھی نہیں گزرتا تھا۔ میں تو صرف اس قدر خیال کرتا تھا کہ جلدیں بندھی ہوئی۔ دو کی لوحیں زریں اور پانچ لوحیں سیاہ قلم کی ہوں گی، واللہ اگر تصور میں بھی گزرتا ہو کہ کتابیں اس رقم کی ہوں گی۔

"دستنبو" کہاں بکی

بہر حال غالب نے "دستنبو" کی جلدیں حکام اور دوستوں میں تقسیم کیں ایک مکتوب سے جو اپریل ۱۸۵۹ء کا مرقومہ ہے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک "دستنبو" کا پہلا ایڈیشن ختم ہو چکا تھا۔ غالب کا خیال تھا کہ "دستنبو" یا تو انگریزوں نے زیادہ خریدی ہوگی یا اہلِ پنجاب نے منشی شیو نرائن سے استفسار کیا تو انہوں نے بتایا کہ زیادہ تر پنجاب والوں ہی نے خریدی۔ اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن غالب کی اجازت سے ۱۸۶۵ء میں لٹریری سوسائٹی روہیلکنڈ کے مطبع واقع بریلی میں چھپا تیسرا ایڈیشن بھی اسی مطبع نے ۱۸۷۱ء میں چھاپا۔ اس کے بعد میرے علم کے مطابق "دستنبو" الگ شائع نہیں ہوئی۔ میرے پاس ۱۸۷۱ء والا ایڈیشن ہے۔

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے۔ پنج آہنگ، مہر نیمروز اور "دستنبو" کے مجموعہ کا نام کلیات نثر ہے۔ یہ کلیات پہلی بار ۱۸۶۸ء میں چھپا تھا۔ تیسری بار ۱۸۸۴ء میں شائع ہوا۔ اس کے بعد غالباً کوئی ایڈیشن نہیں چھپا۔

"قاطع برہان"

اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ غدر کے دنوں میں غالب خانہ نشین ہو گئے تھے

ہنگامہ فرو ہو جانے کے بعد شہر والوں بالخصوص مسلمانوں پر مدت تک جو گوناگوں مصیبتیں نازل ہوئیں۔ ان کا نقشہ غدر کے باب میں پیش کیا جا چکا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس زمانے میں دوستوں کی صحبتوں سے بڑی حد تک محروم ہو گئے تھے۔ اور ان کا زیادہ وقت تنہائی میں گزرتا تھا۔ کچھ مدت تک وہ "دستنبو" کی ترتیب میں مصروف رہے۔ اس سے فراغت پائی تو مطالعہ کے سوا وقت گزاری کا اور کوئی ذریعہ نہ تھا۔ ان کے پاس صرف "برہان قاطع" تھی جو فارسی لغات کی ایک مشہور کتاب ہے۔ اور جس کے مؤلف محمد حسین ہیں۔ یہ تبریزی مشہور تھے۔ اس لئے کہ ان کے آباؤ اجداد تبریز سے ہندوستان آئے تھے۔ لیکن وہ خود ہندوستان میں پیدا ہوئے اور دکن میں ان کی ساری عمر گزری اسی وجہ سے غالب ان کو جا بجا "دکنی" کہتے ہیں۔

"برہان" کو دیکھتے دیکھتے اس میں جو غلطیاں نظر آئیں ان کے متعلق کتاب کے حاشیے پر اشارات لکھتے گئے[1]۔ اس طرح ایک اچھے رسالے کا مواد فراہم ہو گیا۔ جسے غالب نے اپنے شاگردوں اور عام فارسی دانوں کے فائدے کے لئے ایک کتاب کی صورت میں مرتب کر دیا۔ وہ خود فرماتے ہیں:

ہرگاہ غم تنہائی زور آورد روئے "برہان قاطع" را نگرستے۔ چوں آں سفینہ گفتارہائے نادرست داشت و مردم را از راہ مے برد من آئین آموزگاری داشتم بر پیرداں خودم دل سوخت جادہ نمایاں ساختم تا بے راہہ نپو یند

غالب نے اپنی کتاب کا نام "قاطع برہان" رکھا۔ یہ ۱۲۷۶ھ (مطابق ۱۸۶۰ء) میں مکمل ہوئی۔ وہ خود فرماتے ہیں:۔

---

[1] "برہان قاطع" کے جس نسخہ سے غالب نے "قاطع برہان" مرتب کی تھی اور جس کے حاشیہ پر ان کے لکھے ہوئے اشارات ہیں، وہ اس وقت والی لوہارو کے ذاتی کتب خانہ میں موجود ہے۔

یافت چوں گوشمال زیں تحریر　　آنکہ "برہان قاطعش" نام است
شد مسمّٰی بہ "قاطع برہان"　　"دُرسِ الفاظ" سال اتمام است

اُردو کے ایک خط میں غدر کا ذکر کرتے ہوئے صاحب عالم مارہروی کو لکھتے ہیں:

اس درماندگی کے دنوں میں چھاپے کی "برہان قاطع" میرے پاس تھی۔ اس کو میں دیکھا کرتا تھا، ہزارہا لغت غلط، ہزارہا بیان لغو، عبارت پوچ، اشارت پادر ہوا، میں نے سو دو سو لغت کے اغلاط لکھ کر ایک مجموعہ بنایا ہے اور "قاطع برہان" اس کا نام رکھا ہے۔ چھپوانے کا مقدور نہ تھا۔ مسودہ کاتب سے صاف کروا لیا ہے۔ اگر کہو تو بہ سبیل مستعار بھیج دوں۔ تم اور چودھری صاحب[۲] اور جو اور سخن شناس اور منصف ہوں اس کو دیکھیں اور پھر میری کتاب میرے پاس پہنچ جائے۔

"قاطع کی طباعت" "قاطع" ۱۲۷۸ھ (۱۸۶۲ء) میں چھپی۔ ایک خط سے معلوم ہوتا ہے نواب یوسف علی خاں والی رام پور نے اس غرض کے لئے دو سو روپے مرحمت فرمائے تھے[۳] لیکن "قاطع" کے خاتمہ پر غالب نے جو عبارت لکھی اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کتاب منشی نولکشور کی توجہ اور مہربانی سے چھپی تھی:

اگر ایں جوانمرد بیدار دل بہ بستن شیرازہ اوراق پریشان نہ پرداختے، کاغذ مسودات "قاطع برہان" را یا کاغذ گر بُردے و بآب آغشتہ فردِ کوفتے یا سرمہ فروش خریدے تا چکسہ[۵] ہا ساختے[۶]

بہ ہر حال "قاطع" نولکشور کے مطبع میں چھپی اور ایک روپیہ اس کی قیمت ٹھہری غالب مجروح کو لکھتے ہیں:

"قاطع برہان" کا چھاپا ختم ہوا۔ ایک جلد بہ طریق نمونہ آ گئی۔ میں نے پچاس جلدوں کی درخواست پہلے سے دے رکھی ہے۔ اب پچاس روپے بھیجوں تو پچاس جلدیں منگاؤں۔ دیکھئے نو من

---

[۱] ۱۲۷۶ھ [۲] چودھری عبد الغفور سرور [۳] خواجہ حالی نے فرمایا کہ "قاطع برہان" پہلی مرتبہ ۱۲۷۶ھ میں شایع ہوئی۔ دوسری مرتبہ اسے ۱۲۷۸ھ میں باضافہ دیگر مضامین و فوائد چھاپا گیا۔ یہ دونوں تاریخیں غلط ہیں [۴] اُردوئے معلّٰی صفحہ ۱۳ [۵] کاغذ بنانے والا [۶] پڑیاں۔

تیل کب میسر آئے اور رادھا کب ناچے۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نواب یوسف علی خاں نے جو دو سو روپے سلسلہ طباعت "قاطع" بھیجے تھے دوسری ضروریات میں صرف ہو گئے۔ کتاب منشی نولکشور نے چھاپ دی اور غالب کو پچاس جلدیں خریدنے کیلئے روپیہ کا انتظام کرنا پڑا۔

"قاطع" کی مخالفت کا طوفان

ہندوستان کے عام فارسی دانوں کے متعلق غالب کی سخت رائے نے ۱۸۲۹ء میں ان کے خلاف کلکتہ میں جو ہنگامہ بپا کیا تھا وہ "قاطع برہان" کی اشاعت پر زیادہ شدت و وسعت کے ساتھ دوبارہ اُبل پڑا اور غالب کو تادمِ زیست اس سے نجات نہ ملی۔ خواجہ حالی نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ اس زمانے میں تقلید نہ محض مذہب میں بلکہ ہر فن ہر کام اور ہر چیز میں اس درجہ ضروری ہو گئی تھی کہ تحقیق کا خیال نہ خود کسی کے دل میں خطور کرتا تھا اور نہ کسی دوسرے کو اس قابل سمجھا جاتا تھا کہ وہ سلف کے خلاف کوئی بات زبان پر لائے[1]۔ چنانچہ "قاطع" کے شائع ہوتے ہی جامد خیال مقلدوں کے لشکر غالب کے خلاف صفیں باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ ان میں سے کوئی یہ سوچنے کیلئے تیار نہ تھا کہ غالب نے کیا لکھا ہے یا اصول فارسی کے لحاظ سے اس کی حقیقی حیثیت کیا ہے۔ سب محض اس وجہ سے جوش میں آ گئے کہ غالب کو صاحب "برہان قاطع" کے خلاف زبان کشا ہونے کی جرأت کیونکر ہوئی؟ اس سلسلے میں غریب غالب نے چھوٹے پیمانے پر وہ تمام مصیبتیں اور اذیتیں برداشت کیں، جو تقلید و جمود کے راستے سے الگ ہو کر چلنے والوں کو ہر عہد اور ہر دائرے میں ہمیشہ پیش آتی رہی ہیں،

"قاطع" کی داد کیلئے پانچ اوصاف کی ضرورت

غالب نے ایک جگہ لکھا ہے کہ جس شخص میں پانچ

---

[1] یادگار غالب صفحہ ۴۲

باتیں ہوں گی وہ "قاطع برہان" کی داد دیگا ورنہ عام آدمی محض "برہان قاطع" کے نام پر جائیں قربان کرنے کیلئے آمادہ ہوجائیں گے۔ پانچ باتیں یہ ہیں :

(۱) عالم ہو۔

(۲) فن لغت کو جانتا ہو۔

(۳) فارسی زبان کا کافی علم رکھتا ہو۔ اس زبان سے اسے لگاؤ ہو، اساتذہ سلف کا کافی کلام دیکھ چکا ہو اور اسے کچھ یاد بھی ہو۔

(۴) منصف مزاج ہو، ہٹ دھرم نہ ہو۔

(۵) طبع سلیم اور ذہن مستقیم رکھتا ہو، معوج الذہن اور کج فہم نہ ہو۔

مخالفین کے ایرادات | "قاطع" کے چھپتے ہی جو حالت پیدا ہوگئی، اس کا نقشہ غالب مندرجہ ذیل لفظوں میں پیش کرتے ہیں :

معتقدانِ "برہان قاطع" برچھیاں اور تلواریں پکڑ پکڑ کے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں ہنوز دو اعتراض مجھ تک پہنچے ہیں۔ ایک تو یہ کہ "قاطع برہان" غلط ہے، یعنی ترکیب خلاف قاعدہ ہے۔ برہان "قاطع" نہیں ہوسکتی۔ لو صاحب "برہان قاطع" صحیح اور "قاطع برہان" غلط۔ برہان قطع کی فاعل ہوسکتی ہے۔ اور قطع کا محل آپ قبول نہیں کرتی۔ "قاطع برہان" میں جو برہان کا لفظ ہے مخفف "برہان قاطع" ہے۔ "برہان قاطع" کے رد کو قطع سمجھ کر "قاطع برہان" نام رکھا تو کیا گناہ ہوا۔ دوسرا ایراد یہ ہے کہ "با انگلشیان ستیز بے جا"[1] انگلش کا نون تلفظ میں نہیں آتا

---

[1] غالب نے "قاطع" کے آغاز میں ترتیب کتاب کی سرگزشت بیان کرتے ہوئے غدر کے ذکر میں ایک قطعہ لکھا تھا جس کے ایک مصرعہ پر محولہ بالا اعتراض ہوا۔ قطعہ یہ ہے :

چوں کرد سپاہ ہند در ہند | با انگلشیان ستیز بے جا
تاریخ وقوع ایں وقائع | واقع شدہ رستخیز بے جا

میں پوچھتا ہوں خدا کے واسطے انگلش اور انگریز کا نون بہ اعلان کہاں ہے؟ اگر ہے بھی تو ضرورت شعر کے واسطے۔ لغات عربی میں سکون و حرکت کو بدل ڈالتے ہیں اگر انگلش کے نون کو غنہ کر دیا تو کیا گناہ ہوا؟

دوسری جگہ فرماتے ہیں:

"قاطع برہان" کا لکھنا کیا ہے گویا باسی کڑھی میں اُبال آیا ہے۔ لکھنا کیا ہے سہام ملامت کا ہدف ہوا کہ یہ تنگ مایہ معارض کا بر سلف ہوا۔ ایک صاحب فرماتے ہیں کہ "قاطع برہان" کی ترکیب غلط ہے۔ میں کہتا ہوں کہ "برہان قاطع" اور "قاطع برہان" کی ایک نمط ہے۔ برہان قاطع نے کیا لٹھا بنو، نین سکھ قطع کیا ہے، جو آپ نے اس کو قاطع کا لقب دیا ہے؟ برہان جب تک غیر کے کسی برہان کو قطع نہ کرے کیونکر "برہان قاطع" کا نام پائے گی؟ "برہان قاطع" کی صحت میں جتنی تقریر کیجیے گا۔ وہ "قاطع برہان" کی صحت ہونے کے کام آئے گی۔

مخالف و موافق کتابیں "قاطع برہان" کی مخالفت میں جو کتابیں لکھی گئیں ان کی فہرست میری تحقیقات کے مطابق یہ ہے:

(۱) "محرق قاطع" مؤلفہ مولوی سعادت علی۔

(۲) "ساطع برہان" مؤلفہ میرزا رحیم بیگ۔

(۳) "قاطع القاطع" مؤلفہ مولوی امین الدین پٹیالوی۔

(۴) "مؤید برہان" مؤلفہ مولوی آغا احمد علی۔

غالب نے اور غالب کے دوستوں اور مؤیدوں نے جواب میں جو رسالے لکھے ان کے نام یہ ہیں:

(۱) دافع ہذیان" مؤلفہ مولوی نجف علی۔

(۲) "لطائف غیبی"۔

(۳) "سوالات عبدالکریم"۔

(۴) "نامۂ غالب" مؤلفہ غالب۔

(۵) "تیغ تیز" مؤلفہ غالب۔

محرق قاطع | یہ پہلی کتاب ہے جو "قاطع" کے جواب میں لکھی گئی۔ اس کے مؤلف مولوی سعادت علی پہلے راجپوتانہ ریزیڈنسی میں میر منشی تھے، پنشن لیکر دہلی میں مقیم ہو گئے کتاب فارسی میں ہے، خاتمہ کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ مؤلف نے یکم محرم الحرام ۱۲۸۰ھ (۱۸ جون ۱۸۶۳ء) کو جمعہ کے دن اس کی تسوید سے فراغت پائی۔ ۱۸۶۴ء میں یہ شاہدرہ (دہلی) کے مطبع احمدی میں چھپی۔ ضخامت ۹۶ صفحے ہے۔ میں نے مطبوعہ کتاب نہیں دیکھی۔ اس کی نقل میرے پاس موجود ہے۔ شیخ احمد کاتب نے تاریخ طبع میں مندرجہ ذیل قطعہ کہا:

آنکس کہ ز اقوال بزرگان سر تافت — حرف تشنیع در حق ایناں بنگاشت

مے داں بحق خویشتن امروز آں حرف — دیروز کہ از پئے کسانہا پنداشت

اس میں بقول مصنف "صنعت یہ ہے کہ چار مصرعوں کے پہلے حرف جوڑے جائیں، تو صاحب قطعہ کا نام بن جاتا ہے اور چار مصرعوں کے آخری حرفوں کے اعداد جمع کئے جائیں تو تاریخ طبع (سنہ ۱۲۸۰ھ) نکل آتی ہے۔ ویسے قطع کی مہملیت محتاج بیان۔ اس کتاب کے متعلق غالب منشی حبیب اللہ خاں ذکا کو لکھتے ہیں،

اہاہا "محرق قاطع" کا تمہارے پاس پہنچنا ع

کامے کہ خواستم ز خدا شد میسرم

میں اس خرافات کا جواب کیا لکھتا۔ مگر ہاں سخن فہم دوستوں کو غصہ آ گیا، ایک صاحب نے فارسی میں اس کے عیوب ظاہر کئے[1]۔ دو طالب علموں نے اردو میں دو رسالے جدا جدا لکھے[2]

---

[1] دافع ہذیان مؤلفہ مولوی نجف علی   [2] لطائف غیبی اور سوالات عبدالکریم

دانا ہو اور منصف ہو۔ محرق کو دیکھ کر جانو گے کہ مؤلف اس کا احمق ہے اور جب وہ
احمق "دافع ہذیان"۔ "سوالات عبدالکریم" اور "لطائف غیبی" کو پڑھ کر متنبہ نہ ہوا اور "محرق"
کو ڈھونڈ ڈالا تو معلوم ہوا کہ بے حیا بھی ہے "دافع ہذیان" "سوالات" "لطائف غیبی"
تینوں نسخے ایک پارسل میں اس خط کے ساتھ روانہ ہوتے ہیں۔ یقین ہے کہ
بہ تقدیم و تاخیر دو روز نظر انور سے گزریں۔

یہ خط ۲۸ نومبر ۱۸۶۴ء کا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ "محرق قاطع" کی طرح اس کے جواب میں جو رسائل لکھے گئے تھے وہ بھی ۱۸۶۴ء ہی میں چھپ گئے تھے۔

دافع ہذیان "محرق قاطع" کے جواب میں پے در پے تین رسالے لکھے گئے۔ جیسا کہ محولہ بالا خط سے ظاہر ہے: "دافع ہذیان" فارسی میں "لطائف غیبی" اور "سوالات عبدالکریم" اردو میں۔ "دافع" کے مصنف سید نجف علی تھے جو غالباً جھجھر کے رہنے والے تھے۔ یہ فارسی اور عربی کے فاضل تھے۔ دساتیر کی ایک فرہنگ بھی لکھی تھی جو ۱۸۶۴ء میں شائع ہوئی۔ اس پر غالب نے تقریظ رقم فرمائی جو فرہنگ کے ساتھ چھپ گئی مگر دوسری تقریظوں کی طرح کلیات نثر فارسی میں شامل نہ ہو سکی۔

"دافع" کی ضخامت صرف ۲۸ صفحے ہے یہ ۱۲۸۱ھ د ۱۸۶۴ء میں اکمل المطابع دہلی سے شائع ہوئی۔ ذکا حیدرآبادی نے غالب کی وساطت سے ایک خط مولوی سید نجف علی کو بھیجا تھا۔ اس پر ذکا کو لکھتے ہیں:

ہاں صاحب خط دیروزہ کے ساتھ ایک خط مولوی نجف علی صاحب کے نام کا مع اس حکم کے کہ "میں اس کو مولوی صاحب کے پاس پہنچاؤں" میں نے پایا۔ حال یہ ہے کہ مولوی صاحب سے میری ملاقات نہیں۔ صرف اتحاد معنوی کے اقتضا سے "دافع ہذیان" لکھ کر انہوں نے فن سخن میں مجھ کو مدد دی ہے۔ منشی گوبند سنگھ دہلوی ایک ان کے شاگرد اور میرے آشنا ہیں۔ ان کو یہ خط بجنسہ بھیج دیا۔ یقین ہے کہ وہ مولوی نجف علی صاحب کو بھجوا دیں گے

انہی کے اظہار سے دریافت ہوا ہے کہ مولوی صاحب مرشد آباد بنگالہ میں ہیں۔ نواب ناظم نے نوکر رکھ لیا ہے۔

لطائف غیبی اور سوالات عبدالکریم

لطائف غیبی ۴۴ صفحے کا اردو رسالہ ہے جسے سیف الحق میاں داد خاں سیاح کی تصنیف ظاہر کیا گیا ہے لیکن میرے نزدیک یہ رسالہ یا تو شروع سے آخر تک غالب کی تصنیف ہے یا سیاح کی عبارت میں اتنا تصرف کیا گیا ہے کہ اسے غالب ہی کی تصنیف سمجھنا چاہیئے۔ عبارت کی روانی اور تعریضات کی شوخی میں غالب کا رنگ بہت نمایاں ہے۔ سیاح کی نگارش کا ڈھنگ اور تھا جیسا کہ ان کی "سیر سیاح" سے جو غالباً ۱۸۷۲ء میں چھپی تھی، ظاہر ہے۔ شہادت کے طور پر "لطائف" کے مندرجہ ذیل اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں۔

سعادت علی صاحب جامع "محرق" کی نسبت ارشاد ہوتا ہے:

کوئی شخص ہے رعایائے دہلی میں سے کہ کبھی کسی زمانے میں کسی محکمہ انگریزی کا سررشتہ دار ہو گیا تھا اور اب خانہ نشین ہے، موسوم بہ منشی سعادت علی، نہ نثر سے واقف، نہ نظم سے آگاہ، نہ عقل کا سرمایہ، نہ علم کی دستگاہ، کسی گاؤں میں، کسی بستی میں، کسی گھاٹ پر، کسی باٹ پر اس بزرگ کا نام کسی سے نہیں سنا۔

پھر ارشاد ہوتا ہے:

اہل نظر "قاطع" و "محرق" کو باہم دیکھیں گے تو قاطع کی عبارتیں موتی کی لڑیاں نظر آئیں گی اور "محرق" کی نثریں ماش کی بڑیاں نظر آئیں گی۔ ہمارے منشی صاحب از روئے علم و فن منشی نہیں ہیں، از روئے پیشہ و حرفت منشی ہیں جیسے منشی بھیروں ناتھ اور منشی گینڈا مل۔

لطیفہ دوم میں فرماتے ہیں:

اے صاحبان فہم و انصاف عبارت "محرق قاطع برہان" کو دیکھا چاہیئے۔ خلط مبحث،

اطناب ممل، سوء ترکیب، تباہی روزمرہ، غلطی فہم اس سے مجھے کچھ کام نہیں۔ بھلا عامیان معوج الذہن کی نثر اور کیسی ہوگی۔ خالصاً للہ یہ بتاؤ کہ یہ مناظرہ ہے یا پھکڑ، صاف معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہیجڑا تالیاں بجا کر گالیاں دیتا ہے یا ایک سڑی کو کسی نے چھیڑ دیا ہے، وہ فحش بک رہا ہے۔

کتاب میں بعض مطالب ایسے آئے ہیں جن کے متعلق صحیح واقفیت صرف غالب ہی کو ہو سکتی تھی۔ مثلاً منشی سعادت علی نے ایک موقع پر لکھا تھا، یا محرق میں چھپ گیا تھا "من ایں قدر قلم را چرا سود" اس کے جواب میں "لطائف غیبی" مظہر ہے کہ قلم کے واسطے "فرسودن" ہوتا ہے، نہ کہ "سودن" ایک دوست نے کہا:

منشی جی نے خفا ہو کر قلم کو سرمہ کی مانند پیس ڈالا ہوگا۔ میں نے کہا کہ "من" کی خبر سودُ بھلا اس کی کوئی وجہ اور تاویل کرو؟ "سودم" کی جگہ "سود" کے کیا معنی؟ اس ظریف نے کہا کہ "سودم" میں "دم" کی صورت پائی جاتی ہے اور منشی جی "بے دم" ہیں "من" جو حرف متکلم کا ہے، یہ دم کے ساتھ آتا تو خدانخواستہ منشی جی دمدار بن جاتے۔

اس کے بعد لطیفہ لکھتے ہیں:

شاہ عباس ثانی پادشاہ ایران کے عہد میں حکیم شفائی اصفہانی بڑا شیوہ بیان اور ہمہ دان شاعر تھا۔ مومن خان یوزباشی میں اور اس میں عداوت پیدا ہوئی۔ حکیم شفائی نے اس کی ہجویں لکھیں ازاں جملہ ایک ترکیب بند نے بڑی شہرت پائی اور قبول طبع خاص و عام ہوا۔

اس ترکیب بند کے پہلے دو شعر درج کر کے لکھتے ہیں:

...... اوباش اصفہان ہر رہگزر میں دف و چنگ کے ساتھ اس ترکیب بند کو گاتے پھرتے تھے۔ مومن خان سن کر خفا ہوتا تھا، مگر اس طائفہ بے نام و ننگ سے کیا کہہ سکتا تھا۔ ناچار اپنے گھر بیٹھ رہا اور دروازہ بند کر لیا۔ اس جماعت نے اس کے در دولت پر شد و مد سے گانا شروع کیا۔ پایان کار مومن خاں اپنے پیٹ

میں چھری مار کر مر گیا۔

میں ڈرتا ہوں منشی جی بھی ان لطائف کو دیکھ کر کہیں اپنے کو ہلاک نہ کر یں۔ اس بزرگ نے فرمایا کہ میاں دادخاں یہ کام ہے غیرت والوں کا، منشی جی کی طرف یہ احتمال بے جا ہے۔

غرض میری رائے میں یہ کتاب غالب کی تصنیف ہے، اگرچہ میاں دادخاں سیاح کے نام سے چھپی۔

سوالات عبد الکریم صرف آٹھ صفحے کا مختصر سا رسالہ ہے یہ بھی اردو میں ہے اور غالب ہی کا لکھا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ یہ دونوں رسالے اکمل المطابع میں چھپے تھے غالب کے بیان کے مطابق صاحب مطبع نے فروخت کیلئے چھاپے تھے۔ لطائف کی قیمت آٹھ آنے تھی غالب لکھتے ہیں:

لطائف غیبی کی پندرہ جلدیں سات روپے آٹھ آنے دام بھیج کر منگوائیں یہ جو میں نے سیف الحق کا خطاب دیا ہے، اپنی فوج کا سپہ سالار مقرر کیا ہے۔ تم میرے ہاتھ ہو، میرے بازو ہو، میرے نطق کی تلوار تمہارے ہاتھ سے چلتی رہے گی "لطائف غیبی" نے اعدا کی دھجیاں اُڑا دیں۔

"ساطع برہان" "دافع ہذیان" کے بعد "قاطع برہان" کی مخالفت میں دوسری کتاب "ساطع برہان" لکھی گئی۔ یہ بھی فارسی میں ہے۔ ۱۷۴ صفحے ضخامت ہے۔ سنہ ۱۲۸۲ھ میں مطبع ہاشمی میں چھپی تھی۔ اس کے مصنف میرزا رحیم بیگ تھے جو مولانا امام بخش صہبائی کے شاگرد تھے میرٹھ میں مکتب پڑھاتے تھے۔ آخری عمر میں بینائی جاتی رہی تھی غالب لکھتے ہیں،

رحیم بیگ کا اصل وطن سردھنہ ہے اور فی الحال میرٹھ میں مقیم اور معلمی اس کا پیشہ ہے۔ وہ آٹھ دس برس سے اندھا، نظم و نثر میں مولوی امام بخش صہبائی کا شاگرد اور فارسی شعر کہتا ہے۔

سیاح کو لکھتے ہیں :۔

وہ جو ایک اور کتاب کا تم نے ذکر لکھا ہے وہ ایک لڑکے پڑھانے والے ملائے کتب دار کا خبط ہے . . . . رحیم بیگ اس کا نام میرٹھ کا رہنے والا، کئی برس سے اندھا ہو گیا ہے. باوجود نابینائی کے احمق بھی ہے۔ اس کی تحریر میں نے دیکھی۔ تم کو بھی بھجواؤں گا. مگر ایک بڑے مزے کی بات ہے کہ اس میں بیشتر وہ باتیں ہیں جن کو "لطائف غیبی" میں رد کر چکے ہو۔ بہ ہر حال اب اس کے جواب میں فکر نہ کرنا۔

مولوی عبدالرزاق شاکر کو لکھتے ہیں :۔

"نامۂ غالب" کا مکتوب الیہ رحیم بیگ نامی میرٹھ کا رہنے والا ہے۔ دس برس سے اندھا ہو گیا ہے. کتاب پڑھ نہیں سکتا، سن لیتا ہے. عبارت لکھ نہیں سکتا، لکھوا دیتا ہے۔ بلکہ اس کے ہم وطن کہتے ہیں کہ وہ قوت علمی بھی نہیں رکھتا، اوروں سے مدد لیتا ہے اہل دہلی کہتے ہیں کہ مولوی امام بخش صہبائی سے اس کو تلمذ نہیں ہے اپنا اعتبار بڑھانے کو اپنے کو ان کا شاگرد بتاتا ہے. میں کہتا ہوں کہ وائے اس ہیچ پوچ پر جس کو صہبائی کا تلمذ موجب عز و وقار ہو۔

"نامۂ غالب" | نامۂ غالب" میرزا رحیم بیگ مصنف "ساطع برہان" کے نام اُردو میں لکھا گیا تھا. غالب نے اس کے تین سو نسخے دہلی کے مطبع محمدی میں چھپوا کر اپنے دوستوں میں تقسیم کر دیئے تھے. فرماتے ہیں :

"نامۂ غالب" صاحب مطبع نے اپنی بکری کے واسطے نہیں چھاپے جو میں مول لے کر بھیجوں اور تم سے ان کی قیمت مانگ لوں. میں نے آپ تین سو جلد چھپوائی دوستوں کو دور نزدیک بانٹ دی۔ آج یک شنبہ ہے پارسل روانہ نہ ہو گا جتنے یہ نسخے میرے پاس ہیں، کل تمہیں بھجوا دوں گا۔

یہ خط ۱۷ ستمبر ۱۸۶۵ء کا ہے بعض قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ "نامۂ غالب" اگست ۱۸۶۵ء میں چھپا ہوگا مستقل طور پر چھپ جانے کے بعد یہ اودھ اخبار کے دو نمبروں (۱۰ اکتوبر و ۱۷ اکتوبر ۱۸۶۵ء) میں بھی شائع ہوا تھا۔ ایڈیٹر نے اس پر جو تمہیدی عبارت لکھی تھی۔ ذیل میں درج ہے:

جناب ممدوح (غالب) نے ایک کتاب "قاطع برہان" میں اکثر لغات و محاورات کے موارد استعمال کی تصحیح اور اغلاط کتاب "برہان" کی بہ عبارت دلچسپ اصلاح فرمائی۔ اس پر بعض حسود کوتہ اندیش نے بہ مقتضاے کور باطنی جبلی اور نیز بہ اُمید اس کے کہ ایسے کامل الفن طوطیٔ ہند کے مقابلے میں کچھ تھوڑی چیں چیں کر کے عوام کالانعام کی نظروں میں کسی طرح سرخروئی حاصل کریں، بجائے داد کے بیداد کیا کہ تردید کلام بلاغت نظام میں محنت بے جا اٹھائی مگر لطیف الطبع میاں داد خاں صاحب سیاح رفیق سید غلام بابا صاحب رئیس سورت نے ان تشکیلات کو بہ براہیں شایستہ رفع کیا۔ اسی طرح میرزا رحیم بیگ نامی کو بھی خلل دماغ ہوا تھا، ان کی اصلاح مزاج کے واسطے حضرت (غالب) نے خود توجہ فرمائی چنانچہ وہ نامۂ بلاغت آگین میں بجنسہ درج ذیل ہے۔

"قاطع القاطع" "قاطع" کے جواب میں تیسری کتاب امین الدین پٹیالوی نے لکھی جو ۱۲۸۳ھ (۱۸۶۶ء) میں مطبع مصطفائی میں طبع ہوئی۔ یہ ۲۶۸ صفحے کی کتاب ہے اس کا مصرعہ تاریخ یہ ہے:

شمشیر آبدار زبانِ امین دین

اس کتاب کے سلسلے میں امین الدین کے خلاف غالب نے ازالۂ حیثیت عرفی کا دعوے دائر کیا تھا۔ خواجہ حالی فرماتے ہیں کہ جب کامیابی کی امید نہ رہی تو انھوں نے راضی نامہ داخل کر دیا۔ اثناء تحقیقات میں دہلی کے بعض اہل قلم عدالت میں بلائے گئے انھوں نے ملزم کو سزا سے بچانے کیلئے زیر تحقیقات فقروں کے ایسے معنی بیان کئے

جن سے ملزم پر کوئی الزام عائد نہ ہو۔

ازالہ حیثیت عرفی کا مقدمہ

اس مقدمے کی مسل مل گئی ہے۔ اس سے معلوم ہوا ہے کہ ۲۰ دسمبر ۱۸۶۸ء کو غالب نے ڈپٹی کمشنر کے پاس ایک درخواست دی تھی جس میں اپنے خاندانی اعزازات اور علو تبار کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ امین الدین نے ایک علمی بحث کے سلسلے میں میرے لئے ایسے ناشایستہ الفاظ استعمال کئے ہیں کہ کوئی شخص کسی اور چمار کیلئے بھی استعمال نہ کرے۔ میں نے منشی عزیز الدین کو اپنا وکیل بنایا ہے :

امیدوار ہوں کہ بعد تصدیق وکالت نامہ سررشتہ فوجداری میں یہ مقدمہ پیش ہو اور خاص آپ کی تجویز سے اول سے آخر تک یہ مقدمہ فیصل ہو اور کسی ماتحت محکمے میں یہ مقدمہ سپرد نہ ہو۔

لیکن ڈپٹی کمشنر نے اس درخواست پر لکھا کہ فوجداری مقدمات اسسٹنٹ کمشنر کے پاس پیش ہوتے ہیں لہذا یہ مقدمہ بھی انہی کی عدالت میں جانا چاہیئے۔ چنانچہ اسسٹنٹ کمشنر کی عدالت میں وکالت نامہ پیش ہوا۔ قاطع القاطع پیش ہوئی۔ جن عبارتوں پر اعتراض تھا ان میں سے تیرہ مقامات تعین کے ساتھ بتائے گئے۔

لیکن ابھی مقدمے کی کارروائی شروع نہیں ہوئی تھی کہ غالب نے ۲۳ جنوری ۱۸۶۸ء کو پھر ایک درخواست ڈپٹی کمشنر کو دی کہ مقدمے کو پیش ہوئے قریباً تیسرا مہینا ہے (صحیح یہ ہے کہ دوسرا مہینا تھا) آپ نے حکم دیدیا کہ اسے اسسٹنٹ کمشنر کے سپرد کیا جائے میری خوشی اس میں تھی کہ مقدمہ کا فیصلہ آپ خود فرماتے۔ اب بھی :

بصد گونہ عجز و زاری استدعا کرتا ہوں کہ کاغذات مقدمہ وہاں سے منگائے جائیں اور حضور کے سامنے پیش کئے جائیں تاکہ امین الدین مدعا علیہ کی طلبی کا حکم پٹیالہ کو جائے اور بعد اس کے حاضر آنے کے بموجب اس کے اور میرے وکیل کے مقدمہ تجویز ہو کر میری دادرسی ہو اور مدعا علیہ کو سزائے سخت ملے تاکہ پھر کوئی چھوٹا آدمی بڑے آدمی کو ایسے کلمات فحش و ناسزا نہ لکھے۔

لیکن ڈپٹی کمشنر نے اسی روز حکم دے دیا کہ یہ ممکن نہیں۔ ۳۰ جنوری تک اسسٹنٹ کمشنر کا تبادلہ ہو گیا تو اس نے خود لکھ دیا کہ مقدمہ ڈپٹی کمشنر بہادر کے پاس پیش ہو۔ ۵ فروری کو مدعا علیہ کی طلبی کا پروانہ جاری ہوا ۱۴ فروری کو منشی امین الدین کی عرضی پیش ہوئی۔ ۲۰ فروری کو فریقین کے نام حکم صادر ہوا کہ گواہوں کی فہرستیں پیش کریں۔ ان کی تفصیل یہ ہے:

من جانب امین الدین	من جانب غالب
(۱) مولوی ضیاء الدین اسسٹنٹ پروفیسر عربی دہلی کالج	(۱) ماسٹر پیارے لال آشوب
(۲) مولوی سدید الدین سابق پروفیسر عربی و استاد مولوی ضیاء الدین	(۲) مولوی نصیر الدین فرسٹ اورنٹیل و ٹیچر کلاسٹر دہلی نارمل سکول
(۳) حکیم حشمت اللہ خاں	(۳) منشی حکم چند مدرس دہلی کالج جو فارسی کے فاضل اور بڑے مضمون نگار تھے۔
(۴) محمد حمید الدین خاں عرف عبد الحکیم	(۴) مولوی حکیم لطیف حسین صاحب فرسٹ اورنٹیل ماسٹر دہلی کالجیئٹ سکول
(۵) مولوی ابراہیم	(۵) مولوی محمد سعادت علی مدرس گورنمنٹ سکول دہلی
(۶) مولوی محمد حسین	
(۷) مولوی قمر الدین	

دونوں فریقوں کی جانب سے صرف پہلے چار چار گواہ پیش ہوئے۔ امین الدین کے گواہوں کی کوشش یہ تھی کہ اعتراض کردہ فقروں کا ایسا مفہوم پیش کریں۔ جو ازالہ حیثیت عرفی کا موجب نہ بن سکے۔ غالب کے گواہوں نے کتاب کی عبارتوں کو زیادہ سے زیادہ خراب اور موجب ہتک عزت ظاہر کیا۔ خود امین الدین نے بھی اپنے بیان میں عبارتوں کو ایسے رنگ میں پیش کیا تھا کہ اعتراض کی گنجایش نہ رہے۔

آخری گواہی غالباً ۱۴ مارچ ۱۸۶۸ء کو ہوئی پھر معلوم نہیں کیا کچھ ہوتا رہا۔ ۲۳ مارچ ۱۸۶۸ء کو غالب کے وکیل عزیز الدین کی طرف سے مندرجہ ذیل عرضی ڈپٹی کمشنر کے پاس پیش ہوئی:

جوکہ مجھ مدعی کا مقدمہ بنام مولوی ایبن الدین بابت ازالۂ حیثیت عرفی حسب منشا دفعہ ۴۹۹ تعزیرات ہند دائر عدالت ہے۔ چنانچہ بہ فہمائی چند گرامی رؤسا شہر باہم رضامندی ہوئی۔ اب مجھ کو کچھ دعوے بابت مقدمہ باقی نہیں۔ مقدمہ داخل دفتر ہووے۔

اس پر اڈبراڈن صاحب ڈپٹی کمشنر نے مقدمہ خارج اور کاغذ داخل دفتر کردیے۔

محولہ بالا عرضی سے ظاہر ہے کہ خواجہ حالی کے بیان کے مطابق کامیابی کی طرف سے مایوسی دست برداری کی علت نہ تھی بلکہ اکابر دہلی نے بیچ میں پڑکر صلح کرادی تھی۔ ممکن ہے غالب اسی وجہ سے صلح پر راضی ہوئے ہوں کہ انہیں کامیابی کی اُمید نہیں رہی تھی۔

اس زمانے میں دہلی سے ایک انگریزی اخبار "مفصلائٹ" کے نام سے نکلتا تھا جس میں غالب کے اس مقدمے کے متعلق ایک خط ۱۲ر مارچ ۱۸۶۸ء کو چھپا تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مولوی ضیاءالدین مدعاعلیہ کی طرف سے شہادت کے لئے پیش ہوئے تو کسی نے مجسٹریٹ کے کان میں کہہ دیا کہ یہ بڑے معزز اور عالم ہیں، گواہی لیتے وقت انہیں کرسی دی جائے۔ مجسٹریٹ نے قاعدے اور دستور کے خلاف مولوی صاحب کے لئے کرسی کا انتظام کردیا۔

مکتوب نگار لکھتا ہے۔ میں سخت حیران ہوں کہ اسسٹنٹ کمشنر نے مولوی ضیاءالدین کو کس بنا پر کرسی دی۔ اس رعایت سے غالب کے ساتھ سخت بے انصافی ہوئی ہے وہ سوسائٹی میں نہایت معزز ہیں۔ لفٹنٹ گورنر کے دربار میں انہیں مولوی ضیاءالدین سے اونچے درجے پر بٹھایا گیا تھا۔

دوستوں سے استعانت

اس زمانے میں مخالفوں کے جواب کے لئے غالب خود بھی دوستوں میں تحریک کرتے رہتے تھے مثلاً نواب علاءالدین احمد خاں کو ایک خط میں لکھتے

ہیں کہ شہاب الدین نے "محرق قاطع" کا ایک نسخہ میرے کہنے پر بھیجا ہے اگر فرصت مساعدت کرے تو اس کی غلطیاں جمع کر کے مجھے بھیج دو۔

میرا ایک دوست ہے کہ وہ منجملہ رجال الغیب ہے۔ ان ہفوات کا خاکہ اڑا رہا ہے۔

نیّر رخشاں نے اس کو مدد دی ہے تم بھی بھائی مدد دو۔

خواجہ غلام غوث بیخبر کا معاملہ

وہ واقعی سخت پریشانیوں کا دور تھا اور غالب حد درجہ ذکی الحس ہو گئے تھے کسی نے کہہ دیا کہ آپ کے عزیز دوست خواجہ غلام غوث خاں بیخبر "قاطع" کا جواب لکھ رہے ہیں۔ غالب نے بے تاب ہو کر خواجہ صاحب کو لکھا کہ یہ کیا واقعہ ہے۔ اصل خبر بالکل غلط تھی۔ خواجہ صاحب نے شکوہ کیا۔ اس کے جواب میں فرماتے ہیں،

پیر و مرشد خفا نہیں ہوا کرتے۔ یوں سُنا مجھے باور نہ آیا۔ یہاں تک تو میں مورد نہیں ہو سکتا۔ جھگڑا استعجاب پر ہے۔ محل استعجاب وہ ہے کہ آپ کا دوست کہتا ہے کہ میر منشی صاحب لفٹنٹ گورنر بہادر میرے شاگرد ہیں اور وہ "قاطع برہان" کا جواب لکھ رہے ہیں۔ اولیاً کا یہ حال ہے تو وائے برحال ہم اشقیا کے۔ یہ حکایت ہے شکایت نہیں۔ میں دنیاداری کے لباس میں فقیری کر رہا ہوں۔ لیکن فقیر آزاد ہوں نہ شیاد و کیاد

"قاطع" کی دوبارہ طباعت

۱۸۶۵ء میں غالب نے "قاطع" کو دوبارہ چھپوانے کا ارادہ کیا۔ نواب یوسف علی خاں نے وعدہ فرمایا کہ اپریل ۱۸۶۵ء کی تنخواہ کے ساتھ دو سو روپے "قاطع" کی طبع دوم کے لئے بھیجیں گے۔ لیکن اپریل کے آخری عشرہ میں ان کا انتقال ہو گیا۔ اور ساتھ ہی امید امداد بھی جاتی رہی۔

اردوئے معلّےٰ صفحہ ۱۳

سیف الحق سیاح کی وساطت سے نواب میر غلام بابا خاں سے درخواست کی گئی انہوں نے گھڑی بھیج دی۔ غالب نے دوبارہ لکھا تو ۸ ستمبر ۱۸۶۵ء کو صاحب موصوف نے سو روپیہ کی رقم ارسال کی۔ اس کے بعد کتاب چھپنے کیلئے دیدی اور خود اکتوبر ۱۸۶۵ء میں نواب کلب علی خاں بہادر کی تخت نشینی کے جشن میں شرکت کے لئے رام پور چلے گئے۔ کتاب دہلی میں اکمل المطابع میں چھپ رہی تھی۔ میرزا شمشاد علی بیگ رضوان کو ۴ نومبر ۱۸۶۵ء کے خط میں رام پور سے لکھتے ہیں:

"قاطع برہان" کا حال لکھنا۔ میں نے تیس روپئے کی ہنڈی (سو روپئے کی باقی) حکیم جی (حکیم غلام نجف خاں) کو بھیج دی ہے۔ حضرت نے رسید بھی نہیں لکھی۔ ان سے رسید لکھوا بھیجو اور سب جلدوں کے شیرازے بندھ جائیں اور موٹا کاغذ دونوں طرف لگ جائے خبردار کوئی نسخہ بے جلد نہ رہے۔ تین سو مجلد کے تیار ہونے کی خبر اور بقیہ حساب میرے پاس بھیج دینا۔ روپیہ فوراً بھیج دوں گا یا اگر دوں گا۔

طبع ثانی میں غالب نے کچھ فوائد بڑھا دیئے تھے اور اس کا نام "قاطع برہان" کے بجائے "درفش کاویانی" رکھا۔ عبدالرزاق شاکر کو لکھتے ہیں:

"قاطع برہان" میں اور مطالب بڑھائے ہیں اور ایک دیباچہ دوسرا لکھا ہے۔ "درفش کاویانی" اس کا نام رکھا ہے۔[1]

۸ جنوری ۱۸۶۶ء کو رام پور سے واپس آئے تو "درفش" تیار ہو چکی تھی۔ سیاح کو لکھتے ہیں:

اجی ہاں میاں سیف الحق! رام پور سے آ کر تین سو جلدیں "درفش کاویانی" کی تیار پائیں۔ نواب میر غلام بابا خاں کے حصہ برادرانہ کو ڈیڑھ سو جلد کا پشتارہ بنایا۔ اس پر ٹاٹ لپٹوایا،

---

[1] اردوئے معلیٰ صفحہ ۷

ڈاک گھر بھجوایا، سرکاری ڈاک والوں نے ہرگز اس کا بھیجنا قبول نہ کیا۔ ٹھیکے والے، پمفلٹ والے، ریل والے، متفق اللفظ اس کے ارسال سے انکار کرتے ہیں۔ تم یہ رقعہ حضرت نواب میر غلام بابا خاں، کو پڑھواؤ۔ اور اس باب میں جو وہ فرمائیں مجھ کو لکھو۔

"مؤید برہان"

"قاطع" کے جواب میں سب سے آخری کتاب مولوی احمد علی کی "مؤید برہان" ہے۔ جو ۱۸۶۶ء میں چھپی۔ مولوی صاحب ڈھاکہ کے باشندے تھے جس کا نام جہانگیر نگر تھا۔ اسی لئے جہانگیر نگری مشہور تھے، مگر ایرانیت کے تصنع میں اپنے نام کے ساتھ آغا لکھواتے تھے۔ کلکتہ کے فارسی دانوں میں اس تصنع کا مرض عام طور پر رہا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے اجداد اصفہان سے آئے تھے۔ اسی لئے غالبؔ نے مؤید برہان والے قطعے میں لکھا ہے:

خواجہ را از اصفہانی بودن آبا چہ سود
خانقش در کشور بنگالہ پیدا کردہ است

مولوی صاحب مدرسہ عالیہ کلکتہ میں مدرس تھے۔ ایشاٹک سوسائٹی کی مطبوعات کی تصحیح بھی کیا کرتے تھے۔ فارسی مثنویوں کے حال میں ایک رسالہ "ہفت آسمان" لکھا تھا جو سوسائٹی نے چھاپ دیا ہے۔

"مؤید برہان" ۴۰۸ صفحے کی ہے، مطبع مظہر العجائب کلکتہ میں ٹائپ میں طبع ہوئی تھی غالبؔ کے پاس یہ کتاب ۱۸۶۶ء میں پہنچی تھی۔ وہ خود ذکا کو ۲۴ مارچ ۱۸۶۷ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں:

"مؤید برہان" میرے پاس بھی آگئی ہے۔ اور میں اس کی خرافات کا حال بہ قید شمار صفحہ و سطر لکھ رہا ہوں۔ وہ تمہارے پاس بھیجوں گا۔ شرط مودت بہ شرط آنکہ جانی نہ رہی ہو اور باقی ہو، یہ ہے کہ میں ہوں یا نہ ہوں تم اس کا جواب ضرور دو۔ میرے بھیجے ہوئے اقوال جہاں جہاں مناسب سمجھو درج کر دو۔

"تیغ تیز"

"مؤید برہان" کے بعد غالبؔ نے اردو زبان میں "تیغ تیز" لکھی۔ یہ تئیس صفحے کا

ایک مختصر سا رسالہ ہے جو "اکمل المطابع" میں چھپا۔ اس کی تمہیدی عبارت میں "قاطع برہان" کے سلسلے کی متعدد کتابوں کا ذکر آیا ہے۔ مثلاً "محرق" کے متعلق فرماتے ہیں:

ایک مرد بے مغز معوج الذہن، نہ فارسی داں، نہ عربی خواں نے میری نگارش (قاطع برہان) کی تردید میں ایک کتاب بنائی اور چھپوائی تھی اور "محرق قاطع" اس کا نام رکھا۔

مؤلف "ساطع برہان" کے متعلق لکھتے ہیں:

ایک مرزا رحیم بیگ میرٹھ کے رہنے والے بروے کار آئے اور ایک تحریر مسمّٰی بہ "ساطع برہان" نکال لائے۔ مطالب مندرجہ لغو، بیشتر "محرق قاطع" کے مضامین منقول۔ فقیر نے صرف ایک خط مرزا جی کو لکھ بھیجا زیادہ اس طرف التفات کو تضیع اوقات جانا۔

مؤلف قاطع القاطع | مؤلف "قاطع القاطع" کی نسبت ارشاد ہوتا ہے:

میاں امین الدین کہ اب پٹیالہ میں ملقب بہ مدرس ہیں، انہوں نے "قاطع القاطع" چھپوایا، استعداد علمی یہاں سے بعد صرف مقاصد نحو و صرف فارسیت کی اس قدر رعایت منظور رکھی۔ کہ فقیر کے بعض فقروں کی ترکیبیں اپنی عبارت کے قالب میں ڈھالیں۔ باقی سوائے عربی فشری اور فارسی مسروقہ کے وہ مغلظ گالیاں دی ہیں، جو کنجڑے اور بھٹیارے استعمال کرتے رہے ہیں۔ یارب میاں امین الدین کس بُری قوم کے اور کس پاجی گروہ کے ہیں کہ مولوی کہلائے مدرس بنے۔ مگر الفاظ مستعملہ قوم نہ چھوڑے۔ اگر میری طرف سے ازالہ حیثیت عرفی کی نالش ہو جاتی تو میاں پر کیسی بنتی؟ مگر میرے کبر نفس نے ازالہ حیثیت کے لفظ کو گوارا نہ کیا[1]۔ ان کی تحریر ان کے پاجی پن پر سجل ہے۔

مؤلف مؤید برہان | مؤلف "مؤید برہان" کی نسبت فرماتے ہیں:

عربیت میں امین الدین سے بڑھ کر فارسیت میں برابر فحش و دشنام گوئی میں کمتر جتنے الفاظ

---

[1] اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ غالب نے نالش کر دی تھی۔

تذلیل کے ہیں۔ وہ چُن چُن کر میرے واسطے استعمال کئے اور یہ نہ سمجھا۔ کہ غالب اگر عالم نہیں شاعر نہیں، آخر شرافت و امارت میں ایک پایہ رکھتا ہے، صاحب عز و شان ہے، عالی خاندان ہے، امرائے ہند، رؤسائے ہند مہاراجگان ہند سب اس کو جانتے ہیں، رئیس زادگان سرکار انگریزی میں گنا جاتا ہے۔ بادشاہ کی سرکار سے نجم الدولہ خطاب ہے۔ گورنمنٹ کے دفتر میں "خان صاحب بسیار مہربان دوستان" القاب ہے۔ جس کو گورنمنٹ خاں صاحب لکھتی ہے اس کو سڑی اور کتا اور گدھا کیوں کر لکھوں۔ فی الحقیقت یہ تذلیل بفحوائے "ضرب الغلام اہانت المولیٰ" گورنمنٹ بہادر کی توہین اور وضیع و شریف ہند کی مخالفت ہے۔ میرا کیا بگڑا؟ مولوی نے اپنا پاجی پن ظاہر کیا۔ میں نے "معلم ابن بے دین" کو شیطان کے حوالے کیا۔ اور احمد علی کے الفاظ مذموم سے قطع نظر کیا۔ اور ان کے مطالب علمی کا جواب اپنے ذمہ لیا۔

اس کے بعد اصل کتاب یعنی "تیغ تیز" شروع ہوتی ہے، جو سترہ فصلوں پر مشتمل ہے۔ ان میں مختلف اعتراضات پر تبصرہ کیا ہے۔ اور ان کے جوابات دیئے ہیں۔ آخر میں چند اعتراضات کو استفتا کی شکل دے کر سولہ سوالات مرتب کئے ہیں اور ہر سوال کے ساتھ نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ کی طرف سے جواب درج ہے۔ تمام جوابات میں غالب کی تائید کی گئی ہے۔ خواجہ الطاف حسین حالیؔ۔ مولوی محمد سعادت علی مدرس گورنمنٹ سکول دہلی۔ اور نواب ضیاء الدین احمد خاں نے مجیب یعنی نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ کے جوابات کی تصدیق و توثیق کی ہے۔

"تیغ تیز تر" مؤید برہان کے جواب میں غالب نے فارسی میں ایک قطعہ لکھا جس میں اگرچہ کل اکتیس شعر تھے۔ لیکن "مؤید" جیسی دس کتابیں بھی اس کی تاثیر جہانگیر کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھیں۔ اس پر ادبی جنگ نے نثر کے بجائے نظم کی شکل اختیار کر لی۔ اور غالب ہی کی زمین میں موافق و مخالف چار سو تیرہ شعر کہے گئے۔ غالب کا جواب سب سے پہلے مولوی احمد علی کے شاگرد عبدالصمد فدا اسلہٹی نے دیا۔ اشعار سے ظاہر ہوتا ہے کہ

علم و ادب میں بہت معمولی حیثیت رکھتے ہیں۔ فدا کے جواب میں سید شاہ باقر علی[1] باقر بہاری اور خواجہ فخرالدین حسین[2] سخن نے دو قطعے لکھے۔ فدا نے پھر ان قطعوں کا جواب دیا۔ اور یہ سارا مجموعہ منظومات "تیغ تیز تر" کے نام سے چھاپ دیا۔

"ہنگامہ دل آشوب" حصہ اوّل و دوم،

غالب، فدا، باقر اور سخن کے قطعات آخرالذکر دو بزرگوں کی سعی سے منشی سنت پرشاد کے مطبع واقع آرہ (بہار) میں بھی چھپ گئے۔

اس مجموعہ کا نام "ہنگامہ دل آشوب" رکھا گیا۔ لیکن منظومات کی جنگ اس پر ختم نہ ہوئی جواہر سنگھ جوہر لکھنوی ناطق مکراتی کے ایک شاگرد تھے۔ انہوں نے مولوی احمد علی کی تائید میں ایک قطعہ لکھا۔ باقر و سخن دونوں نے اس کے جواب میں دو قطعے شائع کئے۔ نیز فدا کے جوابی قطعے پر دو اور قطعے لکھے۔ ایک مختصر سی نظم اُردو میں منشی محمد امیر صاحب امیر لکھنوی نے بہ طور محاکمہ لکھی۔ جس میں غالب کی تائید کی گئی۔ یہ مجموعہ بھی منشی سنت پرشاد ہی کے مطبع میں "ہنگامۂ دل آشوب" (حصہ دوم) کے نام سے چھپ گیا۔[3]

آغا علی شمس لکھنوی نے غالب کے اُردو کلام پر چند اعتراضات اودھ اخبار میں

---

[1] سید شاہ باقر علی باقر بیر نگر (ضلع گیا۔ بہار) کے سادات میں تھے۔ مادری سلسلہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی سے ملتا ہے علم و فضل کے علاوہ سپہگری اور متعلقہ فنون میں اپنے عہد کے ایک ممتاز فرد تھے تصوف و سلوک سے بھی بہرہ وافی حاصل تھا۔ غالب کی تصانیف دیکھ کر اور خواجہ فخرالدین حسین سخن سے ان کے کمالات سُن کر غائبانہ عقیدت پیدا ہوئی خط و کتابت کے ذریعہ سے شرف تلمذ حاصل کیا۔ ۱۳۱۲ھ میں وفات پائی۔ ان کا دیوان چھپ گیا ہے۔

[2] خواجہ فخرالدین حسین سخن دہلی کے باشندے تھے۔ غالب کے ساتھ رشتہ داری بھی تھی۔ غدر سے کچھ پہلے دہلی سے لکھنؤ چلے گئے۔ بعد ازاں آرہ پہنچ گئے۔ جہاں ان کے عزیز مقیم تھے۔ "سروش سخن" ان کی مشہور تصنیف ہے۔ ستمبر ۱۸۷۸ء میں ان کا دیوان چھپ گیا تھا۔

[3] "ہنگامہ دل آشوب" کے دونوں حصے رسالہ اُردو بابت جنوری ۱۹۳۷ء میں شائع ہو چکے ہیں۔

چھاپے تھے ان کے جواب میں خواجہ فخر الدین حسین سخنؔ نے ایک مضمون اردو میں اور سید شاہ باقر علی باقرؔ نے ایک مضمون فارسی میں شائع کیا اور ایک ایک اعتراض کا قاطع جواب دیا۔ یہ دونوں مضمون بھی "ہنگامۂ دل آشوب" (حصہ دوم) میں شامل کر دیئے گئے۔

شمشیر تیز تر

مولوی احمد علی صاحب مؤلف "مؤید برہان" نے غالب کی "تیغ تیز" کے جواب میں ایک رسالہ بہ زبان فارسی "شمشیر تیز تر" کے نام سے لکھا، جو ۱۸۶۶ء[1] میں مولوی غلام نبی کے مطبع نبوی میں عبداللہ خاں کے زیر اہتمام چھپا۔ یہ رسالہ ۱۰۰ صفحے کا ہے۔ اس کے آغاز میں قدا کا رسالہ تیغ تیز تر بھی شامل کر دیا گیا۔ غرض "قاطع برہان" کی اشاعت پر جو ہنگامہ شروع ہوا تھا، وہ نظم و نثر کے مختلف مراحل سے گزرتا ہوا ۱۸۶۶ء میں "شمشیر تیز تر" پر ختم ہوا۔

غالب نے "مؤید برہان" کے متعلق جو قطعہ لکھا تھا، وہ ذیل میں درج ہے۔ یہ "سبد چیں" میں شائع ہو گیا تھا:

قطعہ

در سپاسگزاری و پاآوری بہ عالی خدمت جناب مولوی آغا احمد علی صاحب جہانگیر نگری از جانب

پوزش خواہ بے راہ روی اسداللہ خان غالب دہلوی

مولوی احمد علی احمد تخلص نسخہ — در خصوص گفتگوے پارس انشا کردہ است

ہیچ و مکراں را کہ در سند است و از ایران جدا — شامل اقلیم ایراں بے محابا کردہ است

قوم بر پیچ را بہ ایرانی نژاداں دادہ خلط — ترک ترکان سمرقند و بخارا کردہ است

در جہاں توام بود روے وے و پشت قتیلؔ — پیشواے خویش ہندو زادہ را کردہ است

ہندیاں را در زباں دانی مسلّم داشتہ — تا چہ اندر خاطر والاے او جا کردہ است

خوش[2] برآمد با ہمہ ہندوستاں زایاں چہ خوش — تکیہ آرے بر ولادت گاہ آبا کردہ است

۱۔ "شمشیر تیز تر" کا ایک نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں موجود ہے۔ جو شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد مرحوم کا مملوکہ تھا۔

۲۔ یہ شعر "ہنگامۂ دل آشوب" والے مجموعہ میں شامل نہیں ہے۔

هرکه بینی بازبان مولدِ خود آشنا است — سازِ نطق موطن اجداد بے جا کرده است

خواجه را ز اصفهانی بودن آبا چه سود — تا نقش در کشور بنگاله پیدا کرده است

با قتیل و جامع[۱] "برهان" و لاله ٹیک چند[۲] — لابه و سوگیری و لطف و مدارا کرده است

داوری گاہے بنا فرمود در وے هر سه را — منصف و صدر امین و صدر اعلیٰ کرده است

گرچنیں با هندیاں دارد تولّا در سخن — من هم از هندم چرا از من تبرّا کرده است

میلِ او با هر کسے از هند و جنگش خاص من — حیف میلے باد و عالم شور و غوغا کرده است

کرده است از خوبی گفتار من قطع نظر — ظلم زیں قطع نظر بر چشم بینا کرده است

مطلب از بد گفتن من چیست گویا نیک مرد — مزد ایں کار از حق آمرزش تمنا کرده است

درچنیں بود چناں باشد که در عرض کمال — تا برآرد نام ایں هنگامه پیدا کرده است

صاحب علم و ادب و انگه ز افراط غضب — چو سفیهاں فن نفرین و ذم وا کرده است

در جدل دشنام کار سوقیاں باشد ولے — ننگ دارد علم زاں کارے که آغا کرده است

انتقام جامع "برهان قاطع" مے کشد — آنچه ما کردیم با وے خواجه با ما کرده است

من سپاہی زاده ام گفتار من باید درشت — وائے بر وے گر به تقلید من اینها کرده است

زشت گفتم لیک داد بذله سنجی داده ام — شوخی طبعے که دارم ایں تقاضا کرده است

مے کند تائیدِ "برهاں" لیک برهاں ناپدید — نیست جز تسلیم قولش هرچه انشا کرده است

سستی طرز خرام نامه "برهاں" نگار — یا نمے دانست یا دانسته اخفا کرده است

بهر من توهین و بهر خویش تحسیں جابجا — هم مرا هم خویش را در دهر رسوا کرده است

آید و بیند همه اندر رکنت اب مولوی — هرچه از هنگامه گیراں کس تماشا کرده است

لغو و حشو و ادعائے محض و اطناب مُمل — مار و موش و سوسمار و گربه یکجا کرده است

---

۱ محمد حسین دکنی مؤلف "برہان قاطع" ۲ لالہ ٹیک چند بہار مؤلف "بہار عجم"۔

بگزر از معنے ہمیں الفاظ را بربستہ ہیں — بادہ نبود شیشہ و ساغر مہیا کردہ است
یافتم از دیدن نارسیہائے آں کتاب — خود بدم گفت و بہ احباب خود ایما کردہ است
غازیاں ہمراہ خویش آوردہ از بہر جہاد — تا نہ پنداری کہ ایں پیکار تنہا کردہ است
جوش زد از غایت قہر و غضب خوں در دلش — تا زبانش را بدیں کلپترہ گویا کردہ است
آتش خشمے کہ سوزد صاحب خود را نخست — در دلش ہم چوں شرر در سنگ ماوا کردہ است

چوں نباشد باعث تشنیع جز رشک و حسد
باد غالب خستہ زر گر خستہ پروا کردہ است

مولانا ابوالکلام کا ارشاد

"قاطع برہان" کے متعلق مولانا ابوالکلام آزاد فرماتے ہیں:

میری تیرہ برس کی عمر تھی کہ مدراس کے ایک اخبار "جریدۂ روزگار" میں یادگار غالب کا اشتہار دیکھا۔ یہ اخبار ہر ہفتہ سرورق پر ایک مخمس قدسی کی مشہور نعتیہ غزل "مرحبا سید مکی مدنی العربی" پر چھاپا کرتا تھا۔ اس لئے حافظ ولی اللہ (والد مرحوم کے خادم خاص اور میرے بچپن کے زمانہ کے استاد) اسے بڑی دلچسپی سے پڑھا کرتے تھے۔ والد مرحوم کے ایک مرید حاجی مصلح الدین سوداگر انہیں ہر ہفتہ لا دیا کرتے تھے۔

بہر حال میں نے بڑے شوق سے کتاب منگائی۔ یہ میرے اردو مطالعہ کا بالکل آغاز تھا۔ کتاب میں "برہان قاطع" کے معرکے کا جب حال پڑھا تو شوق ہوا کہ یہ تمام کتابیں دیکھنی چاہئیں۔ چنانچہ "قاطع برہان" اس کا دوسرا ایڈیشن "درفش کاویانی" "قاطع القاطع" "ساطع برہان" "محرق قاطع" "موئد برہان" "تیغ تیز" "شمشیر تیز تر" وغیرہ تمام رسائل بہ سعی و جستجو جمع کئے۔ چونکہ اس زمانے میں فارسی ادب اور فارسی لغات کے مطالعہ و تحقیق کا بھی شوق تھا اور تصحیح الفاظ کی بڑی کاوش رہتی تھی۔ اس لئے پوری دلچسپی کے ساتھ مطالعہ کا موقع ملا۔

واقعہ یہ ہے کہ میرزا غالب نے یہ چند اجزا (یعنی "قاطع برہان") لکھ کر علم و تحقیق کی بڑی

خدمت انجام دی ہے۔ افسوس کہ خواجہ حالی نے اس مبحث کو زیادہ تفصیل کے ساتھ نہیں لکھا۔

میرزا کے حالات میں ضروری ہے کہ اس معاملہ پر بہ تفصیل نظر ڈالی جائے۔ برہان قاطع کے جو خرافات انھوں نے نقل کئے ہیں، انہیں پڑھ کر تعجب ہوتا ہے کہ کوئی اہل علم و بصیرت کیونکر ان کی تائید کر سکتا ہے؛ مگر مصیبت یہ ہے کہ سارا معاملہ ایک طرح کا منطقی مصادرہ تھا۔ اعتراض ہندی لغت نویسوں پر تھا اور ہندی لغت نویسوں ہی کا کلام بہ طور دلیل کے پیش کیا جاتا۔

رضا قلی خاں ہدایت صاحب "مجمع الفصحا" نے مرزا غالب کے چند سال بعد "فرہنگ انجمن آرائے ناصری" لکھی جو طہران میں چھپ گئی ہے اور بمبئی کے تاجروں سے مل سکتی ہے۔ اسے بھی پیش نظر رکھنا چاہیئے اور اس معاملہ پر امثلہ و مباحث نقل کر کے بہ تفصیل بحث کرنی چاہیئے۔

کیا اچھا ہو اگر "درفش کاویانی"، کو بعد کے مباحث کے اضافہ کے ساتھ از سر نو شائع کر دیا جائے یا "تیغ تیز" اور "لطائف غیبی" بجنسہٖ آخر میں شامل کر دیئے جائیں۔ "درفش کاویانی" کی طباعت میں غلطیاں بہت ہیں ان کی تصحیح ضروری ہے۔

پندرھواں باب

کلام، طریقِ اصلاح اور مُشاعرے

ہندرا ز بدسخن پیشیہ گمنامے ہست
اندریں دیرِ کہن مے کدہ آشامے ہست

غالب نے اپنے منتخب اُردو اور فارسی اشعار کا مجموعہ "گل رعنا" کے نام سے مرتب کیا تھا اس کے دیباچہ میں تصریح کی ہے کہ پہلے اُردو میں شعر کہنے شروع کئے تھے[1] فارسی دیوان کے خاتمہ کی عبارت ہیں، جو ۱۲۵۳ھ میں لکھی گئی تھی، فرماتے ہیں کہ گیارہ برس کی عمر میں شعر گوئی کا آغاز ہوگیا تھا[2] لالہ بہاری لال مشتاق کا بیان ہے۔ کہ آگرہ کے ایک صاحب لالہ کنہیا لال جو غالب کے ہم عمر تھے۔ ایک مرتبہ دہلی آئے۔ اور غالب سے بھی ملے۔ اثناء گفتگو میں یاد دلایا کہ آپ نے پتنگ بازی کے متعلق ایک مثنوی اُردو میں لکھی تھی[3]

---

[1] کلیات نثر فارسی صفحہ ۵۹ [2] کلیات نثر فارسی صفحہ ۶۰ [3] یادگار غالب صفحہ ۹۔

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

فارسی شعر گوئی بھی چھوٹی ہی عمر میں شروع کردی تھی۔ خواجہ حالیؔ فرماتے ہیں کہ ابتدائی زمانے میں ایک فارسی غزل لکھی تھی۔ جس کی ردیف "کہ چہ" تھی۔ یہ غزل ان کے اُستاد شیخ معظم کے پاس پیش ہوئی تو شیخ نے ردیف کو مہمل بتایا۔ لیکن ایک روز غالب کو ظہوری کے کلام میں "کہ چہ" "بہ معنی" "چہ" کی سند مل گئی۔ شیخ نے یہ سند دیکھی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۴۹) لالہ کنہیا لال کا بیان ہے۔ کہ یہ مثنوی جب لکھی گئی تو غالب کی عمر آٹھ نو برس سے زیادہ نہ تھی۔ اس کا کوئی سراغ نہیں ملتا تھا۔ لیکن ایک صاحب حاجی سید اکبر علی بلیغ سہارن پوری تھے۔ جو ابو ظفر بہادر شاہ کے مقرب تھے اور کمپنی کے ساتھ مقدمات میں بادشاہ کی طرف سے پیروی کرتے تھے۔ اس لئے وقتاً فوقتاً آگرہ جاتے رہتے تھے انہوں نے ایک بیاض یادگار چھوڑی تھی۔ جس میں یہ مثنوی بھی مرقوم تھی۔ میں اسے تبرکاً یہاں نقل کرتا ہوں:

ایک دن مثل پتنگ کاغذی — لے کے دل سر رشتۂ آزادگی

خود بخود کچھ ہم سے کنیانے لگا — اس قدر بگڑا کہ سر کھانے لگا

میں کہا اے دل ہوائے دلبراں — بسکہ تیرے حق میں رکھتی ہے زیاں

بیچ میں ان کے نہ آنا زینہار — یہ نہیں ہیں گے کسو کے یار غار

گورے پنڈے پر نہ ان کے کر نظر — کھینچ لیتے ہیں یہ ڈورے ڈال کر

اب تو مل جائے گی ان سے تیری سانٹھ — لیکن آخر کو پڑے گی ایسی گانٹھ

سخت مشکل ہوگا سلجھانا تیرا — قہر ہے دل ان سے الجھانا تیرا

یہ جو محفل میں بڑھاتے ہیں تجھے — بھول مت اس پر اُڑاتے ہیں تجھے

ایک دن تجھ کو اُڑا دیں گے کہیں — مفت میں ناحق کٹا دیں گے کہیں

دل نے سن کر کانپ کر کھا پیچ و تاب — غوطہ میں جا کر دیا کیا کٹ کر جواب

"رشتہ در گردنم افگندہ دوست

مے برد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست

تو حیران رہ گئے اور فرمانے لگے کہ فارسی زبان کے ساتھ تمہیں خداداد مناسبت ہے تم ضرور فکر شعر کیا کرو۔[1]

اردو شاعری اور فارسی | غالب ایک اُردو مکتوب میں فرماتے ہیں:

خاکسار نے ابتداء سن تمیز میں اردو زبان میں سخن سرائی کی ہے پھر اوسط عمر[2] میں بادشاہ دہلی کا نوکر ہو کر چند روز اسی روش میں خامہ فرسائی کی ہے۔ نظم و نثر فارسی کا عاشق و مائل ہوں، ہندوستان میں رہتا ہوں، مگر تیغ اصفہانی کا گھائل ہوں۔

نواب انور الدولہ کو فارسی کے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

از دیر باز دستانسرائی اُردو ندانم ہمانا از رضاجوئی شہریار سلیمان پیشکار (بہادر شاہ مرحوم) گاہ گاہ ناگاہ رنگ ریختہ ریختن، و یژہ بہ فرمان بانوے بلقیس پرستار (نواب زینت محل بیگم والدہ شہزادہ جواں بخت) در ریختہ بدیں ردیف تار و ادل آورختن[3] مگر در مقطع غزل مرستانہ آوے زدہ باشم[4] آں شاہ[5] یکے گمان کمالے کہ نہ داشت، داشت، پنداشت کہ روے سخن سوے اوست در مقطع غزلے کہ مردہ بہ ہنجار ستیزہ گام زدہ دانست کہ گفتار مرا پاسخ سازد۔[6]

اسی مکتوب میں آگے چل کر فرماتے ہیں:

آہ از من کہ مرا زیاں زدہ و سوختہ خرمن آفریدند۔ نہ بہ آئین نیاگان خویش سلطان سنجر وار کلاہ و کمرے

---

[1] یادگار غالب صفحہ ۹۔ [2] وہ ۱۲۶۶ھ (مطابق ۱۸۵۰ء) میں شاہی ملازم ہوئے تھے۔ اور اس وقت بہ حساب سنین قمری ان کی عمر ۵۴ برس کی تھی۔ ملاحظہ ہو کلیات نثر فارسی صفحہ ۱۷۱۔

[3] یہ "سہرے" کا قصہ ہے۔ جو غالب کے بیان کے مطابق نواب زینت محل کی خاص فرمایش پر لکھا گیا تھا۔

[4] ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں   دیکھیں اس سہرے سے کہہ دے کوئی بہتر سہرا

[5] ذوق

[6] جن کو دعویٰ ہو سخن کا یہ سنا دو ان کو   دیکھو اس طرح سے کہتے ہیں سخنور سہرا

ورنہ بہ فرہنگ فرزانگان پیشین بوعلی آسا علم و ہنرے۔ گفتم درویش باشم و آزادانہ راہ سپرم۔ ذوق سخن کہ ازل آوردہ بود، رہزنی کردہ مرا بہ آں فریفت کہ آئینہ زدودن و صورت معنی نمودن نیز کار نمایاں است۔ سرلشکری و دانشوری خود نیست، صوفی گری بگزار و بہ سخن گستری روے آر۔ ناگزیر ہم چناں کردم و سفینہ در بحر شعر کہ سراب است رواں کردم قلم علم شد و تیرہاے شکستہ نیاگان قلم یا خود بہ روزگار دیدہ ورے نہ بود یا بود و بہ من نہ پرداخت۔

نواب شمس الامرا حیدر آبادی کے نام کے فارسی خط میں لکھتے ہیں:

شعر و سخن را بانہاد کمترین پیوند روحانی است و خامہ از بد و فطرت در گہر افشانی۔ در آغاز ریختہ گفتمے و بہ اردو زبان غزل سرا بودمے، تا بہ پارسی زبان ذوق سخن یافت و ازاں وادی عناں اندیشہ برتافت۔ دیوان مختصرے از ریختہ فراہم آورد آں را گلدستہ طاق نسیان کرد۔ کما بیش سی سال است کہ اندیشہ پارسی نگار است۔

نواب علی بہادر خاں والی باندہ کو لکھتے ہیں:

از دیر باز بہ گفتن ریختہ نے گرایم و بہ پارسی سخن مے سرایم۔ لیکن چوں رضاے خاطر حضرت ظل الٰہی دراں است کہ ایں گونہ گفتار براے حضرت فلک رفعت ارمغان بردہ باشم ناچار گاہ گاہ ریختہ مے گویم۔

بہ ہر حال غالب کی تمام تحریرات کو سامنے رکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں انہوں نے اردو میں شعر کہے۔ پھر فارسی میں بھی کہنے لگے۔ چند سال بعد صرف فارسی کے لئے وقف ہو گئے۔ جب قلعہ کے ساتھ ملازمت کا تعلق پیدا ہوا تو بادشاہ کی خوشنودی کے لئے پھر گاہ گاہ اردو میں کہنے لگے۔

ملا عبد الصمد کی صحبت کا اثر | میرا خیال ہے کہ فارسی کی طرف زیادہ توجہ دلانے کا باعث ملا عبد الصمد ہوئے جو ۱۲۲۶ھ میں آگرہ آئے جبکہ غالب عمر صرف چودہ برس کی تھی۔ ابتدائی اردو کلام میں فارسیت کی افراط محتاج اعادہ نہیں۔ بادی النظر میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ پہلے فارسی شعر کہہ لیتے

تھے۔ اس کے بعد کہیں کہیں اس میں فارسی الفاظ کی جگہ اُردو الفاظ داخل کر دیتے تھے۔ یا کہنا چاہیئے کہ ان کا تخیل فارسی میں شعر کہتا تھا اور کاغذ پر تکلفاً اُسے اُردو بنا لیتے تھے۔ عام طور پر اُس کی وجہ یہ سمجھی جاتی ہے کہ ذوق یا دوسرے اُردو شعرا کی طرح ابتدا میں اُردو زبان پر اُنہیں یہ قدرت حاصل نہ تھی۔ یہ خیال بالکل غلط ہے۔ اُن کی والدہ ماجدہ آگرہ کی تھیں۔ ننہال کا پورا خاندان ہندوستانی تھا۔ والد اور چچا دہلی میں پیدا ہوئے۔ وہیں تربیت پائی۔ پھر والد آگرہ، لکھنو اور حیدر آباد میں رہے جو اُردو کے مرکز تھے۔ لہٰذا یہ کیونکر مانا جا سکتا ہے کہ وہ اُردو سے زیادہ واقف نہ تھے۔ اصل وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ ابتدا ہی میں وہ زیادہ تر فارسی اساتذہ کا کلام دیکھنے لگے تھے۔ تخیل فطرتاً بلند پرواز تھا۔ بیدل کے فکر کی آسمان پیمائیوں سے بدرجۂ غایت متاثر ہو گئے۔ اسی کے انداز کی پیروی اردو میں کرنے لگے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ کلام میں نہ محض فارسیت ہی کی فراوانی ہو گئی بلکہ بیدل کی خاص تراکیب و اصطلاحات بھی ان کے ابتدائی اشعار میں بے تکلف استعمال ہونے لگیں۔

فارسی پر ناز اور اُردو سے نفرت اپنے اُردو اشعار کے متعلق زیادہ حسن ظن نہ تھا۔ اور وہ فارسی ہی کو خدا داد کمالات کی حقیقی نمایش گاہ سمجھتے تھے۔ ان کا مختصر سا اُردو دیوان سفائن ادب اُردو میں بجائے خود کتنا ہی بیش بہا ہو۔ لیکن حق یہ ہے کہ جن گران مایہ جواہر پاروں سے ان کے فارسی کلام کا دامن لبریز ہے۔ ان کا عشر عشیر بھی اُردو کو نہ مل سکا۔ اساتذہ فارسی میں سے کسی کی ایک چیز اچھی ہوگی، کسی کی دو چیزیں اچھی ہوں گی۔ لیکن غالب کے ذوق کی جامعیت و ہمہ گیری کا یہ عالم ہے۔ کہ ان کی ہر چیز اچھی ہے۔ مثنوی، غزل، قصیدہ، قطعہ، رباعی، نثر میں واقعات نگاری، علمی بحثیں، انتقاد غرض ہر دائرے میں وہ یکساں بلند پایہ ہیں۔ لیکن ہندوستان میں ان کی شہرت کا مدار صرف اُردو کلام پر ہے۔ انھوں نے خود ایک موقع پر ذوق کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا:

اے کہ در بزم شہنشاہ سخن رس گفتہ | کے بہ پُرگوئی فلاں درشعر ہمسنگ من است
راست گفتی لیک مے دانی کہ نبود جاے طعن | کمتر از بانگ دہل گر نغمۂ چنگ من است
نیست نقصاں یک دو جزو است ار سواد ریختہ | کاں دو زم برگے ز نخلستان فرہنگ من است
فارسی بیں تا بہ بینی نقشہاے رنگ رنگ | بگذر از مجموعۂ اردو کہ بے رنگ من است
فارسی بیں تا بہ بینی کاندر اقلیم خیال | مانی وارژنگم و آں نسخہ ارتنگ من است

دشمنی را ہم فنی شرط است و آں دانی کہ نیست | از تو نبود نغمۂ درسازے کہ در چنگ من است
در سخن چوں ہم زبان و ہم نواے من نہ | چوں دلت را پیچ و تاب از رشک آہنگ من است
راست مے گویم من و از راست سر نتواں کشید | ہرچہ در گفتار فخر تست آں ننگ من است

غالب کی یہ راے اپنے اردو اشعار کے متعلق ہے۔ اُردو کے مکاتیب کے متعلق معلوم ہے۔ کہ ابتدا میں وہ ان کی ترتیب و اشاعت کو شہرت سخنوری کے منافی سمجھتے تھے۔ لیکن اسی یک دو جزو "دیوان ریختہ اور سخنوری کی شہرت کے منافی مکاتیب کی بدولت غالب کی عظمت کا پرچم آج اُردو ادب و شعر میں بلند ترین مقام پر اُڑ رہا ہے۔ ارباب ذوق اندازہ فرمائیں کہ جس شاعر کے "نخلستان فرہنگ" کے برگ و زم، کی جاذبیت اور حسن و خوبی کا یہ عالم ہے، اس کے "نقشہاے رنگ رنگ" اور "نسخہ ارتنگ" کے طراز و آرایش کا کیا انداز ہوگا لیکن افسوس کہ فارسیت کا ذوق ہندوستان میں بہت کم ہو گیا، اور فطرت غالب کے کمالات کی ان بوقلمونیوں سے اہل علم بہت کم روشناس ہو سکے۔

"نسخہ حمیدیہ" غالب نے ۱۲۳۷ھ مطابق ۱۸۲۱ء میں جب ان کی عمر چوبیس پچیس برس سے زیادہ نہ ہوگی، اُردو زبان کا ایک دیوان مرتب کر لیا تھا جو اسی زمانے میں نواب سیف اللہ محمد خاں رئیس بھوپال کے فرزند ارجمند نواب فوجدار محمد خاں کے پاس

نقل ہو کر پہنچ گیا تھا۔ چند سال ہوئے یہ نسخہ اعلیحضرت نواب حمید اللہ خاں بہادر فرمانروائے بھوپال (متع اللہ المسلمین بطول حیاتہ وحفظ لبقایہ) کی خسروانہ توجہات کی بدولت "نسخہ حمیدیہ" کے نام سے شائع ہو گیا ہے۔

تمہید میں مرقوم ہے کہ یہ نسخہ ۱۵ صفر المظفر ۱۲۳۷ھ کو حافظ معین الدین صاحب نے لکھا تھا۔ غائر مطالعہ سے منکشف ہوتا ہے۔ کہ اس میں زیادہ تر کلام بالکل ابتدائی دور کا ہے جب غالب کی دقت پسند طبیعت بیدل کے مطالعہ سے بہت متاثر تھی۔ لیکن نہ دماغی قوٰی نے بلوغ حاصل کیا تھا، نہ بیان پر پوری قدرت میسر آئی تھی، نہ فکر و تخیل نے جلا پائی تھی۔ وہ بیدل کے خاص الفاظ و تراکیب کو بہ کثرت استعمال کرتے تھے اور اُسے بیدل کی پیروی سمجھتے تھے جس طرح آجکل کور ذوق اصحاب نے اشعار میں اضافتوں کے مسرفانہ استعمال کو غالب کی پیروی سمجھ رکھا ہے۔ ایک صاف اور واضح بات اگر پیچیدہ، مبہم اور عسیر الفہم بن جائے۔ تو ان کے نزدیک غالب کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے۔

بیدل کی پیروی

بیدل کے اثر و سحر کاری کا اعتراف اس عہد کی متعدد غزلیات کے مقطعوں میں موجود ہے:-

اسد ہر جا سخن نے طرح باغ تازہ ڈالی ہے
مجھے رنگ بہار ایجادی بیدل پسند آیا

مطرب دل نے مرے تار نفس سے غالب
ساز پر رشتہ پئے نسخہ بیدل باندھا

ا؎ تمہید نسخہ حمیدیہ، صفحہ ۵۔

مجھے راہِ سخن میں خوفِ گمراہی نہیں غالبؔ
عصائے خضرِ صحرائے سخن ہے خامہ بیدلؔ کا

آہنگِ اسدؔ میں نہیں جز نغمۂ بیدلؔ
عالم ہمہ افسانۂ ما دارد و ما ہیچ

اس زمانے کے کلام میں محض ردیفیں ہی نہیں - بلکہ پورے مصرعے فارسی کے چلے آتے ہیں۔ مثلاً :

بساں جوہرِ آئینہ از ویرانیِ دلہا
غبارِ کوچہ ہائے موج ہے خاشاکِ ساحلہا

فضائے خندۂ گل تنگ و ذوقِ عیش بے پروا
فراغت گاہِ آغوشِ وداعِ دل پسند آیا

بہ شغلِ انتظارِ مہوشاں در خلوتِ شبہا
سرِ تارِ نظر ہے رشتۂ تسبیحِ کوکبہا

غالبؔ اپنے شاگرد عبدالرزاق شاکرؔ کو لکھتے ہیں :

ابتدائے فکرِ سخن میں بیدلؔ و اسیرؔ کے طرز پر ریختہ لکھتا تھا۔ چنانچہ ایک غزل کا مقطع یہ تھا :

طرزِ بیدلؔ میں ریختہ لکھنا
اسد اللہ خاں قیامت ہے

پندرہ برس کی عمر سے پچیس برس کی عمر تک مضامین خیالی لکھتا گیا۔ دس برس میں بڑا دیوان جمع ہو گیا۔ آخر جب تمیز آئی۔ تو اس دیوان کو دور کیا۔ اوراق یک قلم چاک کئے۔

دس پندرہ شعر واسطے نمونے کے دیوان حال میں رہنے دیئے۔

"مضامین خیالی" کا یہی مجموعہ "نسخہ حمیدیہ" ہے۔

نسخہ حمیدیہ کی تصحیح و ترمیم کا مسئلہ

مفتی انوار الحق مرحوم، اصل نسخہ کی کیفیت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس پر جگہ جگہ میاں فوجدار محمد خاں کی مہریں ثبت ہیں۔ جن میں سے بعض ۱۲۴۸ھ کی اور بعض ۱۲۶۲ھ کی ہیں:

یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ دیوان کم سے کم ایک بار اور ممکن ہے کہ چند مرتبہ تصحیح و ترمیم کی غرض سے غالب کے پاس بھیجا گیا ہے۔ اور ان کی نظر سے گزرا ہے۔ اور انہوں نے خود اس میں جا بجا اصلاحیں کی ہیں، کیوں کہ اگرچہ ان اصلاحوں کا خط بہت خراب اور شکستہ ہے۔ لیکن پھر بھی اس میں اور غالب کی طرز تحریر کے موجودہ نمونوں میں ایک گونہ مشابہت پائی جاتی ہے۔ اور گو محض اس کی بنا پر ان کو غالب کا قلمی قرار دینا شاید درست نہ ہو۔ لیکن خود ان اصلاحوں کی نوعیت ایسی ہے کہ ان کو مصنّف کے سوا اور کسی کے قلم کی طرف منسوب کرنا مشکل ہے، کیونکہ ان میں سے اکثر ایسی ہیں۔ کہ ایک لفظ کو کاٹ کر اس کی جگہ دوسرا لفظ رکھ دیا ہے، یا کسی مصرع کی کچھ صورت بدل دی ہے۔ بہت سی غزلیں بھی اسی قلم سے حاشیہ پر بڑھائی گئی ہیں، جن میں سے بیشتر مروجہ دیوان میں بجنسہٖ موجود ہیں، البتہ بعض ایسی بھی ہیں کہ ان میں دوبارہ پھر کچھ انتخاب ہوا ہے۔ اور مطبوعہ دیوان میں ان کے پورے شعر شائع نہیں ہوئے۔

نسخہ حمیدیہ کبھی غالب کے پاس نہیں گیا

لیکن میرے خیال میں مفتی صاحب کی یہ رائے محل نظر ہے۔ اس کے وجوہ اختصاراً ذیل میں درج ہیں:۔

(۱) غالب کلکتہ جاتے ہوئے لکھنؤ بھی ٹھہرے تھے۔ وہاں انہوں نے ایک غزل کہی تھی۔ جس کا مطلع یہ ہے:

واں پہنچ کر جو غش آتا پے ہم ہے ہم کو — صد رہ آہنگ زمیں بوس قدم ہے ہم کو

"نسخہ حمیدیہ" میں ایسے غالبؔ کے اس کلام میں شامل کیا گیا ہے۔ جس کا کوئی ہم طرح شعر قلمی نسخہ موجود نہیں[1] اگر یہ نسخہ کلکتہ سے مراجعت کے بعد غالبؔ کے پاس بغرض تصحیح و ترمیم پہنچا۔ اور انہوں نے نسخہ کی کتابت سے بعد کی کہی ہوئی غزلیں حاشیہ پر بڑھائیں۔ تو اس غزل کو کیوں نظر انداز کیا؟ حالانکہ یہ یقینی طور پر ۱۸۲۶ء میں کہی گئی تھی اور مفتی صاحب کے ارشاد کے مطابق دیوان ۱۸۳۲ء اور ۱۸۴۷ء میں تصحیح و اضافہ کے لئے باہر گیا۔ غرض سفر کلکتہ کے بعد اس نسخہ کا غالبؔ کے پاس پہنچنا قابلِ قبول نہیں۔

(۲) نواب علاءالدین احمد خاں کو غالبؔ اپنے ایک خط مرقومہ ۲۷ جولائی ۱۸۶۴ء میں لکھتے ہیں:

بس پچاس برس کی بات ہے کہ الٰہی بخش خاں مرحوم نے ایک زمین نکالی میں نے حسب الحکم غزل لکھی۔ بیت الغزل یہ ہے:

پلا دے اوک سے ساقی جو ہم سے نفرت ہے
پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے شراب تو دے

الٰہی بخش خاں معروفؔ کا انتقال ۱۲۴۲ھ (مطابق ۱۸۲۶ء) میں ہوا۔ لہٰذا ماننا چاہیئے۔ کہ یہ غزل ۱۸۲۶ء سے پہلے کہی گئی۔ لیکن مطبوعہ "نسخہ حمیدیہ" کے مطابق یہ بھی اس کلام میں شامل ہے۔ جس کا ہم طرح کوئی شعر قلمی نسخہ میں موجود نہیں[2] ثابت ہوا کہ بھوپال والا نسخہ ۱۸۲۵ء کے بعد کبھی بھی غالبؔ کے پاس نہیں گیا۔

---

[1] نسخہ حمیدیہ صفحہ ۱۵۱۔

[2] نسخہ حمیدیہ صفحہ ۲۰۰۔

(۳) سب سے آخر میں یہ کہ خود غالبؔ نے کسی تحریر میں اس نسخہ کا ذکر نہیں کیا حالانکہ غدر کے بعد انہیں اپنے کلام کے مختلف نسخے جمع کرنے کی سخت ضرورت پیش آگئی تھی۔ میرا خیال ہے کہ غالبؔ کو اس نسخہ کا سرے سے علم ہی نہ تھا۔

اردو اشعار کی تعداد سرسری اندازہ سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ قلمی "نسخہ حمیدیہ" میں قصائد اور گیارہ رباعیات کے علاوہ کل ایک ہزار آٹھ سو نوے شعر ہیں۔ ان میں سے غالبؔ نے یا مولانا محمد حسین آزادؔ کی روایت کے مطابق مولانا فضل حق خیر آبادی اور مرزا خانی کوتوال دہلی[1] نے انتخاب کے وقت کل چار سو نہتر شعر لئے۔ ۱۸۲۵ء کے بعد آخری دم تک چوالیس برس میں غالبؔ نے اُردو غزلیات میں مطبوعہ دیوان کے مطابق نو سو نوے شعر کہے۔ بعد کے قصائد، قطعات اور مثنوی انبہ کے اشعار کی تعداد دو سو ستر ہے۔ رباعیات گیارہ ہیں۔ یعنی اگر سب اشعار کو شامل کر لیا جائے تو ان کے چوالیس برس کے کل اُردو اشعار تیرہ سو سے کسی قدر کم بنتے ہیں۔ ان میں وہ اشعار بھی شامل ہیں جو مطبوعہ دیوان میں شامل نہیں ہوئے۔ لیکن رقعات میں چھپ گئے۔ ایسے اشعار بھی ہیں جو نہ رقعات میں چھپے اور نہ دیوان میں شامل ہوئے۔ غرض ۱۸۲۵ء کے بعد سے ان کے کل اُردو اشعار تیرہ ساڑھے تیرہ سو سے متجاوز نہیں ہوں گے۔ اس دوران میں فارسی کے کئی ہزار اشعار کہے۔

انتخاب اشعار نادرست ہے "نسخہ حمیدیہ" والے اشعار کا کوئی مجموعہ اگر انتخاب کے وقت غالبؔ یا ان کے دوستوں کے پیش نظر تھا۔ تو ماننا چاہیئے کہ انتخاب میں فروگزاشتیں ہوئیں۔

[1] آب حیات صفحہ ۵۱۰۔

اس نسخہ میں بعض ایسی غزلیں موجود ہیں جو تماماً یا جزواً انتخاب میں آنی چاہیئے تھیں مگر نہیں آئیں۔ مثلاً مندرجہ ذیل غزل:

دامانِ دل بہ وہم تماشا نہ کھینچیے
اے مدعی خجالت بے جا نہ کھینچیے

عجز و نیاز سے تو وہ آیا نہ راہ پر
دامن کو اس کے آج حریفانہ کھینچیے

خود نامہ بن کے جائیے اس آشنا کے پاس
کیا فائدہ کہ منت بیگانہ کھینچیے

یا:

تماشائے گلشن تمنائے چیدن
بہار آفرینا گنہگار ہیں ہم

اسدؔ شکوہ کفر و دعا ناسپاسی
ہجوم تمنا سے لاچار ہیں ہم

یا:

خود پرستی سے رہے باہمد گر نا آشنا
بیکسی میری شریک، آئینہ تیرا آشنا

ربط یک شیرازۂ وحشت ہیں اجزائے بہار
سبزہ بیگانہ، صبا آوارہ، گل نا آشنا

بہرحال ان میں سے کوئی شعر "شمار سبحہ مرغوب بت مشکل پسند آیا" کے مقابلے میں مستوجب حذف و رد نہ تھا۔

نئے انتخاب کی ضرورت میرا خیال ہے۔ کہ پورا مجموعہ بوقت انتخاب اشعار غالبؔ یا ان کے دوستوں کے سامنے نہ تھا۔ اگر حالات نے مساعدت کی تو میرا ارادہ ہے کہ غالبؔ کے اچھے اشعار کا ایک نیا مجموعہ مرتب کروں۔ اس لئے کہ بعض ان اشعار کی وجہ سے جن میں فارسیت زیادہ اور معانی معمولی ہیں، ان کی عظمت و کمال کا حقیقی بدل عام لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہو رہا ہے۔ اور "غالبیت" کے غلط تصور نے جو مروجہ اردو دیوان کے عام مطالعہ کا لازمی نتیجہ تھا، بہتیرے لوگوں کو اس راستے پر ڈال دیا ہے جو غالبؔ کا راستہ یقیناً نہیں تھا۔

"نسخۂ حمیدیہ" کے علاوہ بھی غالب بعض اچھے اشعار ملے ہیں۔ جو اب تک ان کے دیوان میں شامل نہیں ہو سکے۔ مثلاً:

درد ہو دل میں تو دوا کیجے[1]   دل ہی جب درد ہو تو کیا کیجے
ہم کو فریاد کرنی آتی ہے   آپ سُنتے نہیں تو کیا کیجے

عرض شوخی نشاط عالم ہے
حُسن کو اور خود نما کیجے

یا:

اس جور و جفا پر بھی، بدظن نہیں ہم تجھ سے
کیا طرفہ تمنا ہے، اُمید کرم تجھ سے

یا:

نہ پوچھ حال اس انداز اس عتاب کے ساتھ   لبوں پہ جان بھی آجائیگی جواب کے ساتھ
مجھے بھی تاکہ تمنا سے ہو نہ مایوسی   ملو رقیب سے لیکن ذرا حجاب کے ساتھ

ہزار حیف کہ اتنا نہیں کوئی غالبؔ
جو جاگنے کو ملا دیوے آکے خواب کے ساتھ[1]

اُردو مکاتیب کی تعداد اُردو نثر کے سلسلے میں تمام ضروری تفصیلات باب تصانیف میں پیش کی جا چکی ہیں، یہاں صرف مکاتیب کی تعداد بتانی ہے۔ مطبع فاروقی کے چھپے ہوئے "اُردوے معلّٰی" اور مطبع نولکشور کی چھپی ہوئی عود ہندی سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ دونوں کتابوں میں تقریظوں اور "نامہ غالب" کے علاوہ کل چھ سو پندرہ خطوط ہیں:

---

[1] یہ اشعار آسی صاحب کی مکمل شرح کلام غالبؔ سے ماخوذ ہیں ۱۲

اُردوئے معلّٰی ۱۸۶۸ء

عودِ ہندی ۱۸۶۸ء

ان میں سے کم و بیش ۱۱ رقعات مشترک ہیں۔ اُردوئے معلّٰی کے بعض دوسرے مجموعوں میں چند اور رقعات کا اضافہ ہوا ہے۔ چند نئے رُقعات ہندوستانی اکیڈمی (صوبہ متحدہ) کے رسالہ "ہندوستانی" میں چھپے ہیں۔ بعض رقعات دوسرے رسائل میں طبع ہوئے ہیں۔ فرمانروایانِ رام پور کے نام کے تمام رقعات مولانا امتیاز علی عرشی کی سعی و ترتیب سے چھپ گئے ہیں۔ بہار کے بعض اصحاب کو جو رقعات لکھے گئے تھے۔ ان کا انتخاب "نادر خطوطِ غالبؔ" کے نام سے شائع ہو گیا ہے۔ خواجہ فخرالدین حسین سخنؔ کے پاس جو مکاتیب تھے وہ ابھی تک نہیں چھپے سُنا ہے پنڈت مہیش پرشاد منشی فاضل (ہندو یونیورسٹی بنارس) نے رقعات کا ایک بھاری مجموعہ فراہم کیا ہے۔ جسے متعدد جلدوں میں چھاپیں گے۔ تا حال صرف پہلی جلد چھپی ہے۔ مطبوعہ رقعات میں سے زیادہ تر نواب علاء الدین احمد خاں، علائی، منشی شیونرائن، میر مجروحؔ۔ سرور مارہروی، خواجہ غلام غوث خان بیخبرؔ، نواب انور الدولہ بہادر شفقؔ، حکیم غلام نجف خاں اور میرزا حاتم علی بیگ مہرؔ کے نام ہیں۔

مکاتیب اُردو کے انداز و اسلوب کی نسبت صرف اتنا عرض کر دینا کافی ہے کہ سادہ، سلیس اور بہار آفریں تحریر کا کوئی ایسا نمونہ اُردو زبان میں موجود نہیں حُسنِ بیان، اعجازِ نگارش اور کمالِ اظہارِ جزئیات کی اتنی فراواں مثالیں ان مکاتیب میں موجود ہیں کہ اُردو کی بڑی بڑی اور بہترین کتابیں ان کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔ غالبؔ کے بعد بڑے بڑے ادیبوں اور مصنّفوں کے خطوط شائع ہوئے۔ لیکن ایک مجموعہ بھی مکاتیبِ غالبؔ کے مقامِ بلند تک نہ پہنچ سکا۔ کمال یہ ہے کہ ہر قسم کے مباحث

قلم برداشتہ لکھتے جاتے ہیں۔ یہ انداز نہ ان سے پہلے کسی کو میسر تھا اور نہ ان کے بعد کوئی شخص اس کی پوری پیروی کر سکا۔ غالبؔ کے اُردو اشعار کی کافی قدر ہوئی ہے لیکن ان کے اُردو مکاتیب کی بلند پایگی سے اس وقت تک اہلِ علم بالعموم آگاہ نہیں ہوئے۔ غالبؔ کے بعد اس وقت تک جتنے بڑے بڑے ادیب پیدا ہوئے۔ میں نے سب کے مکاتیب دیکھے ہیں۔ دورِ حاضر کے اکثر اکابر اہلِ علم سے بھی خط وکتابت کا شرف حاصل رہا ہے۔ لیکن حضرت مولانا ابوالکلام آزادؔ کے سوا مجھے کسی بزرگ کے اندازِ تحریر میں غالبؔ کی دلکش خصوصیات جامعیت کے ساتھ نظر نہیں آئیں۔ مولانا کے مکاتیب میں مزید دلچسپی اور افادہ کا پہلو یہ ہے کہ ان کا دائرہ علم و فضل غالبؔ کے مقابلے میں بہت وسیع ہے۔

اچھوتا انداز

مکاتیب کے نادر اسلوب کا غالبؔ کو آخر میں پُورا احساس تھا۔ وہ فرماتے ہیں:

> میں نے وہ اندازِ تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا ہے۔ ہزار کوس سے بہ زبان قلم باتیں کیا کرو۔ اور ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو۔

یہ چیز صرف اُردو کے ساتھ مختص نہیں ہے۔ فارسی میں بھی ان کا عام انداز یہی تھا جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے۔

فارسی نثر

فارسی کے کلام نظم و نثر کی نسبت زیادہ تفصیلات میں جانے کی ضرورت نہیں "قاطع برہان" "پنج آہنگ" "مہر نیمروز" اور "دستنبو" کا مفصل ذکر باب تصانیف میں آ چکا ہے "پنج آہنگ" کے آخری دو حصوں کی نسبت اتنا عرض کر دینا چاہیئے۔ کہ آہنگ چہارم میں غالبؔ کی لکھی ہوئی تقریظیں اور متفرق نثریں ہیں۔ آہنگ پنجم میں فارسی مکاتیب ہیں "آہنگ چہارم" کی نثروں کی فہرست درج ذیل ہے:

(۱) دیباچہ دیوان فارسی۔

(۲) دیباچہ گل رعنا۔

(۳) خاتمہ گل رعنا۔

(۴) مولانا فضل خیر آبادی کے نام خط صنعت تعطیل ہیں۔

(۵) معتمد الدولہ آغا میر وزیر اعظم اودھ کے نام عرضداشت صنعت تعطیل ہیں۔

(۶) خاتمہ دیوان فارسی۔

(۷) دیباچہ دیوان اُردو۔

(۸) تقریظ گلشن بیخار مرتبہ نواب مصطفٰے خاں شیفتہؔ۔

(۹) طلوعِ صبح اور ہجوم ظلمت شب کے متعلق دو نثریں۔

(۱۰) تقریظ دیوان حافظ۔

(۱۱) دیباچہ دیوان میرزا رحیم الدین بہادر حیاؔ جس کا آخری حصہ صنعت مقطع الحروف میں ہے۔

(۱۲) موارد الکلم فیضی کی تقریظ صنعت تعطیل ہیں۔

(۱۳) دیباچہ دیوان منشی ہرگوپال تفتہؔ۔

(۱۴) تقریظ آثار الصنادید سر سیّد مرحوم۔

(۱۵) دیباچہ دیوان ریختہ نواب حسام الدین حیدر خاں۔

(۱۶) دیباچہ تذکرہ طلسم زار مجروحؔ۔

(۱۷) تہنیت عطائے خلعت بہ فرمانروائے رام پور۔

(۱۸) تقریظ مجموعہ آثار مرتبہ مولوی مظہر الحق۔

اس فہرست سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ غالب نے زیادہ تر کتابوں کے دیباچے، خاتمے اور تقریظیں لکھی ہیں۔ لیکن سب کا انداز جداگانہ ہے۔ کوئی نثر ایسی نہیں ہے۔ جس

میں ظہوری کی سہ نثر کی طرح محض خیال آرائی کی گئی ہو۔ اس زمانے میں غیر منقوط یا مقطع الحروف عبارتیں لکھنا کمال نگارش سمجھا جاتا تھا۔ غالب کی نثروں میں اس نگارش کے نمونے بھی موجود ہیں۔

فارسی مکاتیب — نثر فارسی کا حصہ درجہ دل کش مجموعہ ان کے مکاتیب ہیں جن پر آہنگ پنجم مشتمل ہے۔ میرے اندازے کے مطابق ان کی تعداد ایک سو چالیس ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اُردو مکاتیب کی طرح فارسی مکاتیب کی بھی ایک بڑی تعداد ضائع ہو گئی یا چھپ نہ سکی۔ اُردو مکاتیب زیادہ تر غالب کی زندگی کے آخری بیس سال کے ہیں۔ اس سے پہلے وہ عموماً فارسی میں خط و کتابت کرتے تھے۔ چونکہ کثیر الاحباب اور کثیر الاقارب تھے۔ یہ بات قرین قیاس نہیں کہ پندرہ سولہ برس کی عمر سے لے کر پچاس پچپن برس کی عمر تک پینتیس چالیس برس میں انہوں نے محض ایک سو چالیس مکاتیب لکھے۔

کلیات نظم — کلیات نظم کے آغاز میں قطعات، نوحے اور تاریخیں ہیں، پھر ایک مخمس ہے اس کے بعد ترکیب بند بعد ازاں مثنویاں، قصیدے اور غزلیات۔ آخر میں رباعیات ہیں ان کا سرسری اندازہ یہ ہے:

قسم نظم	تعداد	اشعار
قطعات	۹۷	۴۸۴
مخمس	۱	دس بند
ترکیب بند	۳	۲۴۰
ترجیع بند	۱	۵۶
مثنویاں	۱۱	۲۰۲۲
غزلیات	۳۲۸	۴۳۷۴
رباعیات	۱۰۰	۲۰۰

گویا کلیات فارسی کے کل اشعار کا اندازہ سوا دس ہزار کے قریب ہے۔ "سبد چیں" کے اشعار قریباً ساڑھے چھ سو ہیں اس طرح غالب کے فارسی اشعار کا مجموعہ گیارہ ہزار کے قریب بنتا ہے۔ لیکن بعض چیزیں ناپید ہیں۔ بعض قطعات و رباعیات و اشعار نثر دں میں آئے ہیں اور کسی مجموعہ نظم میں شامل نہیں ہو سکے۔ ان سب کو جمع کرنا وقت طلب ہے۔

قطعات اور ترکیب بند

قطعات متفرق مضامین کے متعلق ہیں۔ مثلاً اپنے اور معاصرین کے درمیان فرق، اوامر الٰہی کی پیروی نہ کرنے کا مسئلہ، ایک بخیل کا معاملہ، فارسی اور اُردو شاعری وغیرہ۔ بعض قطعات امرا و حکام کی مدح و تہنیت میں ہیں۔ چند نوحے ہیں۔ ترکیب بند دو ہیں۔ ایک حضرت علی علیہ السلام اور دوسرے ائمہ رضی اللہ عنہم کی منقبت میں اور دوسرا بہادر شاہ کے صاحبزادے کے مرثیہ میں۔ ترجیع بند بہادر شاہ کی مدح میں ہے۔ اور مخمس حضرت علیؑ کی منقبت میں۔

مثنویاں

مثنویوں کی کیفیت یہ ہے:

(۱) بہادر شاہ کی مدح میں موسوم بہ "سرمۂ بینش"۔

(۲) ایک قصہ موسوم بہ "درد و داغ"۔

(۳) بنارس کی تعریف میں موسوم بہ "چراغ دیر"۔

(۴) ایک قصہ موسوم بہ "رنگ و بو"۔

(۵) کلکتہ میں جن لوگوں نے غالبؔ کے خلاف اعتراضات کا ہنگامہ بپا کیا تھا۔ ان کے جواب میں موسوم بہ "باد مخالف"۔

(۶) تبرکات اور مسئلہ امتناع نظیر حضرت ختم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق جو مولانا فضل حق خیر آبادی کی فرمایش سے لکھی تھی۔

(۷) تہنیت نامۂ عید بخدمت بہادر شاہ ثانی۔

(۸) تہنیت نامۂ عید بخدمت شہزادہ فخر الدین فتح الملک ولی عہد بہادر شاہ۔

(۹) واجد علی شاہ فرمانروائے اودھ کی نثر موسوم بہ بست وہفت افسر کا دیباچہ۔

(۱۰) آئین اکبری مصححہ سر سیّد احمد خاں کی تقریظ۔

(۱۱) "ابر گہربار"

ابر گہربار

ان میں سے بعض مثنویوں کی کیفیت اور بعض اشعار کتاب کے مختلف حصوں میں جابجا پیش کئے جا چکے ہیں۔ لیکن آخری مثنوی کے متعلق کسی قدر تفصیل ضروری ہے غالب کی یہ سب سے بڑی مثنوی ہے۔ جس کے اشعار گیارہ سو سے زائد ہیں۔ ارادہ تھا۔ کہ شاہنامہ کے رنگ میں غزوات نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) کو نظم کریں۔ لیکن یہ ارادہ پورا نہ ہوسکا۔ وہ صرف مقدمات یعنی حمد و نعت و منقبت اور غرض تالیف وغیرہ ہی مرتب کر سکے۔ اصل مضمون شروع نہ ہوا۔ اس میں صرف معراج کا واقعہ دو سو اسّی اشعار پر مشتمل ہے۔ آخر میں یہ سلسلہ غرض تالیف فرماتے ہیں:

زبان تازہ سازم زنیروے بخت
بہ ذکر شہنشاہ بے تاج و تخت

گزشت آنکہ دستانسرائے کہن
ز کیخسرو و رستم آرد سخن

منم کم بود در طراز کلام،
شہنشہ پیمبر سپہبد امام

ز فردوسیم نکتہ انگیز تر
ز مرغ سحر خواں سحر خیز تر،

فرو مردن شمع ساسانیاں
بود صبح اقبال ایمانیاں

رقم سنج منشور یزدانیم
ز ایرانیاں گوئیم، ایمانیم

کسے را کہ نازد بہ بیگانگاں
خرد در شمار ز دیوانگاں

بہ اقبال ایماں از نیروے دیں
سخن رانم از سید المرسلین

اس کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

در ضمیر زود اثر پذیر من چناں فرود آمد کہ غزوات خداوند دنیا و دیں، حضرت امام المرسلین سلام علیہ من رب العالمین، بہ بند نگارش اندر آرم۔ توحید و مناجات منقبت و ساقی نامہ

مغنی نامہ، پیدائی پذیرفت۔ باچاشنی وخنیاگری سخنہاے دل آویز و مہرانگیز گفتہ آمد۔ و بیشترہ در مناجات بہ شیوۂ ابداع بداں ساں رندانہ و قلندرانہ سخن سرودہ شد کہ سروشان بہشتی را لب از شور ہا یا ہوے بیتحاشانہ زد۔ و در بارہ معراج عروج فکر آں پایہ یافت کہ سخن از جائیکہ مے رفت ہم بدانجا رسید۔ گفتار ناشناساں کہ بہ نزاکت فارسی گویائی ہند خو گرفتہ اند و آں را بہ بہاے گراں ہمے فروشند بہ خرند حسن خداداد و نطق مرا چوں بینند۔[1]

قصاید | قصائد کی تفصیل یہ ہے:

ممدوح	تعداد قصائد
(۱) حمد و نعت و مناقب ائمہؑ	۱۲
(۲) اکبر شاہ ثانی پادشاہ دہلی	۱
(۳) بہادر شاہ ثانی پادشاہ دہلی	۱۵
(۴) ملکہ وکٹوریہ	۳
(۵) لارڈ آکلینڈ گورنر جنرل	۱
(۶) لارڈ ایلن برا گورنر جنرل	۲
(۷) سر چارلس مٹکاف	۱
(۸) جیمس ٹامسن لفٹننٹ گورنر یو۔پی	۱
(۹) پرنسیپ	۱
(۱۰) ٹامس ماڈک	۱
(۱۱) اینڈریو اسٹرلنگ	۱

[1] مثنوی ابر گہربار، مطبوعہ ۱۲۸۰ھ صفحہ ۱۴

(۱۲) ولیم فریزر	۱
(۱۳) کالون	۱
(۱۴) لارڈ ہارڈنگ گورنر جنرل	۱
(۱۵) ایڈفنسٹن	۱
(۱۶) لارڈ کیننگ گورنر جنرل	۱
(۱۷) سر رابرٹ منٹگمری لفٹنٹ گورنر پنجاب	۲
(۱۸) لارڈ ایلجن گورنر جنرل	۱
(۱۹) لارڈ لارنس گورنر جنرل	۱
(۲۰) شہزادہ فتح الملک	۳
(۲۱) نصیر الدین حیدر شاہ اودھ	۱
(۲۲) امجد علی شاہ اودھ	۱
(۲۳) واجد علی شاہ اودھ	۳
(۲۴) نواب یوسف علی خاں والی رام پور	۲
(۲۵) نواب کلب علی خاں والی رام پور	۲
(۲۶) نواب وزیر الدولہ والی ٹونک	۲
(۲۷) راجہ شیودھیان سنگھ والی الور	۱
(۲۸) مہاراجہ نرندر سنگھ والی پٹیالہ	۱
(۲۹) نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ	۱
(۳۰) مفتی صدر الدین آزردہ	۱
(۳۱) نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر	۱
(۳۲) سر سالار جنگ اول	۱

(۳۳) ایک عام قصیدہ یا نظم جس کا کوئی ممدوح نہیں۔

قصیدوں کا انداز

غالب نے خود ایک جگہ اپنے قصیدوں کے متعلق لکھا ہے:

کیا کروں اپنا شیوہ ترک نہیں کیا جاتا۔ وہ روش ہندوستانی فارسی لکھنے والوں کو مجھ کو نہیں آتی کہ بالکل بھاٹوں کی طرح بکنا شروع کردیں۔ میرے قصیدے دیکھو۔ تشبیب کے شعر بہت پاؤ گے۔ اور مدح کے شعر کم۔ نثر میں بھی یہی حال ہے۔

واقعہ یہی ہے کہ ان کے تمام قصیدوں میں یا تو تشبیبیں بہت اعلیٰ ہیں یا وہ حصے شاعرانہ نقطہ نگاہ سے خاص طور پر قابل قدر ہیں جن میں اپنی حالت بیان کی ہے۔ تشبیبوں میں شاعری کے ہر کمال کو انتہائی حسن و خوبی کے ساتھ نمایاں کیا ہے۔ اکثر قصائد عرفی اور دوسرے مشاہیر اساتذہ کے قصیدوں پر لکھے ہیں۔ اور غالب اگر ان سے آگے نہیں نکلے تو پیچھے بھی نہیں رہے۔ لیکن افسوس کہ نہ غالب کو عرفی اور دوسرے شعرا جیسے قدر دان ملے اور نہ زبان فارسی کا وہ ذوق باقی رہا جس سے زمانۂ گزشتہ کے بڑے بڑے اساتذہ کا کلام صدیوں متمتع رہا۔

غیر مطبوعہ فارسی قطعہ

غالب کا ایک غیر مطبوعہ فارسی قطعہ حال ہی میں ملا ہے جو "معظم الدولہ امین الملک، اختصاص یار خاں، فرزند ارجمند جاں پیوند سلطانی بارنٹ تامس تھیافلس مٹکاف صاحب بہادر فیروز جنگ" کی مدح میں بتقریب ولادت فرزند لکھا گیا تھا۔ اسے تبرک کے طور پر یہاں درج کیا جاتا ہے:

امین ملک و ممالک معظم الدولہ — امیر شاہ نشان و کریم ابر نوال

سراں بہ معرکہ فیروز جنگ خوانندش — نہ ہے بہ طالع فیروز خویش فرخ فال

ستودہ متکلف فرزانہ تا فلس تامس — ریاض شان و شکوہ بہار جاہ و جلال

مآثر حکمش نور دیدۂ دولت — مکارم کرمش روح قالب اقبال

ز ترکتاز سواران موکب جاہش — بسان سبزہ شود چرخ نیلگوں پامال

به منظرش چه زنی دم ز تیر رخشاں | کہ آں در اوج ہوا طائریست زریں بال
کدام تیر رخشاں کہ خود ز منظر او | پدید گشتہ در آئینہ فلک تمثال
زہے عطائے تو کشاف عقدۂ حاجات | خہے نگاہ تو وصاف صورت آمال
ز قیصر و جم و دارا فسانہ ہا دانم | ولے نظیر تو ام نگزرد بہ وہم و خیال
مگر خدائے جہاں آفریں بہ شوکت و جاہ | بنا فریدہ ترا در جہاں عدیل و ہمال
یکے منم ز مسیحا دماں فن کلام | یکے منم ز ہما شہپران اوج کمال
کہ چوں بہ مدح تو روے آدرم، فرو ماند | زباں ز نکتہ سرائی چنانکہ گردد لال
بہ بارگاہ تو کز آسماں بود صحنش | ہمے کنم بہ سخن تحفۂ دعا ارسال
ترا کہ رونق ایں گلشنی، مبارک باد | طرب فزائی پیوند نو دمیدہ نہال

ثمر فشانی ایں نخل بیتی وبہ جہاں
ز نخل عیش و طرب برخوری ہزاراں سال

اس کے ساتھ ایک اُردو تحریر بھی ملی ہے جس میں کاتب کو اس قطعہ کی ترتیب بتائی گئی ہے۔[ا]

اصلاح اشعار

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں غالب کے طریق اصلاح اشعار کا بھی مختصراً ذکر کر دیا جائے۔ وہ اپنے شاگردوں سے صاف لکھا ہوا کلام منگاتے تھے۔ اشعار اور مصرعوں کے درمیان اتنا فاصلہ رکھواتے کہ اس میں حسب ضرورت اصلاح دی جا سکے۔ عموماً مقصد اصلاح بھی واضح فرما دیتے اور اصل مسودہ مرسل کو واپس بھیج دیتے۔ قاضی عبدالجمیل بریلوی کو لکھتے ہیں:

"عنایت نامہ آپ کے اوقات مختلف میں پہنچے۔ پہلے خط کے حاشیہ پر اور پشت پر اشعار

ا؎ سر ٹامس تھافلس مٹکاف (بیرونٹ) لارڈ مٹکاف کے بھتیجے تھے ۱۷۹۵ء میں دہلی میں پیدا ہوئے ۱۸۱۳ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی میں ملازم ہوئے ۱۸۵۳ء میں بیرونٹ بنے۔ مئی ۱۸۵۷ء میں غدر کے آغاز پر دہلی میں مجسٹریٹ تھے ۱۸۶۶ء میں ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ ۱۰ نومبر ۱۸۸۳ء کو وفات پائی۔

لکھے ہوئے ہیں۔ سیاہی اس طرح کی پھیکی کہ حروف اچھی طرح پڑھے نہیں جاتے۔ اگرچہ بینائی میری اچھی طرح ہے۔ اور میں عینک کا محتاج نہیں۔ لیکن بااین ہمہ اس کے پڑھنے میں بہت تکلف کرنا پڑتا ہے۔ علاوہ اس کے جگہ اصلاح کی باقی نہیں۔ چنانچہ اس خط کو آپ کی خدمت میں واپس بھیجتا ہوں۔ تاکہ آپ یہ نہ جانیں کہ میرا خط پھاڑ کر پھینک دیا ہوگا۔ اور مقصد امیر اندیشہ آپ کو معلوم ہو جائے۔ آپ خود دیکھ لیں اس میں اصلاح کہاں دی جائے۔ واسطے اصلاح کے جو غزل بھیجئے۔ اس میں بین الافراد و بین المصرعین کا فاصلہ زیادہ چھوڑیئے۔ آپکے دوسرے خط میں جو کاغذ اشعار کا ہے۔ حروف اس کے روشن ہیں۔ مگر بین السطور مفقود اور اصلاح کی جگہ معدوم۔ آپ کی خاطر سے رنج کتابت اُٹھاتا ہوں اور دونوں غزلوں کو بعد اصلاح لکھتا جاتا ہوں۔ مسودہ تو آپ کے پاس ہوگا۔ اس سے مقابلہ کرکے معلوم کر لیجیے گا۔ کہ کس شعر پر اصلاح ہوئی۔ اور کیا اصلاح ہوئی۔ اور کون سی بیت موقوف ہوئی۔

تفتہ کو لکھتے ہیں:

دوسرا پارسل جس کو تم نے بے تکلف خط بنا کر بھیجا، نہ اصلاح کو جگہ، نہ تحریر بسطور کا پیچ و تاب سمجھ میں آتا ہے۔ تم نے الگ الگ دو ورقے پر کیوں نہ لکھا اور چھدرا چھدرا کیوں نہ لکھا؟ ایک آدھ ورق زیادہ ہو جاتا تو ہو جاتا۔ بہرحال اب مجھے تنکے چُننے پڑے ہیں۔

ایک اور خط میں فرماتے ہیں:

اشعار جناب رند[1] کے پہنچنے کے ایک ہفتہ بعد درست ہو گئے۔ اور اصلاح اور اشارے اور فوائد جیسا کہ میرا شیوہ ہے عمل میں آیا۔

اصلاح سے معذوری آخری عمر میں بہت معذور ہو گئے تھے۔ اور اخباروں میں اعلان چھپوا دیا تھا۔ کہ کوئی صاحب اپنا کلام اصلاح کے لیئے نہ بھیجیں۔ لیکن ارباب عقیدت اس زمانے میں بھی تبرکاً اصلاح کے لئے اصرار کرتے تھے۔ وہ سیاح کو ۲۵ اگست ۱۸۶۷ء

[1] جانی بانکے لال رند وکیل مہاراجہ بھرت پور۔

کے ایک خط میں لکھتے ہیں:

بھائی اب میں تو کوئی دن کا مہمان ہوں۔ اور اخبار والے میرا حال کیا جانیں ہاں اکمل الاخبار اور اشرف الاخبار والے کہ یہاں کے رہنے والے ہیں اور مجھ سے ملتے ہیں۔ سوان کے اخبار میں میں نے اپنا حال مفصل چھپوا دیا ہے اور اس میں میں نے عذر چاہا خطوں کے جواب کا تقاضا اور اشعار کی اصلاح سے اس پر کسی نے عمل نہ کیا۔ اب تک ہر طرف سے خطوں کے جواب کا تقاضا اور اشعار واسطے اصلاح کے چلے آتے ہیں اور میں شرمندہ ہوتا ہوں۔

دستگاہ شعر گوئی خواجہ حالی، حسین میرزا کی زبانی بیان کرتے ہیں۔ کہ ایک روز میں (حسین میرزا) اور غالب دیوان عام میں بیٹھے تھے۔ چوبدار آیا۔ اور کہا کہ حضور نے غزلیں مانگی ہیں۔ غالب نے چوبدار کو ٹھہرا لیا اور اپنے آدمی سے کہا کہ پالکی میں کچھ کاغذ رومال میں بندھے ہوئے رکھے ہیں۔ وہ لے آؤ۔ کاغذ آئے۔ ان میں آٹھ نو پرچے تھے۔ جن پر ایک ایک دو دو مصرعے لکھے ہوئے تھے۔ اسی وقت قلم دوات منگا کر ان مصرعوں پر غزلیں لکھنی شروع کیں اور وہیں بیٹھے بیٹھے آٹھ نو غزلیں تمام کر کے چوبدار کے حوالے کر دیں[1]

انداز شعر خوانی شعر خوانی کا انداز بڑا دلکش اور مؤثر تھا۔ خواجہ حالی نے صرف ایک مرتبہ مشاعرہ میں غزل پڑھتے سنا۔ فرماتے ہیں: "ان کی باری سب کے بعد آئی۔ صبح ہو گئی تھی۔ انہوں نے کہا، صاحبو! میں بھی اپنی بھیرویں الاپتا ہوں" یہ کہہ کر اول اردو طرح کی غزل اور اس کے بعد فارسی کی غیر طرح، نہایت پُر درد آواز سے پڑھی۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا مجلس میں کسی کو اپنا قدردان نہیں پاتے، اس لئے غزل خوانی میں فریاد کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے[2]

"یادگار" میں ایک اور واقعہ مرقوم ہے کہ ایک روز قلعہ سے سیدھے نواب مصطفٰے خاں

---

[1] یادگار غالب صفحہ ۳۲۔ [2] یادگار غالب صفحہ ۴۵

کے مکان پر آئے اور کہنے لگے:

آج حضور نے ہماری قدردانی فرمائی۔ عید کی مبارکباد میں قصیدہ لکھ کر لے گیا تھا۔ جب میں قصیدہ پڑھ چکا تو ارشاد ہوا۔ کہ "مرزا تم پڑھتے خوب ہو"

اس سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے۔ کہ شعر پڑھنے کا انداز بہت اچھا تھا۔

خضر میرزا فرماتے ہیں کہ ایک مصرعہ پڑھ کر چند لمحے کے لئے چپ ہو جاتے۔ پھر اسے دہراتے۔ بعد ازاں دوسرا مصرعہ پڑھتے۔

طریق فکر شعر — فکر شعر کا طریقہ خواجہ حالی کے بیان کے مطابق یہ تھا:

اکثر رات کو عالم سرخوشی میں فکر کیا کرتے تھے۔ اور جب کوئی شعر سرانجام ہو جاتا تھا، تو کمربند میں ایک گرہ لگا لیتے تھے۔ اسی طرح آٹھ آٹھ دس دس گرہیں لگا کر سو رہتے تھے اور دوسرے دن صرف یاد پر سوچ سوچ کر تمام اشعار قلمبند کر لیتے تھے[۱]

ایک خط میں میرزا تفتہ کو لکھتے ہیں:-

کیا ہنسی آتی ہے تم پر، مانند اور شاعروں کے مجھ کو بھی یہ سمجھے ہو۔ کہ اُستاد کی غزل یا قصیدہ سامنے رکھ لیا۔ یا اس کے قوافی لکھ لئے اور ان قافیوں پر لفظ جوڑنے لگے۔ لاحول ولاقوۃ اِلّا باللہ۔ بچپن میں جب میں ریختہ لکھنے لگا ہوں لعنت ہے مجھ پر اگر میں نے کوئی ریختہ یا اس کے قوافی پیش نظر رکھ لئے ہوں۔ صرف بحر اور ردیف قافیہ تو دیکھ لیا۔ اور اس زمین میں غزل اور قصیدہ لکھنے لگا۔ بھائی شاعری معنی آفرینی ہے قافیہ پیمائی نہیں۔

مشاعرے — فارسی مکاتیب میں چند مشاعروں کا بھی ذکر ہے۔ جن میں وہ خود شریک ہوئے۔ اُردو مکاتیب میں میری تحقیق کے مطابق صرف ایک جگہ قلعہ کے مشاعرہ کا ذکر آیا ہے۔ قاضی عبدالجمیل بریلوی نے مشاعرہ قلعہ کا مصرعہ طرح مانگا تھا۔ جواب

---

[۱] یادگار غالب صفحہ ۵۹۔

میں لکھتے ہیں:

قلعہ میں شہزادگان تیموریہ جمع ہو کر کچھ غزل خوانی کر لیتے ہیں۔ وہاں کے مصرع طرحی کو کیا کیجیے گا۔ اور اس پر غزل لکھ کر کہاں پڑھیے گا؟ میں کبھی اس محفل میں جاتا ہوں اور کبھی نہیں جاتا۔ اور یہ صحبت خود چند روزہ ہے۔ اس کو دوام کہاں؛ کیا معلوم ہے۔ کہ اب کے نہ ہو اور اب کے ہو تو آیندہ نہ ہو۔

یہ غدر سے کچھ مدت پہلے کا نقشہ ہے۔ اس سے ظاہر ہے۔ کہ خاندان تیموریہ کے اوضاع و اطوار دیکھ کر ارباب بصیرت کو یقین ہو چکا تھا کہ یہ محفل اب ختم ہونے والی ہے اور اس شمع کی جھلملاہٹ صرف چند لمحوں کی مہمان ہے۔

جن فارسی مکاتیب میں مشاعروں کا ذکر ہے۔ ان میں سے چار نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ کے نام ہیں۔ ایک میر مہدی مجروح کے نام اور ایک منشی نبی بخش حقیر کے نام۔

پہلا مشاعرہ

نواب مصطفےٰ خاں کو لکھتے ہیں۔ کہ جمعہ کی شب کو ۲۳ مارچ (سنہ درج نہیں[۱]) بزم سخن آراستہ ہوئی۔ میں نے طرحی زمین میں غزل نہیں کہی تھی۔ اس لئے مشاعرہ میں جانا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن نواب ضیاء الدین احمد خاں نے زین العابدین خاں عارف اور غلام حسن خاں محو کو دو فرشتوں کی طرح مجھ پر مقرر کر دیا۔ وہ شام کو ہاتھی لیکر میرے مکان پر آئے اور ساتھ لے گئے۔ وہاں پہنچ کر مولانا صدر الدین آزردہ

---

[۱] میرا خیال ہے کہ یہ ۱۸۴۲ء یا ۱۸۴۳ء کا مکتوب ہے۔ اس لئے کہ انہی دنوں میں جیسا کہ آیندہ اقتباسات سے معلوم ہو گا۔ غالب نے "گریستن" والا قصیدہ کہا تھا۔ جو "سید الاخبار" کی ۱۸۴۳ء کی ایک اشاعت میں چھپا۔ "سید الاخبار" کا یہ پرچہ میرے دوست مولانا مظہر الدین مرحوم شیر کوٹی مالک و ایڈیٹر "الامان" و "وحدت" کے پاس تھا۔ اس کا کچھ حصہ "الامان" میں شائع بھی ہو چکا ہے۔

کی زیارت سے رنج راہ کی تلافی ہوگئی۔ صہبائی نے طرحی زمین میں غزل پڑھی۔ دو تین شعر دل نشین تھے۔ عارف وجوہر نے دو غزلیں پڑھیں۔ میں نے اسی روز ایک غزل کہی تھی۔ جس کا مطلع یہ ہے:

صبح شد خیز کہ رو داد اثر بنمائیم
چہرہ آغشتہ بہ خوناب جگر بنمائیم

یہ غزل سنائی۔ آیندہ مشاعرے کے لئے "گریبانم نمے آید"۔ "دامانم نمے آید" طرح ہوئی ہے[۱]۔

دوسرا مشاعرہ

دوسرے مشاعرے میں بھی غالب شریک ہوئے۔ فرماتے ہیں: اردو کے بہت سے شاعر جمع تھے۔ اور انھوں نے لمبی لمبی غزلیں پڑھیں۔ مفتی صدرالدین آزردہ بیمار تھے۔ اس لئے شریک مشاعرہ نہ ہوئے:

چوں نوبت بہ من رسید نخست "ملک نخواست"۔ "فلک نخواست" سرودم۔ آنگاہ غزل طرحی خواندم:

چہ عیش از وعدہ، چوں باور ز عنوانم نمے آید
بہ نوعے گفت مے آیم کہ مے دانم نمے آید[۲]

مشاعرے میں آیندہ کے لئے عرفی کا یہ مصرعہ طرح قرار پایا:

صد سال مے تواں بہ تمنا گریستن،

غالب لکھتے ہیں:

دریں زمین طالب آملی قصیدہ دارد و عرفی دو غزل۔ تا غالب بے نوا را بہ کدام زمزمہ در خروش آرند[۳]۔

---

[۱] کلیات نثر فارسی صفحہ ۲۰۱۔ [۲] اس زمین میں صہبائی کا مقطع یہ تھا:

چو دیدم غالب و آزردہ را از ہند صہبائی بخاطر ہیچ یاد از خاک ایرانم نمے آید

[۳] کلیات نثر فارسی صفحہ ۲۰۲۔

تیسرا چوتھا مشاعرہ

تیسرے مشاعرے کی کیفیت یوں بیان فرماتے ہیں۔ کہ شام ہوئی تو وہی دو فرشتے یعنی عارف و محو آکر مجھے لے گئے۔ میر نظام الدین ممنون اور مولوی امام بخش صہبائی بہ سبب علالت نہ آسکے۔ حضرت آزردہ کی خدمت میں آدمی بھیجا گیا۔ وہ اگرچہ دیر سے آئے مگر آگئے۔ میں نے طرحی زمین میں ایک قصیدہ لکھا تھا اور سوچ رہا تھا۔ کہ اسے "برات نامقبول" کی طرح ناخواندہ واپس لے جاؤں اور اردو کے شعرا کو دردِ سر نہ دوں۔ لیکن حضرت آزردہ کی تشریف آوری سے دل مطمئن ہو گیا۔ اور میں نے قصیدہ پڑھنا ضروری سمجھا۔[1]

اس سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ اگرچہ مشاعرہ میں اُردو اور فارسی دونوں زبانوں کی طرحیں دی جاتی تھیں۔ اور دونوں زبانوں کے شعرا آتے تھے۔ مگر غالب اس زمانے میں صرف فارسی کلام پڑھتے تھے۔[2]

چوتھے مشاعرے کے متعلق لکھتے ہیں۔ کہ اس میں میری "خاک زمیں گیر" ریختہ گویوں کی آنکھوں کا غبار نہ بنی۔ میں نے ایک ہفتہ پہلے غزل کہہ لی تھی۔ جسے حضرت آزردہ کی خدمت میں بھیج دیا۔[3]

---

[1] کلیات نثر فارسی صفحہ ۲۰۳۔ [2] غالب کا قصیدہ بہت مشہور ہے نواب ضیاءالدین احمد خاں نے اس کے متعلق وقت کے اکابر علم کی رائیں حاصل کی تھیں اور یہ رائیں "سید الاخبار" میں چھپی تھیں۔ مفتی صدرالدین آزردہ مرحوم نے اس طرح میں ایک غزل پڑھی تھی۔ جس کا مطلع یہ ہے:

خواہم دمِ دعا بہ دعا تا گریستن
شد بسکہ بے اثر بہ دعا ہا گریستن

ضیاءالدین احمد خاں نیّر کی غزل ان کے مجموعہ نظم میں موجود ہے۔ اس کا ایک شعر یہ ہے:

زیں لیس بہ ضبط کوشم و سوزم بہ سوز اشک
فرسودہ شیوہ ایست ہما تا گریستن

[3] کلیات نثر فارسی ۲۰۲۔

کی زیارت سے رنج راہ کی تلافی ہوگئی۔ صہبائیؔ نے طرحی زمین میں غزل پڑھی۔ دو تین شعر دل نشین تھے۔ عارفؔ و جوہرؔ نے دو غزلیں پڑھیں۔ میں نے اسی روز ایک غزل کہی تھی۔ جس کا مطلع یہ ہے:

صبح شد خیز کہ روداد اثر بنمایم

چہرہ آغشتہ بہ خوناب جگر بنمایم

یہ غزل سُنائی۔ آیندہ مشاعرے کے لئے "گریبانم نمے آید"۔ "دامانم نمے آید" طرح ہوئی ہے[1]۔

دوسرا مشاعرہ

دوسرے مشاعرے میں بھی غالبؔ شریک ہوئے۔ فرماتے ہیں: اُردو کے بہت سے شاعر جمع تھے۔ اور انہوں نے لمبی لمبی غزلیں پڑھیں۔ مفتی صدرالدین آزردہؔ بیمار تھے۔ اس لئے شریک مشاعرہ نہ ہوئے:

چوں نوبت بہ من رسید نخست "ملک نخواست"۔ "فلک نخواست" سرودم۔ آنگاہ غزل طرحی خواندم:

چہ عیش از وعدہ، چوں باور ز عنوانم نمے آید

بہ نوعے گفت مے آیم کہ مے دانم نمے آید[2]

مشاعرے میں آیندہ کے لئے عرفیؔ کا یہ مصرعہ طرح قرار پایا:

صد سال مے تواں بہ تمنا گریستن،

غالبؔ لکھتے ہیں:

دریں زمین طالب آملی قصیدہ دارد و عرفی دو غزل۔ تا غالب بے نوا را بہ کدام زمزمہ در خروش آرند۔[3]

---

[1] کلیات نثر فارسی صفحہ ۲۰۱۔ [2] اس زمین میں صہبائیؔ کا مقطع یہ تھا:

چو دیدم غالب و آزردہ را از ہند صہبائی بخاطر ہیچ یاد از خاک ایرانم نمے آید

[3] کلیات نثر فارسی صفحہ ۲۰۲۔

تیسرا چوتھا مشاعرہ

تیسرے مشاعرے کی کیفیت یوں بیان فرماتے ہیں۔ کہ شام ہوئی تو وہی دو فرشتے یعنی عارف و محو آکر مجھے لے گئے۔ میر نظام الدین ممنون اور مولوی امام بخش صہبائی بہ سبب علالت نہ آسکے۔ حضرت آزردہ کی خدمت میں آدمی بھیجا گیا۔ وہ اگرچہ دیر سے آئے مگر آگئے۔ میں نے طرحی زمین میں ایک قصیدہ لکھا تھا اور سوچ رہا تھا۔ کہ اسے "برات نامقبول" کی طرح ناخواندہ واپس لے جاؤں اور اردو کے شعرا کو دردِ سر نہ دوں۔ لیکن حضرت آزردہ کی تشریف آوری سے دل مطمئن ہو گیا۔ اور میں نے قصیدہ پڑھنا ضروری سمجھا۔[۱]

اس سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ اگرچہ مشاعرہ میں اردو اور فارسی دونوں زبانوں کی طرحیں دی جاتی تھیں۔ اور دونوں زبانوں کے شعرا آتے تھے۔ مگر غالب اس زمانے میں صرف فارسی کلام پڑھتے تھے۔[۲]

چوتھے مشاعرے کے متعلق لکھتے ہیں۔ کہ اس میں میری "خاک زمیں گیر" ریختہ گویوں کی آنکھوں کا غبار نہ بنی۔ میں نے ایک ہفتہ پہلے غزل کہہ لی تھی۔ جسے حضرت آزردہ کی خدمت میں بھیج دیا۔[۳]

---

[۱] کلیات نثر فارسی صفحہ ۲۰۳۔ [۲] غالب کا قصیدہ بہت مشہور ہے نواب ضیاءالدین احمد خاں نے اس کے متعلق دہلی کے اکابر علم کی رائیں حاصل کی تھیں اور یہ رائیں "سید الاخبار" میں چھپی تھیں۔ مفتی صدرالدین آزردہ مرحوم نے اس طرح میں ایک غزل پڑھی تھی۔ جس کا مطلع یہ ہے:

خواہم دمِ دعا بہ دعا تا گریستن
شد بسکہ بے اثر بہ دعا ہا گریستن

ضیاءالدین احمد خاں نیّر کی غزل ان کے مجموعہ نظم میں موجود ہے۔ اس کا ایک شعر یہ ہے:

زیں لبس بہ ضبط کوشم و سوزم بہ سوز اشک
فرسودہ شیوہ ایست ہما تا گریستن

[۳] کلیات نثر فارسی ۲۰۲۔

پانچواں مشاعرہ

میر مہدی مجروح والے خط میں قلعہ کے مشاعرہ کا ذکر ہے۔ فرماتے ہیں:
جمعہ کی شب ۲۵ فروری (سنہ درج نہیں[1]) کو پادشاہ کا حکم پہنچا کہ سب شاعر قلعہ میں جمع ہوں چنانچہ خاندان بابری کے شہزادے اور لوگ اس قدر تعداد میں آئے کہ نشست گاہ میں بیٹھنے کو جگہ نہیں ملتی تھی۔ سب سے پہلے "سلطان الشعرا شیخ محمد ابراہیم ذوق" نے پادشاہ کی غزل پڑھی۔ پھر شہزادہ خضر سلطان[2] نے اپنی غزل سنائی۔ ان کے بعد میرزا حیدر شکوہ، میرزا نور الدین اور میرزا عالی بخت عالی نے اپنا اپنا کلام سنایا۔ عالی کے پاس ہی میں (غالب) بیٹھا ہوا تھا۔ اپنی غزل دس شعر کی پڑھی میرزا حاجی شہرت نے کم و بیش ستر شعر زمین طرح میں سنائے۔ میں ایک بہانے سے اٹھا اور اپنے گھر چلا آیا۔ دکانوں کے دروازے کھلے تھے۔ چراغ روشن تھے۔ شراب پی اور سو رہا۔ صبح قلعہ میں گیا۔ تو وہ چاروں شہزادے جن کے نام اوپر مرقوم ہیں، جمع تھے۔ انہوں نے رات والی غزلیں پھر سنائیں۔ میں نے بھی اپنی غزل دوبارہ پڑھی وہیں سنا کہ مشاعرہ ساری رات جاری رہا۔ سب سے آخر میں "سلطان الشعرا ذوق"

---

[1] یہ مشاعرہ غالباً قلعہ کے ساتھ ملازمت کا تعلق پیدا ہو جانے کے بعد ہوا۔ جبکہ ذوق بقید حیات موجود تھے۔ گویا اسے ۱۸۵۰ء اور ۱۸۵۴ء کے درمیان کا کوئی مشاعرہ سمجھنا چاہیے۔

[2] مولانا ابوالکلام آزاد فرماتے ہیں کہ تمام شہزادوں میں یہ سب سے زیادہ خوش فکر تھے، مگر اجل نے مہلت نہ دی۔ غالب کے شاگرد تھے۔ مندرجہ ذیل مشہور شعر انہی کا ہے:

گالی سے کون خوش ہو مگر حسن اتفاق
جو نیری خو تھی وہ ہی مرا مدعا ہوا

نے دو غیر طرحی غزلیں سُنائی تھیں[1]۔

چھٹا مشاعرہ منشی نبی بخش حقیر کو لکھتے ہیں۔ کہ شہزادگان تیموریہ میں سے ایک نے بزمِ سخن آراستہ کی اور شعرا کو بلایا۔ مجھے ریختہ گوئی سے کوئی ربط نہیں ہا لیکن جانا ضروری تھا۔ شب کو مشاعرہ تھا۔ دن کے وقت بالخصوص مشاعرہ میں جاتے وقت بے تکلف، چند شعر خیال میں آئے۔ یہ شعر آپ کو بھیجتا ہوں، اچاہتا ہوں کہ آپ بھی اس زمین میں غزل لکھکر میرے پاس بھیج دیں[2]۔

خط کے آخر میں مرقوم ہے: "نگاشتہ سہ شنبہ ۱۶ ربیع الاول و ۲۱ فروری ہنگام نیمروز"۔ سال درج نہیں۔ تقویم سے معلوم ہُوا۔ کہ سال ہجری ۱۲۶۳ھ ہونا چاہیئے اور سال عیسوی ۱۸۴۷ء۔

غالب کی شاعری کے متعلق محولہ بالا بیانات کا خلاصہ یہ ہے:

(۱) دس گیارہ برس کی عمر میں شعر کہنے شروع کئے تھے۔ ابتدا اُردو سے ہُوئی۔ تیرہ چودہ برس میں خیالی مضامین کا ایک دیوان تیار کر لیا تھا۔ جب اچھائی بُرائی کی تمیز پیدا ہوئی تو اکثر اشعار حذف کر ڈالے۔ تھوڑے سے بہ طور نمونہ رکھے۔

---

[1] کلیاتِ نثرِ فارسی صفحہ ۲۳۸۔ مولانا ابو الکلام آزاد نے خواجہ حالی مرحوم کی روایت کے مطابق لکھا ہے۔ کہ غالب مشاعرہ میں صرف ایک مرتبہ ذوق سے ہم طرح ہوئے، وہ بھی شاہی مشاعرہ میں اور پادشاہ کے حکم سے۔ غالباً یہ وہی مشاعرہ ہے جسمیں طرح تھی "بیاں کے لئے" "زباں کے لئے"۔ اس زمین میں ذوق کی غزل مشہور ہے۔ غالب نے اس مشاعرہ کی غزل کو چند مدحیہ اشعار بڑھا کر فرخ آباد بھیجا تھا۔ نواب مصطفٰے خاں فرماتے تھے کہ ذوق نے اس مشہور شعر کی بے حد تعریف کی تھی۔ اور بار بار دُہرایا گیا تھا:

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئے
اُٹھا اور اُٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لئے

نواب سعید الدین احمد خاں طالب، نواب ضیاء الدین احمد خاں کی زبانی روایت کرتے تھے کہ ایک مرتبہ بہادر شاہ نے ذوق سے فرمایش کی:۔ اُردو کا کوئی ایسا شعر سُناؤ، جو تمہارے خیال میں سب سے بہتر ہو۔ ذوق نے کچھ دیر تامل کیا، پھر غالب کا یہ شعر پڑھا:

دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک　　میرا سرِ دامن بھی ابھی تر نہ ہُوا تھا

[2] کلیاتِ نثر صفحہ ۲۱۔

(۲) فارسی بھی اُردو کے ساتھ ہی شروع کر دی تھی اور کم و بیش بیس برس کی عمر تک دونوں کی مشق برابر جاری رہی۔

(۳) اس کے بعد فارسی کی طرف زیادہ توجہ ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ ۱۸۲۵ء سے لے کر ۱۸۵۰ء تک وہ اُردو کے بجائے فارسی کے شاعر سمجھے جاتے رہے۔

(۴) قلعہ کے ساتھ ملازمت کا تعلق پیدا ہونے کے بعد بہ پاس خاطر بادشاہ انہوں نے پھر اُردو پر توجہ مبذول کی۔ ان کے مروجہ دیوان کی کئی اچھی غزلیں اسی دور کی کہی ہوئی ہیں۔

(۵) نظم و نثر کا سلسلہ یوں تو آخری دم تک قائم رہا۔ لیکن ان کی اُردو اور فارسی نظم و نثر کی بہترین چیزیں وہ ہیں۔ جو ۱۸۲۵ء سے لے کر قریباً ۱۸۶۵ء تک لکھی گئیں۔ ۱۸۲۵ء سے پیشتر ان میں خامی تھی۔ ۱۸۶۵ء کے بعد دماغی قوےٰ مضمحل ہو گئے۔ اور قوت فکر و نظم پہلی حالت پر قائم نہیں رہی تھی۔

دسمبر ۱۹۴۶ء